علم الانسان ما لم یعلم

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

جامعہ ملیہ اسلامیہ

نئی دہلی

شعبہ ____________

شمارہ ____________

عدد داخلہ ____________

Call No............... Acc. No.....................

الفرقان
لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

تالیف — مولانا محمد منظور نعمانی

بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آب حیات ہے۔

لیکن ہماری دنیا اس سے نا آشنا ہے یہاں تک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
امت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے

(یہ کتاب)

اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔

- یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
- جسمیں ۲۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
- خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
- یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔

طبع ثانی کتابت و طباعت عمدہ کاغذ ، ۲۰۰ صفحات ، مجلد مع گرد پوش ، قیمت ۔/۔

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/۵۰
۶۰ صفحات
قیمت
فی پرچہ .... ۷۵ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۴۰ | بابت ماہ محرم الحرام ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۲ء | شمارہ (۱)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ تاریخ تک آ جانی ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت و منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہو

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اسکی اطلاع ۱۰ تاریخ تک آ جانی چاہیئے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

تمام تعریفیں اور تمام تعظیمیں اُس معبود لاشریک کے لیے ہیں جس کے جوشِ کرم سے یہ کارخانۂ عالم وجود میں آیا، جس کے عدل و حکمت سے اس کی تمام خوبیاں ہیں اور جس کے احسان سے اُس کی معرفت اور اُس کی رضایابی کی راہیں انسان پر کھلیں اور ان راہوں پر رہنمائی کے لیے ہادیوں اور پیغمبروں کا ایک مکمل سلسلہ وجود میں آیا۔ صلوات اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

آغاز جلد چہلم

اُسی خدا کا شکر ہے کہ "الفرقان" اپنی عمر کے انتالیس ۳۹ سال پورے کر کے آج چالیسویں سال میں قدم رکھنے کا موقع پا رہا ہے۔ حالات کی ناسازگاری حد سے گزر چکی ہے، مگر یہ اُس کے دستِ کرم کی مضبوطی ہے کہ پھر بھی یہ ناتواں وجود قائم اور اپنی راہ پر گامزن ہے۔ اسی سلسلے میں کئی بزرگوں اور دوستوں کا قلمی تعاون بھی واجب الشکر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی بہترین جزا اُنھیں عنایت فرمائے۔

اس شمارے کے دو مضمون

یہ شمارہ اپنے ٹھیک وقت پر ہی شائع ہونے کے لیے تیار تھا کہ ایک بہت قیمتی مضمون کو اس میں شامل کرنے کی خاطر چند دن کی تاخیر گوارا کرنا پڑی اور بعض مضامین روکے گئے۔ یہ مضمون مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی کا ہے۔ "مسلم پرسنل لا" میں تبدیلی کی جو مہم کچھ ترقی پسند مسلمانوں" کی طرف سے کچھ کھلے غیر اسلامی محرکات کی بنا پر چلائی جا رہی ہے، ملک کے ایک مشہور جدید تعلیمیافتہ شیعہ فاضل، پروفیسر آصف فیضی صاحب کا ایک سنجیدہ اور بظاہر مدلل مقالہ اسکی تائید میں ہے۔ انہی دنوں انگریزی اور اُردو میں شائع ہوا اور بڑے اہتمام سے اسکی اشاعت کا دائرہ وسیع کیا جا رہا ہے۔ مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے اسکے کتاب و سنت اور فقہ کے حوالوں پر ایک تنقیدی نظر ڈالکر بعض بہت حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں۔ اس مقالے پر اُردو میں غالباً کوئی قابلِ لحاظ تبصرہ یا کم سے کم اس نوعیت کا تبصرہ ابتک شائع نہیں ہوا ہے۔ امید ہے کہ یہ تبصرہ فیضی صاحب کے مقالہ پر غور و فکر کرنیوالوں کیلیے بڑی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ — وقت کا ایک ایسا ہی دلچسپی کا مسئلہ "شاہ نعمت اللہ ولی" کا قصیدہ بنا ہوا ہے۔ اس پر ایک مختصر تحریر اسی شمارہ میں مدیر مسئول مدظلہ کے قلم سے ہے اور یہ بھی غالباً اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی تحریر ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نیا سال، الفرقان اور ناظرین الفرقان دونوں کو مبارک کرے۔

شاہ نعمت اللہ ولی اور اُن کا قصیدہ

ـــــــــ محمد منظور نعمانی

شاہ نعمت اللہ ولی کا نام اور اُن کے قصیدہ کے حوالے سے عجیب وغریب قسم کی ـــ ان کی کچھ پیشنگوئیاں تو اپنے بچپن میں بھی سنی تھیں ـــ جن میں سے یہ پیشنگوئی، جس کا اُس زمانہ میں بہت چرچا تھا، اب تک خوب یاد ہے کہ ـــ

امیر کابل اپنی فوجوں کے ساتھ حملہ کرکے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیں گے اور یہاں افغانوں کی [illegible] حکومت ہو جائے گی[۱] اور پھر کچھ مدت کے بعد اسی چودھویں صدی میں امام مہدی کا ظہور ہو جائے گا اور پھر ساری دنیا میں اسلام ہی کی حکومت ہو جائے گی۔

یہ بھی یاد ہے کہ بعض کم پڑھے لکھے سادہ دل بوڑھے بزرگ اس پیشنگوئی کا تذکرہ کر کے

۱؎ "امیر کابل" اور اُن کی فوج اور حکومت کے بارہ میں یہ خوش فہمی اُس زمانہ میں بہت ہی عام تھی، یہ زمانہ امیر حبیب اللہ خان کا تھا، مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے رفیق اور سکریٹری ظفر حسن ایبک کی "آپ بیتی" جب شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ حکومت افغانستان اُس وقت انتہائی پسماندہ حالت میں تھی اس کے پاس اتنے وسائل بھی نہیں تھے جتنے کہ اس زمانہ کی ہندوستان کی دوم اور سوم درجہ کی ریاستوں کے پاس تھے۔ یہ ظفر حسن ایبک اُسی زمانہ میں (۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۲ء تک) پورے سات سال مولانا سندھی مرحوم کے ساتھ کابل میں رہے تھے۔ اپنی ذاتی قابلیت اور صلاحیت کی وجہ سے جنرل نادر خان کے بہت معتمد ہوگئے تھے۔ پھر مولانا مرحوم ہی کے ساتھ کابل سے روس اور پھر وہاں سے ترکی چلے گئے تھے، اور ترکی فوج میں لے لیے گئے تھے، وہیں کی شہریت اختیار کرلی تھی۔ اب ریٹائر ہوچکے ہیں اور وہیں اقامت گزیں ہیں۔

یقین کے ساتھ کیا کرتے تھے اور اس کے ظہور کی ان کو پوری امید تھی کم سنی اور ناواقفی و نافہمی کی وجہ سے خود اپنا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا ___ (یہ غالباً پہلی جنگ عظیم ۱۴ء تا ۱۸ء کا زمانہ تھا) ___ بعد میں جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اتنی واقفیت اور سمجھ نصیب ہو گئی کہ اس طرح کی باتوں کے بارہ میں علم و عقل کی روشنی میں غور کر کے رائے قائم کی جا سکے تو اندازہ ہو گیا کہ یہ پیشینگوئیاں اسی قسم کی مزخرفات ہیں جس طرح کی ہزاروں موضوع روائتیں اور قصے کہانیاں خاص مزاج کے داستان گو لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت کی طرف نسبت کر کے کسی زمانہ میں مسلمانوں میں پھیلا دی تھیں اور اُن میں سے بہت سی اب تک کچھ جاہل مسلمانوں کے عقیدہ کا جز بنی ہوئی ہیں، حالانکہ محدثین نے پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد نشاندہی کر دی ہے کہ یہ موضوعات اور خرافات ہیں۔

"شاہ نعمت اللہ ولی" جن کی طرف ان پیشینگوئیوں کی اور قصیدہ کی نسبت کی جاتی ہے اُن کی شخصیت کوئی معروف تاریخی شخصیت نہیں ہے ___ ایسی کسی شخصیت کی طرف نسبت کر کے کچھ بھی کہہ دینا بڑا آسان ہے۔

اس قصیدہ کا چرچا اب تک ہمیشہ سنا ہی تھا، دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا __ گزشتہ جنوری میں صوبہ بہار کے ایک دوست نے پھلواری شریف (بہار) سے شائع ہونے والے ایک ایسے ہفتہ وار اخبار کا (جس کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا) تراشہ بھیجا، جس میں ایک پورا قصیدہ تقریباً ۶۰ شعروں کا شائع ہوا ہے اور اس کو شاہ نعمت اللہ ولی کا مشہور تاریخی قصیدہ بتلایا گیا ہے۔ ہر شعر کے ساتھ اردو میں اس کا ترجمہ یا حاصل مطلب بھی لکھ دیا گیا ہے۔

اس اخبار کی ایک اشاعت میں (کسی کتاب کے حوالے کے بغیر) شاہ نعمت اللہ ولی کے تعارف میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہ امیر تیمور کے زمانہ میں بڑے کامل بزرگ گزرے ہیں، ان کا مزار علاقہ کرمان (ایران) میں ہے، اور ان کی پیشینگوئیاں آٹھ سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہیں۔

گزشتہ ۳-۴ ہفتوں میں مختلف ذرائع سے یہ بات علم میں آئی کہ مسلمانوں کے بعض مخصوص حلقوں میں اس قصیدہ اور اس کی پیشینگوئیوں کا آج کل بڑا چرچا ہے اور وہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں خدا کی دی ہوئی اپنی عقل و بصیرت سے کام لینے کے بجائے اس قصیدہ

کی خوشگن اور خواب آور پیشینگوئیوں کو ایک ولی کامل کا الہام سمجھ کر اُن کے ظہور کی آس لگائے ہیں۔ ظاہر ہو کہ موجودہ حالات میں یہ چیز مسلمانوں کے لیے کس قدر مضر اور تباہ کن ہو سکتی ہے۔

بہرحال راقم سطور نے یہ قصیدہ پہلی بار اس اخباری تراشہ ہی میں دیکھا اور پڑھا ہے۔ اس کے بارہ میں میرا پہلا تاثر اور احساس تو یہ ہے کہ جو شخص فارسی زبان و ادب سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو وہ اس قصیدے کے اکثر و بیشتر شعروں کو پڑھ کر بغیر کسی گہرے غور و فکر کے محسوس کرے گا کہ یہ عہد تیموری کے کسی باکمال ایرانی شاعر کا کلام تو کجا، فارسی کے کسی اچھے ہندوستانی شاعر کا کلام بھی نہیں ہو سکتا۔ الفاظ، بندش اور تعبیر ہر چیز میں اتنا بے تکا پن ہے کہ بالکل صاف محسوس ہوتا کہ کسی بہت ہی معمولی لکھے پڑھے ہندوستانی کی طبع آزمائی ہے ۔۔ لیکن جو بیچارے فارسی نہیں جانتے ظاہر ہے کہ وہ اس چیز کو محسوس نہیں کر سکتے اور کوئی ایسی تدبیر بھی نہیں جس سے ان کو یہ چیز محسوس کرائی جا سکے۔

قریباً پچاس سال پہلے کی بات ہے ایک آریہ سماجی مناظر تھے جنھوں نے کہیں سے عربی کی کچھ شد بد بھی حاصل کر لی تھی (غالباً پنڈت کالی چرن نام تھا) وہ دعویٰ کرتے تھے کہ میں قرآن مجید جیسی عربی زبان لکھ سکتا ہوں، اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے لکھے ہوئے عربی کے ایک دو رسالے اپنے دعوے کے ثبوت میں شائع بھی کیے تھے، جو راقم سطور نے اُسی زمانہ میں دیکھے تھے ۔۔۔۔ ان کی عربی کا حال یہ تھا کہ غالباً کوئی ایک سطر بھی ایسی نہیں تھی جو غلطی سے خالی ہو، ان رسالوں کو دیکھ کر بڑا ہی غصہ آتا تھا کہ یہ شخص جس کی تحریر میں ایک جملہ بھی صحیح عربی زبان میں نہیں ہے۔ قرآن کے مقابلہ میں عربی لکھنے کا دعویٰ کرتا ہے اسی کے ساتھ اس احساس سے بڑا دکھ ہوتا تھا کہ جو عوام عربی زبان اور اس کی صرف و نحو نہیں جانتے ۔۔ اور غلط و صحیح اور فصیح و غیر فصیح کے فرق کو بالکل نہیں سمجھ سکتے اُن کو یہ بات کسی طرح سے محسوس نہیں کرائی جا سکتی۔ ہم دیکھتے تھے کہ بہت سے اچھے تعلیمیافتہ ہندو صاحبان بھی یہی سمجھتے تھے کہ ہمارے پنڈت جی نے قرآن کے مقابلہ میں عربی کی ایک کتاب لکھ کے پیش کر دی اور قرآن کے اعجاز کا دعویٰ توڑ دیا۔ اس قصیدہ کو دیکھ کے قریباً آدھی صدی پہلے کی یہ بات یاد آ گئی۔

بہر حال جو حضرات فارسی نہیں جانتے وہ تو محسوس نہیں کر سکتے لیکن جن کو فارسی زبان ادب سے کچھ بھی واقفیت ہے انھیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ قصیدہ ہرگز کسی اچھے ایرانی شاعر کا کلام نہیں ہے اور جب بھی گڑھا گیا ہو' ہندوستان میں گڑھا گیا ہے۔ اور غالباً مختلف زمانوں میں مختلف لوگوں نے اس میں حصہ لیا ہے۔

پھر قطع نظر اس سے' اس کی بہت سی پیشینگوئیاں گویا خود سے بول رہی ہیں کہ یہ واقعات کے بعد گھڑی گئی ہیں۔ قرآن پاک اور کتب حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض انبیاء سابقین کی بھی بہت سی پیشینگوئیاں مذکور ہیں' اسی طرح امت کے بہت سے مسلم عارفین کی پیشینگوئیاں بھی ان کے تذکروں میں محفوظ ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر ہر وہ شخص جس کو اللہ نے ان باتوں کی کچھ بھی سمجھ دی ہو' اندازہ کر سکتا ہے کہ وحی و الہام کی بنیاد پر جو پیشینگوئیاں کی جاتی ہیں ان کا انداز کیا ہوتا ہے' ان میں اس طرح کا تعین بالکل نہیں ہوتا جس طرح کا تعین اس قصیدہ کی پیشینگوئیوں میں ہے۔ مثلاً پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء سے متعلق جو پیشینگوئی کی گئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اس میں یورپ کی فلاں فلاں حکومتیں فریق ہوں گی پھر فلاں فریق کی فتح ہوگی اور فلاں کی شکست اور ایک کروڑ اکتیس لاکھ آدمی اس جنگ میں مقتول ہوں گے[1]۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے ۲۱ سال بعد دوسری جنگ عظیم ہوگی جو چھ سال تک جاری رہے گی' اس میں فلاں فلاں حکومتیں فریق ہوں گی' فلاں کی فتح ہوگی اور فلاں کی شکست[2]۔

جیسا کہ عرض کیا گیا وحی و الہام یا کشف صحیح کی بنیاد پر انبیاء علیہم السلام یا عرفائے کاملین کی جو پیشینگوئیاں مستند طور پر منقول ہیں ان کا یہ انداز قطعاً نہیں ہے۔ الغرض ایک صاحب نظر اور صاحب فراست کو اس میں ذرا بھی شک نہیں ہو سکتا کہ یہ پیشینگوئیاں واقعات کے بعد گھڑی گئی

---

[1] اخبار نے اس پیشینگوئی کی صداقت کے ثبوت میں برطانیہ کے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کے حوالے سے اس جنگ کے مقتولین کی تعداد بھی بتلائی ہے

[2] اس دوسری جنگ عظیم کے مقتولین کی تعداد قصیدہ میں غالباً اس لیے نہیں دی جا سکی کہ ۱۹۴۲ء تک جبکہ اس اخبار کے بیان کے مطابق یہ قصیدہ پہلی دفعہ شائع ہوا تھا' اس جنگ کے مقتولین کی تعداد کسی رپورٹ سے معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

ہیں۔ (اور کسی بہت زیادہ ہوشیار آدمی نے کبھی نہیں گھڑی ہیں)

علیٰ ہذا دوسری جنگ کے بعد انگریزی حکومت کے خاتمہ اور ملک کی دو حصوں میں تقسیم اور پھر حالات کی خرابی اور ہندوستانی مسلمانوں پر آنے والی مصیبتوں اور تباہیوں کی پیشینگوئی کی گئی ہے۔ یہ ساری پیشینگوئیاں جس طرح اور جس انداز میں کی گئی ہیں وہ منھ سے بول رہی ہیں کہ یہ سب بعد کی گڑھی ہوئی ہیں۔[1]

یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ ایک ایسا معرکہ کا قصیدہ جس میں اتنی غیر معمولی قسم کی پیشینگوئیاں کی گئی ہیں (جو بظاہر (معاذ اللہ) پیغمبروں کی پیشینگوئیوں سے بھی زیادہ واضح یقینی اور انسانی عقل کو حیران کر دینے والی ہیں) اس اخبار کے دعوے کے مطابق "ہزاروں افراد" کے پاس سیکڑوں برس سے موجود اور محفوظ تھا لیکن نہ وہ پہلی جنگ سے پہلے کبھی چھپا' نہ دوسری جنگ سے پہلے' اور نہ ملک کی تقسیم کے واقعہ (۱۹۴۷ء) سے پہلے چھپا' جب یہ سب واقعات ہو چکے تب اس کو چھاپا گیا۔ اگر اللہ نے کسی کو عقل و فراست سے بالکل محروم نہ کیا ہو تو اس کے لیے اتنی ہی بات یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ یہ سب پیشینگوئیاں واقعات کے بعد گھڑی گئی ہیں۔ اس قصیدہ میں ملک کی تقسیم اور ہندوستان میں مسلمانوں پر آنے والی مصیبتوں اور تباہیوں کی ان پیشینگوئیوں کے بعد ... شعروں میں مسلمانوں کو عجیب و غریب قسم کی یہ خوشخبریاں سنائی گئی ہیں کہ

پھر ماہ محرم میں مسلمانوں کے ہاتھ میں تلوار آ جائے گی۔[1]

اور ایک مجاہد[2] جس کا نام غنمانی ہوگا جہاد کا علم لے کر میدان میں آ جائے گا' اور اس کے ساتھ[3] ایک دوسرا شخص حبیب اللہ جو صاحب قرآن ہوگا وہ بھی اپنی تلوار نیام سے نکال لے گا۔

پھر سرحد[4] کے بہادر غازیوں کا ٹڈی دل لشکر جن کے ساتھ ایرانی بھی ہوں گے 'حملہ آور ہوگا اور افغان[5] قوم ہندوستان کو فتح کر لے گی۔

---

[1] ہمارے استاذ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین ہوئے اپنے خاص مزاحی انداز میں فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اس قصیدہ میں ایک دو شعر بڑھ جاتے ہیں۔

پھر اسلام اور مسلمانوں کے بدخواہ دشمن ختم کر دیے جائیں گے

اس کے بعد ایک شعر میں یہ خوشخبری بھی سنائی گئی ہے کہ ایک کینہ پرور بقال یعنی بنیا جس کا چھ حرفی نام گ سے شروع ہوگا دل سے اسلام قبول کر لے گا۔ اس سے مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوگی اور پھر ہندوستان ہندوانہ طور طریقوں سے پاک ہو جائے گا۔

پھر قصیدہ کے بالکل آخری شعر میں امام مہدی کے ظہور کی پیشینگوئی کی گئی ہے۔

پھلواری شریف (بہار) کے جس ہفتہ وار میں یہ قصیدہ شائع ہوا ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ قصیدہ جنوری [illegible] میں کلکتہ میں فلاں اخبار میں چھپا تھا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو راقم سطور کا قیاس یہ ہے کہ ملک کی تقسیم کے فیصلہ کے بعد جو صورت حال ۴۷ء اور ۴۸ء میں پورے شمالی ہند کے مسلمانوں کے سامنے آئی تھی جس نے یہ حقیقت سورج کی طرح روشن کر دی تھی کہ جو علاقے تقسیم کے بعد ہندوستان ہی میں رہ جانے والے تھے اُن کے مسلمانوں نے تقسیم کے مطالبہ کی حمایت کر کے بڑی غلطی کی اور خود ہی اپنے پاؤں میں کلہاڑی مار لی ہے۔ غالباً اُن ہی میں سے کسی صاحب نے اپنا اور اپنے بھائیوں کا غم غلط اور دلوں کا بوجھ ہلکا کرنے اور ذہنوں کو دوسری طرف موڑنے کے لیے اس وقت اس قصیدہ کی شکل میں یہ پیشینگوئیاں شائع کی ہوں گی۔

پھر اب جب پاکستانی قیادت کی احمقانہ پالیسیوں اور اقدامات کے نتیجہ میں وہ افسوسناک واقعات ظہور میں آئے جنہوں نے بالآخر مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا دیا۔ تو اب پھر اسی مقصد سے اس قصیدہ کی اشاعت کی جا رہی ہے۔ گویا اس کے ذریعہ بیچارے عام مسلمانوں کو پھر افیون کی گولیاں دی جا رہی ہیں کہ وہ ان خرافاتی خوابوں میں مست رہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی فکری اور عملی غلطیوں کو محسوس کر کے ان کی اصلاح اور تلافی کی فکر کریں، بس پردۂ غیب سے ان پیشینگوئیوں کے ظہور کا انتظار کرتے رہیں۔

حالات اتنے نازک، زمانہ اتنا تیز رفتار، مسائل اتنے پیچیدہ اور مسلمانوں کی سادہ لوحی کا یہ حال! بس اللہ ہی عقل و بصیرت نصیب فرمائے!!

---

[1] وہ صورتیں جن میں یہ پیشینگوئی کی گئی ہے

اور ب سین حرفی ابنال [illegible] مسلم شود بحاظ از لطف آں یگانہ

[2] یہ کہ یہ پیشینگوئی گاندھی جی کی زندگی میں کی گئی تھی ان کے مشہور نام میں چھ حرف ہیں اور پہلا حرف گ ہے۔

"مسلم پرسنل لا" پر فیضی صاحب کا مقالہ

ایک محدود اور مختصر جائزہ

(از۔ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

ہندوستان کے مسلمان گفتنی و ناگفتنی اسباب کی بنا پر جن مسائل سے دوچار ہیں، اُن میں پرسنل لا" میں تبدیلی کا خطرہ غالباً سب سے زیادہ اہم ہے، مسئلہ کی اہمیت اور کچھ دوسری وجوہ .... کی بنا پر آئے دن اخبارات، رسائل، کانفرنسوں اور دوسرے ذرائع سے "مسلم پرسنل لا" میں تبدیلی ہونے نہ ہونے کی ضرورت و افادیت پر اظہارِ خیال کیا جاتا رہتا ہے۔

اسی سلسلہ کی کڑی، ہندستان کے مشہور دانشور اور قانون داں پروفیسر آصف فیضی صاحب کا مضمون بھی ہے جس کا ترجمہ پچھلے دنوں ــــ اسلام اور عصر جدید' دہلی میں شائع ہوا ہے، اور بعض حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا اور پسند کیا گیا، غالباً موصوف کی شخصی اہمیت اور مضمون کی خاص نوعیت کے پیش نظر ان کے بعض قدردانوں نے اسے "مسلم پرسنل لا" کے نام سے الگ بھی شائع کر دیا ہے۔

چند روز پہلے ہمیں بھی اسے دیکھنے کا موقع ملا۔ مضمون نگار نے قانونی اور دوسری حیثیتوں سے مسئلہ پر بحث کرنے کے علاوہ بعض جگہ قرآنِ کریم کی آیات اور فقہاء کے اقوال سے بھی حصولِ مدعا کی کوشش کی ہے، یہی حصہ ہمارے لیے سب سے زیادہ دلچسپی اور توجہ سے پڑھنے کا تھا، مگر طالب علمانہ اندازِ نظر سے دیکھنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ موصوف سے قرآنِ مجید کی آیات سے استدلال

اور فقہاء کی عبارتوں سے استشہاد کرتے وقت نہ صرف یہ کہ ان کے مفہوم سمجھنے میں لغزشیں ہوئی ہیں بلکہ ائمہ کے اقوال اور اُن کی آراء نقل کرنے میں بھی شدید قسم کی فروگذاشتیں ہوگئیں، اس لیے علمی دیانت کا تقاضا بلکہ فریضہ معلوم ہوا کہ ان کی نشاندہی کی جائے تاکہ غلط فہمی دور ہوجائے، اور جن ذہنوں میں وہ چیزیں اثرانداز ہوگئی ہیں اُن کو نظرثانی کا موقع مل جائے۔

بس یہی احساس ہے جس کی بنیاد پر یہ گزارشات پیش کی جارہی ہیں، اُمید ہے محترم فیضی صاحب ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد اپنے مضمون پر نظرثانی کرلیں گے، یا پھر اس غلطی کو دور کرنے کی طرف توجہ دیں گے!

فی الحال صرف اسی فریضہ کی ادائیگی پیش نظر ہے۔ نفس مسئلہ (پرسنل لا میں تبدیلی) پر اس وقت نہ رائے زنی مقصود ہے اور نہ اس کے حسن و قبح سے بحث کرنا ہے، کیونکہ وہ ایک طویل الذیل اور مستقل موضوع ہے تھوڑے وقت اور محدود مطالعہ سے اس پر کچھ لکھنا مسئلے کو سلجھانے کے بجائے اُلجھانے کا باعث بھی ہوسکتا ہے۔ آئندہ خدا نے توفیق دی تو اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ وما توفیقی الا باللہ۔

۱۔ فیضی صاحب نے مطلقہ عورت کو شوہر کی طرف سے مختلف مدوں میں (مثلاً مہر کفالت کے لیے تا حیات یا عقد ثانی تک) ایک رقم ادا کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے متاع المطلاق (طلاق نامہ بیانہ) کی مشروعیت ظاہر کی ہے، اور اس پر اس طرح استدلال کیا ہے:

"مذکورہ بالا شق دفعہ (د) کی متاع الطلاق کی ادائی کی تجویز میری تجویز میں نے شافعی اور مالکی فقہ کی بنیاد پر پیش کی ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ شوہر مطلقہ بیوی کو مہر کے علاوہ ایک رقم بطور ہرجانہ ادا کرتا ہے۔ اس اصول کی بنیاد قرآن مجید کی یہ آیت ہے۔

لا جناح علیکم ان طلقتم النساء	تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اُن بیویوں کو
ما لم تمسوھن او تفرضوا لھن	جنھیں تم نے نہ ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لیے
فریضۃ ومتعوھن علی الموسع	مہر مقرر کیا طلاق دے دو۔ وسعت والے
قدرہ وعلی المقتر قدرہ متاعا	کے ذمہ اس کی حیثیت کے لائق ہے اور
بالمعروف حقا علی المحسنین۔	تنگی والے کے ذمہ اس کی حیثیت کے لائق

[illegible] ہے

[illegible]

اس بدیہی حکم اور واضح آیت کی تاویل فقہاء نے غلط طور پر کی ہے اور ان میں سے اکثر نے "متاعا بالمعروف" کے حکم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ صرف شافعی اور مالکی مسلک میں اس کی ادائی لازمی قرار دی گئی ہے۔ (ملخص صفحہ ۲۵ سطر ۲ تا ۵)

اس طویل اقتباس کا ماحصل تین چیزیں ہیں۔ ۱۔ آیت مذکورہ سے ہر قسم کی مطلقہ کے لیے متاع الطلاق کا وجوب ثابت ہو رہا ہے۔ ۲۔ اکثر فقہاء نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ۳۔ صرف شافعی اور مالکی مسلک میں اس کی ادائی لازمی قرار دی گئی ہے۔

اب آئیے! دیکھیں کہ ان دعاوی میں کتنی صداقت ہے:

الفاظ آیت میں غور کرنے سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ "مَتِّعُوْهُنَّ" کا حکم ان مطلقہ عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے جن کا نکاح کے وقت نہ تو مہر مقرر ہوا تھا اور نہ ان سے عملاً تعلقِ زوجیت ہی قائم ہوا۔ آیت کے الفاظ "ما لم تمسوهن او تفرضوا لهن" خاص طور سے قابلِ لحاظ ہیں۔ مضمون میں بھی اس حصہ کا ترجمہ کیا گیا ہے "جنھیں تم نے نہ ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا" اسی طرح مستند اردو ترجمہ یا ترجمہ قرآن مجید چاہے جس کسی کا بھی اٹھا کر دیکھیے سب میں یہی ملے گا (ان میں پایا جانے والا تھوڑا بہت الفاظ کا فرق ہو) کہ بغیر مہر مقرر کیے اور بغیر ہاتھ لگائے جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے صرف ان کے لیے یہ حکم ہے نہ کہ تمام مطلقہ عورتوں کے لیے۔[۵]

تمام قدیم عربی تفسیروں میں بھی یہی ملتا ہے، مثلاً مشہور مفسر علاء الدین الخازن لکھتے ہیں:[۶]

ای لم تمسوهن ولم تفرضوا لهن فريضة يعني ولم تسموا لهن صداقا ولم توجبوا عليكم .... فنفى الله الحرج والجناح عنه اذا كان الفراق اروح من الامساك .... اذا تزوج امرأة ولم يفرض لها مهرا ثم طلقها قبل المسيس يجب لها عليه المتعة وبه قال

---

۵ ملاحظہ کیجیے: ترجمان القرآن مولانا آزاد ص ۲۴۳ ج ۱، بیان القرآن مولانا تھانوی صفحہ ۱۳۱ ج ۱۔

۶ تفسیر خازن ص ۱۶۴ ج ۱

الشافعی وابوحنیفۃ واحمد وقال مالک المتعۃ مستحبۃ۔

یہی تفسیر تھوڑے فرق سے تقریباً ہر معتبر تفسیر کی کتاب میں ملتی ہے[1]۔ ان سب کا مفہوم یہی ہے کہ اگر کسی عورت کو بغیر مہر مقرر کیے اور بغیر ہاتھ لگائے طلاق دے دی گئی تو اس کی دلشکنی کے تدارک کے طور پر شوہر کو کچھ ضرور دینا چاہیے۔ اپنی استطاعت کے مطابق تاکہ دلشکنی کی یک گونہ تلافی ہو جائے۔

(وان کان فی ھذا انکسار لقلبھا ولھذا امر اللہ تعالیٰ بامتاعھا وھو تعویضھا عما فاتھا۔ ابن کثیر)

وجوب متعہ کے سلسلہ میں ائمہ کا مسلک اور آیت کا یہی مفہوم تقریباً ہر تفسیر میں ملتا ہے کہ اس صورت میں متعہ (طلاق کا ہرجانہ)[5] شوہر پر واجب ہے۔ لیکن کن ائمہ کے نزدیک؟ (نہایت حیرت کی بات یہ ہے کہ صرف فیضی صاحب کے بیان کردہ) امام مالکؒ کے نزدیک نہیں، بلکہ ان کے علاوہ تمام ائمہ یعنی ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، احمدؒ، کے نزدیک گویا فیضی صاحب نے جن ائمہ پر آیت کو نظر انداز کر دینے کا الزام لگایا تھا انہی کے یہاں سب سے زیادہ آیت کی رعایت نکلی، اور جن کے بارے میں انھوں نے وجوب کا دعویٰ کیا تھا اُن کے یہاں بظاہر سب سے کم رعایت ملتی ہے (نظر انداز انھوں نے بھی نہیں کیا) یعنی امام مالک کے یہاں متعہ صرف مستحب ہے۔ یہ تصریح خود اُن کے شاگرد نے براہ راست ان سے ہی نقل کی ہے، دیکھئے عبدالرحمٰن بن القاسم، سحنون التنوخی کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

سحنون نے سوال کیا (قلت) ارأیت ھذہ التی طلقھا زوجھا قبل ان یدخل بھا ولم یفرض لھا اکان مالک یقول لا یجبرہ مالک علی المتعۃ وقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ فی ھذہ بعینھا وجعل لھا المتعۃ فقال لاجناح علیکم ان طلقتم النساء ...(قال) قال

---

[1] مثلاً دیکھئے تفسیر بیضاوی سورہ بقرہ ص ۱۵۶ مطبع مجتبائی دہلی، ابن کثیر ص ۲۸۶-۲۸۸ ج ۱، احکام القرآن لابن العربی ص ۹۱-۹۲ ج ۱۔ موخر الذکر نے یہاں آیت کی تفسیر میں دو قول اور ملتے ہیں، لیکن جمہور کے قول کو ہی ظاہر قرار دیا ہے دیکھئے (ص ۹۱) [5] فقہی اصطلاح میں اس کو متعہ کہتے ہیں، یہاں اس لفظ سے نکاح کی مخصوص قسم جو منسوخ ہو چکی ہے، مراد نہیں ہے۔

مالک انما خفف عندی فی المتعۃ ولم یجبر علیہا المطلق فی القضاء فی رأیی لأنی اسمع الله تعالیٰ یقول حقا علی المحسنین وحقا علی المتقین فلذلک خففت فلم یقض بہا [1]

سحنونؒ نے عبدالرحمٰنؒ بن القاسم (تلمیذ امام مالک) سے سوال کیا کہ امام مالک ایسی عورت کے لیے متعہ کو لازم کیوں نہیں قرار دیتے کہ جس کے بارے میں قرآنی آیت نے متعہ کا حکم دیا ہے (اور پھر یہی آیت تلاوت کی) عبدالرحمٰن نے جواب دیا امام مالک نے فرمایا ہے کہ میرے نزدیک متعہ کے حکم میں تخفیف اس لیے ہو گئی ہے کہ آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یہ متعہ ان لوگوں پر ہے جو اچھا برتاؤ کرنے والے ہیں" (ہر شخص پر نہیں ہے)

ابن رشد مالکیؒ نے امام مالکؒ کے استدلال اور اُن کی بیان کردہ آیت کی توجیہ وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے، فرماتے ہیں "واما مالک فانہ حمل الامر بالمتعۃ علی الندب لقولہ تعالیٰ فی آخر الآیۃ (حقا علی المحسنین) ای علی المتفضلین المتجملین وما کان من باب الاجمال والاحسان فلیس بواجب [2]۔ (یعنی متعہ کا حکم آیت میں لازمی اور وجوبی نہیں معلوم ہوتا، بلکہ حُسنِ اخلاق، اور مروت کے طرز کا معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ واجب نہیں ہونا چاہیے)

ان سے قبل انہی کے چچا (صاحب "المقدمات" [3] کے بیان کے مطابق) اور ان کے ہم نام ابن رشدؒ (اول) اس اعتراض کا جواب دے چکے ہیں کہ دراصل امر تو وجوب کے لیے آتا ہے پھر امام مالکؒ نے یہاں وجوب کیوں نہیں مراد لیا۔ فرماتے ہیں:-

"فمتعوھن" امر بالمتاع والامر علی الوجوب ما لم یقترن بہ قرینۃ تصرفہ عن الوجوب الی الندب وقد اقترن بہ قرائن تدل علی ان المراد بہ الندب من ذلک تخصیصہ بہا المحسنین من غیر المحسنین [4]

(امر وجوب کے لیے اس وقت آتا ہے جب کوئی قرینہ اس کے خلاف نہ ہو اور یہاں ایسے قرائن موجود ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ متعہ کا حکم صرف "محسنین" کے ساتھ خاص کر دیا گیا ہے۔

---

[1] المدونۃ الکبریٰ صفحہ ۲۹ ج ۲، [2] بدایۃ المجتہد صفحہ ۹۲ ج ۲ مطبعۃ الاستقامہ مصر، [3] المنجد معجم الاعلام الشرق والغرب صفحہ ۲۱۶ [4] المقدمات صفحہ ۲۵ ج ۲۷۰ھ

(یعنی ہر ایک کے لیے نہیں ہے)

بہرحال امام مالکؒ کے مسلک میں کوئی کبھی ایسا قول نہیں ملتا کہ جس سے وجوب کا پتہ چلتا ہو نہ معلوم فیضی صاحب نے یہ کہاں سے اخذ کرلیا، موصوف حوالہ دے دیتے تو اچھا ہوتا!

اوپر کی سطروں میں جس طرح امام مالکؒ کا مسلک صرف دوسروں کے نقل کرنے سے نہیں بلکہ خود امام کے قول اور اُن کے مقلدین کے نقل کرنے سے معلوم و متعین ہو چکا ہے اسی طرح دوسرے ائمہ کا مسلک بھی اُن کے مقلدین کے بیان اور اقوال میں ملتا ہے، مفسر خازن شافعی المسلک ہیں، انھوں نے امام شافعی کا قول وجوب ہی نقل کیا ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ اب دیکھیے حنفی مسلک کی سب سے مشہور اور مستند کتاب ہدایہ میں امام ابوحنیفہ کا کیا مسلک بیان کیا گیا ہے؟

ولو طلقها قبل الدخول فلها المتعة لقوله تعالى ومتعوهن على الموسع قدره [illegible] المتعة واجبة رجوعاً إلى الأمر وفيه خلاف مالكؒ[1]

اگر اس عورت کو (جس کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو) دخول سے پہلے ہی طلاق دے دی تو اُس کے لیے شوہر پر متعہ ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر۔ (اور آیت ذکر کی) اور یہ متعہ واجب ہے، آیت میں امر کی بنا پر اور اس میں حضرت امام مالکؒ کا اختلاف ہے۔

ہدایہ کے شارح محقق ابن ہمامؒ نے اس عبارت کے بعض حصوں کی شرح بھی کردی ہے جس سے اور وضاحت ہوگئی۔ دیکھیے فرماتے ہیں:

قوله فلها المتعة اى متعة المطلقة قبل الدخول التي لم يفرض لها مهر في العقد واجبة عندنا وعند الشافعي واحمد..... وقوله رجوعاً الى الامر..... هو قوله تعالى ومتعوهن عقيب قوله لا جناح عليكم الخ۔[2]

غور فرمایئے تمام ائمہ اور اُن کے متبعین اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے متعہ کا حکم دے رہے ہیں اور یہ متعوهن کا تقاضا ہے کیونکہ صیغہ امر وہی ہے (متاعاً بالمعروف کا نہیں جیسا کہ فیضی صاحب کہتے ہیں)۔

حنفی فقیہ ابن نجیمؒ نے امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یعنی وجوب متعہ بیان کرنے کے بعد امام مالکؒ کے

۱۔ ہدایہ اولین صفحہ ۳۰۴/۲ حنفی مسلک کی تمام کتابوں میں یہی ملتا ہے۔ ۲۔ فتح القدیر صفحہ ۴۶/۲ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ

استدلال اور اُن کی توجیہ کا جواب بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

لها المتعة ان لم يسم شيئاً..... ثم هذه المتعة واجبة رجوعاً الى الامر ولا يكون لفظ المحسنين قرينة صارفة الى الندب لان المحسن اعم من المتطوع والقائم بالواجب مع ما انضم اليه من لفظ "حقاً" و "على"[5]

(متعوھن میں امر وجوب ہی کے لیے ہے اور لفظ "المحسنین" ایسا قرینہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے امر کا اصل تقاضا (وجوب) نظرانداز کر کے اسے مستحب پر محمول کیا جائے کیونکہ محسن ضروری اور مستحب دونوں قسم کے کام کرنے والوں پر بولا جاتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ آیت میں "حقا" اور "علیٰ" بھی ہے (جس سے وجوب کے پہلو کو مزید تقویت پہنچتی ہے)

خلاصۂ کلام یہ کہ ائمۂ ثلٰثہ کے یہاں اسی آیت کی بنا پر اس مطلقہ کے لیے، جس کا آیت میں ذکر ہے متعہ واجب ہے، اس سے بخوبی معلوم ہو رہا ہے کہ ان حضرات میں سے کسی نے بھی آیت کو نظرانداز نہیں کیا (مجموعی طور پر امام مالکؒ) بلکہ ان کے بارے میں ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا البتہ ایسی بدگمانیاں اسی ذہن میں راہ پا سکتی ہیں جو ائمہ کا مرتبہ شناس نہ ہو اور ان کے بارے میں [illegible] رکھتا ہو

۲۔ فاضل مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں:۔

"حنفی اور فاطمی شریعت کے ماتحت بیوہ اپنے شوہر کی املاک میں سے کسی حصہ کی دعویدار نہیں ہو سکتی" (رسالہ سطر ...)

فاطمی "شریعت" کے بارے میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں، اس لیے ہم تو فیضی صاحب کے "فاطمی شریعت" سے پیش کردہ کسی بھی مسئلہ پر اظہارِ خیال سے معذور ہیں، لیکن حنفی مسلک (نہ کہ شریعت، کیونکہ شریعت تو صرف نبیؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہے کسی فقیہ یا مجتہد کی طرف نہیں) کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف حنفی بلکہ شافعی، مالکی اور حنبلی کسی بھی امام کے یہاں یہ قول نہیں مل سکتا، کیونکہ بیوہ کا شوہر کی ہر قسم کی متروکہ چیزوں میں حصہ ہونا قرآن کی نص صریح سے ثابت ہے۔ اور خود فیضی صاحب بھی اپنے اس مضمون میں زیر بحث

---

[5] بحرالرائق ص ۱۵۲ ج ۳۔

عبارت سے اتنی بات قبل اس کا اعتراف کر چکے ہیں کہ "موجودہ شرعی قانون کے تحت بیوہ شوہر کی صرف آٹھویں حصہ کی حقدار ہوتی ہے"۔ اس لیے پورے طور پر ہم نہیں سمجھ سکے کہ پھر یہ کیا بات فرما گئے؟ یہ عبارت پڑھ کر لکھنے والے کے بارے میں یہ تاثر قائم ہونا لازمی ہے کہ شرعی قوانین کے مطالعہ کی اس نے زحمت نہیں اٹھائی کیونکہ ان کے خیال میں (جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے) حنفی اور فاطمی مسلک کے مطابق بیوہ اپنے شوہر کی مملوکہ اشیا میں جج یا منصف کے یہاں اپنے حق وصول کرنے کا "دعویٰ نہیں کر سکتی"۔

حالانکہ تمام فقہی شہادتیں اس کے بالکل برخلاف ہیں بلکہ ہمیں تو حنفی فقہ کی ایسی کتاب کہ جس کے مطابق طویل مدت تک ہندوستان کی عدالتوں کے فیصلے ہوتے رہے ہیں اس میں ایسی نظیریں بھی ملتی ہیں۔

رجل ادعى على امرأة أنه تزوجها وأنكرت ذلك ثم مات الرجل فجاءت تدعي ميراثها فلها الميراث كذا في المحيط[1]	ایک شخص نے ایک عورت کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ میں اس سے نکاح کر چکا ہوں اور وہ عورت منکر رہی پھر اس شخص کے مرنے کے بعد وہ عورت میراث کا دعویٰ کرتی ہو تو اس کو میراث کا حق ہے۔

غور کیجئے! عورت ایک شخص کی زندگی میں اس کی بیوی ہونے سے انکار کرتی رہی، مگر اس کے مرجانے کے بعد منصف یا جج کے یہاں اسی شخص کے مال میں اس کی بیوی ہونے کی بنیاد پر دعویدار بنتی ہے تو حنفی فقہ کے مطابق اسے مقررہ حصہ دلوایا جائے گا۔ کیونکہ مرنے والے نے تو خود کو اس عورت کا شوہر کہا تھا، لہٰذا اس کا اقرار معتبر مان لیا گیا۔

اور سنیئے!

ولو ادعیا نکاح امرأة ...... واقاما البینة فمات أحدهما فأقرت المرأة بنکاح المیت صح إقرارها ویقضی لها بالمهر والمیراث[2]

یہ صورت عورتوں کے حقوق کی رعایت پر پہلی صورت سے بھی زیادہ واضح طور پر دلالت کر رہی ہے، ایک عورت کے بارے میں دو دعویدار ہیں اور ہر ایک یہ کہتا ہے کہ اس عورت کا مجھ سے نکاح ہوا ہے...

---

[1] عالمگیری ص۲۲۵ جلد رابع مطبعۃ الکبری الأمیریہ بولاق مصر اشاعت ۱۳۱۰ھ　[2] ایضاً ص۴۹/۴۷۔

..... اور دونوں نے گواہ بھی پیش کر دیے، ابھی فیصلہ نہ ہو پایا تھا کہ ایک مدعی دنیا سے چل بسا، اب عورت اس مرنے والے سے نکاح ہو چکنے کا اقرار کر لیتی ہے تو حنفی فقہ کی رو سے، اس عورت کو متوفی کی بیوی مان کر مہر اور ترکہ دونوں چیزیں ملیں گی۔

یہاں یہ بات ذکر کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ زوجہ، اُن ورثہ میں ہے جو کبھی ترکہ سے محروم نہیں ہو سکتے، فقہ حنفی کی شہرۂ آفاق کتاب۔ اب جس پر تمام تر یا اکثر فتاویٰ کا مدار ہے یعنی۔ درمختار[۵۱] میں ہے ولایحرم ستۃ من الورثۃ بحال البنت الاب..... والزوجان.... الخ واقعہ یہ ہے کہ زوجہ کسی بھی وارث سے، شریعت کی نظر میں کم اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ اسے کچھ امتیاز ہی حاصل ہو۔ مثلاً یہ حکم ہے کہ تمام ورثہ میں اس کا حصہ پہلے لگایا جائے[۵۲]۔ ترکہ کی تقسیم اور حصص کی حکمتوں پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑا حکیمانہ کلام کیا ہے۔ اس کے لیے دیکھئے حجۃ اللہ البالغہ[۵۳]

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ زوجہ کو شوہر کے مال میں سے صرف آٹھواں حصہ ملتا ہے، حالانکہ یہ بات اپنے اندر صرف جزوی صداقت رکھتی ہے، کیونکہ آٹھواں حصہ شوہر کے اولاد ہونے کی صورت میں ملتا ہے ورنہ چوتھا حصہ ملتا ہے۔ آیت میں اس کی صراحت موجود ہے بلکہ پہلے اسی صورت کا ذکر ہے۔ (وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ)[۵۴]

۳۔ تین طلاقوں کے بارے میں تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"(۱) تین طلاقوں کا قاعدہ بدعت بھی ہے اور مکروہ بھی۔ اور یہ طریقہ شیعہ اثنا عشری یا فاطمی شریعت میں ناجائز ہے، مگر حنفی شرع میں جائز مانا گیا ہے۔ (۲) یہ صورت بعض تاریخی حالات کے تحت بہت بعد میں پیدا ہوئی۔ (صفحہ ۲۴ سطر ۳، ۴، ۵)

بیک وقت تین طلاقوں کے ناپسندیدہ ہونے پر ہمیں اتفاق ہے۔ اور اکثر فقہاء نے اسے ناجائز

---

۵۱ درمختار مطبوعہ برحاشیہ شامی صفحہ ۴۹۱ جلد ۵ ۵۲ ایضاً صفحہ ۴۹۱ جلد ۵۔ اصل عبارت ہے:۔ ثم یبدأ بذوی الفروض مقدماً الزوجۃ۔ اور یہ بات مسلمات فن میں سے ہے کہ ترکہ کی تقسیم میں ذوی الفروض مقدم ہوتے ہیں دیکھئے سراجی صفحہ ۴ (فیبدأ باصحاب الفرائض) ۵۳ حجۃ اللہ جز ثانی صفحہ ۱۱۱، ۱۹۱ کتبہ رشیدیہ دہلی۔ ۵۴ سورۂ نساء آیت ۱۲ پارہ ۴

کہا ہے، مگر کسی فعل کا ناجائز ہونا اور بات ہے اور اس کا اثر انداز ہونا علیحدہ بات! اگر موصوف کا "حنفی شرع میں جائز مانا گیا ہے" سے یہ مطلب ہے کہ تین طلاقوں کو امام ابوحنیفہ "مؤثر" مانتے ہیں تو یہ خیال صحیح ہے مگر اس میں امام صاحب منفرد نہیں ہیں بلکہ بلا استثنار تمام ائمہ اربعہ اور جمہور علماء یہی فرماتے ہیں جیسا کہ علامہ محی الدین نووی شارح مسلم فرماتے ہیں:-

"من قال لامرأتہ "أنت طالق ثلاثاً" فقال الشافعی ومالک وابوحنیفة و أحمد وجماہیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلاث"[1]

اور اگر "جائز" کا مطلب وہ ہے جو عام طور پر لیا جاتا ہے، یعنی ناجائز وحرام کا مقابل، تب امام ابوحنیفہ کی طرف یہ نسبت غلط ماننی پڑے گی، کیونکہ تمام حنفی علماء کا مسلک یہی ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا بدعت اور گناہ ہے (اگرچہ طلاقیں تین ہی پڑ جاتی ہیں) فقہ کی تمام متند کتابوں میں یہ مسئلہ ملتا ہے، مثلاً ہدایہ میں ہے:-

"وطلاق البدعة أن یطلقہا ثلاثاً بکلمة واحدة أو ثلاثاً فی طہر واحد فاذا فعل ذلک وقع الطلاق وکان عاصیاً"[2]

طلاقِ بدعت یہ ہے کہ یکبارگی تین طلاقیں دی جائیں یا ایک طہر میں تین مرتبہ طلاق دی جائے اگر ایسا کیا تو یہ طلاقیں پڑ جائیں گی اور گنہگار ہوگا۔ یہی بات امام مالک بھی فرماتے ہیں، جیسا کہ ابن رشد المالکی نقل کرتے ہیں:-

"لا یجوز عند مالک أن یطلقہا ثلاثاً فی کلمة واحدة فان فعلہ لزمہ"[3]

امام مالک سے براہ راست بھی ان کے شاگرد یہی نقل کر رہے ہیں۔ (قال) سحنون قلت لعبد الرحمٰن بن القاسم ھل کان مالک یکرہ ان یطلق الرجل امرأتہ ثلاث تطلیقات فی مجلس واحد (قال) نعم یکرہہ أشد الکراہیة ..... (قلت) فان ھو طلقہا ثلاثاً أو عند کل طہر واحدة حتی طلق ثلاثاً أیلزمہ ذلک فی قول مالک (قال) نعم[4]

امام شافعیؒ اور امام احمد رحمہ اللہ کے یہاں تین طلاقیں بیک وقت دینا حرام نہیں ہے بلکہ

---

[1] شرح مسلم للنووی ص۴۷۴ ج۱ [2] ہدایہ اولین ص۳۵۵ ج۲ و بدائع ص۹۴ ج۳ [3] المقدمات ص۶۰ ج۲ و بدایة المجتہد ص۶۳ ج۲ [4] المدونہ ص۶۶ ج۲

نامناسب اور خلاف اولیٰ ہے۔ اور یہی سب نے نقل کیا ہے۔ مثلاً نووی کہتے ہیں:-

أما جمع الثلاث دفعة فليس بحرام عندنا لكن الأولى تفريقها وبه قال أحمد وأبو ثور وقال مالك والأوزاعي وأبو حنيفة والليث هو بدعة [1] خود امام شافعی "الام" میں فرماتے ہیں:-

(قال الشافعي)..... ان النبي صلى الله عليه وسلم اذ لم يعب الطلاق الذي هو ثلاث دليل على ان الطلاق بيد الزوج ما أبقى منه ابقى لنفسه وما أخرج منه أخرج من يده لزمه غير محرم عليه كما لا يحرم عليه ان يعتق رقبة [2]

امام شافعی کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل طلاق کو جو تین طلاقوں پر مشتمل ہوتی ہے معیوب نہیں قرار دیا، یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ طلاق کا معاملہ پورے طور پر شوہر کے اختیار میں ہے پس وہ (تین میں سے) جتنی چاہے دے دے، جتنی چاہے باقی رکھے اس میں حرام ہونے کا کوئی سوال نہیں، جس طرح اپنے غلام کو آزاد کرنا حرام نہیں (حالانکہ یہاں بھی اپنی چیز ہاتھ سے نکلتی)

غور فرمائیے کہ کتابچہ میں پیش کردہ بات سے، حقیقت کتنی مختلف ہے۔ اس صورت حال کے بارہ میں فاضل مقالہ نگار فرماتے ہیں کہ "بعض تاریخی حالات کے تحت بعد میں پیدا ہوئی"۔ اچھا ہوتا اگر موصوف وہ تاریخی حالات پیش فرما دیتے، عبارت کا مطلب الفاظ سے یہی نکل رہا ہے۔ کہ تین طلاقیں دینے کا رواج، یا یک وقت دی گئی تین طلاقوں کا مؤثر ہونا زمانۂ نبوت سے بعد کی پیداوار ہو حالانکہ ان دونوں (تین طلاقوں کا دینا اور ان کا مؤثر ہونا) قسم کے واقعات کا ثبوت زمانۂ نبوت میں بھی ملتا ہے اور اس کے بعد صحابہ کے دور میں بھی۔

امام بخاری نے اس موضوع پر مستقل باب قائم کیا ہے "باب من أجاز الطلاق الثلاث" اس کے تحت دو حدیثیں ذکر کیں پہلی حدیث کے آخر میں ہے:۔ فطلقها ثلاثاً، دوسری حدیث اس طرح ہے:-

• ان رجلاً طلق امرأته ثلاثا فتزوجت فطلق فسئل النبي صلى الله عليه وسلم

---

[1] شرح مسلم للنووی ص ۴۷۸ ج ۱ [2] کتاب الام للامام الشافعی ص ۱۲۳ تا ص ۱۲۴ ج ۵

أتحل للاول قال لاحتى يذوق عسيلتها كما ذاق الاول"[1] مفہوم :- ایک شخص نے اپنی بیوی کو تینؔ طلاقیں دیں پھر اس مطلقہ عورت نے ایک دوسرے شخص سے نکاح کرلیا، اس نے بھی طلاق دے دی تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اس عورت کا پہلے شوہر سے نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں ؟ آپؐ نے فرمایا اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک یہ دوسرا شوہر اس عورت سے اسی طرح لطف اندوز نہ ہولے جس طرح پہلا شوہر ہوا تھا۔

دوسری جگہ بخاری میں ایک اور حدیث اسی مضمون کی موجود ہے۔[2] اس مضمون کی احادیث امام مالک، اور امام شافعی کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ اور مؤخرالذکر نے تو "کتاب الأم" میں پورے دوؔ صفحے کے اندر اس مضمون کی احادیث جمع کی ہیں۔ تفصیل وہاں دیکھ لی جائے۔[3] اور امام مالک نے بھی اس مضمون کی احادیث "مؤطا" میں نقل کی ہیں[4]

بعض اہلِ علم کو مسلم کی ایک روایت سے غلط فہمی ہوئی ہے، حالانکہ مسلم کے مشہور شارح محی الدین نووی نے اور اُن کے علاوہ دیگر بہت سے علماء نے روایت کا صحیح محمل بتا دیا ہے۔ یہاں کسی پہلو کو ترجیح دینے یا نہ دینے کی بحث نہیں ہے۔ بس ایک بات اس سلسلہ میں ذکر کردینا شاید نامناسب نہ ہو، وہ یہ کہ اس روایت (مسلم کی روایت) کے راوی حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ اگر اس روایت کا وہی مفہوم ہوتا جو استدلال کرنے والے اخذ کرتے ہیں تو راوی اس کی مخالفت کیوں کرتے۔ مؤطا امام مالک میں موجود ہے کہ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سَو طلاقیں دے دی ہیں۔ اب آپ کی کیا رائے ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا، کہ اس پر تینؔ طلاقیں پڑ گئیں اور رشتۂ نکاح منقطع ہوگیا، تو نے اللہ کی کتاب سے مذاق کیا۔ اور ان ہی سے دوسرے شخص نے آکر تین طلاقیں دینے کا ذکر کیا، اس کو بھی ایسا ہی جواب دیا۔ (احکام القرآن للجصاص)

ان کے علاوہ بکثرت صحابہ سے تین طلاقوں کا معتبر ماننا ثابت ہے۔ ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں اور ملا علی قاری نے مرقاۃ شرح مشکاۃ میں ان روایات کو جمع کردیا ہے، جن میں حضرت عمرؓ حضرت

---

[1] بخاری ص۷۹۴ ثانی مطبوعہ مکتبۂ رحیمیہ دیوبند [2] بخاری جلد ثانی ص۸۹۹ [3] دیکھئے کتاب الأم جلد خامس ص۱۲۲ تا ۱۲۴

[4] مؤطا امام مالک ص۲۰۹

علی کرم اللہ وجہہ، حضرت عثمان بن عفان رضؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ شامل ہیں۔ (مرقاۃ ج ۲۹۳ تا ۲۹۶، احکام القرآن ج ۲۸۱ تا ۲۹۱)

مرقاۃ میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ حضرت حسن بن علی (سبط نبیؐ) رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی شہبار کو تین طلاقیں دیں ـــ اس تفصیل کے بعد یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ جن علماء نے اس مسئلہ پر اجماع نقل کیا ہے انھوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔

سردست صرف ان چند فقہی فروگزاشتوں کی نشاندہی پر اکتفا کیا جاتا ہے [عہ]، اگرچہ فیضی صاحب کے اس مقالہ میں اور بھی متعدد ایسی چیزیں ہیں جو محل نظر اور لائق نقد ہیں، لیکن اختصار کے پیش نظر اسوقت ان کو نظر انداز کر کے ایک تاریخی مباحث کیطرف بھی اشارات پیش کیے جا رہے ہیں، زیادہ تفصیل کا نہ موقع ہے نہ چنداں ضرورت۔

۴۔ فیضی صاحب انکشاف فرماتے ہیں کہ:-

"۴۰ سے چوتھی صدی ہجری (یعنی ۶۶۰ء) کے دوران نہ تو پیغمبر اسلام تھے اور نہ آپ کے صحابۂ کرام میں سے کوئی ایسا تھا جس سے رشد وہدایت حاصل کی جا سکتی" (صفحہ ۵ سطر ۲، ۳)

۴۰ھ سے چوتھی صدی ہجری تک (بلکہ قیامت تک) پیغمبر اسلام کا نہ ہونا تو مسلّم! لیکن کیا یہ بھی درست ہے کہ ۴۰ھ کے بعد صحابہ میں کوئی اس مرتبہ کا باقی نہیں رہا تھا جس سے رشد وہدایت حاصل کی جاتی؟ اس حقیقت کا پتہ چلانے کے لیے مختصراً تاریخ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت شان اور تبحر علمی سے کون ناواقف ہوگا، موصوف نے "اعلام الموقعین" میں فقہائے صحابہ کی۔ جن سے رشد وہدایت حاصل کی جاتی تھی۔ تین قسمیں بیان کی ہیں۔ (رشد وہدایت حاصل کرنے کو فقہی اصطلاح کے مطابق فتوے لینے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے)۔

قسم اول، جن حضرات سے بکثرت فتاویٰ حاصل کیے جاتے تھے یعنی (مکثرین)۔ قسم دوم ـــ متوسطین ـــ قسم سوم، مقلین۔

عہ فاضل مضمون نگار نے مندرجہ بالا تین بحثوں کے بعد فیضی صاحب کے اس نظریہ پر بھی مفصل کلام کیا تھا کہ سنت کو وحی کا درجہ حاصل نہیں ہے، لیکن الفرقان کے صفحات میں گنجائش نہ ہونے کے باعث محترم مضمون نگار کی اجازت سے اس بحث کو نکال لینا پڑا ـــ ادارہ

پہلی قسم میں سات صحابہ کے نام لیے ہیں۔
عمر بن الخطابؓ، علی بن ابی طالبؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، عائشہ ام المومنینؓ، زید بن ثابتؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، عبد اللہ بن عمرؓ۔ صحابہ کرام میں یہ حضرات گویا سرخیل اور رشد و ہدایت کا منارہ تھے۔
علامہ ابن حزم کے بیان کے مطابق ان میں سے ہر شخص کے فتاویٰ کا ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔
(وکان المکثرون منهم سبعة..... (قال ابو محمد) ابن حزم ویمکن ان یجمع من فتویٰ کل واحد منهم سفر ضخم[1]

دیکھئے ان میں سے اتنے حضرات ۴۰ھ کے بعد تک بقید حیات رہے۔
۱۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ م ۱۷ رمضان ۵۸ھ یعنی ۴۰ھ کے بعد کم سے کم سترہ سال علم و ہدایت کی روشنی پھیلاتی رہیں۔
۲۔ حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ م ۷۳ھ یعنی ۴۰ھ کے بعد دس بیس نہیں پورے تینتیس سال علوم و معرفت کے دریا بہاتے رہے۔
۳۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ۔ م ۶۸ھ " " " " اٹھائیس " "
۴۔ حضرت زید بن ثابت۔ م ۴۵ھ یعنی ۴۰ھ کے بعد صرف پانچ سال سرچشمۂ ہدایت بنے رہے۔
اس وقت ہمیں صرف یہ دکھانا ہے کہ صف اول کے فقہائے صحابہ کی اکثریت (سات میں سے چار) باقی رہی۔ فقہائے صحابہ کی دوسری قسم متوسطین فتویٰ دینے والے اصحاب میں جن کے فتوے نہ بہت زیادہ، نہ بہت کم۔ اس زمرہ میں ان بیس صحابہ کے نام لیے ہیں:۔
حضرت ابوبکر صدیقؓ، ام سلمہؓ، انس بن مالکؓ، ابو سعید خدریؓ، ابو ہریرہؓ، عثمان بن عفانؓ، عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ، عبد اللہ بن زبیرؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، سعد بن وقاصؓ، سلمان فارسیؓ، جابر بن عبد اللہؓ، معاذ بن جبلؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، عبد الرحمن بن عوفؓ، عمران بن حصینؓ، ابوبکرہؓ، عبادہ بن الصامت، معاویہ بن ابی سفیانؓ
تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان بیس میں ۴۰ھ کے بعد یہ حضرات باقی رہے۔
۱۔ انس بن مالک (م ۹۱ھ) ۲۔ ابوبکرہ (م ۵۲ھ) ۳۔ جابر بن عبد اللہ (م ۷۴ھ) ۴۔ سعد بن

---

[1] مجموعہ "المحاوی الارواح" و "اعلام الموقعین" لابن القیم ص ۱۲ مطبعۃ النیل۔ مصر۔

ابی وقاص (م سنہ ۵۵ھ) ۵۔ ابو سعید خدری (م سنہ ۷۴ھ) ۶۔ ام سلمہؓ (م سنہ ۵۹ھ) ۷۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاص (م سنہ ۶۵ھ) ۸۔ عمران بن حصین (م سنہ ۵۲ھ) ۹۔ معاویہ بن ابی سفیان (م سنہ ۶۰ھ) ۱۰۔ ابو موسیٰ اشعری (م سنہ ۴۲ھ) ۱۱۔ عبد اللہ بن الزبیر (م سنہ ۷۳ھ) ۱۲۔ ابو ہریرۃ (م سنہ ۵۷ھ، ۵۸ھ یا ۵۹ھ) [۱]

غور فرمائیے طبقۂ ثانیہ (متوسطین) کی بھی اکثریت (بیس میں سے بارہ) سنہ ۴۰ھ کے بعد تک موجود رہی۔ جن میں سے بعض سنہ ۴۰ھ کے بعد ۴۰۔۵۰ سال تک ہے۔ اس فہرست کے علاوہ بھی بہت سے ممتاز صحابہ و صحابیات رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ مثلاً ابو مسعود انصاری المتوفی سنہ ۴۲ھ، حضرت حفصہؓ (م سنہ ۴۵ھ) حضرت عبد اللہ بن سلام (م سنہ ۴۳ھ) حضرات حسنینؓ اور حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا و عنہم اجمعین (م سنہ ۵۱ھ)۔ پھر نہ معلوم کس طرح یہ لکھ دیا گیا کہ سنہ ۴۰ھ کے بعد صحابہ میں سے کوئی رشد و ہدایت کا اہل باقی نہیں رہا۔ ہاں! اگر خلفاء اربعہ کے علاوہ۔ خاکم بدہن۔ کسی صحابی کو منصب ارشاد و ہدایت کا اہل نہ سمجھنے کی جسارت کی جائے تو یہ بات اور ہے (واضح رہے کہ آخری خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر ۱۷ رمضان سنہ ۴۰ھ کو حملہ ہوا۔ اس کے تین دن بعد جام شہادت نوش کیا۔)

نہ صرف تاریخ بلکہ حدیث کی کتابوں میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شروع اموی دور میں صحابہ موجود تھے اور وہ نہ صرف تابعیوں کو بلکہ خلفاء تک کو برملا۔ خلافِ شرع حتیٰ کہ خلافِ سنت کاموں پر ٹوک دیتے تھے، اور خلیفہ بہت سی کمزوریوں کے باوجود ان کی بات برداشت کر لیتا تھا، اور سزا دینا تو کجا، غصہ کا اظہار بھی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ کبھی بات مان بھی لیتا تھا، اموی دور کے بدنام ترین خلیفہ مروان۔ کہ جس پر لعنت بھیجنا بھی بعض حلقوں میں کارِ ثواب سمجھا جاتا ہے۔ کے بارے میں صحیح مسلم میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے مروان سے کہا کہ تو نے سودی لین دین کو رواج دے دیا، مروان نے کہا کہ میں نے تو ایسا نہیں کیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ تم نے "صکاک" کی بیع کو جائز کر رکھا ہے، اور حدیث سنائی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلّہ پر قبضہ ہو جانے سے پہلے اس کی فروختگی سے منع فرمایا ہے چنانچہ مروان نے سرکاری اعلان جاری کر دیا کہ آئندہ کاغذی سندیں (صکاک) نہیں فروخت کی جا سکیں گی۔ راوی اپنا مشاہدہ بتاتے ہیں کہ اس اعلان کے بعد حکومت کے سپاہیوں کو سندیں (جن لوگوں کو وہ فروخت

[۱] ان صحابہ کے احوال مع سنین وفات اس موضوع کی ہر کتاب میں دیکھے جا سکتے ہیں ہم نے یہ سنین وفات شیخ ولی الدین ابو عبد اللہ محمد الخطیب صاحب مشکوٰۃ کی "الاکمال فی اسماء الرجال" سے لیے ہیں۔ اس میں حروف تہجی کی ترتیب سے صحابہ و تابعین کے مختصر احوال اور سنین وفات موجود ہیں۔

کرنے دیکھ لیتے تو ان) لوگوں کے ہاتھوں سے چھینتے ہوئے دیکھا۔ اصل حدیث ملاحظہ فرمائیے!

عن ابی هريرة انه قال لمروان احللت بيع الربا فقال مروان ما فعلت فقال ابوهريرة احللت بيع الصكاك وقد نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الطعام حتى يستوفى فخطب مروان الناس فنهى عن بيعها قال سليمان فنظرت الى حرس ياخذ ونها من ايدى الناس [1]

دیکھا آپ نے کہ مروان نے حضرت ابوہریرہؓ سے حدیث سن کر فوراً حکم کی تعمیل کی۔ مروان ہی سے متعلق خطبۂ عید کے بارے میں ایک اور واقعہ یہ بھی ملتا ہے کہ جب اُس نے عید کا خطبہ نماز سے پہلے دینا شروع کیا تو حضرت ابوسعید خدری نے مجمع عام میں ٹوکا بلکہ اس کا دامن اور ہاتھ پکڑ کر منبر کی طرف جانے سے روکا [2] اسی طرح جب وہ منبر پر بیٹھ گیا تو ایک دوسرے صحابی (ابومسعود انصاری) نے کھڑے ہو کر ڈانٹتے ہوئے کہا، الصلوٰۃ قبل الخطبۃ (میاں، نماز تقریر سے پہلے پڑھو) [3]۔

اس پر بھی مروان نہ غصہ ہوا اور نہ ان میں سے کسی کو سزا دی اگرچہ اس نے ان کی بات نہیں مانی۔ یہاں مروان یا کسی اموی خلیفہ کی کمزوریوں کی پردہ پوشی مقصود نہیں، بلکہ دکھانا صرف یہ ہے کہ اس دور میں بھی حق بات کہنے والے باقی تھے، ایسا نہیں جیسا عام طور پر مشہور ہے۔ یا مضمون میں جیسی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخری بات!

اوپر کے صفحات میں چند گذارشیں اہل علم، خاص طور پر فیضی صاحب کی توجہ کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ کہنے کے لیے اور بھی بہت سی باتیں تھیں جو اس موقع پر کہی جاتیں تو نامناسب نہیں ہوتا۔ مگر خوفِ طوالت اور قلتِ فرصت مانع ہے، لیکن آخر میں ایک بات کہے بغیر رہا نہیں جاتا۔ شکایت نہیں، بلکہ تاثر کا اظہار۔ کہ کسی مسلمان کی زبان و قلم کا ایسا انداز، کہ جس سے کھلے طور پر شریعت، اور شرعی قوانین کا (کما حقہ ان پر غور کیے بغیر) استخفاف، اور انصاف سے بعید ہونا۔ اس کے بالمقابل غیر شرعی قوانین کی برتری اور ان کا عدل و نصفت سے قریب تر ہونا ظاہر ہو بھلا نہیں اور جی چاہتا ہے کہ کاش اس طرح کے موضوع پر قلم اُٹھاتے وقت "اسلام سے نسبت" کرنے کے تقاضوں کو۔ کم سے کم الفاظ کی حد تک۔ ملحوظ رکھا جایا کرتا۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ثانی ص۵ کتب خانہ رشیدیہ دہلی [2] بخاری جلد اول ص۱۳۱ (فخیذت فوجبہ) مسلم جلد اول ص۲۹ (وانما اجرۃ نحو الصلوٰۃ) [3] تفصیلی واقعہ کے لیے دیکھئے فتح الملہم شرح مسلم ص۲۲۵ ج۲

بوئے گل در برگِ گل

حضرت شاہ غلام علی مجدّدی دہلویؒ اپنے مکتوبات کے آئینے میں

تلخیص و ترجمہ —— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

حضرت شاہ ابوسعید مجددیؒ اور حضرت شاہ احمد سعید مجددیؒ کو ایک مکتوب میں یوں مخاطب فرماتے ہیں۔

صاحبزادۂ عالی نسب حضرت حافظ ابوسعید صاحب و احمد سعید صاحب سلمہا اللہ تعالیٰ —— بعد سلام مسنون مطالعہ کریں —— دو خط صادر ہو کر باعثِ مسرت ہوئے۔ اُن کے مضمون سے آگاہی ہوئی۔ اپنے اوقات (کی تعمیر) کے بارے میں لکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ اور زیادہ توفیق عنایت فرمائے اور اعمال میں بزرگوں کی اتباع اور اُس کے نیک نتائج عطا کرے —— (اپنے متوسلین کے) ادراکِ حالات" میں خوب غور کریں اور کڑی نظر رکھیں......

انوارِ نسبت کا تحقق مدتوں میں ہوتا ہے۔ اس تحقق کے نتیجے میں تہذیبِ اخلاق کی صورت بنتی ہے۔ اللہ کے لیے جینا اور بغیر توجیہ و تاویل کے راضی برضا رہنا میسر آتا ہے۔ نیز دلِ حزیں، سینۂ بے کینہ اور نیتِ صالحہ کا حصول ہوتا ہے —— چاہیئے کہ گزشتہ اعمال پر بھی حزن ہو کہ میں نے بیکار طریقہ پر بے اخلاقِ حسنہ اور بے نیتِ صالحہ، اعمال انجام دیئے —— اور آئندہ کے متعلق بھی فکر و غم ہو کہ معلوم نہیں تقدیر میں کیا ہے؟ — سینۂ بے کینہ، تقدیرِ الٰہی اور فضلِ الٰہی کو پیشِ نظر رکھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا —— نظر اصل پر رہنی چاہیئے .... ع

تو مباش اصلا کمال این است و بس

(اس کے بعد معرفت کی ایک باریک و پُرمغز بات لکھ کر تحریر فرماتے ہیں)

معاذ اللہ ـــــ درویشوں والی یہ معرفت میں نے کیوں لکھ دی؟ میں نادان معارف کیا جانوں ـــــ .... میں نے وقت ضائع کیا، معاف کرنا ـــــ میرے پیر و مرشد (حضرت مرزا جانجاناںؒ) نے فرمایا ہے کہ جس شخص کی سیر متوسط درجے کی ہو۔ اُس کو مقاماتِ مجدد الفِ ثانی کا حصول دس سال میں ہوتا ہے ـــــ مولوی غلام یحییٰ[عہ] (بہاری) نے پانچ سال میں نصف سلوک طے کیا تھا۔ اس تحریر کی غرض و غایت یہ ہے کہ احتیاط کو ضروری و لازمی سمجھ کر اختیار کیا جائے ایسا نہ ہو کہ کسی طالب کا سلوک ناقص رہ گیا تھا اُس کی تکمیل کے بغیر اُس کو اجازت دیدی گئی پھر اُس نے کجروی اختیار کی۔ اُس کی کجروی اور غلط روی کو دیکھ کر منکرِ طریقہ کے لیے سند و دستاویز ہاتھ آجائے۔ والسلام۔

ایک مکتوب میں خواجہ حسن مودودی لکھنویؒ کو حضرت شاہ ابوسعید کے بارے میں یوں تحریر فرماتے ہیں

.... حضرت حافظ ابوسعید پیرزادہ مجددی سلّمہ اللہ تعالیٰ لکھنؤ آئے ہوئے ہیں میں نے اُن کو لکھ دیا ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں پہونچیں۔

عہ علامہ غلام یحییٰ بہاری ابن نجم الدین، منطق و فلسفہ کے ایک زبردست عالم تھے۔ بہار کی ایک بستی باڑھ میں پیدا ہوئے ہوش سنبھالا تو تعلیم کے لیے سندیلہ آئے اور مدرسہ منصوریہ میں مولانا ابو اللہ جونپوریؒ سے پڑھا۔ اور شیخ بدرعالم ساداموی سے بیعت ہوئے۔ پھر لکھنؤ میں تعلیم دینے کے لیے آئے۔ میر زاہد رسالہ پر حاشیہ لکھا۔ پھر دہلی کا سفر اور حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ سے بیعت ہوئے۔ یہاں پانچ سال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہ کر خلافت کی۔ شرح مُسَلّم مُلّا حمد اللہ پر بھی آپ کا حاشیہ ہے۔ کلمۃ الحق بھی آپ کی ایک کتاب ہے جس کا جواب حضرت شاہ رفیع دہلویؒ نے دفع الباطل کے نام سے لکھا ہے۔ ذی قعدہ ۱۱۸۰ھ میں علامہ غلام یحییٰؒ نے لکھنؤ میں وفات پائی۔ اور زاویۂ شاہ پیر محمد لکھنویؒ میں دفن ہوئے۔

(نزہۃ الخواطر جلد ۶ بحوالہ بحر ذخار)

انھوں نے پہلے حضرت شاہ درگاہیؒ سے نسبت چشتیہ کا ایک رنگ حاصل کیا تھا۔ اور
ہ توحید کے بارے میں جو رائج ہے (یعنی توحید وجودی) تقریر و گفتگو کیا کرتے تھے۔ بعدہٗ کسب نسبت
جددی کی غرض سے فقیر کے پاس آئے ــــ آہ آہ میں کہاں ؟ اور اس نسبت عالیہ میں کمال
کمال کہاں ؟ــــ مجھے تو دریاؤں سے فقط نمی ملی ہے۔ افسوس کہ میری قسمت میں بس نمی
تھی۔ سمجھ لیجئے جس کو فقط نمی ملی ہو وہ دوسروں کو سیراب و شاداب کس طرح کر سکتا ہے؟ بہرحال
صاحبزادہ مذکور جو مجددی نسبتوں کے انوار سے حصہ پائے ہوئے ہیں، آپ کی ملاقات سے مشرف
ہوں گے۔ صحبت اہل باطن سکوت اور انعکاس انوار باطن کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور صحبت علماء
میں علمی گفتگو ہوا کرتی ہے۔ صاحبزادہ مذکور اپنے وجدان و دریافت کی بناء پر پُر از معارف مجدّد
الف ثانی ہیں۔ حضرت مجددؒ کی نسبت کے نور سے ان کا باطن جگمگا رہا ہے ... فقیر کے حالات
ان کی زبانی معلوم ہوں گے۔ والسلام

ــہ حضرت شاہ درگاہی نقشبندی رامپوریؒ ۱۱۶۲ھ میں تخت ہزارہ (پنجاب میں) پیدا ہوئے۔ معدن فیض حق
تاریخ ولادت ہے۔ ایام طفولیت ہی میں آپ گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور صحرانوردی اختیار کر لی تھی۔ صحرائے
رامپور میں ... التارکین کے مزار پر حافظ جمال اللہ رامپوریؒ سے بیعت ہوئے۔ بالآخر انہی سے خلافت
حاصل کی۔ حضرت شاہ درگاہیؒ دو واسطوں سے حضرت خواجہ محمد زبیر مجددیؒ سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ آپ کے
مزاج میں استغراق بہت زیادہ تھا۔ اغنیاء سے ملاقات نہیں کرتے تھے۔ ۱۲۲۶ھ میں انتقال ہوا۔ مزار رامپور میں
ہے۔ (نزھۃ الخواطر و ضمیمۂ مقامات مظہری) ــ حضرت شاہ ابوسعید مجددیؒ اول اپنے والد شاہ صفی القدرؒ سے
بیعت ہوئے پھر ان کی اجازت سے حضرت شاہ درگاہیؒ سے بیعت ہو گئے تھے۔ انھوں نے مُرید کے حال پر بہت کچھ
عنایات فرمائیں، اجازت، خلافت سے نوازا۔ اس وقت حضرت شاہ ابوسعیدؒ کے مزاج میں شورش بدرجۂ کمال
پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ کثیر تعداد میں آپ سے بیعت ہونے لگے۔ حلقہ بھی ... جس میں بیہوشی و وجد کی کیفیات پیدا
ہوتی تھیں۔ خدا طلبی کے سلسلے میں آپ ... دہلی اس وقت اہل علم اور اہل صلاح و تقویٰ کا مرکز تھی۔ قاضی
ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ بھی اس وقت حیات تھے۔ حضرت شاہ ابوسعید مجددیؒ نے قاضی صاحب کو ایک خط لکھا
جس میں ... کے بارے میں مشورہ طلب کیا تھا۔ حضرت قاضی صاحبؒ نے مشورہ دیا کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

میاں محمد حسن وکیل انگریز کے نام

السلام علیکم و رحمۃ اللہ ــــ چالیس سال یا اس سے زیادہ ہو گئے کہ خلوت کے اندر دل کی آرزوؤں کو شکستہ کر کے اور مخلوق سے نظر ہٹا کر صبر و قناعت میں زندگی بسر ہو رہی ہے اور بغیر کسی کی امداد کے تقرر کے عافیت و فراغت کے ساتھ ایام عمر گزر رہے ہیں۔ الحمد للہ علی ذالک ــــ نواب امیر الدولہ (والیٔ ٹونک) سے امداد خانقاہ کا بالکل تذکرہ نہ کیا جائے اُن کی امداد مجھے منظور نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس اخیر عمر میں فقر و قناعت اور صبر و توکل کے طریقے میں کوئی خلل واقع ہو جائے۔

آبروئے فقر و قناعت نمی بریم　　با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

(ہم فقر و قناعت کی آبرو برباد کرنا نہیں چاہتے۔ نواب امیر خاں والیٔ ٹونک سے کہہ دو کہ روزی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر و مقرر ہے)

اس عمر میں محتاجوں کے سامنے اپنی احتیاج پیش کرنا درویشوں کے استغناء کے خلاف ہے۔

...... والسلام

غلام محمد خاں کو حضرت شاہ رؤف احمد مجددیؒ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

خاں صاحب عالی مراتب غلام محمد خاں سلمہ اللہ تعالیٰ بفقیر غلام علی کا خط بعد از سلام اشتیاق مطالعہ کریں ــــ مدت سے آپ کا کوئی عنایت نامہ وارد ہو کر مسرت رساں نہیں بنا۔ اُمید ہے کہ اپنے احوال لکھ کر شاد کام کریں گے ــــ جامع کمالات حضرت رؤف احمد صاحب نے بعنایت الٰہی فقیر سے طریقہ اخذ کر کے اجازت حاصل کر لی ہے۔ مناسب یہ سمجھا گیا کہ وہ آپ کے علاقے میں ربط قائم کر کے طریقے کو رواج دیں ــــ آپ کو اگر فرصت ہو تو بہتر یہ ہے کہ اُن سے توجہ حاصل کریں ــــ

(گزشتہ حاشیہ سے پیوستہ) اس وقت آپ کے لیے حضرت شاہ غلام علیؒ سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ پس آپ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پہونچے اور مقبول بارگاہ ہوئے۔ حضرت شاہ رؤف احمد نے کبھی دہلی آکر بیعت کی اُس وقت حضرت شاہ درگاہیؒ حیات تھے۔ مرشد اوّل کا احترام برابر کرتے رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مرشد اوّل کو ابتدا میں مجھ سے کچھ کدورت رہی۔ بالآخر وہ کدورت زائل ہو گئی تھی۔

(ضمیمہ)

اللہ تعالیٰ اُن کے قدم کی برکت سے اس ضلع میں برکت و آبادی عنایت فرمائے۔ والسلام۔

ایک دوسرے مکتوب گرامی میں خان مذکور کو ارقام فرماتے ہیں

خان صاحب عالی مراتب والا مناقب غلام محمد خان صاحب .... بعد از سلام واضح ہو۔ رقیمۂ کریمہ نے وارد ہوکر مسرت پہونچائی۔ مندرجہ سے آگاہی ہوئی۔ آپ نے دعا کے واسطے اور اور درگاہِ مجیب الدعوات میں التجا کے لیے لکھا تھا حسب الطلب دُعا کی گئی۔ آئندہ بھی اُس دربارِ جود و عطا میں دُعا و التجا کی جائے گی۔ وہ وہابِ بے منت اور بخشندۂ عطیاتِ بے نہایت ہے۔ دوجہاں کی کام بخشی اور مقصد برآری اسی کی عطاء کے سمندر کا ایک قطرہ ہے اور مقصود رسانی دارین اُسی کے گلستانِ نعمت کی ایک خوشبو ہے ..... اُمید ہے کہ (منجانب اللہ) آپ کو جمعیت و کامیابی حاصل ہوگی ــــ .... ــــ

منور خاں حاکم سرونج کو شاہ رؤف احمد صاحب مجددیؒ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

خاں صاحب عالی مراتب منور خاں صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ ــــ بعد سلام سنت الاسلام واضح ہو ــــ سالہا سال ہوگئے آپ نے اپنے احوال سے مسرور نہیں کیا۔ دوستی کا تقاضا تو یہ ہے کہ اپنے حالات تحریر فرماکر رفعِ انتظار کرتے رہیں۔ صاحبزادۂ والا نسب حضرت رؤف احمد صاحب نے جو آپ سے ربط دوستی رکھتے ہیں ــــ اس فقیر سے طریقہ اخذ کرکے اور اس راہ کے فیض حاصل کرکے اجازت پائی ہے اب وہ آپ کے یہاں پہونچ رہے ہیں۔ جو شخص بھی ان سے طریقہ



غلامُ رسُول مہر

(از جناب مالک رام ایم، اے)

"۱۶ رنومبر ۱۹۷۱ء کو مولانا غلام رسول مہر کا حرکت قلب بند ہو جانے سے لاہور میں انتقال ہو گیا۔"

نئی نسل کے خصوصاً ان لوگوں نے جو بیس پچیس کے پیٹے میں ہیں، یہ ایک سطری خبر پڑھی یا سنی ہوگی؟ لیکن انھیں کیا معلوم کہ غلام رسول مہر کون تھے؟ انھوں نے اردو صحافت کی کیا خدمت کی؟ اردو علم و ادب میں کیا اضافہ کیا؟ ملکی سیاست میں ان کا کتنا حصہ تھا؟ اور حقیقت یہ ہے کہ میں بھی اس مختصر مضمون میں ان سب سوالوں کا تشفی بخش جواب کہاں دے سکتا ہوں!

مولانا غلام رسول ۱۵ اپریل ۱۸۹۵ء کو مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر سے چار میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں پھول پور میں پیدا ہوئے۔ گھر میں کچھ موروثی زمینداری تھی اور یہی خاندان کی بسر اوقات کا ذریعہ تھی۔ پھول پور آج بھی مختصری بستی ہے۔ اس زمانہ میں تو اور بھی چھوٹی ہوگی۔ یہاں تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یہ پانچ چھ برس کے ہوئے تو قریب کے ذرا بڑے گاؤں کے مدرسے میں بھیجے گئے۔ اس کے بعد جالندھر شہر کے مشن ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۱۱ء میں دسویں درجے کی سند لے کر لاہور منتقل ہو گئے۔ اسلامیہ کالج اس زمانے میں مسلمان طلباء میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ یہ بھی انٹر کے درجے میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۵ء میں یہیں سے بی۔ اے۔ کی سند لی۔

وہ ابھی انٹر کے طالب علم تھے کہ جولائی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنا مشہور ہفتہ وار "الہلال" کلکتہ سے جاری کیا۔ "الہلال" بلا مبالغہ اردو صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا

ہے۔ اس کا سائز، ٹائپ کی چھپائی، کاغذ، تصاویر، مضامین کی تبویب، مختلف ممالک میں اس کے نامہ نگاروں کی تقرری۔ غرض اس کی کس کس ۔ اولیت کا ذکر کیا جائے! یہ سب باتیں اپنی جگہ، لیکن اسکی دو خصوصیتیں ناقابلِ فراموش ہیں۔ اوّل اس کا اسلوبِ تحریر، مولانا ابو الکلام آزاد کا خطیبانہ انداز جس میں نقل و حدیث سے ایسا برجستہ استدلال تھا کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے دل میں آگ لگا دی۔ جن کے لیے یہ پرچہ جاری کیا گیا تھا۔ دوسرے اس کی حکومت کے خلاف نکتہ چینی اور قوم پرورانہ بلکہ کانگریس کی تائید پالیسی تھی۔ سرسید کے زمانے سے مسلمانوں کا مطمح نظر ایک ہی رہا تھا۔ انگریز دوستی اور کانگریس دشمنی ۔ تیس برس تک کسی کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

مولانا آزاد نے سب سے پہلے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور چونکہ انھوں نے اپنی تائید میں پوری قوت سے قرآن و حدیث کو کھڑا کیا، کسی کو کچھ کہتے نہ بنی۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا محمود الحسن دیوبندی کو یہ کہنا پڑا کہ آزادی کا جو سبق ہم بھلا چکے تھے، وہ ہمیں مولانا ابو الکلام آزاد اور الہلال نے یاد دلایا۔

ہم بھی الہلال کے خریدار بن گئے اور اپنے ہزاروں معاصرین کی طرح اس کے والہ و شیدا ہو گئے۔ مولانا آزاد نے اس کے علاوہ مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے ایک تحریک چلائی تھی جس میں شامل ہونے والوں سے بعض شرطوں پر بیعت لی جاتی تھی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی کتاب "ذکر آزاد" میں اس بیعت کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔

ترجمہ:۔ بیعت کرتا ہوں میں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ خلفاء اور نائبین کے اس پر کہ

(۱) اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعتقاد اور عمل پر قائم رہوں گا اگر استطاعت پائی۔

(۲) پانچ وقت کی نماز قائم رکھوں گا۔ رمضان کے روزے رکھوں گا، زکاۃ اور حج ادا کرونگا اگر استطاعت پائی۔

(۳) ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا۔ برائی کو روکوں گا، صبر کی وصیت کرونگا

(۴) میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں، اور دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

(۵) اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں، اپنی جان سے، اپنے مال

سے، اپنے اہل و عیال سے، دنیا کی ہر نعمت اور دنیا کی ہر لذت سے زیادہ اللہ کو، اس کے رسول کو، اس کی شریعت کو، اس کی امت کو محبوب رکھوں گا، اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب و سنت کے مطابق دیا جائیگا السمع والطاعۃ کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔"

یہ جماعت حزب اللہ کہلاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مقصود مسلمانوں کی اصلاح اور انھیں دین کے احکام کا پابند اور ان پر عامل بنانا تھا۔ مہر صاحب بھی الہلال کے خریدار کی حیثیت سے اس تحریک سے ناواقف نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی حزب اللہ کے رکن بن گئے۔ ان تمام ارکین کے نام اور پتے ایک رجسٹر میں درج کیے جاتے تھے جو مولانا آزاد کے دفتر میں محفوظ رکھا گیا تھا۔

مہر صاحب نے ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے پاس کر لیا۔ اب تلاش روزگار کی مہم شروع ہوئی۔ اس زمانہ میں ریاست حیدر آباد تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ملجا و ماوی تھی۔ اس ریاست کا رقبہ ۸۲ ہزار مربع میل تھا، جو یورپ کے کئی ممالک سے زیادہ تھا۔ نظام حیدر آباد کے بعض امراء و عمائد کے پاس بڑی بڑی جاگیریں اور پائیگاہیں تھیں، جن کا ہزاروں ایکڑ کا رقبہ تھا، اور ان کی لاکھوں کی آمدنی تھی۔ یہ امیر اپنی اپنی جاگیر میں خود مختار تھے اور ان کی حیثیت کسی چھوٹے موٹے حکمراں اور نواب سے کم نہیں تھی۔ ایسے ہی ایک امیر وقار الامراء تھے۔ انھوں نے اپنی جاگیر میں رعایا کی تعلیم کے لیے مدارس اور تعلیم کا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ مہر صاحب کو بھی ان ہی کی پائیگاہ میں انسپکٹر مدارس کی ملازمت مل گئی۔

یہ پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کا زمانہ تھا۔ جب نومبر ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی تو اتحادیوں نے دوران جنگ کے تمام وعدے بھلا کر ترکی پر بزن بول دیا، جو جنگ میں جرمنی کا حلیف اور اتحادی طاقتوں کا مخالف رہا تھا۔ سلطان ترکی عالم اسلام کا خلیفۃ المسلمین تھا۔ اتحادیوں کی اس معاندانہ روش سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان کے مسلمان خاص طور پر انگریزوں کے خلاف ہو گئے کیونکہ انگریزی فوج میں ہندی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے مختلف محاذوں پر لڑائی میں حصہ لیا تھا۔

یہ مہر صاحب کی جوانی کا زمانہ تھا، وہ بھی اس صورت حال پر تلملا اٹھے۔ بعض مقامی دوستوں کے مشورے سے انھوں نے ایک اخبار جاری کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کا نام "سلطنت" تجویز ہوا تھا۔ جب مالی پہلو سے اطمینان ہو گیا تو انھوں نے اسے جاری کرنے کی درخواست داخل کر دی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار برابر بڑھتے آگے نکل رہا تھا، ایک طرف وہ مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات اور اُن کی پُرانی تاریخ کی روایات کی طرف بلاتا، دوسری طرف یورپی حکومتوں کی اسلام دشمنی اور ترکی سے عناد پر سخت نکتہ چینی کرتا۔ حکومت پر مخفی نہیں تھا کہ الہلال کی ان تحریروں کا اثر کتنا دور رس ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے نومبر ۱۹۱۴ء میں الہلال کی دو ہزار کی وہ ضمانت ضبط کر لی جو اس سے ستمبر ۱۹۱۳ء میں حادثۂ مسجد کانپور کے بعد لی گئی تھی۔ مولانا آزاد نے اخبار بند کر دیا۔ سال بھر کے بعد انھوں نے نومبر ۱۹۱۵ء میں "البلاغ" کے نام سے دوسرا پرچہ جاری کیا، جو نام کے اختلاف کے ماسوا ہر طرح الہلال کا مثنیٰ تھا۔ جنگ ہنوز جاری تھی، بلکہ اتحادی افواج جرمنوں کی یلغار اور پیش قدمی کے سامنے ہر جگہ پسپا ہو رہی تھیں۔ ایسے میں حکومت کیونکر خاموش رہ سکتی تھی۔

حکومت بنگال نے ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو مولانا آزاد کو حکم دیا کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر صوبۂ بنگال سے باہر چلے جائیں۔ پنجاب، یو، پی وغیرہ کی حکومتیں ان کے اپنے ہاں داخلے پر پہلے سے پابندی عائد کر چکی تھیں۔ انھوں نے ہر طرف کے دروازے بند دیکھ کر رانچی (بہار) کا رُخ کیا اور یہاں قریب کے ایک دیہات مورابادی میں رخت سفر کھول دیا۔ انھیں یہاں آئے تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت نے انھیں یہیں نظر بند کر دیا۔

مولانا آزاد جب مارچ ۱۹۱۶ء میں کلکتہ سے روانہ ہوئے تو ان کے گھر اور دفتر کی تلاشی لی گئی اور پولیس نے ان کے تمام مسودات اور کاغذات اور "الہلال" سے متعلق رجسٹر وغیرہ اپنے قبضے میں کر لیے۔ انھیں میں وہ رجسٹر بھی تھا، جس میں "حزب اللہ" کے ارکین کے نام درج تھے۔ مولانا مہر کا بھی نام ان میں تھا۔

حکومت کی نظر میں یہ تمام لوگ مشتبہ قرار پائے۔ مختلف صوبائی حکومتوں کو حکم موصول ہوا کہ ان سے متعلق تحقیق کی جائے اور ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کی جائے۔ جب مولانا مہر سے متعلق پوچھ گچھ شروع ہوئی تو شدہ شدہ معلوم ہوا کہ وہ حیدرآباد میں مقیم ہیں، فائل ان کے تعاقب میں حیدرآباد پہنچی۔ تفتیش پر راز کھلا کہ انھوں نے ایک اخبار "سلطنت" کے ڈکلیریشن کی درخواست دے رکھی ہے جو زیر غور ہے۔ حکومت جو مولانا آزاد کے اخبار "الہلال" سے تنگ آ چکی تھی بھلا ان کے کسی

مُرید کے اخبار کی اجازت کیوں دینے لگی؟ چنانچہ اُن کی درخواست نامنظور ہوگئی۔

۱۹۲۰ء میں مہر صاحب حیدرآباد سے ملازمت ترک کرکے واپس پنجاب چلے آئے۔ یہ کانگریس اور خلافت کی تحریکوں کے شباب کا زمانہ تھا۔ یہ بھی وطن پہونچ کر — خلافت کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے، اور بالآخر جالندھر خلافت کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہو گئے۔

جالندھر کے قیام اور خلافت کمیٹی میں کام کے زمانے میں انھیں پھر اپنا اخبار جاری کرنے کا خیال آیا۔ بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ بہتر ہو اگر پہلے تجربہ حاصل کرنے کے لیے کسی دوسرے اخبار میں کام کیا جائے۔ یہ کام جالندھر میں رہ کر نہیں ہو سکتا تھا، صحافت کا مرکز لاہور تھا اور یہاں اس وقت مولانا ظفر علی خاں اور ان کے روزنامے "زمیندار" کا طوطی بولتا تھا۔

"زمیندار" شروع میں ہفتہ وار پرچہ تھا، جسے ظفر علی خاں کے والد مولوی سراج الدین احمد نے جاری کیا تھا۔ یہ پہلے تھوڑی مدت لاہور سے شائع ہوتا رہا لیکن بعد کو وہ اسے اپنے وطن کرم آباد (ضلع گوجرانوالہ مغربی پنجاب) لے گئے۔ اس زمانے میں "زمیندار" واقعی اسم بامسمّی تھا۔ اس میں کھیتی باڑی کے فروغ اور کسانوں کی معاشی اور معاشرتی اصلاح کے نقطۂ نظر سے مضامین شائع ہوتے تھے۔ دسمبر ۱۹۰۹ء میں مولوی سراج الدین احمد کا انتقال ہو گیا۔ ظفر علی خاں نے والد کی وصیت کے احترام میں "زمیندار" کو زندہ رکھنے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن ہفتہ وار اخبار، وہ بھی دیہی نوعیت کا اور اس پر وہ شائع بھی ہو کرم آباد جیسے کوردیہہ سے — یہ ان کی جولانیٔ طبع کے لیے کافی نہیں تھا۔ ادھر لاہور کے احباب بھی مصر تھے کہ وہ لاہور منتقل ہو جائیں۔ قصہ کوتاہ انھوں نے مئی ۱۹۱۱ء میں کرم آباد کو خیرباد کہا اور اس کے بعد ہفتہ وار "زمیندار" اور "پنجاب ریویو" ماہنامہ (جسے انھوں نے اگست ۱۹۱۰ء میں کرم آباد ہی میں جاری کیا تھا) لاہور سے شائع ہونے لگے۔ مختلف یورپی اقوام کے اسلامی ممالک کے خلاف جارحانہ اقدام کا یہی زمانہ تھا۔ اول اٹلی نے طرابلس الغرب (لیبیا) پر ۱۹۱۱ء میں حملہ کر دیا۔ مولانا ظفر علیخاں نے اکتوبر ۱۹۱۱ء میں "زمیندار" کو روزنامہ کر دیا۔ اس دور کا پہلا شمارہ ۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو شائع ہوا تھا۔

۱۹۱۲ء میں بلقان کی متعدد ریاستوں نے متحدہ محاذ بنا کر ترکی کے یورپی حصے پر دھاوا

بول دیا اور اڈیٹر یا نوپس (اور سنہ) پر قبضہ کر لیا۔ اس سے ہندی مسلمانوں میں جوش (وخروش) پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔ لیکن اسے جو اپنے میں مولانا ظفر علی خاں کی تحریر و تقریر کا بہت ہاتھ تھا۔ ان کا اخبار "زمیندار" ان کی آواز کو ملک کے کونے کونے تک پہونچانے لگا۔ حادثۂ مسجد مچھلی بازار کانپور (اگست ۱۹۱۳ء) پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء) رولٹ ایجٹ (۱۹۱۹ء) جلیانوالہ باغ امرتسر کا خونیں ڈرامہ (۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء) صرف چند واقعات ہیں جنھوں نے زمیندار کو اور اس کے مدیر کو ہر دلعزیزی کی انتہائی بلندیوں تک پہونچادیا لیکن اب وہ حکومت کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگے ۔ زمیندار اور اس کے مطبع کی ضمانت کئی بار ضبط ہوئی، جسے مولانا کے عشاق نے ہمیشہ چند دن میں جمع کر کے ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ جب یہ سب وار خالی گئے اور مولانا ظفر علی خاں کی شعلہ نوائیوں میں کسی طرح کمی نہ آئی تو بالآخر حکومت پنجاب نے ستمبر ۱۹۲۰ء میں خود انھیں گرفتار کر کے دو برس کے لیے جیل بھیجدیا۔

یہ صورت حال مولانا ظفر علی خاں کے نزدیک غیر متوقع نہیں تھی۔ انہوں نے پیش بندی کے طور پر چار پانچ مہینہ پہلے نئے اڈیٹر کا انتظام کر لیا تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک اس زمانے میں سید ممتاز علی (سید امتیاز علی تاج کے والد) کے ادارے دارالاشاعت سے وابستہ اور ان کے اخبارات "پھول" اور "تہذیب نسواں" کے ایڈیٹر تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے انھیں "زمیندار" کے ادارۂ تحریر میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ سالک صاحب اپنی ملازمت اور مالی حالت سے مطمئن تھے اور دارالاشاعت کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن انھیں ظفر علیخاں کے اصرار کے سامنے سر جھکاتے ہی بنی۔ سید ممتاز علی نے بھی بطیب خاطر انھیں جانے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ یکم مئی ۱۹۲۰ء کو وہ "زمیندار" کے دفتر پہونچ گئے۔ اور تھوڑے دن بعد مدیر مسئول مقرر ہو گئے اور جب ستمبر ۱۹۲۰ء میں ظفر علی خاں جیل گئے تو وہ اب اخبار کے گویا ہر لحاظ سے کرتا دھرتا بن گئے۔

لیکن یہ پکڑ دھکڑ کا زمانہ تھا اور "زمیندار" خاص طور پر انگریزی حکومت کے نزدیک قابل گردن زنی قرار دیا جا چکا تھا۔ یکے بعد دیگرے اس کے کئی اڈیٹر گرفتار ہوئے لیکن یہ کچھ ایسا سخت جان ثابت ہوا کہ اسے کبھی قابل اڈیٹر کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ سالک صاحب

جب زمیندار کے اڈیٹر مقرر ہوئے تو ان کی عمر ۲۵ برس تھی لیکن انھوں نے ایسی قابلیت اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا کہ پرانے اور تجربہ کار صحافی بھی ان کا لوہا مان گئے۔ حکومت بھی تاک میں تھی۔ وہ ان ایام میں "زمیندار" کے چیف اڈیٹر تھے اور اس کا اداریہ لکھا کرتے تھے۔ بالآخر ایک اداریہ حکومت کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا۔ جس پر نومبر ۱۹۲۱ء کے شروع میں انھیں تحریک عدم تعاون کے کارکن کی حیثیت سے گرفتار کر لیا گیا اور فیصلے میں ایک سال کی سزا ہو گئی۔

اس زمانے میں "زمیندار" کے منیجر شفاعت احمد صاحب تھے اور سید عبدالقادر شاہ اسلامیہ کالج میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ سالک صاحب کی گرفتاری اور قید کے بعد ان دونوں کی نظر مہر صاحب کی طرف گئی انھوں نے اصرار سے مہر صاحب کو لاہور بلا لیا۔ ان دوستوں کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے وہ نومبر ۱۹۲۱ء میں لاہور آگئے اور "زمیندار" کے اڈیٹر مقرر ہو گئے۔ لیکن وہ یہاں مشکل سے ہفتہ بھر رہے ہوں گے۔ ہوا یہ کہ ان کے بعض بزرگ پھولپور سے لاہور پہونچ گئے اور انھیں مجبور کیا کہ وہ "زمیندار" سے مستعفی ہو کر وطن واپس چلیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے میں اڈیٹری پھولوں کی سیج نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ جس طرح ان سے پہلے کے تمام اڈیٹر قید کر دیے گئے تھے، مہر صاحب بھی اپنی آزادی سے محروم ہو جاتے۔ غالباً ان کے اعزہ نے اسی خطرے کا احساس کر کے انھیں اس نوکری سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا ہوگا۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ بات اس سے زیادہ تھی اور اس پردۂ زنگاری میں کوئی معشوق بھی کام کر رہا تھا۔ مہر صاحب، جیسا کہ لکھ چکا ہوں ایک زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انگریزی حکومت کا اس طبقے پر جو اثر تھا، اس کا اندازہ آج کی نسل نہیں کر سکتی۔ یقیناً حکومت نے اپنے کل پرزوں کا پورا زور لگا دیا ہوگا۔ القصہ مہر صاحب "زمیندار" سے مستعفی ہو کر پھولپور چلے گئے۔ ادھر حکومت نے چند روز بعد پھر "زمیندار" کی مالی ضمانت ضبط کر لی اور اخبار کی اشاعت کلیتہً بند ہو گئی۔

تین ماہ بعد فروری ۱۹۲۲ء میں "زمیندار" کے پھر شائع کرنے کا انتظام مکمل ہو گیا، تو اب مہر صاحب بھی دوبارہ لاہور منتقل طور پر پہونچ گئے۔ اسی سال نومبر میں سالک صاحب بھی اپنی ایک سال کی قید کاٹ کر رہا ہوئے۔ اب مہر اور سالک کے اشتراک کا وہ دور شروع ہوا جو بجا طور پر اردو صحافت کا زریں دور ثابت ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ "زمیندار" صحافت کی درس گاہ تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کو اردو، فارسی عربی اور انگریزی ۔ چاروں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ وہ اُردو اور فارسی دونوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے ساتھ جن اصحاب کو کام کرنے کا موقع ملا، وہ بعد کو اُردو کے مشہور اور کامیاب صحافی ثابت ہوئے۔ بھلا جس اخبار میں عبداللہ العمادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتحپوری، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خاں میکش، نصراللہ خاں عزیز کے جیسے دیو قامت صحافیوں نے کام کیا ہو اور تجربہ حاصل کیا ہو، اس کی خدمات کبھی فراموش کی جاسکتی ہیں؟ یہاں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

یہ واقعہ ہے کہ ظفر علی خاں بنیادی طور پر علمی، ادبی آدمی تھے۔ اُن کے سے انشا پرداز اُردو نے بہت کم پیدا کیے وہ اگر سیاست کے خارزار میں نہ اُلجھ گئے ہوتے اور یکجوئی سے علم و ادب اور صحافت ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہتے تو آج ہماری زبان کا دامن کیسے کیسے گلہائے رنگ رنگ سے معطر اور مشک بو ہوتا۔ اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میرے نزدیک یہی بات مولانا ابوالکلام آزاد حسرت موہانی اور شاید کسی حد تک مولانا محمد علی پر بھی صادق آتی ہے۔ کون بتا سکتا ہے کہ ان اصحاب کی شکل میں اُردو ادب نے کتنی بڑی قربانی دی ہے سیاست کی بارگاہ پر —!

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ مہر اور سالک کے قران السعدین نے روزنامہ "زمیندار" کو کامیابی اور شہرت کے عروج کمال پر پہونچا دیا تو یہ قدرتی بات تھی۔ انھوں نے اُردو صحافت کو چار چاند لگائے اور دوسرے اخباروں کے لیے قابل تقلید نمونہ ثابت ہوئے۔ اخبار کا اداریہ مہر صاحب لکھتے اور اس کا مزاحیہ کالم 'افکار و حوادث' کے عنوان سے سالک صاحب۔ یہ سب کو تسلیم ہے کہ مہر صاحب کا سا مدلل، ٹھوس اور بھرپور اداریہ کسی اخبار کو نصیب نہیں ہوا۔ سالک اپنے کالم میں ملک کے سیاسی، سماجی، معاشرتی مسائل پر طنز و مزاح کے انداز میں ایسا تبصرہ کرتے تھے کہ ان کا شکار اس کی چبھن سے تلملاتا بھی تھا اور زبان و بیان کے چٹخارے سے لذت اندوز بھی ہوتا تھا۔

سنہ ۱۹۲۷ء کے شروع میں مہر اور سالک کے مولانا ظفر علی خاں کے صاحبزادے اختر علی

خاں سے کچھ اختلاف پیدا ہو گئے۔ اختر علی خاں کی سب سے بڑی پونجی یہ تھی کہ وہ ظفر علیخاں کے بیٹے تھے۔ اس کے سوا ان میں اپنے والد کی ایک صفت بھی تو نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی امر واقع تھا کہ وہ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے اور زمیندار کے بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ مہر اور سالک نے بہت طرح دی، لیکن نہ صرف یہ کہ اختلافات رفع نہ ہوئے بلکہ ظفر علیخاں نے بھی ان لوگوں کی شکایات سے التفات نہ کیا۔ مجبور ہو کر ان دونوں نے اواخر مارچ ۱۹۲۷ء میں زمیندار کی ملازمت سے استعفا دیدیا۔

مہر اور سالک دونوں علمی آدمی تھے۔ روزنامہ اخبار کی بے پناہ اور ہمہ وقتی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے تو انھوں نے اطمینان کی سانس لی کہ اب کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کا کام کریں گے لیکن انھیں کیا معلوم کہ

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

ان کے "زمیندار" سے الگ ہونے کے ساتھ ہی اخبار کے سارے عملے نے بھی ملازمت چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ انہیں ادارتی شعبے کے لوگ اور کاتب تک سب شامل تھے۔ یہ لوگ مہر صاحب کے پاس آئے اور اپنی خدمات پیش کیں۔ اگرچہ مہر صاحب طے کر چکے تھے کہ اب نہ وہ کوئی اخبار نکالیں گے، نہ کسی اور اخبار میں ملازمت کرینگے لیکن اب سوال اس عملے کے روزگار کا تھا اور یہ لوگ اخبار کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں تھے۔ ادھر بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنا روزنامہ اخبار جاری کریں۔ سب سے مشکل مسئلہ روپے کا تھا۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ ایک سو دوستوں سے جنکی فہرست تیار کی گئی تھی، کہا جائے کہ ہر ایک سو سو روپیہ فوراً ادا کرے۔ وعدہ سب نے کر لیا لیکن اس کا ایفا کم ہی نے کیا۔ اگرچہ بعض احباب نے تین تین سو بلکہ پانچ پانچ سو تک ادا کر دیا۔ بہرحال دو تین دن میں ساڑھے تین ہزار روپیہ جمع ہو گیا اور اسی کے بل بوتے پر اخبار جاری کر دیا گیا۔ خدا نے اس میں برکت دی اور یہ بہت کامیاب رہا۔ "انقلاب" کا پہلا شمارہ ۲ اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا۔

مہر و سالک جن حالات میں "زمیندار" سے الگ ہوئے تھے وہ سخت دل گرفتہ تھے اور انھیں مولانا ظفر علی خاں سے جائز شکایت تھی کہ انھوں نے اپنے بیٹے کی محبت میں تمام اصولوں کو دھتا بتا دیا۔ اور پرانے رفیقوں اور ہم کاروں کی جائز شکایتوں کی پروا نہ کی۔ ایسی حالت میں کہ دل شکوہ و شکایت سے لبریز ہوں، انسان اپنے غم و غصہ کے اظہار کے لیے بے تاب

رہتا ہے ع

ایک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔ اس لیے اندیشہ تھا کہ اب جبکہ مہر اور سالک کے ہاتھ میں اپنا اخبار ہے، اور ان کے دل مولانا ظفر علی خاں کے خلاف بھرے ہوئے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ دونوں اخباروں کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مہر صاحب کو لکھا کہ اب جبکہ علیحدگی ہو چکی ہے، زمیندار سے [illegible] جائے یہ بہر اعتبار سے غلط اور مضر طریقہ کار ہوگا۔ خود مولانا ظفر علی خاں بھی کوئی کش مکش نہیں چاہتے تھے۔ شروع میں واقعۃً دونوں طرف سے موافقت اور مساعدت کے جذبات کا اظہار ہوتا رہا لیکن نکالنا انجام کو صلح و آشتی کی یہ فضا نہ بھائی۔ مولانا ظفر علی خاں کو شبہ تھا کہ "انقلاب" جاری کرانے میں اقبالؔ اور فیروز خاں نون کا ہاتھ ہے۔ ممکن ہے "انقلاب" کی پیشانی پر چھپنے والے اقبالؔ کے مندرجہ ذیل شعر سے بھی ان کے شبہ کو تقویت پہونچی ہو جس میں زمیندار کو کنایے میں ڈوبا ہوا تارا کہا گیا تھا ؎

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تک

اسی لیے ظفر علی خاں نے کہا تھا ع

مجموعہ انقلاب کا اقبالؔ و نونؔ ہیں!

(لفظ انقلاب کے حروف میں اقبال اور ن ہے)

بس اس پر مہابھارت چھڑ گئی۔ پھر تو وہ گھمسان کا رن پڑا کہ مدتوں بعد تک بھی ادبی حلقوں میں اس کی گونج سنائی دیتی رہی۔ انقلاب میں مہر اور سالک کے احباب کا پورا گروہ جو نیازمندانِ لاہور کہلاتے تھے لکھتا تھا محمد دین تاثیر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ابوالاثر حفیظ، پنڈت ہری چند اختر کے سے مشاہیر اور قادر الکلام شاعر اور ادیب روزانہ انقلاب کے صفحات میں "زمیندار" اور مولانا ظفر علی خاں کے خلاف نظم و نثر میں لکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی سید احمد شاہ بخاری پطرس بھی انہیں آملتے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو اتنے تنگ نرغے میں گھر کر ہتھیار ڈال دیتا۔ لیکن آفریں ہے ظفر علیخاں

کو پریشان اور ہراساں ہوتا تو درکنار، انھوں نے سب مخالفوں کو للکارا ؎

زمیندار ایک، آپ اتنے، مگر اوج صحافت پر
یہ اک تکل لڑے گا، آپ کی ساری پتنگوں سے

ظفر علی خاں جو کبھی لڑ رہے تھے۔ اداریہ لکھا جارہا ہے۔ نظم کہی جارہی ہے۔ سالک کے "اخبار و حوادث" کے جواب میں "نقاش" کے نام سے نکاہات قلم بند ہو رہے ہیں۔ یہ سخن گسترانہ باتیں اپنی جگہ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مہر و سالک دونوں نے ظفر علی خاں سے بہت کچھ سیکھا تھا اور اب ان دونوں کا ان کے خلاف محاذ قائم کرنا ان کو بہت شاق گزرا تھا۔ اپنے اس رنج و غم کا اظہار انھوں نے ایک نظم میں بھی کیا تھا، اس کے دو شعر دیکھیے۔

مہر و سالک کے انقلاب کو دیکھ
انقلابات ہیں زمانے کے
مہر و سالک ہوں اور میرے خلاف
اتفاقات ہیں زمانے کے

بالآخر بعض اکابر شہر نے بیچ بچاؤ کیا اور دونوں طرف کے ادیبوں کو ایک دوسرے سے گلے ملا دیا۔

چونکہ سب لکھنے والے ایک درجہ کے نہیں تھے۔ اس لیے بے شک کبھی کبھی بات متانت کی سطح سے اتر کر سوقیت کی حدود کو چھو لیتی تھی لیکن عام طور پر معیار بلند اور تخلیقات کی ادبی حیثیت قائم رہی۔ یہ جنگ مہینوں جاری رہی جس سے شہر کی فضا بھی متاثر ہونے سے نہ بچ سکی۔

جن اصحاب کو انقلاب کے مسلسل مطالعے کا موقع ملا ہے وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اس اخبار نے کبھی صحافت کے معیار سے کمتر کوئی بات نہیں کی۔ مہر نے یورپ اور ایشیا کے بیشتر ممالک کا سفر کیا تھا اور وہاں کے کئی اکابر سے ان کے ذاتی دوستانہ تعلقات تھے۔ ان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر انکی گہری نظر تھی جو ایک روزنامہ اخبار کے اڈیٹر کی حیثیت سے انکے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اداریے ہمیشہ صحیح معلومات پر مبنی ہوتے تھے۔ اور ان کے مخالف بھی بادل ناخواستہ انھیں داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں آزادی آئی۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ ایک کی جگہ دو دو ملک وجود میں آئے۔

مہر و سالک نے دیکھا کہ تبدیل شدہ حالات آزاد صحافت کے حق میں نہیں ہیں۔ اگر وہ چاہیں کہ اپنی آزادیٔ رائے بھی قائم رکھیں اور حکومت بھی ان سے خوش رہے تو یہ ناممکن ہے چونکہ انکی نظر میں آزادیٔ تحریر و رائے خوشنودیٔ حکومت سے عزیز تر تھی اس لیے انھوں نے "انقلاب" کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو انقلاب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ایک کامیاب با اثر و رسوخ اور نفع مند اخبار کو اصول کی خاطر بند کر دینے کی ایسی مثال شاید ہی کہیں مل سکے!

اس کے بعد مہر صاحب نے براہ راست سیاست اور صحافت سے بہت کم تعلق رکھا۔

مہر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۶ء کے نصف آخر میں ہوئی میں اسی سال کے وسط میں انٹر کا امتحان پاس کر کے بی۔ اے میں داخلہ لینے کے لیے لاہور پہونچا تھا۔ میں نے دسویں درجہ کا امتحان اس سے پہلے جوبلی ہائی اسکول وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ) سے پاس کیا تھا۔ نویں اور دسویں درجہ میں میرے فارسی کے استاد قاضی [illegible] اشرف رہے تھے۔ وہ صحیح معنی میں عالم اور زبان کے رسیا تھے۔ اس وقت جبکہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں ان کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ وہ ایک مستقل مضمون کے مستحق ہیں اور انشاء اللہ بشرط فرصت میں اس فرض سے کسی وقت سبکدوش ہونے کی کوشش کروں گا۔ . . . .

۱۹۲۶ء میں لاہور پہونچا تو ایک دن کسی نے بتایا کہ قاضی صاحب "زمیندار" کے ادارہ تحریر سے وابستہ ہیں۔ ان کا نام [illegible] اپنی [illegible] یاد آئیں جو صحافت کی [illegible] زمانہ میں ان کی خدمت میں مجھے حاصل تھیں اگلے ہی دن میں کالج کے اوقات کے بعد زمیندار کے دفتر پہونچا۔ اطلاع کرائی، فوراً کمرے [illegible] وہ میرے استاد [illegible] میں ان کا شاگرد ہوں [illegible] تھے انہیں خوشی ہوئی [illegible] کے حالات پوچھنے [illegible] سالک صاحب سے [illegible] اگر آپ خیال ہوں تو میں [illegible] دوست کے ساتھ [illegible] صاحب نے فرمایا۔

تشریف لائیے۔ سالک صاحب بھی وہیں آگئے۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے ہوسٹل چلا آیا۔ یہ تھی مہر صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

میں ۱۹۲۶ء تک لاہور میں رہا۔ ان سے اکثر ملاقات رہی۔ لیکن ان کا یہ سارا زمانہ صحافت کی نذر ہوا اور صحافت بھی کیسی؟ روزانہ اخبار کی ایڈیٹری اور اخبار بھی 'انقلاب' جو بلا مبالغہ اپنے زمانے کا اہم ترین روزنامہ تھا لیکن ہے یہ کہ بنیادی طور پر علمی مزاج کے آدمی تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ تاریخ، مذہب، فارسی اور اردو ادب و شعر سے متعلق ان کی معلومات کا اندازہ ان اصحاب کو نہیں ہو سکتا جنھوں نے انھیں محض انقلاب یا زمیندار کے صفحات پر دیکھا ہے۔ ان کے علم و ادب سے شغف کا پہلا ثمرہ ان کی کتاب "غالب" تھی جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے غالب کے اردو فارسی کلام نظم و نثر سے ان کی سوانح عمری مرتب کی ہے۔ اس ایک کتاب سے ان کا مطالعہ کا شوق، اہم اور غیر اہم کے درمیان انتخاب کی صلاحیت، بہتر نتائج اخذ کرنے کی قابلیت، معلومات کے جمع کرنے میں جدوجہد، حسن ترتیب — غرض سب تصنیفی خوبیاں نمایاں ہیں اور لطف یہ کہ سارا مواد ان سے پہلے بھی جوں کا توں موجود تھا۔ لیکن کسی نے اسے استعمال کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ....

ان کا ایک اور کارنامہ سید احمد شہید رائے بریلوی کی سوانح عمری ہے۔ ۱۹۳۴ء میں وہ افغانستان کی سیاحت کو گئے۔ کابل میں ان کی ملاقات مولانا محمد بشیر سے ہوئی۔ مولانا محمد بشیر نے باتوں باتوں میں ان سے فرمائش کی کہ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کے حالات مرتب کریں۔ انھوں نے وعدہ کر لیا۔ یقیناً اس وقت انھیں کام کی وسعت اور دشواریوں کا اندازہ نہیں تھا لیکن یہ بھی ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھا کہ کسی کام کو شروع کرنے کے بعد محض مشکلاتِ راہ کے باعث اسے ترک کر دیں۔ جب فرصت ملی تو وہ اس پر جٹ گئے۔ انھوں نے اس کتاب کے لیے مواد جمع کرنے میں چودہ برس صرف کیے۔ موضوع سے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ پورے مواد کا مطالعہ کیا جو بلا مبالغہ ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے سفر سرحد کے تمام منازل کی ذاتی تحقیق کی۔ انھوں نے سرحد کے کم و بیش وہ تمام مقامات خود جا کر دیکھے جہاں سید شہید اور ان کے ساتھیوں نے پڑاؤ کیے تھے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آگیا۔

تقریباً ہندوستان سے سات برس کی جبری غیر حاضری کے بعد ۱۹۵۴ء کے اواخر میں وطن آیا۔ چند روز کے بعد لاہور پہونچا تو انقلاب کے دفتر ان سے اور مولانا مہر صاحب سے ملاقات کے لیے گیا۔ جنوری کے دن تھے۔ میں دوپہر کو گیا تو باہر صحن میں کرسیاں دھوپ میں بچھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں اچھی خاصی محفل جم گئی۔ ۔۔۔ صاحبزادہ ان میں مولانا غلام مرشد بھی تشریف فرما تھے۔ انھیں تصوف سے خاص شغف تھا (خدا معلوم وہ زندہ ہیں یا اللہ کو پیارے ہو گئے) وہ بھاٹی دروازے کی اونچی مسجد میں امامت کرتے تھے اور قرآن کا درس دیا کرتے تھے۔ چونکہ تصوف سے شدید دلچسپی تھی، اس لیے ان کی تفسیر میں بھی تصوف کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اسی لیے بعض اوقات ان کی تاویل دور از کار معلوم ہوتی، جس سے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں نے مہر صاحب سے پوچھا کہ فرمایئے، حضرت احمد شہید سے متعلق آپ کی کتاب کس مرحلہ پر ہے؟

فرمایا: "پہلا مسودہ تو مکمل ہو گیا ہے۔ اب اس میں قطع و برید کرکے چاہتا ہوں کہ حجم کچھ کم ہو جائے کیونکہ موجودہ صورت میں اس کی ضخامت بہت زیادہ ہے۔"

اس کے بعد اسی موضوع پر گفتگو ہونے لگی تو فرمایا کہ

"میں بالاکوٹ گیا تھا۔ وہاں جو قبر حضرت سید صاحب کی بتائی جاتی ہے، میرے خیال میں وہ ان کی نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا "کیوں؟"

کہنے لگے کہ "میں نے متعدد بزرگوں کے مزارات پر حاضری دی ہے۔ حضرت سید صاحب کی قبر کو دیکھ کر دل پر وہ اثر مرتب نہیں ہوتا جو اتنے بڑے بزرگ کے مزار سے ہونا چاہیے اس لیے میرا خیال ہے کہ غالباً یہ قبر ان کی نہیں ہے۔"

اس پر میرے منھ سے نکل گیا کہ "اثر کا مرتب ہونا مدفون کی بزرگی سے اتنا علاقہ نہیں رکھتا جتنا آپ کی اپنی انفعالی کیفیت سے۔ سورج کی روشنی کا عکس آئینہ اور پتھر پر یکساں نہیں ہوتا، حالانکہ اس کا نور ایک ہی ہوتا ہے۔ خدا معلوم جب آپ قبر پر گئے، آپ کی دلی کیفیت کیا تھی اور آپ اس وقت اس سے کوئی تاثر لینے کے قابل تھے بھی یا نہیں۔"

چونکہ میری بات کسی حد تک اسناد و ثبوت کی حدود میں آگئی تھی اس لیے مولانا غلام مرشد کو بہت پسند آئی اور انہوں نے بھی میری تائید کی۔ مہر صاحب نے ایک لمحہ تعظیم کے لیے سر جھکایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"بات تو آپ نے بڑے پتے کی کہی ہے اور اس سے میری ایک خلش بھی دور ہو گئی۔ عین ممکن ہے کہ یہی توجیہ درست ہو۔ بہرحال یہ مسئلہ مزید تحقیق طلب ہے۔"

انھیں اقبال کے کلام سے بہت حظ و لذت تھی۔ اقبال سے عمر بھر ذاتی تعلقات بھی رہے اور مختلف نظموں کی شان نزول کا جتنا علم انھیں تھا اتنا شاید ہی کسی اور کو ہو۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اقبال کا صرف نصف یا ایک تہائی کلام چھپا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اقبال نے اپنی کئی نظمیں یا شعر اس لیے اپنے کسی مطبوعہ مجموعے میں شامل نہیں کیے کیونکہ وہ ان کے خیال میں ان کے معیار سے فروتر تھے۔ یا ان کے عام انداز فکر سے میل نہیں کھاتے تھے۔

اپنی طویل رفاقت کے زمانے میں ایسا بہت سا کلام مہر صاحب کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ وہ اسے توضیحی حواشی کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ نہ معلوم اب اس کا کیا حشر ہوگا!

انھوں نے بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم کے مطالب و معانی سے متعلق مستقل کتابیں مرتب کی ہیں۔ ایک کتاب اقبال کے حالات پر مستقل بھی چھوڑی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے ادب پر بھی خاص توجہ دی۔ اس سلسلے میں ان کی چھوٹی بڑی تصانیف جو شائع ہوئیں کوئی پچاس کتابیں ہوں گی۔ انھوں نے ترجمے بھی کیے۔ ان میں زیادہ توجہ تاریخ اسلام پر مرکوز رہی۔ عجیب ہمہ گیر طبیعت پائی تھی۔ لیکن ترجمہ ہو کہ تالیف، سوانح ہو کہ تاریخ، سیاست ہو کہ مذہب، ادب ہو یا شعر، کسی میدان ہو وہ کوئی گھٹیا بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جو بھی لکھا اور جب بھی لکھا کوئی ایسی بات نہ لکھی جسے پڑھنے والے کو اس سے شرم کا احساس ہو، نہ خود انھیں بھی بعد کو اس کے باعث ندامت ہوئی۔

(بشکریہ 'تحریک' قدرے ترک کے ساتھ)

زکوٰۃ کے مقاصد اور منافع

انفرادی اور اجتماعی زندگی میں

استاذ یوسف القرضاوی

(۲)

زکوٰۃ کی منفعت اور مقصد لینے والے کے اعتبار سے

اسلام لوگوں کے لیے ایسی زندگی کا خواہاں ہے جس میں وہ آسودہ ہوں، آسمان اور زمین کی برکتیں پا رہے ہوں اور رزق کی ایسی آسانی اور فراوانی ہو کہ خوش بختی کے احساس سے دل معمور ہوں، امن اور اطمینان کا سرور حاصل ہو اور اللہ کی نعمت و ربوبیت کے شعور سے انسان کا پورا وجود لبریز ہو جائے۔

انسان کی خوش بختی کے لیے اسلام نے مادیات کو بھی پوری پوری اہمیت دی ہے۔ رسول کریم علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات کا ارشاد ہے۔

"تین چیزیں خوش بختی میں شامل ہیں بیوی، جسے دیکھ کر تم خوش ہو اور غیر حاضری میں اطمینان ہو کہ وہ تمہاری تمام امانتوں کی حفاظت کرے گی سواری جو تابعدار ہو اور دوستوں سے ملنے میں آسانی فراہم کرے۔ گھر جس میں وسعت اور تمام ضرورتوں کی کفایت ہو" (مستدرک حاکم)

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

چار چیزیں انسان کی سعادت میں شامل ہیں :-
نیک بیوی ، کشادہ مکان ، اچھا پڑوسی ، اور اچھی سواری .
اور چار چیزیں انسان کی بدبختی ہیں :-
برا پڑوسی ، بری عورت ، بری سواری اور تنگ مکان "

(صحیح ابن حبان)

بہرحال اسلام انسانوں کو خوش حال دیکھنا چاہتا ہے، ان کی پریشان حالی اسے پسند نہیں! او کوئی ایسا سماجی ڈھانچہ اور تقسیم دولت کا نظام جو کچھ لوگوں کو ظلماً بدحالی میں مبتلا کرتا ہو اُس کے لیے قطعاً ناقابلِ برداشت ہے۔

مزید کوئی دلیل اگر اسلام کے اس نقطۂ نظر پر چاہیئے تو خود قرآن مجید میں دیکھئے، اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر بطور احسان ذکر فرماتا ہے۔ "وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ" (اور اُس نے تجھ کو تنگ دست پایا تو مال و دولت سے بھی نوازا ۔۔۔ سورۃ الضحیٰ) اور مسلمانوں پر ہجرت کے بعد کے احسانات کے سلسلے میں ایک جگہ یاد دلایا گیا ہے۔

فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ	اُس نے تم کو پناہ گاہ مہیا کی، اپنی نصرت
وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ۔	سے طاقت بخشی اور نفیس چیزیں رزق میں
(الانفال)	عطا کیں۔

ایمان اور عملِ صالح کے نقد انعام کے طور پر وعدہ کیا گیا ہے کہ آسائشِ حیات اور برکاتِ ارض و سماء سے نوازا جائے گا۔ اور کفر و عصیان کی دُنیوی سزا یہ قرار دی گئی ہے کہ رزق و عافیت کی چادر تنگ کر دی جائے۔ فرمایا گیا ہے

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا	اور اگر بستیوں والے ایمان اور تقوےٰ کے
وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ	راستے پر چلتے تو کھول دیتے ہم ان پر دروازے
مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ۔ (الاعراف آیت ۹۶)	آسمان اور زمین کی برکتوں کے۔
وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا	اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا تو وہ اس کے
وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔	لیے راستے پیدا فرمائے گا اور رزق دے گا۔

(الطلاق۔ ۲۔۳) ایسے طریقوں سے جن کا اسے گمان بھی نہ ہو۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ۔

(النحل ۱۱۲)

اور اللہ بطور مثال ذکر فرماتا ہے ایک بستی کا جو امن و اطمینان سے آسودہ تھی۔ ہر چہار طرف سے اُس کا رزق آتا تھا۔ پھر اُس نے ناقدری کی اللہ کے احسانات کی تو محیط کر دیا اللہ نے اُس پر لباس بھوک اور خوف کا اُس کے اعمال کی پاداش میں۔

حاجتمندی کی ذلتوں اور پریشانیوں سے آزادی اسلام نے مالدار مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کر کے یہی چاہا ہے کہ ناداروں کو بھی کھانے پینے اور پہننے رہنے کی سہولتوں میں حصہ ملے، وہ بھی زندگی کی سرگرمیوں میں شریک ہوں۔ اپنے آپ کو معاشرہ کا ایک زندہ عضو سمجھیں اور ایک انسان کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کر سکیں۔ اسلام نے زکوٰۃ کی تقسیم بھی حکومت کے سپرد کی ہے تاکہ لینے والے کی عزت نفس پر کسی طرح کی آنچ نہ آئے۔ وہ کسی کا احسان سمجھ کر اس کو قبول نہ کرے بلکہ اپنا حق سمجھے جو معاشرے کے ذمہ تھا۔ اور اگر یہ اصلی شکل کسی وقت قائم نہ رہ سکے اور افراد کو خود ہی اپنی زکوٰۃ تقسیم کرنا پڑے تو ایسی صورت میں قرآن آگاہی دیتا ہے کہ فقراء کی اہانت اور اپنی برتری کا کوئی انداز کہیں سے نہ پیدا ہونے پائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا۔

(سورۃ البقرۃ ۲۶۴)

اے ایمان والو نہ کالعدم کرو اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور اذیت پہونچا کر مثل اُس شخص کے جو اپنا مال دکھاوے کے لیے خیرات کرتا ہے۔ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا پس اُس کے صدقے کی مثال ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک چٹان پر کچھ مٹی ہو اور اس پر بارش کی رو پڑ جائے تو اُسے صاف کر ڈالے۔

بغض و حسد سے حفاظت: ایک نادار اور بدحال انسان جب اپنے ارد گرد کچھ لوگوں کو عیش و آرام سے رہتے ہوئے دیکھتا ہے جو اس کی کوئی خبر گیری نہیں کرتے، تو اس کا دل بغض و حسد سے پاک نہیں رہ سکتا اور یہ بغض و حسد جیسی آفت ہے اس کے بتانے کی حاجت نہیں۔ فرد اور معاشرہ دونوں کی تباہی ہے۔ اس میں دین کا خسارہ یہ پڑ جاتا ہے کہ آدمی اللہ کی تقسیم میں بے انصافی کا گمان کرنے لگے۔ اس سے نفسیاتی ہی نہیں جسمانی امراض بھی پیدا ہوتے ہیں، زخم معدہ اور خون کی روانی میں رکاوٹ (ضغط دم) جیسے مہلک امراض اس کے عام اثرات ہیں۔

ایک بھوکے ننگے اور بدحال انسان کو صرف یہ خطاب سنا کر بغض و حسد سے نہیں روکا جا سکتا تھا۔ اسلام نے زکوٰۃ کے ذریعہ وہ جڑ کاٹ دینے کی کوشش کی جس سے یہ بیماری پیدا ہوتی ہے اس نے اس ذریعہ سے بے روزگاروں کے لیے روزگار پانے کی صورت نکال دی، معذوروں کی کفالت کا انتظام کر دیا، قرض میں دبے ہوؤں کے لیے گلو خلاصی کی راہ پیدا کی، مسافروں کی بے بسی کا حل پیدا کیا اور بغض و حسد کے بجائے اخوت کے احساس کے لیے زمین ہموار کر دی۔

زکوٰۃ کے اجتماعی منافع اور مقاصد

زکوٰۃ کے مسائل پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ زکوٰۃ میں اجتماعی منافع کا بھی پہلو ہے۔ آیت مصارف زکوٰۃ میں فرمایا گیا ہے

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ	زکوٰۃ حق ہے فقراء اور مساکین کا اور کارکنان
وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ	زکوٰۃ کا اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب
قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ	مقصود ہو اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور
وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ	قرضداروں کے قرض ادا کرنے میں اور خدا کی راہ میں
فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ.	اور مسافروں کی مدد میں بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیے
(سورہ توبہ)	یہ حقوق زکوٰۃ اللہ کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں۔

اس آیت میں مؤلفۃ القلوب اور فی سبیل اللہ کی مد سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کے بعض مقاصد دینی اور سیاسی نوعیت کے ہیں۔ اسلام کی دعوت اور اس کے سیاسی نظام کی حفاظت ہی کے سلسلے میں

تالیف قلب اور فی سبیل اللہ کی مد پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہاں اس نوعیت کے اجتماعی منافع اور فوائد
پر گفتگو مقصود نہیں ہے۔ اس کا محل دوسرا ہے۔ یہاں سماجی فوائد اور مقاصد پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

زکوٰۃ اور سماجی نظامِ کفالت

سماج اور جماعت افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ جو چیز فرد کی شخصیت کو بناتی اور
بڑھاتی ہے وہی لازماً سماج اور جماعت کی طاقت اور ترقی کا بھی باعث ہے۔
اور جو چیز مجموعی طور پر سماج کے لیے نفع بخش ہو اُس میں افراد کا بھی فائدہ ہے چاہے غیر شعوری ہی
کیوں نہ ہو۔ فرد اور جماعت کے درمیان کوئی ایسا خط نہیں کھینچا جا سکتا جو ان دونوں کو بالکل الگ
الگ کر دے۔ پس حاجتمند افراد کی دستگیری اور فقیر و مسکین اور مقروض و مسافر کی زکوٰۃ کے ذریعہ
اعانت و کفالت جہاں انفرادی منفعت کہلائے گی وہیں اسے سماجی منفعت بھی کہنا درست ہوگا۔
اس اعانت و کفالت کے اثرات صرف ان افراد تک محدود نہیں رہتے، مجموعی طور پر کل معاشرے کی
فلاح و ترقی اس میں پوشیدہ ہے۔

زکوٰۃ دراصل اسلام کے نہایت وسیع اجتماعی نظام کفالت کا ایک جزو ہے، جو علمی، ادبی،
سیاسی، دفاعی، اقتصادی، اخلاقی، تہذیبی، اور معاشی ہر طرح کے معاملات کی کفالت کو جامع
ہے، یہ نظام جبکہ زندگی کی تمام شاخوں اور انسانی تعلقات کی تمام شکلوں پر محیط ہے زکوٰۃ اس کے
میں ایک دائرے پر حاوی ہے۔ اور وہ وہ ہے جس کی ضرورت کو آج سماجی بیمہ اور سماجی کفالت
کے دو نظام مل کر پورا کرتے ہیں۔ بیمہ میں آدمی اپنی آمدنی کا ایک حصہ پابندی سے بیمہ کمپنی کو ادا کرتا ہے
اور پھر یہی اندوختہ ایک خاص حساب سے اس کی ضرورت کے وقت کام آتا ہے۔ کفالت کے نظام
میں کچھ جمع کرنے کا سوال نہیں ہوتا۔ بلکہ حکومت عام سرکاری خزانے سے اس کا بجٹ بناتی ہے۔
اور وہ مقررہ اسکیم کے ماتحت حاجتمندوں پر صرف ہوتا ہے۔

زکوٰۃ میں یہ دونوں باتیں اس طور پر جمع ہیں کہ ایک شخص نے اس سال زکوٰۃ ادا کی لیکن
اگلے سال وہ خود اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے قابل نہیں رہا۔ یا کسی افتاد نے اور آگے بڑھ کر اسے
مقروض بنا دیا وغیرہ ذالک تو اس صورت میں یہ شخص خود زکوٰۃ لینے کا حقدار ہو جائے گا ایسے لوگوں
کے حق میں زکوٰۃ بیمہ بن جاتی ہے۔ انھوں نے جو بیت المال میں اپنا حصہ جمع کیا تھا وہ گویا ان کے
بھی کام آگیا۔ ان کے برعکس بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو کبھی زکوٰۃ ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتے

لیکن لینے کا حق رکھتے ہیں۔ ایسوں کے حق میں زکوٰۃ کا نظام کفالت کا نظام ہے۔ لیکن زکوٰۃ میں بیمہ کے بمقابل کفالت ہی کا پہلو زیادہ غالب ہے۔ اس لیے کہ وہ اولی الذکر اشخاص کو جب دی جاتی ہے تو اس حساب سے نہیں دی جاتی ہے کہ انھوں نے کیا دیا تھا۔ بلکہ اس حساب سے دی جاتی ہے کہ انکی ضرورت کیا ہے۔ چاہے وہ ضرورت زیادہ ہو یا کم۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ نظام کفالت مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اسلامی ریاست کے تمام باشندے اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ثابت ہے کہ آپ نے ایک یہودی کو دربدر مانگتے ہوئے دیکھا تو اسی وقت بیت المال سے اس کی کفالت کا حکم جاری کیا۔ اسی طرح دمشق کے ایک سفر میں جذام زدہ نصاریٰ کا ایک گروہ آپ نے دیکھا تو اُن کا گزارہ بھی اسلامی بیت المال سے جاری کرایا۔

زکوٰۃ کا اقتصادی اثر | زکوٰۃ کا معاشرے کی اقتصادیات پر سب سے نمایاں اثر یہ ہے کہ وہ اقتصادی عمل کو تیز کرتی ہے۔ مالداروں کے ہاتھ سے جب زکوٰۃ کی مد میں کچھ مال لازمی طور پر جائے گا تو اس کسر کو پورا کرنے کے لیے ان میں پیداواری حرکت و عمل کا بڑھ جانا ناگزیر ہے۔ خصوصاً نقد روپیہ کو ڈال کر رکھ لینے کی زکوٰۃ والے معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ پیسہ آدمی کام میں لگائے یا نہ لگائے ۲½ فی صد سالانہ اسے ادا کرنا ہوگا۔ اس لیے اس معاشرے میں آدمی کے لیے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ

الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات کے متعلق اعلان

(مطابق فارم ۴ دیکھئے قاعدہ ۸)

مقام اشاعت ... ... لکھنؤ

وقفہ اشاعت ... ... ماہانہ

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر کا نام ... ... محمد منظور نعمانی

قومیت ... ... ہندوستانی

پتہ ... ... کچہری روڈ، لکھنؤ

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔

(دستخط) محمد منظور نعمانی

یکم مارچ ۱۹۷۲ء

ہندوستان میں علم حدیث

(۶)

از مولانا تقی الدین ندوی مظاہری
(مقیم حال، مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور)

سلسلہ کے لیے دیکھئے الفرقان بابتہ ماہ رمضان ۹۱ھ

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی ہندوستان کے بارے میں یہ بھی شہرت ہے کہ یہاں کے مشائخ سلوک تک علم حدیث سے کوئی خصوصی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ان حضرات کی دلچسپیوں کا موضوع صرف تصوف و فقہ کی کتابیں تھیں اور انھیں کی ترویج و اشاعت ان کے پیش نظر تھی۔ مگر ہندوستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ صوفیاء کرام جن کے قلوب کی حرارت و گرمی کی بدولت لاکھوں نفوس کو اسلام کی دولت نصیب ہوئی اور بہت سے بندگانِ خدا کو اللہ کی محبت و معرفت اور حب نبی کا وافر حصہ ملا، ان صوفیاء کرام میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی بھی تھی جنھیں علم حدیث میں کمال حاصل تھا یا خصوصی مقام حاصل تھا، انہی برگزیدہ ہستیوں میں شیخ الاسلام زکریا بن محمد بہاء الدین ملتانی کی ذات گرامی ہے۔ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی ھبار بن اسود کی اولاد میں تھے۔ کنیت ابو محمد، لقب بہاء الدین تھا۔ جب عمر شریف بارہ[12] سال کو پہونچی تو خراسان و بخارا کا سفر کیا، پندرہ برس کے سن میں علوم ظاہری کی تکمیل کی۔[1] بخارا کے لوگ آپ کے صلاح و تقویٰ کو دیکھ کر بہاء الدین لقب سے پکارنے لگے، اس لیے آپ اسی لقب سے مشہور رہے۔ ان کے دادا کمال علی شاہ قریشی مکہ مکرمہ سے خوارزم آئے، اور وہاں سے ملتان آکر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ لیکن ان کے والد شیخ وجیہ الدین نے یہاں سے علاقہ

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۰۴

شیخ سلیمان ملتانی | شیخ فاضل سلیمان بن زکریا ملتانی قرشی امام علم الدین ملتانی، فقہ، حدیث اور عربیت کے ممتاز علماء میں ہیں، ملتان میں ولادت ہوئی، اور وہیں نشو ونما پائی، حرمین شریفین، بیت المقدس، بغداد و عراق وغیرہ کا سفر کیا، حج و زیارت کی سعادت حاصل کی اور وہاں کے نامور علماء سے فیضیاب ہوئے، پھر واپس آئے اور غیاث الدین تغلق م ۷۲۶ھ کے عہد میں دہلی وارد ہوئے[1]۔

مولانا برہان الدین محمود بلخی | امام صغانی کے شاگرد مولانا برہان الدین بلخی ہیں۔ آپ صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صاحب ہدایہ نے ان کے بارے میں علم کی بشارت دی تھی، سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہندوستان واپس آئے، اور مشارق الانوار کا درس دینا شروع کیا، ۶۸۶ھ میں وفات پائی۔ دہلی میں حوض شمسی کے پورب میں دفن ہوئے، ان کے خاص شاگرد مولانا کمال الدین دہلوی ہیں[2]۔

مولانا کمال الدین زاہد | مولانا کمال الدین بڑے متبحر اور مرتاض، اور کمال ورع وتقویٰ کے بزرگ تھے، حضرت نظام الدین اولیاء نے حدیث کی کتاب مشارق الانوار انھیں سے پڑھی تھی، اور انھوں نے مولانا برہان الدین بلخی سے پڑھی تھی، حدیث میں یگانۂ روزگار تھے، اور دہلی میں اس کا درس دیتے تھے، غیاث الدین بلبن نے شاہی امام مقرر کرنا چاہا، مگر مولانا نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ ہمارے پاس نماز کے سوا اور رہے ہی کیا، سلطان اس کو بھی ہم سے لینا چاہتے ہیں[3]۔

حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء | آپ کی ذات گرامی سے اس ملک کو خصوصیت سے جو روحانی دینی فیض پہونچا، وہ محتاج بیان نہیں، اس کی تفصیل دعوت وعزیمت جلد سوم (مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حضرت کی عظیم شخصیت جو پورے ملک کی روحانی و دینی پیشوائی کر رہی تھی۔ حق تعالیٰ نے انھیں جس کار عظیم کے لیے پیدا فرمایا تھا، وہ اتنا اہم تھا کہ اس کی مشغولیت دوسرے درسی وعلمی مشاغل میں مشغول ہونے کا موقع ہی کب دیتی اس لیے علم حدیث کی درس وتدریس، تصنیف وتالیف کا مشغلہ حضرت کے یہاں نہیں تھا، مگر حضرت کے حالات زندگی میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں مقامات حریری کے چالیس

---

۱ نزہۃ الخواطر ص ۱۴۲ ۲ اخبار الاخیار ص ۴۹ ۳ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۲ ۴ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۳

مقامے زبانی یاد کیے تھے۔ بعد میں اس کے کفارے کے طور پر دہلی آکر مولانا کمال الدین زاہد سے مشارق الانوار کا درس حاصل کیا اور اس کو حفظ کر ڈالا [۱]

غور کرنے کی بات ہے کہ امام صغانی کی مشارق الانوار جو صحیحین کی دو ہزار چھ سو بیالیس ۲۶۴۲ حدیثوں پر مشتمل ہے۔ حضرت کو زبانی یاد تھی، آج موجودہ دور میں شاید ہی کوئی ایسا محدث مل سکے جو اتنا زبردست حافظ حدیث ہو۔ یہی نہیں بلکہ میر خورد نے سیر الاولیاء میں ان سند جو ان کے استاد مولانا کمال الدین نے عطا فرمائی تھی اس کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں۔

"قرأ هذا الاصل المستخرج من الصحيحين على ساطر هذه السطور۔	صحیحین سے حدیثوں کا یہ مجموعہ جو منتخب کیا گیا ہے اس کو ان سطور کے لکھنے والے سے پڑھا ہے۔

اس سند میں یہ الفاظ بھی لکھے ہیں۔

قرأة بحث واتقان وتنقيح معانيه وتنقير مبانيه [۲]	اور یہ پڑھائی کامل بحث و اتقان اور معانی کی تحقیق اور اس کی بنیادوں کے کھوج کرید کے ساتھ ہوئی۔

اجازت نامہ میں تاریخ ۲۲ ربیع الاول ۶۷۹ھ درج ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت آپ کی عمر حساب سے ۴۳ سال کی تھی۔

ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ مورخ فرشتہ نے "اسماع مباح لاھلہ" کے بارے میں لکھا ہے کہ حضرت نے غلطی سے اس کو حدیث نبوی سمجھ لیا تھا۔ یہ درحقیقت مورخ فرشتہ کا تسامح ہے۔ اگر مورخ فرشتہ کی بات کو دیکھا جائے تو انھوں نے خود حضرت کے بارے میں لکھا ہے "در فقہ وتفسیر وحدیث واصول وکلام استحضار تمام داشت" [۳] حضرت کے ملفوظات کے دو مجموعے فوائد الفواد اور افضل الفوائد یہ دونوں مشہور ہیں۔ ان میں بکثرت حضرت کی زبان مبارک سے حدیثیں مذکور ہیں۔ اور ان کے اسرار و رموز بیان فرمائے ہیں حضرت

۱؎ سیر الاولیاء صفحہ ۱۰۶　۲؎ سیر الاولیاء صفحہ ۱۰۱　۳؎ تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۹۶ ج ۲

کے ان ملفوظات کو پڑھنے کے ساتھ ضروری ہے کہ یہ بات پیش نظر رہے کہ چونکہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیثوں کا محدثین اعتبار کرتے ہیں۔ اس لیے اس طرح کی حدیثوں کا آنا بھی ان میں ناگزیر ہے تاہم ان ملفوظات کو بیان فرماتے تھے کبھی آپ فرما دیتے کہ "ایں قول مشائخ است" یہ مشائخ کا قول ہے یہی نہیں بلکہ ان ملفوظات میں متعدد جگہ اس قسم کے الفاظ بھی موجود ہیں کہ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ یہ حدیث کیسی ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا: "ایں حدیث در کتب احادیث کہ مشہور است و معتبر نیامدہ" ایک صاحب نے آپ کی مجلس میں دریافت کیا "السخی حبیب الله وان کان فاسقا" یہ حدیث ہے یا کسی کا مقولہ ہے۔ مجلس میں سے ایک دوسرے شخص نے کہا کہ یہ "یعنی (جہل حدیث) میں ہے۔" اس پر حضرت نے ارشاد فرمایا جو کچھ صحیحین میں ہے۔ وہ صحیح ہے۔ کبھی فرما دیتے کہ یہ حدیث میں نے خود نہیں دیکھی۔ بلکہ اپنے استاد مولانا کمال الدین اصولی سے سنی ہے[۱]

شیخ نصیر الدین محمود چراغ | آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے جلیل القدر و مشہور خلفاء میں ہیں۔ غنا نہیں سنتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے چند رفقاء غنا سن رہے تھے۔ اس مجلس سے حضرت نصیر الدین محمود اٹھ گئے۔ لوگوں نے بیٹھنے پر اصرار کیا۔ فرمایا: یہ خلاف سنت ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اپنے پیر کے مسلک سے ہٹ گئے۔ فرمایا: پیر کا عمل حجت نہیں بن سکتا۔ کتاب و سنت سے کوئی دلیل لاؤ۔ بعض اصحاب نے یہ فقرہ حضرت سلطان جی تک پہونچا دیا، تو حضرت سلطان الاولیاء نے فرمایا: راست می گوید[۳]

علامہ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں۔ ان کے ملفوظات میں بکثرت حدیثیں ملتی ہیں[۴]

شیخ محمود بن یوسف کرمانی | شیخ محدث محمود بن یوسف بن علی کرمانی ہندی حنفی نزیل مکہ، آپ نے صحیح ابن حبان کا رضی طبری سے سماع حاصل کیا تھا، اور انھوں نے اس کی اجازت آپ کو دی تھی ان کے علاوہ زین طبری، جمال مطری، شیخ خلیل مالکی سے بھی سماع حدیث حاصل کیا۔ نیز ابن سکرے بھی رجب ۷۵۲ھ میں صحیح ابن حبان کا سماع حاصل کیا اور انھوں نے آپ کو اس کی اجازت بھی مرحمت فرمائی تھی۔ مکہ مکرمہ سے ہندوستان واپس آئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا[۵] (باقی)

---

[۱] فوائد الفواد ص۱۰۲ [۲] فوائد الفواد ص۱۶۵ [۳] اخبار الاخیار ص۸۱ [۴] مقالات سلیمانی ص۳۱ ج۲ [۵] نزہۃ الخواطر ص۱۶۱ ج۲

مولانا نعمانی کی تالیفات

جو قرآن و حدیث کی تعلیمات کی ترجمان اور دینی اصلاح کا مکمل نصاب ہیں

اسلام کیا ہے؟ نہایت آسان زبان اور دلنشیں انداز میں اسلامی تعلیمات کا مکمل خلاصہ۔ جو دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ کافی ہے۔ ۲/۵۰

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اس کتاب میں سیکڑوں عنوانات کے تحت قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، جو پڑھنے والے کو قرآنی دعوت اور تعلیم کے ساتھ اس کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔ غیر مسلموں کے لیے خاص تحفہ
قیمت مجلد ۵/- انگریزی ایڈیشن ۱۲/-

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ جن لوگوں نے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کو نہیں پایا وہ اس کتاب کے مطالعہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو پوری طرح جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لیے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔
مجلد ۲/۵۰ غیر مجلد ۲/-

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ اس کتاب میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سوانح حیات آپ کی عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم کارنامے کی تفصیل بیان کی گئی ہے جس نے سلطنت مغلیہ کا رخ الحاد سے اسلام کی طرف موڑ دیا۔ قیمت ۵/-

مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ یہ کتاب حضرت خواجہؒ کے ارشاد و ہدایت کے پورے نام کا آئینہ ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصومؒ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ اور خلیفہ ہیں۔ آپ ہی کی تربیت نے اورنگ زیب عالمگیر کو ایک مثالی حکمراں بنا دیا تھا۔ قیمت مجلد ۵۰/۴

کلمہ طیبہ کی حقیقت توحید اور رسالت کی شہادت کا کیا مطلب ہے اور اس کے کیا تقاضے اور کیا مطالبے ہیں۔ ۵۰/-

نماز کی حقیقت اپنی نماز کو حقیقی نماز بنانے اور اس میں روح پیدا کرنے کے لیے اس کا مطالعہ ضرور کیجیے۔ شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی اور دیگر اکابر کے افادات کا نچوڑ ہے۔ قیمت ۱/-

برکات رمضان اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ ۱/-

دین و شریعت اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت، اور احسان و تصوف پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۷۵/۳

معارف الحدیث احادیث نبوی کا ایک جدید انتخاب، اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ۔ اس کتاب میں صرف وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن میں امت کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے اور جن کا انسانوں کی عملی و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے۔
جلد اول ۵/-، جلد دوم ۵/۵۰، جلد سوم ۶/-، جلد چہارم ۵/۲۵ جلد پنجم ۶/۵۰ (مجلد کے لیے ۲۵/- فی جلد مزید)

صحبتے با اہل دل (مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی (پیر نیجے میاں) آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ہم آج بھی ان کی اصلاحی مجالس میں شریک ہو سکتے ہیں اور ان کے ارشادات سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب ان کی عرفانی و اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان کے ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ہے۔
قیمت مجلد ۶/-

انسانیت زندہ ہے یہ مولانا نعمانی کے چار چھوٹے چھوٹے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پر تاثیر واقعہ اور تجربہ نہایت سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔ قیمت ۵۰/-

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ پر لگائے گئے معاندین اہل بدعت کے الزامات کا مدلل اور مسکت جواب۔ قیمت ۱/-

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مستند تفاسیر و علوم قرآنی

تفسیر ماجدی

از مولانا عبدالماجد دریابادی

قرآن مجید کی یہ تفسیر متعدد حیثیتوں سے منفرد و ممتاز اور بے حد قابل قدر ہے۔ عربی کی تمام مستند تفاسیر اور معروف انگریزی لغوی تحقیقات کا عطر کشید کر دیا گیا ہے۔ ایک عام آدمی کامل اعتماد کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔

قیمت مجلد اول -/۱۵ ، دوم مجلد -/۱۶

تفسیر ابن کثیر محشیٰ (اردو)

علامہ ابن کثیر کی عظیم الشان تفسیر جس کو جدید و مفید حاشیہ و مسائل کی وضاحت کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ نہایت ہی جامع و مفید کتاب ہے۔ چار جلدوں میں مکمل غیر مجلد -/۶۰ مجلد -/۶۵

تفسیر بیان القرآن

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی مشہور زمانہ تفسیر تین جلدوں میں مکمل سیٹ مجلد -/۶۳ ۔ مکمل سٹ کی خریداری پر رعایتی قیمت -/۶۰

تفسیر حقانی مکمل

مولانا عبدالحق حقانی دہلوی کی شہرۂ آفاق تفسیر الگ الگ جلدوں میں [illegible] قدیم میں شائع ہوئی تھی جس میں مقدمہ بھی شامل ہے۔ مجلد پانچ جلدوں میں مکمل ہے۔

قیمت کامل مجلد -/۸۰

تفسیر موضح القرآن

شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کی مشہور و مقبول تفسیر جو تفاسیر میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بڑے سائز کی ایک ہی جلد میں مکمل ہدیہ مجلد -/۲۶

کشف الرحمٰن مع تیسیر القرآن و تسہیل القرآن

(از مولانا احمد سعید صاحب دہلوی) قرآن شریف کا ترجمہ اور تیسیر القرآن و تسہیل القرآن کی ترتیب و تالیف ، مولانا موصوف کی ۱۸ سالہ محنت و عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ قیمت مکمل -/۲۰

تفسیر مظہری

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی یہ تفسیر اب تک عربی زبان میں چھپتی رہی۔ اب اسے اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے ۔ نہایت معتبر اور مستند و مقبول ہے۔ ۱۲ پاروں کی تفسیر چھپ کر آ چکی ہے

قیمت .... -/۹۰

قصص القرآن

(از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم) جس میں انبیاء و امم سابقہ کے سلسلے میں قرآن کے بیانات پر تاریخ و حدیث اور علوم قرآنی کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ان واقعات کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔

قیمت جلد اول -/۱۰ جلد دوم -/۵ جلد سوم -/۷ چہارم -/۸

مجلد کے لیے -/۲ فی جلد مزید۔

ارض القرآن

یعنی قرآن مجید کی تاریخی آیات کی تفسیر ، سرزمین قرآن (عرب) کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا تذکرہ ہے ان کی تاریخی اور اثری تحقیق مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قیمت مکمل غیر مجلد -/۱۰.۵۰

قرآن اور تعمیر سیرت

(از ڈاکٹر میر ولی الدین) اس کتاب میں سیرت و کردار سازی کے جامع نقطۂ نظر سے قرآن کی بعض اہم تعلیمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب متعدد مقالوں پر مشتمل ہے۔ قیمت صرف -/۶

قرآن اور تصوف

یہ بھی ڈاکٹر میر ولی الدین کی تصنیف ہے ڈاکٹر صاحب اپنی جدید تعلیم کے باوجود تصوف کے حامل اور داعی ہیں۔ اس کے مطالعے سے تصوف کے بارے میں بہت سے شکوک رفع ہو جاتے ہیں۔ قیمت -/۳

قاموس القرآن (نیا ایڈیشن)

تالیف مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ اس میں الحمد سے لے کر والناس تک بہ ترتیب حروف تہجی تمام الفاظ قرآنی کے معانی اور ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح درج کر دی گئی ہے۔

طباعت و کاغذ اعلیٰ ، صفحات آٹھ سو ، قیمت مجلد -/۱۱

لغات القرآن

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب حل کرنے اور سمجھنے کے لیے اردو زبان میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ ایک عام آدمی اسکے پڑھنے سے قرآن کا ترجمہ اچھی طرح سے کر سکتا ہے۔

قیمت کامل غیر مجلد -/۳۲ ، مجلد -/۴۰

فہم قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ قرآن کو صحیح طور پر سمجھا کن علوم و شرائط پر موقوف ہے؟ قیمت -/۲

کتب خانہ الفرقان ، کچہری روڈ ، لکھنؤ

علم حدیث اور فقہ پر اہم اور مستند کتابیں

کتاب الزہد والرقائق | امت کے جلیل القدر امام عبداللہ بن مبارک کی مقبول و مشہور تالیف

جو عرصہ سے نایاب تھی اس کو ہمارے ملک کے مایۂ ناز محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ایڈیٹ کر کے نہایت مفید اور ایمان افروز مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا ہے کوئی کتب خانہ اور لائبریری اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں۔ قیمت مجلد صرف -/۳۰

ترجمان السنہ مکمل | (تالیف: مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی) اردو زبان میں ضروری تشریح و مباحث کے ساتھ ارشادات نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ ہے۔ حدیث کے مستند لٹریچر میں یہ کتاب بلاشبہ عدیم النظیر ہے۔

قیمت جلد اول -/۱۲ جلد دوم -/۱۰ جلد سوم -/۱۲ جلد چہارم -/۱۲

(مجلد کے لیے فی جلد -/۲)

نصرۃ الحدیث | کیا حدیث بھی قرآن کی طرح واجب العمل ہے؟ ہمارے وقت کے مشہور صاحب نظر فاضل اور محقق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اپنی اس کتاب میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور حدیث کی حجیت کے مسئلہ کو بے غبار کر دیا ہے۔ قیمت -/۲/۵۰

محدثین عظام اور انکے علمی کارنامے | مؤلفہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری

اس کتاب میں ائمہ اربعہ اور ارباب صحاح ستہ اور امام طحاوی کا تحقیقی تذکرہ اور تاریخ تدوین حدیث اور محدثین عظام کی کوششوں کا ذکر ہے نیز محدثین عظام کے علمی کارناموں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے قیمت -/۶/۵۰

فن اسماء الرجال | یعنی تاریخ رجال حدیث کی تدوین و تحقیق کتب اسماء الرجال سے استفادہ کا طریقہ

اہم مشہور کتب رجال پر تبصرہ و تعارف۔ مؤلفہ مولانا تقی الدین ندوی قیمت -/۷/۷۵

مظاہر حق (اردو مع متن عربی) | حدیث کی مشہور و مقبول ترین کتاب "مشکوٰۃ شریف" کی اردو زبان میں شرح۔ پانچ جلدوں میں مکمل قیمت غیر مجلد کامل -/۶۵

ایضاح البخاری | احادیث کی سب سے مستند کتاب (بخاری شریف) کی اردو شرح۔ افادات حضرت مولانا فخرالدین صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) ۱۲ حصے طبع ہو چکے ہیں۔ قیمت فی حصہ ۲/۲۵

زاد سفر | "ریاض الصالحین" کا اردو ترجمہ۔ از امۃ اللہ تسنیم۔ یہ کتاب بہترین مصلح و مرشد کا کام کرتی ہے عنوان کے نیچے پہلے قرآن مجید کی آیات مع ترجمہ پھر احادیث ہیں۔

قیمت جلد اول ۶/۵۰

شمائل ترمذی و خصائل نبوی (اردو) | شمائل ترمذی کی عام فہم و فاضلانہ شرح

جس میں احادیث کی روشنی میں حضور کی سیرت و صورت، عادات، خصلتیں، معمولات و لباس وغیرہ کی تفصیل ہے۔ قیمت -/۶

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند | افادات حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ۔ دارالعلوم دیوبند سے پوچھے گئے ہزارہا فقہی سوالات اور ان کے جوابات کا یہ بے نظیر مجموعہ جو اب تک بطون اوراق میں محبوس تھا مولانا ظفیر الدین صاحب نے ۸ جلدوں میں مرتب کیا ہے قیمت کامل سٹ -/۵۶

فتاویٰ رشیدیہ | حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی شخصیت علمی حلقہ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کو تمام علوم اسلامیہ میں منصب امامت حاصل تھا مگر خصوصی مناسبت آپ کو فقہ و حدیث میں تھی۔ زندگی کے تمام ضروری مسائل کے بارے میں آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ -/۸

فتاویٰ مولانا عبدالحی فرنگی محلی (اردو) | مولانا عبدالحی لکھنوی کا مجموعہ فتاویٰ جو فقہی اور اعتقادی مسائل کا ایک نادر ذخیرہ ہے۔ اردو فتاویٰ کے ساتھ عربی و فارسی فتاویٰ کا نہایت سہل و سلیس اردو میں ترجمہ بھی ہے۔

تینوں حصے یکجا، قیمت مکمل مجلد -/۱۶

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

سیرتِ نبوی پر منتخب کتابیں

سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندوی کی مشہور و مقبول تالیف ۔۔ یہ رسول اللہؐ کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشادات کا ذخیرہ ہے۔ سیرت کے موضوع پر ایک عظیم شاہکار ہے۔ چھ جلدوں میں مکمل قیمت مکمل غیر مجلد/۸۵

رحمۃ للعالمین از علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری یہ کتاب جامعیت و کاملیت اور تاریخیت میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ حوالہ جات مستندہ دلائل مضبوط، انداز بیان شگفتہ اور عشق نبوی میں سرشار کرنے والا ہے۔ تین ضخیم جلدوں میں مکمل، حسین و رنگین گردپوش سے مزین۔ قیمت کامل سیٹ .. ۔ -/۲۰

سیرت طیبہ از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی سیرت نبوی کے موضوع پر ایک عظیم شاہکار۔ حدیث کی مستند کتابوں کی بنیاد پر جدید انداز تعبیر کے ساتھ۔ ۴۵۰ صفحات قیمت صرف ۵/

رحمت عالم علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت کے موضوع پر یہ کتاب خاص طور سے مدارس کے طلباء کے لیے لکھی ہے۔ قیمت صرف ۲/

محسن انسانیت اس میں سیرت رسول ایک نئے اور دلآویز انداز میں بیان کی گئی ہے۔ آپ کے عہد کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ ایک مفید ترین کتاب۔ قیمت ... -/۱۰

خطبات مدراس حیات نبوی کے مختلف پہلوؤں پر علامہ سید سلیمان ندوی کے خطبات جو مرحوم کے علم و تحقیق کا نچوڑ ہیں۔ قیمت ۳/

مقالات سیرت سیرت نبوی پر آٹھ گرانقدر مقالات کا مجموعہ۔ از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ قیمت ۵/

تقریر سیرت سیرت پاک پر مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی دو معرکۃ الآرا تقریریں۔ پہلی تقریر سیرت ۱/۷۵ دوسری تقریر سیرت ۲/۷۵

نبی عربیؐ اس کتاب میں متوسط استعداد کے بچوں کیلیے سیرت نبوی کے تمام واقعات کو اختصار کیساتھ سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد .. ۱/۷۵ مجلد .. ۲/۰

ہمارے حضور سیرت نبوی کے صحیح اور مستند واقعات پر مبنی یہ کتاب خاص طور پر کمسن طالب علموں کے لیے نہایت شیریں و آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ قیمت ... ۱/۸۰

سیرت صحابہ و تابعین

حیاۃ الصحابہ حضرت جی (حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ) کی حیاۃ الصحابہؓ کا اردو ترجمہ صحابہ کرامؓ کی دعوت اسلام کے لیے محنت و جدوجہد، ان کے سرفروشانہ مجاہدات مخصوص صفات و کمالات پاکیزہ حالات، فقر و صبر، زہد و قناعت اور ایمان و یقین سے متعلق احادیث و قصص کا دلکش مجموعہ ہے۔ تین جلدوں میں مکمل قیمت مکمل سیٹ ۳۴/

سیرت خلفاء راشدین سیرت خلفاء راشدین پر مولانا عبد الشکور لکھنوی کی عظیم تصنیف ضمناً اس میں اس دور کے اہم تاریخی واقعات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ قیمت مجلد ۲/۵۰

صدیق اکبرؓ اس کتاب میں حضرت ابوبکر صدیق کے مفصل سوانح حیات اور اُن کے عہد کے تمام حالات کا محققانہ اور فاضلانہ تذکرہ ہے۔ اس کتاب نے ایک بڑے خلاء کو پر کر دیا ہے۔ از مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ قیمت -/۹

الفاروق علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے اس کتاب میں حضرت عمر فاروقؓ کے مفصل سوانح حیات عادات و خصائل علمی کمالات ان کے عہد کے تمام ملکی اور فوجی انتظامات اور اُن کے مجاہدانہ کارناموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قیمت مجلد -/۹

سیرت عائشہ از علامہ سید سلیمان ندوی۔ اس کتاب میں حضرت عائشہؓ کے واقعات زندگی اور اخلاق و عادات کی تفصیل اور اُن کے علوم و مجتہدات پر بحث کی گئی ہے۔ قیمت صرف .. -/۷

خلفاء راشدین از مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی اس کتاب میں خلفاء راشدین کے سوانح حیات اور انکے سیاسی انتظامی مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کا تفصیلی تذکرہ ہے قیمت ۱/۵۰

مہاجرین اس میں بقیہ حضرات عشرہ مبشرہ و اکابر بنی ہاشم اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے اکثر صحابہ کرام کے حالات مجاہدات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں قیمت اول ۷/، دوم ۷/

سیر انصار اس کتاب کے پہلے حصہ میں پچاس انصار کرامؓ اور دوسرے حصہ میں ۴۶ انصار کرامؓ کے سوانح حیات اور ان کے فضائل و کمالات کا تذکرہ ہے۔

قیمت اول -/۸ دوم -/۵

مفصل تفصیلات کے لیے کتب خانہ کی مکمل فہرست مفت طلب کیجئے

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

BOMBAY ANDHRA
TRANSPORT CO.

(Transport Contractor)

113, Bhandari Street *(Chakla)*

BOMBAY-3

PHONE: 4301

ماءُ ! مُصطفائی

طاقت اور خون پیدا کرنیوالا مشہور و معروف ٹانک

مقوی دل و دماغ و جگر و معدہ و باہ مغلظ منی ہاضم طعام
مقوی بصر دافع ضعف رحم و درد کمر و درد حیض و درد
بعد ولادت امراض سینہ و نمونیہ و ام الصبیان و سوکھیا
مسان۔ کمزور بوڑھوں اور بچوں کے لئے یکساں
مفید اور ہر موسم میں قابل استعمال۔

دار الشفاء مصطفائی میرٹھ (رجسٹرڈ)



Monthly **'ALFURQAN'** Lucknow.

VOL 40 NO. 1 MARCH 1972 Regd. No. L-353

پکوان کے
عمدہ تیلوں میں
آپ کی خاص پسند۔

پوسٹ مین برانڈ
صاف کیا ہوا مونگ پھلی کا تیل
۱، ۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو
عمدہ وناسپتی
۱، ۲، ۴ اور ۱۶٫۵ کیلو
تلوا، تل کا تیل
۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو
برانڈ خالص ناریل کا تیل
۲، ۴ اور ۱۶ کیلو
کوکوجل
صاف کیا ہوا ناریل کا تیل
۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو
ای سلاڈ تیل
۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو
•
احمد ملز، بمبئی ۸

الفرقان لکھنؤ

مُرتّبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

تالیف — مولانا محمد منظور نعمانی

بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آب حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے نا آشنا ہے یہاں تک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
ملت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے

(یہ کتاب)

اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔

- یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
- جس میں ۷۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
- خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
- یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔

نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۴۰۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت [illegible]

کتب خانہ الفرقان [illegible]

ZAKIR HUSAIN LIBRARY
... NAGAR
DELHI-110025

سالانہ چندہ
ہندستان اور بنگلادیش سے
۸ روپے
ضخامت ۶۰ صفحات
قیمت
فی کاپی .... ۷۵ پیسے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد (۴۰) بابت ماہ صفر المظفر ۱۳۹۲ھ مطابق اپریل سنہ ۱۹۷۲ء شمارہ (۲)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۸ اپریل تک آجانی چاہیئے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسلمانوں کے نکاح و طلاق، ازدواجی زندگی کے حقوق و فرائض، وراثت، وصیت اور وقف وغیرہ کے معاملات میں ملک کا قانون اُن کے قانونِ شریعت ہی کو اب تک واجب العمل تسلیم کرتا ہے اور اس کو قانونی زبان میں "مسلم پرسنل لا" کہا جاتا ہے۔ لیکن کچھ عرصے سے یہ مطالبہ بعض لوگ کرنے لگے ہیں کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

تبدیلی کا یہ مطالبہ اولاً دستورِ ہند کے ...... "رہنما اصولوں" کی دفعہ ۴۴ کی بنیاد پر اٹھایا گیا جس میں حکومتِ ہند کو اس بات کی کوشش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ ملک کے تمام شہریوں کے لیے شہری زندگی کے ہر دائرے کا قانون یکساں ہو۔ ظاہری طور پر اس ہدایت کے پیچھے قومی یکجہتی کا نظریہ کارفرما ہے۔ چنانچہ جب کبھی قومی یکجہتی کا سوال زوروں پر آیا یہ مسئلہ بھی ساتھ ساتھ اُٹھا۔ لیکن مسلمانوں نے ہر ایسے موقع پر صفائی اور شدت کے ساتھ یہ بات واضح کر دی کہ وہ قومی یکجہتی کے اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتے جس میں اُن کو اُن معاملات میں بھی اپنے مذہبی احکام کو خیرباد کہنا پڑے جو براہِ راست انھیں کے فعل و عمل کے دائرے میں آتے ہیں۔ یہ مقاومت سخت بھی تھی اور معقول بھی۔ اس لیے اس آواز کو دب جانے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور حکومت کو بھی مسلمانوں کی تشویش کو رفع کرنے کے لیے یہ اطمینان دلانے کی پالیسی اختیار کرنا پڑی کہ جب تک خود مسلمان ہی اپنے پرسنل لا میں کسی ترمیم کی خواہش نہیں کریں گے اس میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرا محاذ کھل گیا اور اب دفعہ ۴۴ کی دستوری ہدایت یا قومی یکجہتی کی ضرورت کی بنیاد پر مسلم پرسنل لا کی مکمل منسوخی کے بجائے اس موقف کے ساتھ کچھ لوگ سامنے

آنے لگے کہ مسلم پرسنل لا کے تحت جو شرعی قانون اس وقت نافذ ہیں اُن میں سے بعض کی بنا پر عورتوں اور بچوں کے بہت سے حقوق ضائع ہو رہے ہیں۔ اس لیے ایک ذمہ دار حکومت اور پارلیمنٹ کا فرض ہے کہ وہ ان ناانصافیوں کے سدباب کے لیے اس قانون میں مناسب ترمیم کرے۔ لیکن یہ موقف بھی جسے کچھ مسلمان نام کے لوگ اپنا کر سامنے آئے تھے، اتنا ہی قابل اعتراض تھا جتنا اس سے پہلے والا۔ کیونکہ یہاں بھی ایک فرقہ کے مذہبی قانون میں ترمیم یا جزوی تنسیخ کا حق ایک ایسی حکومت اور پارلیمنٹ کے لیے تسلیم کرایا جا رہا ہے جو ایک دوسرے فرقے کی غالب اکثریت پر مشتمل ہے، بغیر اس کے کہ اس فرقے کی یا اس کے متعلقہ طبقوں کی طرف سے ایسی کوئی درخواست کی جا رہی ہو۔ چنانچہ یہاں بھی مسلمانوں کا اُصولی اعتراض مؤثر ثابت ہوا۔ اور حکومت کو اس سلسلے میں بار بار یہ اطمینان دلانا پڑا کہ وہ بغیر متعلقہ فرقے کی خواہش کے اس قسم کی کسی کارروائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔

مسلمانوں کی مخالفت اور حکومت کے اس رویئے کے بعد مسلمان ناموں والا یہ نام نہاد "ترقی پسند اور روشن خیال" گروہ یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگ گیا ہے کہ اس کا مطالبہ مسلمان عورتوں کا مطالبہ ہے اور اس لیے حکومت کو اس کی طرف دھیان دینا چاہیئے، چنانچہ کچھ نام نہاد "مسلمان" عورتوں، کچھ دھوکہ دے کر جمع کی جاتے والی مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کے جلوس جلسے ....منظم کیے جا رہے ہیں اور اُن کی پبلسٹی نیشنل پریس کی سرگرم اعانت کے ذریعے کرائی جا رہی ہے ـــــ یہ جد و جہد اس غرض سے کی جا رہی ہے کہ حکومت کے راستے کی رکاوٹ دور ہو جو خود بھی اس راستہ پر قدم بڑھانا چاہتی ہے اور اس کی یقین دہانیوں میں اس کے اندر کا یہ پہلو صاف طور پر نظر آتا رہا ہے، دوسری طرف اس ترمیم و تبدیلی کا حامی ایک طبقہ مسلمانوں کی مخالفت کو نرم کرنے کے لیے علمی انداز پر سرگرم ہوا ہے۔ اور یہ دو طرح کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ کچھ لوگ مسئلے پر تاریخی گفتگو کے ذریعے مسلمانوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا کی حیثیت کا مذہبی تصور ناواقفی اور بے خبری کی بات ہے۔ ورنہ حقیقت میں یہ مجموعہ قانون ہر زمانے کے خاص تصورات اور سماجی تقاضوں کے تحت علماء و فقہاء کی آزادانہ رایوں کے تحت ادلتا بدلتا اس شکل تک پہونچا ہے۔ اور ان تبدیلیوں میں کبھی کبھی غیروں کے ہاتھ بھی شریک ہوئے ہیں۔ دوسرے کچھ لوگ قرآن و سنت اور اسلامی اصولوں ہی کا یہ تقاضہ بتانے میں لگے ہیں کہ مسلمان اپنے اس پرسنل لا میں ترمیم پر راضی ہوں جو اس وقت

ہندوستان میں رائج ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس یکطرفہ جد وجہد کا اثر مسلمانوں پر بالخصوص اُن کی نئی نسل پر پڑ رہا ہے۔ شکوک وشبہات بلکہ ان مطالبات سے ہم آہنگی کے جراثیم نے اپنا حلقہ وسیع کر لیا ہے۔ ایسے نوجوان اس نے میں نے ملانے کے لیے نکل آئے ہیں جن کے گھرانوں کو دیکھتے ہوئے ہی نہیں خود ... اُن کی ذات کو دیکھتے ہوئے بھی اُن کی یہ روش ایک بڑی تشویش دل و دماغ پر مسلط کرتی ہے۔ مسلم پرسنل لا نام کے مجوزہ قوانین ہی کے خلاف نہیں اسلام کے عائلی تصورات کے بھی خلاف پروپیگنڈے کی جو شاطرانہ دھول اڑائی جا رہی ہے اور اپنے بنیادی موقف کی معقولیت کے لیے جو مغالطہ آمیز اور طنز آلود منطق کام میں لائی جا رہی ہے اُس کے بھرپور اثر کی مثالیں ان نوجوانوں میں سامنے آنے لگی ہیں۔ انتہائی بے باکی کے ساتھ وہ انہی لوگوں کی زبان میں بول رہے ہیں جو اس وقت مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور انہی کی منطق کو لے کر بحث ومباحثے کے میدان میں اُتر رہے ہیں۔ ایک اخبار میں شائع ہونے والے مراسلے کے چند ٹکڑے آپ بھی پڑھیے جس کے لکھنے والے سے ہم ذاتی طور پر واقف ہیں، لکھتے ہیں:۔

۱۔ "طلاق کے معاملہ میں مرد کو حقوق ملے ہوئے ہیں اور عورت بے بس۔ کیا کوئی حکومت اگر اس پر قدغن کرتی ہے تو وہ مداخلت فی الدین کر رہی ہے؟"

۲۔ "مختصر تنخواہ پانے والے کلرک صاحب اگر شادی کا نمکن کوٹا پورا کر لیتے ہیں تو بیویوں کے ساتھ فاقے میں تو مساوات برت سکتے ہیں مگر اور کسی طرح کا انصاف نہیں، ....

...... پھر اگر کوئی گورنمنٹ اس پر پکڑ دھکڑ کر رہی ہے تو کیا زیادتی کر رہی ہے؟"

۳۔ "مسلمانوں کے فوجداری قوانین کے نفاذ کرانے پر زور کیوں نہیں۔ مولانا لوگ کیوں نہیں کہتے کہ مسلمان چور کا ہاتھ کاٹا جائے یا اس سے بڑے قصوروار کو سنگسار کیا جائے۔ خالی انہی قوانین پر زور کیوں ہے کہ طلاق دینے کی آسانی رہے۔ چار شادی کی اجازت رہے۔"

پروپیگنڈے کی شدت اور مغالطوں کی کثرت معاشرے کو ایسا گمراہ کن رُخ دینے میں کامیاب ہو گئی ہے کہ جن لوگوں کے متعلق یہ خیال کرنا آسان نہیں تھا کہ وہ اپنے دین میں کسی بیرونی مداخلت کو

گوارہ کریں گے وہ مداخلت کے حامی بن کر سامنے آرہے ہیں' وہ اپنے علماء ہی کو نہیں دین تک کو طنز و تعریض کا نشانہ بنا رہے ہیں' وہ اس کے نکاح و طلاق کے مسائل کو اپنے زمانے کے لیے نامناسب قرار دیتے ہوئے ہر اس طاقت کے لیے احسان مندی ظاہر کرنے کو تیار ہیں جو اس کی "اصلاح" کا بیڑا اٹھائے۔ وہ یہ مان بیٹھے ہیں کہ علماء اور دوسرے راسخ العقیدہ مسلمان جو اس "تحریک اصلاح" کی مخالفت کر رہے ہیں' اس کی بنیاد یہ ہے کہ انھیں عورتوں کے حقوق کی کوئی پرواہ نہیں اور اسکے برعکس چار شادیوں کی اجازت بلا کسی قید و بند کے برقرار رہنے سے بڑی دلچسپی ہے۔ حالانکہ کوئی ذمہ دار عالم اور کوئی سمجھدار مومن یہ کہنے والا نہیں ملے گا کہ طلاق کی اجازت کا اگر غلط استعمال ہو رہا ہے تو اس کے انسداد کی تدبیر نہ کی جائے۔ بیویوں کے جو حقوق اللہ اور اللہ کے رسول نے قائم فرمائے ہیں' اُن کے تحفظ کی فکر نہ کی جائے اور دین کی اجازتوں سے فائدہ اٹھانے والوں کو ان اجازتوں کی ذمہ داریوں کے معاملے میں بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے۔ علماء اور دوسرے راسخ العقیدہ اور معاملہ فہم مسلمانوں کو جو اس وقت کی "تحریک اصلاح" سے اختلاف ہے یا وہ جو اس کی ہمنوائی نہیں کر سکتے اُس کی بنیاد بالکل دوسری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس تحریک کے سربراہ اور سرگرم کارکن یا تو دین و شریعت کے کھلے دشمن ہیں، یا کم از کم اس نظریے کے لوگ ہیں کہ نکاح و طلاق اور وراثت و وصیت کو دین و مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلا عنصر اگر عورتوں اور بچوں کی خیر خواہی کے دعوے میں مخلص بھی ہو تب بھی اس کا مقصد صرف اس خیر خواہی تک محدود نہیں' بلکہ مسلمانوں کو اُن کے دین اور اُن کی شریعت سے برگشتہ و بیزار کرنا بھی اس کا برابر کا مقصد ہے۔ اور یہ مقصد اُس کے طریق کار اور طرز گفتار میں پہلے مقصد سے کہیں زیادہ نمایاں ہے۔ کیا کوئی مسلمان اپنے آپ کو صدق دل سے مسلمان کہتے ہوئے ایسے لوگوں سے مزاحمت کے بجائے ان کی ہمنوائی پر تیار ہو سکتا ہے؟

دوسرا عنصر اگرچہ اس قبیل سے نہیں لیکن اس کے غلط ہونے میں کیا شبہ ہے؟ قرآن و حدیث پر ایمان تو الگ بات ہے صرف اس سے واقف ہی ہونے کے بعد اس بات کی گنجائش نہیں کہ آدمی ان معاملات زندگی کو اسلام کے دینی اور تشریعی دائرے سے باہر قرار دے سکے۔ قرآن و حدیث کے اندر ان معاملات میں صاف صاف ہدایتیں اور بہت سے قطعی اور ابدی قسم کے احکام ہیں اور مسلمانوں سے بربنائے اسلام و ایمان ہی ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے ۔ ۔ بہ حال اس عنصر سے

بہرحال جس کا مطلب یہی ہے کہ کم از کم قرآن و حدیث کے ایک حصے کی نفی یا اس کی بجا آوری سے انکار کیا جائے۔ پہلا عنصر تو کہہ ہی گیا، دوسرے عنصر کے نزدیک بھی یہ بات بہت معقول ہوسکتی ہے کہ اگر مسلمانوں کا رائج پرسنل لا عورتوں کے حقوق کی حفاظت میں کسی پہلو سے ناکام ہو رہا ہے تو حکومت یا پارلیمنٹ کچھ نئی قانون سازی کرکے اس کا نقص دور کر دے۔ لیکن جو لوگ ان معاملات کو اسلام کے تشریعی دائرے کے معاملات مانتے ہیں وہ کیونکر اس کی تائید کر سکتے ہیں؟ کسی معاملے کو اسلام کے تشریعی دائرے میں داخل ماننے کا مطلب بدیہی طور پر یہ ہے کہ اس معاملے میں قانون سازی شرعی دلائل سے ہوگی۔ لیکن ایک غیر مسلم یا سیکولر حکومت کی بطور خود قانون سازی میں اس شرط کے تصور کی کیا گنجائش؟ علاوہ ازیں جب یہ معلوم ہے کہ حکومت کا اس معاملے میں بجائے خود ایک مطمح نظر ہے، یعنی مختلف فرقوں کے جدا جدا شخصی اور عائلی قوانین کو ختم کرکے سب کو ایک سول کوڈ کے ماتحت کر دینا جس کی ہدایت اسے دستور میں دی گئی ہے، تو علاوہ شرعی مسئلے کے یہ تو ہماری ملی مصلحت کا بھی کھلا ہوا تقاضہ ہے کہ حکومت کو ان معاملے میں دخیل ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ اس صورت میں حکومت کے لیے اس سے بڑھیا بات کیا ہو سکتی ہے کہ ہم خود ہی اسے اپنے پرسنل لا میں ترمیم کی دعوت دے دیں اور اس کے "نقائص" دور کرنے کو اس کا حق تسلیم کر لیں۔ اس کے بعد کچھ زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ نام کو اگرچہ مسلم پرسنل لا کا جداگانہ عنوان باقی رہے مگر عملاً ایک سول کوڈ ہی کی صورت پیدا ہو جائے۔ اور پھر یہ بیکار نام بھی کب تک اور کیوں باقی رہے گا؟ اور رہ کر بھی کیا کرے گا؟

مسلمانان ہند کی مخصوص ملی شخصیت اور انفرادیت جس قسم کے کھلے ہوئے خطروں اور حملوں کے نرغے میں گھری ہوئی ہے، جیسے جیسے منظم ہے اور ہر سطح کے منصوبہ بند طریقے اس کے تشخصات کو فنا کر دینے اور اول سے آخر تک اکثریت کا ہم رنگ ضمیمہ بنا دینے کے لیے استعمال ہو رہے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے بھی پرسنل لا جیسے معاملے میں حکومت سے کرم فرمائی کی درخواست یا اس کے کسی ایسے اقدام پر ممنونیت کا اظہار صرف وہی "مسلمان" کر سکتے ہیں جو خود ہی مسلمانوں کی ممتاز ملی شخصیت اور تہذیبی انفرادیت کو ایک فضول چیز سمجھتے اور جلد سے جلد مسلمانوں کا اس سے پیچھا چھوٹ جانا پسند پسند کرتے ہوں۔ زیر بحث "تحریک اصلاحات" کے جن دو عناصر کی نشاندہی اوپر کی گئی ہے ان میں سے پہلے کا نقطۂ نظر تو علی الاعلان یہی ہے اور دوسرے کو بھی کم از کم کوئی خاص دلچسپی

مسلمانوں کی ملی انفرادیت اور ان کے جداگانہ رنگ کی بقا سے ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے ان لوگوں کے لیے تو بالکل ٹھیک ہے کہ حکومت سے اس معاملے میں [illegible] کی درخواست کریں اور مسلمانوں کو بھی اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں، مگر جن کا نقطۂ نظر اپنی ملی انفرادیت کے بارے میں یہ نہیں ہے وہ یہ موقف کیسے اختیار کرسکتے ہیں۔

الغرض اس وقت کا اختلافی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلم پرسنل لا کے رائج الوقت ضابطوں میں کسی نظرثانی کی ضرورت ہے یا نہیں، بلکہ اختلاف اس مسئلے پر ہے کہ اس نظرثانی ـــ اور بضرورت ہو تو ترمیم ـــ کا کام کون انجام دے؟ اور کس اصول کے ماتحت یہ کام ہو؟ ـــ لیکن جیسا کہ مذکورہ بالا مراسلے سے اندازہ ہوتا ہے، یہ حقیقت کچھ نظروں سے اوجھل ہو رہی ہے اور یہ سمجھا جا رہا ہے کہ علماء بدلے ہوئے حالات اور مختلف معاشروں کے طبعی اختلافات اور ان کے واقعی غور طلب تقاضوں کا بھی کوئی نوٹس لینے کو تیار نہیں، بلکہ قدیم فقہ میں جو کچھ اور جس حد تک قانون سازی کی گئی ہے اسے ان حالات میں بھی کہ مطلوبہ عدل و انصاف اور توازنِ حیات برقرار رکھنے میں یہ ناکافی ہو رہی ہو، بلا کسی ترمیم و اضافے کے جوں کا توں برقرار رکھنے پر مصر ہیں۔

اس صورت حال پر نظر کرتے ہوئے یہ بات بڑی ہی اطمینان آفریں ہے کہ ہندوستان میں علم دین کے سب سے بڑے مرکز ـــ دارالعلوم دیوبند ـــ کے سربراہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے ملت کے علماء اور راسخ العقیدہ اربابِ فکر و دانش کا ایک نمائندہ اور ہمہ گیر اجتماع کرنے کی طرف قدم اٹھایا اور اس مقصد کے پہلے قدم کے طور پر جو ایک محدود اور مختصر سا اجتماع ۱۴، ۱۵ مارچ کو دارالعلوم دیوبند میں ہوا اس نے مسئلہ پر اپنا ایک تمہیدی بیان جاری کر کے کم از کم اس طرح کی غلط فہمیوں کے ازالہ کا مکمل سامان اس پہلے ہی قدم پر کر دیا۔ ضرورت ہے کہ اس بیان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے اور جو لوگ مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ علماء کے موقف کو سمجھنے میں اس بیان سے مدد لیں ـــ بیان کا پورا متن حسب ذیل ہے:۔

”مسلم پرسنل لا“ کا مسئلہ کچھ عرصہ سے ملک میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ اس بارے میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر اور موصوف ہی کی

صدارت میں دار العلوم دیوبند کے لائبریری ہال میں مورخہ ۱۴، ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء کو ہندوستان کے معزز علماء، ماہرین قانون، اور فضلاء کا اجتماع منعقد ہوا جس نے دو دنوں تک مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اور زیر بحث مسئلہ کا پوری فکری سنجیدگی کے ساتھ آئینی، سیاسی اور فقہی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا۔

پوری بحث و گفتگو کے بعد یہ اجتماع اپنے مندرجۂ ذیل یقین و احساسات کا اظہار کرتا ہے:-

(۱)

اسلام ایک کامل و مکمل دین ہے جس کا نظام انسانی زندگی کے تمام ہی شعبوں پر حاوی نیز ہر دور اور ہر ملک کے لیے یکساں طور پر فلاح کا ضامن ہے ـــــ اسلام کی بنیادی کتاب قرآن کریم ہے اور نظام اسلامی کی واضح اور کامل تعبیر و تشریح سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ـــــ جن جزئی مسائل و حوادث کا ذکر قرآن و سنت میں نہیں ائمہ مجتہدین اور صاحب بصیرت فقہائے اسلام نے قرآن و سنت کے دیے ہوئے اصول و قواعد کلیہ کی روشنی میں ان کا حل تجویز کیا جس نے "اجماع" اور "قیاس" کی بنیادیں فراہم کیں ـــــ اس طرح فقہ اسلامی مرتب ہوئی جس کے مصادر "کتاب و سنت" اور کتاب و سنت کی ہی روشنی میں تبعاً اصولاً "اجماع" اور "قیاس" قرار پائے۔

(۲)

یہ اجتماع یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ فقہ اسلامی ایک زندہ قانون ہے جس میں حالات زمانہ کی رعایت، عرف و عادت کا اعتبار، ضرر و حرج کا دفعیہ اور شرعی نقطۂ نظر سے قابل اعتبار مصالح کے لحاظ سے فقہی اصول موجود ہیں جن کی وجہ سے فقہ اسلامی کسی زمانہ میں بھی جمود کا شکار نہیں ہو سکتی۔

(۳)

اس اجتماع کے نزدیک یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں مغل حکومت کے زوال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی عہد اقتدار میں ملک کی بسنے والی مذہبی اکائیوں کو کچھ محدود معاملات میں اپنے مذہبی قوانین پر عمل پیرا رہنے کی آزادی حسب سابق حاصل رہی اور یہ بات بطور اصول تسلیم کر لی گئی کہ ان مخصوص معاملات میں مسلمانوں پر شرع اسلامی کے قوانین جاری رہیں گے۔ اور ہندوؤں پر دھرم شاستر۔ اور یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ شرع اسلامی کے خلاف علاقائی یا قبائلی رسوم باطل تصور کیے جائیں گے ـــ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ دستور ہند نے مذہبی آزادی کو شہریوں کا بنیادی حق تسلیم

کیا اور مسلمانوں پر مسلم پرسنل لا نافذ تسلیم کیا گیا۔

(۴)

مسلم پرسنل لا کے تحت جو معاملات آتے ہیں اور جن کے بارے میں اصولی طور پر قانون شریعت نافذ ہے، اس اجتماع کے خیال میں یہ وہ خالصۃً مذہبی معاملات ہیں، جن پر امت کی امتیازی حیثیت اور ملی و تہذیبی انفرادیت کی بقا موقوف ہے ـــ لہذا قانون شریعت (مسلم پرسنل لا) کے بجائے مشترک سول کوڈ کے نفاذ کی کوشش یا بالواسطہ قانون سازی کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کی کوشش نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو ختم کرنا ہوگا بلکہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت ہوگی اور آئین ہند میں دی ہوئی مذہب و تہذیب کی آزادی پر حملہ ہوگا۔ یہ اجتماع اس روش کی مذمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور کسی قیمت پر اسے گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

(۵)

بدقسمتی سے ملک میں ایک خاص طبقہ العیاذ باللہ شرع اسلامی کو ہی ناکارہ اور ظالمانہ قرار دینے کی کوشش کر رہا ہے اور اس طرح مسلم پرسنل لا اور قانون شریعت کے خلاف آواز اٹھا کر مشترک سول کوڈ کی صورت میں غیر اسلامی عائلی قوانین کے نفاذ کے لیے میدان ہموار کر رہا ہے یا پھر مبہم اصطلاحات کا سہارا لے کر منصوص احکام شرعیہ ہی کو بدل دینا چاہتا ہے۔ اس اجتماع کے خیال میں یہ روش نہ صرف علماء اور امت اسلامیہ بلکہ ہر انصاف پسند شہری کی طرف سے قابل مذمت ہے۔

(۶)

اس اجتماع کو اس امر پر یقین ہے کہ فقہ اسلامی ایک زندہ قانون ہے، اور علمائے اسلام کے ہاتھوں میں قرآن و سنت سے مستنبط اصول و کلیات اور مسائل مستنبطہ کی نظائر موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ شرع اسلامی میں مصالح معتبرہ کا معیار کیا ہے؟ کس درجہ کی ضرر و حرج کا دور کرنا شرعاً مطلوب ہے؟ عرف و عادت کی قوانین میں کیا اہمیت ہے؟ اور تغیر احوال کا کیا اثر احکام پر پڑتا ہے؟

انھیں اصولوں پر علماء و فقہاء اسلام نے ہر دور میں مسائل کا حل کیا ہے اور آج بھی

انھیں اصولوں کے پیش نظر ہر نئے مسئلہ کا حل اور معاشرہ میں پیدا ہونے والی واقعی مشکلات دور کی جا سکتی ہیں۔

(۷)

پس موجودہ حالات میں جبکہ شرع اسلام کو ہی مجروح کرنے کی مذموم کوششیں کی جا رہی ہیں اس اجتماع کے نزدیک علماء و فقہاء اسلام کا یہ فریضہ ہے کہ وہ مجتمع ہو کر جملہ احکام و مسائل پر غور فرمائیں اور بدلی ہوئی معاشرت کا جائزہ لیں اور جہاں واقعۃً ایسی دشواریاں معاشرہ میں پیدا ہو گئی ہیں جنکو دور کرنا شرعاً ضروری ہو تو انھیں قواعد و کلیات شرع کی روشنی میں دور کرنے کی صورت تجویز کریں اور جو سوالات محض غیر اسلامی تصورات کے نتیجہ میں سامنے آرہے ہوں انھیں وضاحت کے ساتھ رد فرما دیں۔ اس طرح اس فتنہ کا سدباب فرما دیں جو ان کی خصوصی ذمہ داری ہے۔

یہ اجتماع اس سلسلہ میں ایک بڑے اجتماع کے انعقاد کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے جو بلا لحاظ اختلافِ مسلک تمام ہی مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہو۔ اور صدر اجتماع سے درخواست کرتا ہو کہ وہ اس اجتماع کے انعقاد کے لیے تیاری کمیٹی کی تشکیل فرما دیں"

ان صفحات میں کبھی دفعہ ۱۵۳ الف کے اُن مقدمات کا ذکر آچکا ہو جو راقم سطور پر ندائے ملت کی ادارت کے زمانے میں حکومت یو، پی کی جانب سے چلنا شروع ہوئے تھے۔ اور جن کا سلسلہ اس ادارت ہی سے نہیں ندائے ملت سے کلی بے تعلقی کے بعد بھی قائم رہتے ہوئے رفتہ رفتہ چھ کے عدد تک پہونچ گیا۔ خدا کا شکر ہو کہ تین سوا تین سال کے بعد ان میں سے ایک مقدمہ کا فیصلہ ۱۰ر فروری ۷۲ء کو ہوا اور یہ بریت کا فیصلہ تھا۔ باقی اکثر مقدمات بھی اب فیصلہ کی منزل کے قریب ہیں۔ اپنے ہمدرد و مخلص ناظرین سے دعا کی درخواست ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مدد فرمائے۔

اسی سلسلے کے دو مقدمات میرے چھوٹے بھائی میاں حفیظ نعمانی پر بھی ہیں، ناشکری ہوگی اگر میں اسی طرح اُن کے لیے بھی ناظرین سے دعا نہ چاہوں اسلئے کہ اس ابتلاء کا بوجھ اٹھانے میں انھوں نے جس طرح میرا ساتھ دیا ہو، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں مجھے جس طرح حتی الامکان بے فکر رکھنے کی کوشش کی ہو اُس کے اظہار و اعتراف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنے بہترین افضال سے نوازے اس زندگی کے آخری سانس تک بھی، اور اس کے بعد کی ابدی حیات میں بھی!۔

کتابُ المعَاشرۃ والمعَاملات

معارف الحدیث

(مُسلسَل)

نکاح وازدواج اور اس کے متعلقات

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ انسانوں کے پیدا کرنے والے حکیم وخبیر نے ان کی دونوں جنسوں مرد اور عورتوں میں شہوت اور جنسی عمل کی خواہش بھرپور رکھی ہے اس کا ایک مقصد تو نسل انسانی کی بقاء و ترقی ہے اور دوسری مصلحت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے مرد و عورت ایک دوسرے سے ایسے متعلق اور وابستہ ہوجاتے ہیں کہ اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق ایک دوسرے کی ذمہ داری اُٹھانے اور اس کے کام آنے پر آمادہ ہوجاتا ہے، بلکہ وہ اس کی طبیعت کا تقاضا بن جاتا ہے ـــــ عقد نکاح اور ازدواجی رشتہ اس کا مقررہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ اس کے ذریعہ مرد وعورت باہم زندگی کے شریک و رفیق ہوجاتے ہیں اور شہوت کے فطری تقاضے کے پورا ہونے کا ایک مستقل ہموار، پرسکون اور پاکیزہ بندوبست ہوجاتا ہے جو اشرف المخلوقات انسان کے فطری شرف کے بالکل مطابق ہے، اور اس بنا پر وہ انسان کی بنیادی معاشرتی ضرورت ہے ـــــ اسی لیے یہ نکاح وازدواج اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے قریب قریب سارے نبیوں اور انسانیت کے مسلّم رہنماؤں کا معمول اور طریقہ رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی ضرورت تمام اقوام وملل کے مسلمات میں سے ہے اور اسلام نے اس نکاح وازدواج کو ایک مقدس معاہدہ قرار دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربوں میں مبعوث ہوئے، وہی آپ کے اول مخاطب تھے، انہی کو

آپ کی دعوت قبول کر کے اس کا حامل و امین، دُنیا بھر میں اس کا مبلغ اور آپ کی شریعت کا مروّج بنا تھا۔ اس لیے حکمت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ نکاح و شادی (اور اسی طرح دوسرے معاملات میں بھی) جو طور طریقے عربوں میں رائج تھے اُن کی خرابیوں کی اصلاح کر کے اور اُن کے غلط اور مضر عناصر کو کاٹ چھانٹ کے انہی کو شریعت بنا دیا جائے۔

آگے نکاح، مہر، طلاق اور عدت وغیرہ کے بارے میں جو احادیث درج ہوں گی اُن کو اسی روشنی میں سمجھنا چاہیئے۔

نکاح و شادی کی ضرورت و اہمیت :۔

اکثر دوسری جاندار مخلوقات کی طرح انسان کی تخلیق بھی اس طرح ہوئی ہے کہ غذا سے جس طرح رگوں میں دوڑنے والا خون بنتا ہے اسی طرح ایک تناسب سے مادّہ منویہ بھی پیدا ہوتا ہے پھر اس کی پیدائش کے مطابق شہوت اور جنسی عمل کی خواہش اُبھرتی ہے جس کی تسکین کا اگر انتظام نہ ہو تو وہ اندرونی ہیجان، بے چینی اور گندے وساوس و خیالات پیدا کرتی ہے۔ اس حالت میں بندہ یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ کے لائق نہیں رہتا جو اس دُنیا میں انسان کی معراج ہے۔ اور اگر اپنے نفس پر قابو نہ پا سکے (جیسا کہ اکثر لوگوں کا حال ہوتا ہے) تو یہ شہوت اور جنسی خواہش اس کو ایسے فواحش و معصیات میں مبتلا کر دیتی ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات کی سطح سے گرا دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات ان کی وجہ سے بڑے تباہ کن فتنے برپا ہو جاتے ہیں ـــــ نکاح اور شادی ان سب برائیوں سے حفاظت کا واحد ذریعہ ہے۔ اسی لیے تمام ادیان و مذاہب میں اس کو ایک دینی و مذہبی عمل قرار دیا گیا ہو۔ ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں نکاح و ازدواج کی جو تاکید فرمائی ہو اور اپنے عمل سے اس کی جو ترغیب دی ہے اُس کی بنیاد بھی یہی ہے۔

اس تمہید کے بعد اس سلسلہ کی مندرجہ ذیل احادیث پڑھیئے :۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَّمْ

يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ ـــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اے جوانو! تم میں سے جو کوئی شادی کر سکتا ہو تو اُسے چاہیے کہ وہ شادی ضرور کرلے، کیونکہ شادی کرنا نگاہ اور شرمگاہ کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اور جو شادی نہ کر سکتا ہو اس کو روزے رکھنے چاہئیں، یہ اُس کے لیے شہوت کے ہیجان کو توڑنے اور ٹھنڈا کرنے کی تدبیر ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) ظاہر ہے کہ جوانوں میں مادۂ منویہ زیادہ مقدار میں پیدا ہوتا ہے، اس وجہ سے جنسی عمل کی خواہش اور شہوت بھی ان میں زیادہ ہوتی ہے، جس کی تسکین کا اگر جائز انتظام اور بندوبست نہ کیا جائے تو حرام میں مبتلا ہونے کا سخت خطرہ ہوتا ہے، اس لیے اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت سے جوانوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ اگر وہ نکاح اور شادی کر سکتے ہوں (مثلاً اُن کے پاس بیوی کو رکھنے کے لیے مکان ہو اور کھانے کپڑے وغیرہ کا ضروری خرچ اٹھا سکتے ہوں) تو ان کو چاہیے کہ اپنی اُس فطری ضرورت اور تقاضے کو حلال اور جائز طریقہ سے پورا کرنے کے لیے نکاح ضرور کرلیں۔ اس سے وہ حرام سے محفوظ ہو جائیں گے اور نگاہ کی آوارگی سے بھی حفاظت ہو جائے گی ـــ اور جن کے حالات ایسے نہ ہوں کہ وہ نکاح اور شادی کر سکیں تو اس حدیث میں ایسے جوانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مسلسل روزے رکھا کریں اس سے شہوت کے ہیجان کا علاج ہو جائے گا ـــ لیکن یہ صرف مجبوری کا علاج ہے، صحیح اور فطری طریقہ یہی ہے کہ نکاح اور شادی کر کے اس ضرورت کو پورا کیا جائے۔

بعض افراد اور فرقے روحانی ترقی اور قربِ خداوندی کے نقطۂ نظر سے تجرد کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں، یہ حقیقت ناشناسی ہے، انسان جب تک انسان ہے اور اس کی خلقت میں کوئی نقص نہیں ہے وہ جس طرح کھانے پینے اور سانس لینے سے فرشتوں کی طرح بے نیاز نہیں ہو سکتا، اسی طرح وہ شہوت کے فطری تقاضے کو جائز طریقہ پر پورا کرنے کے لیے نکاح و شادی سے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا ـــ (فِطْرَةَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللهِ) اسی لیے اللہ کے پیغمبر نے تقرب الی اللہ کے لیے تجرد کی زندگی اختیار کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی، بلکہ سب نے خود بھی نکاح

کیے اور بیوی بچوں والی زندگی گزاری، اور اسی کو نفس و روح کی پاکیزگی کے لیے مفید و معاون قرار دیا ——

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں آپ کے بعض صحابہ میں کثرتِ عبادت کے شوق میں اس طرح کا رجحان پیدا ہوا اور اُن میں سے ایک صاحب نے اپنے لیے طے کرلیا کہ وہ تجرد ہی کی زندگی گزاریں گے اور نکاح و شادی نہیں کریں گے —— جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اُن کو بلا کر تنبیہ فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ مجھے خدا کا خوف اور اس کے عذاب و ناراضی سے بچنے کی فکر تم سب سے زیادہ ہے (اَمَا وَاللهِ اِنِّي لَاَخْشَاكُمْ وَاَتْقَاكُمْ لله) اس کے باوجود میں نے نکاح کیے ہیں اور میری بیویاں ہیں —— یعنی یہ چیز کمال تقویٰ اور روحانی ترقی کے بالکل منافی نہیں ہے بلکہ اس میں مددگار ہے، اور اسی لیے میں نے ازدواجی زندگی کے اس طریقہ کو اپنایا ہے اور یہی میری سُنّت ہے اور جو کوئی میرے طریقے اور میری سنت سے انحراف کرے وہ مجھ سے الگ ہے (فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي) آگے درج ہونے والی حدیثوں میں یہی بات اور زیادہ صراحت اور وضاحت سے فرمائی گئی ہے۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ فِطْرَتِي فَلْيَسْتَنَّ بِسُنَّتِي وَاِنَّ مِنْ سُنَّتِي النِّكَاحَ۔

—— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کو میری فطرت اور میرا طریقہ پسند ہو اس کو چاہیے کہ میرے طریقہ کی پیروی کرے اور میرے طریقہ میں نکاح بھی ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا صَرُوْرَةَ فِي الْاِسْلَامِ —— رواہ احمد

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ترکِ نکاح اسلام میں نہیں ہے۔ (مسند احمد)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا

تَزَوَّجَ الْعَبْدُ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الدِّيْنِ فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ فِى النِّصْفِ الْبَاقِي — رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ نے جب نکاح کرلیا تو اپنا آدھا دین کامل کرلیا اب اس کو چاہیے کہ باقی آدھے میں خدا سے ڈرتا رہے اور اس کی نافرمانی سے بچتا رہے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) بعض شارحین نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ آدمی کے دین اور اخلاق کو تباہ کرنے والی چیزیں بنیادی طور پر دو ہی ہیں، ایک شہوت نفس، اور دوسرے دولت کی طمع اور ہوس۔ جب کسی نے نکاح کرلیا تو شہوت کے راستے سے آنے والے فساد سے حفاظت کا بندوبست ہوگیا اور اس طرح اس کا آدھا دین محکم اور محفوظ ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرے رستے سے (یعنی دولت کی طمع اور ہوس کے راستے سے) آنے والے شر و فساد کا جو خطرہ باقی رہا اس سے بچاؤ کے لیے آدمی بس خدا سے اور اس کی پکڑ سے ڈرتا رہے، یہ تقویٰ ہی اس کے دین کی پاسبانی کرے گا۔

عَنْ اَبِى هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا خَطَبَ اِلَيْكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِيْنَهُ وَخُلُقَهُ فَزَوِّجُوْهُ اِنْ لَا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِيْضٌ۔

— رواہ الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جب کوئی ایسا آدمی تمہارے ہاں نکاح کا پیغام بھیجے جس کی دینی حالت اور سیرت تمہارے نزدیک پسندیدہ ہو تو (پیغام منظور کرکے) اس سے شادی کردو، اگر تم یہ نہ کروگے تو دنیا میں اس سے بڑے فتنے پیدا ہوں گے اور بڑا فساد پھیلے گا۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) حدیث کا مقصد یہ ہے کہ جب تمہاری بیٹیوں کے لیے یا تمہارے گھرانے اور خاندان کی ان لڑکیوں کے لیے جن کے بارے میں تمہیں کچھ اختیار حاصل ہو، کسی ایسے بھلے آدمی کی طرف سے نکاح کا پیغام آئے جس کی دینی حالت اچھی اور جس کے اخلاق پسندیدہ ہوں،

تو اُس پیغام کو دوسری نا قابلِ لحاظ چیزوں کی وجہ سے) رد نہ کرو بلکہ قبول کرکے شادی کردو۔

اگر شادی کی عمر کو پہونچ جانے کے باوجود لڑکیوں کی شادی نہ کی جائے گی اور اُن کو گھروں ہی میں بٹھلائے رکھا جائے گا، اور اس طرح جوان لڑکے بے شادی کے رہیں گے تو اس سے معاشرہ میں بڑے فتنے پیدا ہوں گے اور شیطان کو لڑکوں اور لڑکیوں کا دین برباد کرنے اور بداخلاقیوں اور فواحش میں مبتلا کرنے کا وسیع میدان مل جائے گا۔

افسوس ہے کہ اُمت کے بہت سے طبقوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اہم ہدایت اور وصیت کو بالکل نظر انداز کر رکھا ہے اور وہ خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں جن کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہی دی تھی۔

اچھی بیوی کی صفات:۔

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ يَقُوْلُ مَا اسْتَفَادَ الْمُؤْمِنُ بَعْدَ تَقْوَى اللّٰهِ خَيْرًا لَهُ مِنْ زَوْجَةٍ صَالِحَةٍ إِنْ أَمَرَهَا أَطَاعَتْهُ وَإِنْ نَظَرَ إِلَيْهَا سَرَّتْهُ وَإِنْ أَقْسَمَ عَلَيْهَا أَبَرَّتْهُ وَإِنْ غَابَ عَنْهَا نَصَحَتْهُ فِي نَفْسِهَا وَمَالِهِ۔

———— رواہ ابن ماجۃ

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ کسی بندۂ مومن نے تقویٰ اللہ کے بعد (اس دنیا میں) کسی ایسی نعمت سے استفادہ نہیں کیا جو اُس نیک بیوی سے بہتر ہو جس میں یہ صفات ہوں کہ جب شوہر اس سے کسی کام کے لیے کہے تو وہ اُس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اور جب اس کی طرف نگاہ کرے تو (حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت کی وجہ سے) وہ اس کے لیے باعثِ مسرت ہو۔ اور اگر شوہر کسی بات یا کسی کام کے لیے اُس کو قسم دے (کہ میں تمھیں قسم دیتا ہوں کہ تم ایسا ضرور کرو) تو وہ اس کی قسم کو پورا کرے (یعنی اس کی مرضی کے مطابق کرے) اور اگر شوہر اس کو چھوڑ کے کہیں (سفر وغیرہ میں) جائے تو یہ نیک بیوی اپنی ذات اور شوہر کے مال کے بارے میں اس کی خیر خواہ اور وفادار رہے (کسی قسم کی

خیانت اور بدکرداری میں مبتلا نہ ہو۔) (سنن ابن ماجہ)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ ایک بندہ کے لیے اس دنیا میں سب سے بڑی نعمت تو تقوے والی زندگی ہے جس کے نتیجہ میں اللہ کی رضا اور جنت ملنے والی ہے، اس کے بعد اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ایسی نیک صالح بیوی ہے جس میں یہ صفات ہوں۔ شوہر کی فرمانبردار اور اطاعت شعار ہو، حسن صورت اور حسن سیرت کی وجہ سے دیدہ و دل کے لیے سامان مسرت ہو، شوہر کی رضاجوئی اس کی خصلت اور عادت ہو، شوہر کی عدم موجودگی میں بھی اس کی ہر امانت کی حفاظت کرے اور کسی قسم کی خیانت کی مرتکب نہ ہو ــــ کسی کو ایسی بیوی نصیب ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت سمجھتے ہوئے اس کی قدر اور اللہ تعالیٰ کا شکر کرے۔

بیوی میں کیا باتیں دیکھی جائیں:-

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ ـــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت سے نکاح چار چیزوں کی وجہ سے کیا جاتا ہے (یعنی لوگوں کی عام عادت یہ ہے کہ نکاح کے لیے کسی عورت کا انتخاب چار چیزوں کی وجہ سے کرتے ہیں) اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب یعنی ذاتی خوبی اور خاندانی شرف و وجاہت کی وجہ سے، اس کے حسن و جمال کی وجہ سے، اس کی دینداری کی وجہ سے۔ پس تجھے چاہیے کہ دیندار بیوی کا انتخاب کرکے کامیابی حاصل کرے، خاک آلود ہوں تیرے ہاتھ۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ نکاح کے لیے کسی عورت کے انتخاب میں لوگ اپنے اپنے طبعی رجحان کے مطابق یا مال کو دیکھتے ہیں یا اس کے ذاتی کمال یا خاندانی وجاہت کو، یا اس کے جمال کو، یا اس کی دینداری اور اس کے صلاح و تقوے کو ــــ دینداری کا ذکر آپ نے سب سے آخر میں فرمایا ــــ اس کے بعد آپ نے مخاطب کو ایسا فرمایا کہ دینی اور اخروی نقطۂ نگاہ سے

بڑی کامیابی کی بات یہ ہے کہ نکاح کے لیے عورت کا انتخاب دینداری اور صلاح و تقوے کی بنیاد پر کیا جائے اور سب سے پہلے یہی چیز دیکھی جائے ـــــ حدیث کا آخری جملہ "تربت یداک" اس کے لفظی معنی تو وہی ہیں جو ترجمے میں لکھے گئے ہیں (خاک آلود ہوں تیرے ہاتھ) لیکن محاورہ میں اظہار خلوص و محبت کے لیے بھی یہ جملہ بولا جاتا ہے اور یہاں اسی مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ ــــــــــ رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دُنیا میں جو کچھ ہے بندوں کے انتفاع اور استعمال کے لیے ہے، اور دُنیا کی قابل انتفاع چیزوں میں سب سے بہتر چیز نیک بیوی ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) واقعہ یہ ہے کہ نیک اور صالح بیوی اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت اور دولت ہے۔ اس کی وجہ سے یہ دُنیا بھی جنت بن جاتی ہے اور وہ اللہ کی رضا اور جنت کے راستہ پر چلنے میں بھی مددگار ہوتی ہے۔

عَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْاُمَمَ۔

ــــــــــ رواہ ابوداؤد والنسائی

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسی عورت سے شادی کرو جو شوہر سے بہت زیادہ محبت کرنے والی اور اولاد پیدا کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھنے والی ہو، میں دوسری اُمتوں کے مقابلہ میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔ (سنن ابوداؤد، سنن نسائی)

(تشریح) بیوی کی حیثیت سے ایک عورت کی سب سے اعلیٰ صفت یہی ہے کہ وہ شوہر سے محبت کرنے والی ہو۔ یہ محبت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی وہ سکون قلب اور خوش عیشی انسان کو حاصل

ہوگی جو شادی اور ازدواج کا اصل مقصد ہے۔ بعض طبیعتوں میں تو انس و محبت کا مادہ ہوتا ہی زیادہ ہو اُن میں ہر ایک کے لیے ہی محبت ہوتی ہے۔ لیکن جہاں صرف ہم مزاجی ہی ہو وہاں بھی قربت و یکجائی سے اُنس و محبت کی شکل بالعموم پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے حدیث کا منشا رغالباً یہ ہے کہ شادی میں کم از کم ہم مزاجی کی تلاش ضرور کر لی جائے تاکہ اُنس و محبت پیدا ہونے میں آسانی ہو اور شادی کا اصل مقصد پورا ہو سکے۔

اولاد پیدا کرنے کی اچھی صلاحیت بھی عورت کا ایک قیمتی وصف ہے۔ اسے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور شادی کے مقاصد میں سے بھی دوسرے نمبر کا مقصد یہی ہے اور ہمیشہ سلیم الطبع معاشروں میں رہا ہے کہ اولاد پیدا ہو۔ شادی کے رشتے کو مستحکم کرنے میں بھی اس کا دخل صاف ظاہر ہے۔ یہ صرف کج فطرتی ہے کہ شادی کر کے بھی آدمی اولاد کے تصور سے گھبراوے۔ جیسا کہ ہمارے زمانے میں یہ رجحان بڑی شدت سے پھیل رہا ہے، حتیٰ کہ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو محدود یا بالکل ہی معدوم کر دینے کی تدابیر اختیار کرنا ایک سمجھداری کی بات بن گئی ہے۔ انبیاء علیہم السلام فطرت کے معلّم اور داعی ہیں اس لیے اُن کی تعلیم ہمیشہ فطرت کے مطابق رہی ہے اور وہ تقلیل اولاد کی ہمت افزائی نہیں کرتے اور نہ ان کی تعلیم پر عمل کرنے والے معاشروں کو اس خلاف فطرت رویہ کو اختیار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کی ضرورت اسی جگہ پیش آتی ہے جہاں زندگی کا عام نہج خلاف فطرت ہو جائے۔ اس کے علاوہ ایک داعی حق کی ہمیشہ یہ خواہش ہوگی اور ہونی چاہیئے کہ اُسکی دعوت کے علمبرداروں کی جمعیت بڑی سے بڑی ہو۔ اور ہمیشہ بڑھتی رہے۔ جس کا اولین اور قریب ترین راستہ یہی ہے کہ اُس کے پیرو خوب پھلیں پھولیں۔ حدیث کے آخری جملے "فَاِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمْ" سے حضورؐ نے اپنی اسی خواہش کا اظہار فرمایا ہے۔

اہم کتابیں

تفسیر حقانی: چار جلدوں میں مکمل قیمت کامل سیٹ -/40
رحمۃ للعالمین: کامل تین جلدوں میں قیمت کامل سیٹ -/30
تاریخ دعوت و عزیمت مکمل: از مولانا ابو الحسن علی ندوی -/26
حیاۃ الصحابہؓ: اصل عربی اور ۳ جلدوں میں مکمل قیمت کامل -/34
حیاۃ عبد الحئیؒ: از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی۔ مجلد -/11
ارشاد السلوک: ارشاد الملوک کا اردو ترجمہ قیمت
علم الفقہ: از مولانا عبد الشکور صاحب لکھنویؒ ... -/21
تاریخ اسلام مکمل: مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی مکمل ۳ جلد مجلد -/44
بہشتی زیور مدلل عکسی: از مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ مجلد -/20
احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت: مولانا تقی امینی -/6
مقالات امینی: از مولانا محمد تقی امینی۔ قیمت ... -/8
مدارج سلوک: از ڈاکٹر میر ولی الدین ... -/5

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

بوئے گل در برگِ گل

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی اپنے مکتوبات کے آئینہ میں

تلخیص و ترجمہ ـــــ از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

شاہ عبد اللطیفؒ کو شاہ رؤف احمدؒ کے متعلق ارقام فرماتے ہیں۔

شاہ صاحب والا مناقب حضرت شاہ عبد اللطیف صاحب معروف بہ میاں ننھے صاحب سلمہم اللہ تعالےٰ ـــــ بعد سلام مسنون گزارش ہے کہ عنایت نامہ وارد ہوکر مسرت کا باعث ہوا۔ اللہ تعالےٰ آپ کو ان الطاف کے ساتھ سلامت رکھے۔ بزرگوں کی یادآوری چھوٹوں کے لیے باعث سعادت ہے۔ اُمید کہ آپ میرے حق میں حُسنِ خاتمہ، دوامِ عافیت، سلامتِ ایمان اور مغفرت کی دُعا فرماکر نصرت فرمائیں گے ـــــ حضرت میاں رؤف احمد پیرزادہ سلمہم اللہ تعالےٰ نے فقیر سے طریقہ سیکھا ہے اور شغل و مراقبہ کی تعلیم سے فیض حاصل کرکے اجازت پائی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اُن کی صحبت اور توجہ میں تاثیر عنایت فرمائی ہے ـــــ الحمد للہ علیٰ ذالک ـــــ اُن کو آپ کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ جو طالب ہو اُن سے استفادہ کرسکے۔ اللہ تعالےٰ احقر کے گمان کو۔ جو اُن کے متعلق ہے۔ سچّا فرمائے (آمین) والسلام۔

حضرت شاہ ابو سعید مجددی کو ایک مکتوب گرامی میں یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

حضرت حافظ ابو سعید صاحب سلمہم اللہ تعالےٰ ـــ بعد سلام مسنون۔ واضح ہو کہ ...... عنایت نامہ آیا جس نے انتظار کو رفع کیا۔ قبل ازیں ایک لفافہ آپ کو بھیج چکا ہوں جس میں تین خط ملفوف تھے۔ ایک تعزیت حضرت سراج احمد صاحبؒ[1] میں اُن کے صاحبزادوں کے نام، دوسرا شیخ

(۱) الشیخ العالم المحدث (مولانا) سراج احمد بن مرشد بن ارشد ...... العمری السرھندی الرامپوری۔ (باقی آگے)

فضل امام (۲) (خیرآبادی) کے نام، تیسرا حضرت مولوی بشارت اللہ (۳) (بہرائچی) کے نام
اُمید کہ وہ لفافہ ملا ہوگا۔ آپ کو کسی نے یہ بیجا بات لکھدی کہ میں آپ سے ناخوش ہوں۔ بندہ آپ سے ناراض نہیں ہے۔

معاذ اللہ۔ ناراضگی کی وجہ کیا ہے؟ (کچھ بھی نہیں) ..... آپ نے نہ آنے اور رامپور یا دہلی یا لکھنؤ قیام کرنے کے بارے میں دل جس بات کی شہادت دے اور گواہی دے اُس پر عمل کریں۔ مقصود یادِ الٰہی ہے ۔۔۔ والسلام

حضرت شاہ ابوسعید مجددیؒ کو ایک اور مکتوب گرامی میں یوں رقمطراز ہیں:۔

حضرت سلامت ۔۔ بعد سلام واضح ہو کہ عنایت نامے نے اپنے ورودِ مسعود سے مسرتیں پہنچائیں۔ اِس مکتوب میں اپنے احوال باطن اور "تاثیرات قلوب طالبان" کو لکھا تھا ۔۔۔ الحمد للہ علی ذالک۔ اللہ تعالےٰ آپ کو کمالِ استقامت کے ساتھ اِس طریقے کے انتہائی کمالات تک پہونچائے اور اشاعت انوارِ نسبت شریفہ کے مقام پر فائز فرمائے۔

(پچھلے صفحہ سے آگے) ۔۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد میں تھے۔ سرھند میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے تعلیم حاصل کی۔ اپنے والد کے ہمراہ رامپور آگئے تھے۔ پھر لکھنؤ چلے گئے تھے وہیں ۱۲۳۰ھ میں انتقال ہوا۔ رامپور میں اپنے والد کے پاس دفن ہوئے۔ آپ کی بہت سی تالیفات ہیں۔ اُن میں سے صحیح مسلم، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ کی شروح بھی ہیں جو فارسی زبان میں ہیں۔ (نزھۃ الخواطر جلد ہفتم)۔ آپ شاہ ابوسعیدؒ کے ماموں تھے (ضمیمہ مقاماتِ مظہری)

(۲) علامہ فضل امام بن محمد ارشد عُمری حنفی ہرگامی ثم خیرآبادی ۔ مشہور و معروف معقولی ہیں۔ کئی رسالے آپ کی تالیفات میں ہیں جن میں مرقات (منطق) مشہور رسالہ ہے جو مدارس عربیہ میں داخل نصاب ہے۔ دہلی میں درس دیتے تھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی آپ کے باکمال صاحبزادے تھے۔ اس مکتوب سے معلوم ہوا کہ آپ کا قیام لکھنؤ میں بھی رہا ہے۔ ۱۲۴۳ھ میں خیرآباد میں وفات ہوئی۔ (نزھۃ الخواطر جلد ۷)

(۳) مولانا بشارت اللہ بہرائچی ابن امانت اللہ۔ بہرائچ میں پیدا ہوئے۔ شیخ بڈھن بہرائچیؒ کی اولاد میں تھے۔ شیخ نعیم اللہ بہرائچیؒ سے جو کہ آپ کے چچا اور پیر استاد تھے تعلیم حاصل کی پھر دہلی جا کر شیخ فضل امام خیرآبادیؒ سے علوم عقلیہ کی تکمیل کی اور حدیث حضرت شاہ عبدالقادرؒ سے پڑھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے درس میں بھی شرکت کرتے تھے۔ حضرت شاہ غلام علیؒ سے بیعت ہو کر طریقہ نقشبندیہ کا سلوک طے کیا اور اُن کے اجلہ خلفاء میں شمار ہوئے۔ ۱۲۵۴ھ میں بہرائچ میں وفات ہوئی۔
(ضمیمہ نزھۃ الخواطر ج ۷)

نیز آپ کی ذات کو آپ کے آباد اجدادِ کرام کی مانند اُمتِ مرحومہ کی ہدایت کا واسطہ و ذریعہ بنائے۔ جب آپ کا خط آتا ہے بغیر توقف اُس کا جواب تحریر کر دیا جاتا ہے معلوم نہیں کہ میرا خط وہاں (لکھنؤ) کیوں نہیں پہونچتا ـــ کچھ دن ہوئے ایک خط مولانا خالد سلمہٗ اللہ تعالےٰ کا آیا ہے جو اُن کی ترقیاتِ نسبت باطن کی بشارت دینے والا ہے۔ اُن کی توجہات سے اشاعتِ طریقہ اور ملک روم و بغداد میں اُن کی نسبت شریفہ کی تاثیراتِ قویہ، پانچسو متبحر علماء کا اُن سے طریقہ حاصل کرنا، اُن کے خلفاء کی کثرت، اُن کا ورع و تقویٰ اور اخلاص، اُس خط سے اور حاجی حسن کی زبانی معلوم ہوا جو مولانا خالد کے علاقے سے آئے ہیں۔ ان سب باتوں سے دل بہت خوش ہوا۔ سبحان اللہ والحمد للہ آپ بھی اللہ تعالیٰ کی ان عنایات، بے غایات سے خوش ہوں ... بیضاوی، مدارک، خیرجاری ... اور کسی قدر نہایہ لکھوا کر رکھو کتابیں موجود ہوں اور میسر آئیں اُن کو بھیجدیا جائے ـــ اس فقیر کو بدعائے سلامتِ ایمان و عافیت دارین۔ ضرور یاد رکھتے ہوں گے۔

رمضان المبارک، دل و دماغ کے انتہائی ضعف کے ساتھ (کچھ) گزر گیا اور باقی گزر رہا ہے۔ اللہ تعالےٰ عاقبت بخیر کرے ..... بخدمتِ بزرگان سلام مسنون (اُمید کہ) احمد سعید اسعدہٗ اللہ سبحانہٗ کمالاتِ ظاہر و باطن پر فائز ہوں گے۔ والسلام۔

ایک مکتوب گرامی میں جو حضرت شاہ ابوسعید مجددیؒ کے نام ہے یوں گوہر فشاں ہیں:۔

حضرت سلامت۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

۱۹ محرم الحرام کا (لکھنؤ سے) لکھا ہوا عنایت نامہ ۱۹ صفر کو ملا۔ اُس کے مندرجات واضح ہوئے۔ آپ نے وبا کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ (تمام انسانوں اور) تمام مسلمانوں کو اس بلا سے محفوظ رکھے۔ دنیا کی زندگی برائے کسب حسنات بہت غنیمت ہے۔ حفاظت کے لیے دُعا کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آیۃ الکرسی اور ہر سہ قل، صبح و شام اور سوتے وقت تین تین بار۔ اس کا ورد رکھیں۔ ان شاء اللہ تعالےٰ محفوظ رہیں گے۔

۲۳ دن ہوئے ہیں کہ مولوی بشارت اللہ صاحب اُس طرف کو (لکھنؤ کو) روانہ ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالےٰ بخیریت پہونچائے۔ وہ ایک سال سے یہاں تھے۔ ایک بار ایک ماہ تک اور دوسری بار دو ماہ بیمار رہے۔ ضعف و نقاہت کے عالم میں اقرباء کی تاکیدِ طلب کے باعث

یہاں سے تشریف لے گئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جمیع آفات سے بچائے۔ تمام احباب کو یعنی حضرت احمد سعید صاحب، امین احمد اور مولوی مراد اللہ[1] کو سلام مسنون۔

ایک ماہ تین روز ہوئے۔ میاں قمر الدین[2] بہرہ وافر حاصل کرکے اور نسبت مجددیہ سے مناسبت پیدا کرکے اجازت و خرقہ خلافت سے سرفراز ہو کر پشاور چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو عافیت سے رکھے اور متقین کا امام بنائے۔ ـــــ۔۔۔۔

جامع مکاتیب شاہ رؤف احمد مجددیؒ کو ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

صاحبزادۂ اعلیٰ مرتبہ میاں رؤف احمد صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ ـــ کو فقیر غلام علی عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام مسنون واضح ہو ـــ آپ کے خط کا جواب بھیجدیا گیا ہے خدا کرے کہ وہ پہونچ گیا ہو ـــــ (کتابوں کے بارے میں یہ لکھنا ہے کہ) ہم کو خرید کتب کا مقدور نہیں ہے۔ آپ کا اگر یہاں آنے کا ارادہ ہو تو پہلے استخارہ مسنونہ کرلیں پھر یہاں کا قصد کریں۔ باخدا اور ماسوا سے اعراض کرنے والے رہیں ـــ اپنے باطن کے احوال اور مستفیدین کے اور اُن احوال کی تاثیر کا ذکر خط میں ضرور کریں ـــ والسلام۔

---

(۱) شیخ مراد اللہ عمری تھانیسریؒ ـــ اپنے والد کے ساتھ دہلی آ گئے تھے۔ اور حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ ـــ کی صحبت اقدس حاصل کی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت اور سکھ گردی میں قصبہ تھانیسر۔۔کی بربادی کے بعد آپ جوانی کے عالم میں لکھنؤ آئے اور حضرت شاہ نعیم اللہ بہرائچی سے بیعت ہو کر نقشبندی سلوک طے کیا بالآخر اپنے پیر و مرشد کے خلیفہ و جانشین ہوئے۔ لکھنؤ اور اس کے اطراف کو آپ سے بہت کچھ دینی نفع ہوا مولانا ابو الحسن نصیر آبادیؒ اور شیخ غلام رسول کانپوریؒ وغیرہما نے آپ سے باطنی فیوض حاصل کیے تھے۔ ۱۲۴۳ھ میں انتقال ہوا۔ مزار لکھنؤ میں ہے (نزہۃ الخواطر جلد ۷، و دیباچہ ترجمۂ معمولات مظہریہ از نعیم الدین احمد طرب دہلویؒ) (۲) میاں قمر الدین پشاوریؒ۔ بزرگانِ طریقۂ قادریہ میں سے تھے اور طریقہ مجددیہ کے منکر تھے۔ بالآخر حضرت شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں دہلی آکر بیعت ہوئے اور سلوک نقشبندیہ کو طے کر کے اجازت حاصل کی۔

(ضمیمۂ مقامات مظہری)

حضرت شاہ ابوسعید مجددیؒ کو ایک مکتوب گرامی میں ارقام فرماتے ہیں :۔

صاحبزادۂ والا نسب حضرت حافظ ابوسعید صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ کو فقیر غلام علی عفی عنہٗ کی طرف سے بعد سلام مسنون واضح ہو کہ آپ کے تین عنایت نامے آئے اُن کے مندرجات سے مطلع ہوا۔ ان میں سے ایک کا جواب بدست سید عمر جو شاہجہان پور میں رہتے ہیں ارسال کیا گیا ہے وہ جواب بفضل الٰہی پہونچا ہوگا ۔۔ آپ کی اقامت کچھ عرصے اور یہاں رہنی چاہیے معلوم نہیں کہ حضرت حق سبحانہٗ کو کیا منظور ہے ۔۔۔۔ حضرت شیخ سیف الرحمٰن احمد جالندھر سے اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں یہاں تشریف لائے ہیں محض برائے طریقہ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو بہت جلد فیض باطن سے کامیاب فرمائے ــــ مولوی بشارت اللہ جیو یہاں سے رخصت ہو گئے۔ میاں جلیل الرحمٰن(۱) بھی سرہند شریف چلے گئے۔ بارہ اشخاص دو دو دن میں (اپنے اپنے علاقوں کو) چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ سب کا حافظ و نگہبان رہے ــــ اپنے صاحبزادوں کو اور والد ماجد(۲) کو سلام پہونچائیں۔

حضرت شاہ ابوسعید مجددیؒ کو صحبت اغنیاء سے منع کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

حضرت سلامت ۔ فقیر غلام علی عفی عنہٗ بعد سلام مسنون تحریر کرتا ہے کہ آپ کے مکتوب سے ۔

---

(۱) میاں جلیل الرحمٰنؒ حضرت شاہ غلام علیؒ کے خلیفہ اور خادم خاص تھے۔ شاید یہ دہلی ہوں۔ یہ اپنے مرشد کی عنایات سے بہرہ ور تھے۔ پیر و مرشد کے مرض وفات میں حلقۂ ذکر میں دو بدوئے مرشد بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بدبخت نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا اور یہ پائے حضرت ایشاں پر گر کر شربت شہادت سے لذت یاب ہوئے۔ حضرت مرزا صاحب شہید کے پائین مزار ان کا مزار ہے۔ (ضمیمہ مقامات مظہری)

(۲) حضرت شاہ صفی القدر ابن حضرت شاہ عزیز القدر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد میں تھے۔ محدث اور فاضل متبحر تھے۔ باطنی حیثیت سے بھی باکمال تھے۔ مطالعۂ حدیث، تفسیر اور اوراد و اشغال سے کام تھا۔ نواب نصر اللہ خاں رامپوری نے بخشی گری کا عہدہ آپ کو دینا چاہا، قبول نہیں فرمایا۔ رامپور سے لکھنؤ چلے گئے تھے، وہیں ۱۲۳۶ھ میں وفات پائی۔ حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ان کے اعزہ کے ساتھ تجہیز و تکفین میں شریک تھے۔ (ضمیمہ مقامات مظہری)

-تذکرۃ العلماء للنادری میں اور اس کے حوالے سے نزھۃ الخواطر میں تاریخ وفات ۱۲۲۶ھ درج ہے جو غلط ہے۔

روایاتِ حدیث میں اختلاف

اور اس کے فطری اسباب

(از افاداتِ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم)

(مندرجہ ذیل مضمون حضرت شیخ الحدیث کے حال ہی میں شائع ہونے والے ایک رسالے (اختلاف الائمہ) سے ماخوذ ہے۔ رسالہ کا تعارف اسی اشاعت میں اپنی جگہ پر پیش کیا جا رہا ہے)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تعلیمِ مسائل کی یہ صورتیں نہیں تھیں جو آج دائر ہیں کہ فقہ کے نام سے مستقل تصانیف، کتب اور رسائل بڑی اور چھوٹی تالیفات ہر ہر نوع اور ہر ہر مسئلہ پر جدا جدا لکھی جاتی یا پائی جاتی ہیں، مسائل اور احکام میں ارکان اور شرائط آداب اور ممنوعات کو جدا جدا بتایا جاتا ہے، اس کی صورت صرف یہ تھی کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جب کوئی حکم نازل ہوا تو اس کو قولاً اور فعلاً خود کر کے بتلا دیا، وضو نازل ہوئی تو خود وضو فرما کر بتلا دی۔ اور نماز نازل ہوئی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پڑھ کر حضور کو بتلا دی اور حضور نے امت کو سکھلا دی، اسمیں یہ صورت نہ یہ تدقیقات کہ فلاں جز و فرض ہو فلاں رکن فلاں سنت ہے فلاں واجب نہیں ہوتی تھیں، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین احتمالات اور عقلیات دریافت ہی نہیں فرماتے تھے۔ اگر کوئی جرح بھی کرتا تھا تو وہ خلافِ ادب شمار کیا جاتا تھا۔ ...... حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ وتر واجب ہے یا سنت ،

انھوں نے جواب میں فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ وتر پڑھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ہمیشہ وتر پڑھے، اس کے بعد مکرر سہ کرر سائل دریافت کرتا رہا ہے کہ وتر واجب ہے یا نہیں اور حضرت ابن عمرؓ یہی جواب مرحمت فرماتے رہے جس کا مطلب یہی تھا کہ عمل کرنے والے کے لیے مذکورات کی ضرورت نہیں جب حضور اقدس اور صحابہ کا معمول یہ ہے تو واجب العمل ہونا خود معلوم ہو جاتا ہے غرض مسائل کی تعلیم اکثر فعلی حسب ضرورت ہوتی رہتی تھی، وہ لوگ ایسی سوچوں کو کہ اگر کوئی وضو میں فلاں چیز ترک کر دے تو کیا حکم ہے اور اگر ایسا ہو جائے تو کیا ہوگا ناپسند سمجھتے تھے حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایسے شخص پر لعنت کی ہے جو ایسے سوالات کرتا پھرے جو درپیش نہیں، جو مسئلہ بحیثیت واقعہ پیش آتا تھا وہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے دریافت کر لیا جاتا تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مناسب و موافق حکم ارشاد فرما دیتے تھے، ایسی صورت میں اختلاف ہونا لازمی اور بدیہی ہے۔

مثال کے طور پر چند واقعات لکھے جاتے ہیں جس سے اس کا اندازہ اور بھی واضح ہو جائے گا۔

امام مسلم نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے نقل فرمایا ہے کہ ایک نابینا صحابی نے آکر حضور سے یہ عرض کیا کہ مجھے مسجد تک پہونچانے والا کوئی شخص نہیں مجھے اس کی اجازت ہے کہ اپنے گھر نماز پڑھ لیا کروں اور مسجد میں حاضر نہ ہوا کروں حضور نے اجازت مرحمت فرما دی اور پھر یہ معلوم کر کے کہ ان کا گھر اتنا قریب ہے کہ اذان کی آواز ان کے گھر تک جاتی ہے، ان کو اجازت نہیں دی۔ اور مسجد میں آکر شرکت نماز کا حکم فرمایا، لیکن عتبان بن مالکؓ کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عدم بینائی کا عذر قبول فرما کر ان کو مسجد میں نہ آنے کی اجازت فرما دی۔ ایسے ہی عبد اللہ بن زیدؓ نے الفاظ اذان کو خواب میں دیکھا تھا ان کے لیے حضور اقدسؐ نے اس کی اجازت فرما دی کہ باوجود بلالؓ کے اذان کہنے کے وہ تکبیر کہیں۔ لیکن ایک سفر کے موقع پر زیاد بن حارث صدائی نے اذان کہی اور اس کے بعد حضرت بلال نے تکبیر کا ارادہ کیا تو حضور اقدس نے یہ فرما کر کہ جو شخص اذان کہے اسی کا حق تکبیر کہنے کا ہے، حضرت بلال کو روک دیا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے تمام مال کو ایک مرتبہ تصدق فرما دیا اور حضور نے

قبول فرمالیا لیکن متعدد صحابہ ایسے تھے جنھوں نے اپنے تمام مال کا صدقہ کیا یا صدقہ کا ارادہ فرمایا اور حضور نے اُن کو رد کردیا اور رد فرمادیا۔ غرض یہ واقعات دو چار نہیں سینکڑوں اور ہزاروں کی مقدار میں ایسے تھے جن سے یہ امر ثابت واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض اشخاص کے لیے کوئی حکم فرماتے تھے جس کی دوسرے بعض کو اجازت نہیں ہوتی تھی، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے روزہ کی حالت میں بیوی سے بوس وکنار کو دریافت کیا تو حضور نے اجازت فرمادی، اور ایک دوسرے شخص نے دریافت کیا تو حضور نے منع فرمادیا، فوراً یہ بات سمجھ میں آئی کہ جس کو اجازت دیدی تھی وہ بوڑھا شخص تھا اور جس کو منع فرمادیا وہ جوان تھا۔

اب ان سب قصوں میں ہر شخص یقیناً وہی امر نقل کرے گا جو اُس پر گزرا اور جس کو خود بلا واسطہ حضور سے معلوم کر چکا ہے، جس شخص کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ میں اس کی اجازت فرمادی ہے وہ بلا تکلف ہر شخص تک اس امر کو پہونچانے کا ساعی ہوگا کہ روزہ کی حالت میں بوس وکنار جائز ہے اور مفسد روزہ نہیں۔ اور دوسرا شخص اسی شد و مد سے اس کے خلاف نقل کرے گا۔ اور وہ روزہ کے لیے اس کو ناجائز قرار دے گا، اور یہ نہیں کہ صرف ان دو شخصوں کی دو متعارض روائتیں ہوگئیں بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ہمیشہ طالبین و مستفیضین کا مجمع رہتا تھا، مسائل پوچھنے والے، زیارت کرنے والے، قاصد وامیر ہر وقت آتے جاتے رہتے تھے۔

اس بنا پر ان مختلف احکام کے دو دو قصوں میں سننے والے جہاں جہاں جائینگے وہی امر نقل کرینگے جو انھوں نے اپنے کانوں سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے سنا ہے۔ درحقیقت یہ ہی ایک وجہ ایسی اہم اور طویل ہے کہ اس کے ذیل میں جس قدر بھی اختلاف روایات ہو وہ کم ہے اسلئے کہ مجمع میں متعدد بلکہ بیحد قوی، ضعیف، ہر نوع کے شخص ہوتے ہیں اور ہر شخص کیلئے اسکی قوت وضعف کے لحاظ سے حکم بدل جاتا ہے، ایک شخص اس قدر قوی القلب ہے کہ وہ اگر اپنا تمام مال صدقہ کردے تو اسکی زبان پر شکوہ یا سوال تو درکنار اسکے قلب پر بھی اطمینان ہے کہ اسکو جتنی بھی تکلیف ہوگی اسی قدر رضائے الٰہی اور توجہ الی اللہ میں انہماک ہوگا، دوسرا وہ شخص ہے جس پر اس قسم کا اطمینان نہیں بلکہ اندیشہ شکوہ شکایت سے بھی آگے بڑھ جانے کا ہے تو اسکے لیے ناجائز ہے کہ وہ اپنا تمام مال تصدق کردے۔

ایسے ہی اگر ایک شخص نہایت قوی ہے اس کے لیے یہی انسب ہے کہ وہ سفر کی حالت

میں رمضان المبارک کا روزہ قضا نہ کرے کہ رمضان المبارک کی فضیلت ہاتھ سے نہ جائے، لیکن اگر دوسرا شخص ضعیف ہے اس کے لیے ایسی حالت میں کہ مضرت کا احتمال غالب ہو، رمضان المبارک میں روزہ رکھنا ناجائز ہوگا۔ اسی فرق کی وجہ سے روایات حدیث میں اس جگہ بھی اختلاف ہوگا، ابوسعید خدریؓ نقل کرتے ہیں کہ ہم سولہ[۱۶] رمضان المبارک کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں ایک غزوہ کے لیے چلے، راستہ میں ہمارے بعض رفقاء نے روزہ رکھا اور بعض نے افطار کیا، کوئی ایک فریق دوسرے پر معترض نہیں تھا، روزہ رکھنے والے افطار کرنے والوں کو مطعون کرتے تھے نہ افطار کرنے والے روزہ رکھنے والوں کا خلاف کرتے تھے۔

حمزہ بن عمرو اسلمیؓ نے خود حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے سوال کیا کہ میری عادت کثرت سے روزہ رکھنے کی ہے سفر کی حالت میں روزہ رکھ لیا کروں؟ حضور نے ارشاد فرمایا اختیار ہے، دل چاہے رکھ لو یا نہ رکھو، لیکن حضرت جابرؓ نقل کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ سفر کی حالت میں روزہ رکھنا کچھ بھلائی کی بات نہیں ہے، بلکہ ایک جگہ نقل کرتے ہیں کہ حضور نے ان لوگوں کو گنہگار بتلایا ہے جو حالت سفر میں روزہ رکھتے ہوں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضور سے نقل فرماتے ہیں کہ سفر کی حالت میں روزہ رکھنے والا ایسا ہے جیسا کہ حَضَر یعنی غیر سفر کی حالت میں روزہ توڑنے والا۔

غرض اختلاف روایات کی بڑی وجہ یہ اختلاف احوال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف احوال و اوقات کے لحاظ سے دو[۲] وقتوں میں دو شخصوں کو علیحدہ ارشادات فرمائے جس مجمع میں جو حکم ارشاد فرمایا، دوسرے حکم کے وقت وہ کا مجمع نہ ہونا بدیہی ہے، اس لیے دو[۲] بڑی جماعتیں دو مختلف حکموں کی ناقل بن گئیں۔

اگرچہ ایسے بھی بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہوں گے۔ بلکہ ہوتے تھے جنھوں نے دونوں حکم سنے ہوں گے اُن کو یہ ضرور تامل و غور کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ ان مختلف احکام کی کیا وجہ ہوئی اور پھر انھوں نے اپنے خیال کے موافق دونوں کو جمع فرمایا جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روزہ کی حالت میں بوس و کنار کے بارے میں دو حدیثیں نقل کیں اور دونوں کے اختلاف کی وجہ بھی بتلا دی، ایسے ہی اور ہزاروں واقعات

نکلیں گے۔ اس جگہ ان کا استیعاب نہ ہو سکتا ہے نہ مقصود، یہ چند واقعات بھی مثال کے طور پر اس لیے ذکر کر دیے ہیں کہ یہ بات اگرچہ خود ہی بدیہی ہے لیکن واقعات کی شہادت سے اور زیادہ ذہن نشین ہو سکتی ہے، ان مختلف روایات کے بعد صحابہ تابعین اور ائمہ مجتہدین کا یہ فرض ہے کہ وہ دونوں طرح کی روایات کا ماخذ، موقع، محل تلاش فرما کر ہر روایت کو اس کے موقع پر محمول فرما دیں۔

اختلاف روایات کی دوسری اور تیسری وجہ | منجملہ ان وجوہ کثیرہ کے دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حکم کسی خاص شخص کے لیے مخصوص فرمایا کسی خصوصیت کی وجہ سے کسی شخص کو مخاطب فرما کر کوئی ارشاد فرمایا۔ حضار مجلس میں سے بعض حضرات نے اس کو عام حکم سمجھ کر کلیہ کے طور پر نقل فرما دیا جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مندرجہ ذیل روایت حضرت عائشہ کے خیال کے موافق۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ اس کا انکار فرماتی ہیں ان کا خیال ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خاص عورت کے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ وہ یہودیہ جس پر یہ گھر والے رو رہے ہیں عذاب دی جا رہی ہے۔ ہمیں اس جگہ پر نہ اس نوع کی روایات کا احصاء مقصود ہے نہ اس پر کلام ہمارا مقصد تحریر کہ حضرت عائشہؓ کی رائے جمہور محققین کے نزدیک راجح ہے یا ابن عمر کی۔ ہمارا مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ اس نوع کا اختلاف بھی روایات حدیث میں بکثرت موجود ہے اسی قبیل سے حنفیہ کی تحقیق کے موافق خطبہ کے وقت تحیۃ المسجد کی روایات ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سُلیک غطفانی ایک صحابی جو نہایت ہی ضرورتمند غریب الحال تھے ان کو اس لیے تحیۃ المسجد کا اس وقت حکم فرمایا تھا کہ لوگ ان کی غربت پر بھی نظر کریں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس خصوصیت کا لحاظ کریں گے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو خطبہ کے درمیان ہی ایسی نوافل کا حکم فرمایا جیسی روایات کے موافق خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ روک کر کھڑے رہے لیکن مجمع میں بہت سے حضرات تھے بعضوں نے اس حکم کو عام قرار دیا اور کلیہ کے طور پر نقل فرما دیا کہ جو شخص خطبہ کے وقت مسجد میں داخل ہو اس کو

دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنا چاہئیں۔ ہے یہی وجوہ ہیں عمران بن حصین کے اس قول کی جس کو ابن قتیبہ نے تاویل مختلف الحدیث میں نقل کیا ہے۔

ان عمران بن حصین قال واللہ	عمران بن حصین صحابی فرماتے ہیں واللہ مجھے
ان کنت لاری انی لو شئت لحدثت	اس قدر حدیثیں یاد ہیں کہ چاہوں تو دو روز
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	تک برابر روایت کر سکتا ہوں لیکن یہ مانع ہے
یومین متتابعین ولکن ابطانی	کہ چند صحابہ نے میری طرح سے احادیث کو سنا
عن ذالک ان رجالا من اصحاب	اور حضور کی خدمت اقدس میں میری طرح
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حاضر باش رہے لیکن پھر بھی روایت میں غلطی
سمعوا کما سمعت وشھدوا کما شھدت	کرتے ہیں مجھے روایت کرنے میں یہی اندیشہ
ویحدثون احادیث ما ھی کما یقولون	ہے کہ روایات مجھ پر ایسی مشتبہ ہو جائیں جیسا
واخاف ان یشبہ لی کما شبہ لھم	کہ ان پر مشتبہ ہو گئیں ہیں اس پر متنبہ کرتا ہوں کہ
فاعلمک انھم کانوا یغلطون لا	ان لوگوں سے کچھ وہم ہوا نہ کہ دیدہ و دانستہ
انھم کانوا یتعمدون۔	غلط روایت کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں کثرت روایت کو منع فرمادیا تھا حتیٰ کہ اسی کثرت کی وجہ سے بعض اجلہ صحابہ پر پابندی عائد کر دی تھی۔ ابو سلمہؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا کیا تم عہد فاروقی میں بھی اسی کثرۃ سے روایت کرتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر اس وقت اس طرح روایت کرتا تو حضرت عمرؓ درہ سے خبر لیتے۔

غرض اختلاف روایات کی دوسری وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جو حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی شخص کے لیے مخصوص طور پر فرمایا تھا اس کو کسی نقل کرنے والے نے علی العموم نقل کر دیا جس کی امثلہ ابھی گزر چکی ہیں اور تیسری وجہ اس کے عکس کی صورتیں ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی حکم علی العموم ارشاد فرمایا تھا اس کو کسی نقل کرنے والے نے کسی شخص کے ساتھ یا کسی وقت کے ساتھ مخصوص قرار دے دیا۔ اس کی مثالیں بھی گزشتہ روایات میں ظاہر ہیں مثلاً حضرت ابن عمرؓ کی وہ روایت جو میت کے عذاب کے بارہ میں گزری ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں وہ مخصوص یہود سے

کا قصہ ہے ان ہی مواقع کی تنقیح کے لیے ائمہ مجتہدین کی ضرورت ہے جن کے سامنے مسئلہ کی مختلف روایات موجود ہوں صحابہ کے مختلف اقوال مستحضر ہوں جن کے مجموعہ سے یہ امر منقح ہو سکے کہ کون حکم عام ہے کون خاص اور کیا داعی ہے کہ ایک ہی امر کو ایک شخص کے لیے جائز قرار دیے گا اور اسی کو دوسرے کے لیے ناجائز فرمانے گا۔

اختلاف روایات کی چوتھی وجہ

روایات حدیث کے درمیان میں بسا اوقات اختلاف اس وجہ سے بھی ہوا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متعدد لوگوں نے ایک کام کرتے دیکھا۔ دیکھنے والوں کے فہم کا مختلف الوزن ہونا بدیہی ہے۔ بعض لوگ مجتہد تھے، فقیہ تھے۔ بات کو اس کے طریقہ کے موافق سمجھنے والے تھے۔ انھوں نے حسب موقع واقعہ کے مطابق خیال کیا اور بعض لوگ حافظہ کے قوی بات کو یاد رکھنے میں یکتا پہلے طبقہ سے بھی اس میدان میں چار قدم آگے لیکن تفقہ میں اُن سے کم انھوں نے واقعہ اپنی فہم کے مطابق نقل فرمایا اس کی مثالیں کتاب الحج میں سینکڑوں ملیں گی۔ مثلاً ایک شخص نقل کرتا ہے کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حج افراد تھا اسلیے کہ اس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لبیک بحجۃ کہتے سنا اسمیں تردد نہیں کی روایت صحیح ہمیں شک نہیں کہ نقل کرنیوالے نے کوئی کوتاہی نہیں کی لیکن دوسرے لوگ نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا احرام قران تھا یہ روایت ظاہراً پہلی کے مخالف ہے اسلیے کہ قران حج کی مستقل دوسری قسم ہے جو افراد کے علاوہ ہے لیکن حقیقت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی بھی اختلاف نہیں اسلیے کہ قارن کیلیے بحجۃ کہنا بھی جائز ہے۔ اب صرف مجتہد ہی کا کام رہ گیا ہے کہ دونوں طرح کی روایات کو سامنے رکھ کر انمیں جمع کی صورت پیدا کرے۔ دونوں کے محل مستقل قرار دے تاکہ تراجم روایات سے خلجان نہ پیدا ہو۔

اسی قبیل سے نبی کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کا ابتدا ءِ احرام ہے۔ اس بارہ میں روایات مختلف واقع ہوئی ہیں کہ حضور نے احرام کی ابتدا کس وقت فرمائی اور اسی اختلاف روایات کی وجہ سے ائمہ میں بھی اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ احرام باندھنا کس وقت افضل ہے چنانچہ انہی مختلف روایات کی بنا پر سعید بن جبیر جو ایک بڑے تابعی ہیں انھوں نے حبر الامۃ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ پر اختلاف روایات کا اشکال کر کے اس کا حل پوچھا ہے۔ ابوداؤد میں یہ مفصل روایت موجود ہے جس کا مطلب مختصر ترجمہ یہ ہے کہ سعید ابن جبیر کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن عباسؓ سے یہ کہا کہ مجھے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے اس اختلاف پر بہت بڑا تعجب ہو رہا ہے جو

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتداء احرام میں واقع ہوا نہ معلوم اس قدر اختلاف کیونکر ہوگیا انھوں نے فرمایا کہ مجھے اس کی اصلیت خوب معلوم ہے حقیقت یہ ہوئی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چونکہ ہجرت کے بعد صرف ایک ہی حج کیا ہے (وہ بھی اخیر عمر میں اس لیے لوگوں کا مجمع بہت ہی زیادہ ہوگیا تھا جس شخص نے حضورؐ کو جس وقت جو کام کرتے دیکھا اسی کو اصل سمجھا) اس بناء پر اختلاف ہوگیا اس احرام کا قصہ یہ ہوا تھا کہ جب حضورؐ نے سفر حج میں ذوالحلیفہ کو قیام گاہ بنا کر اس کی مسجد میں دوگانہ احرام ادا فرمایا تو اسی وقت احرام باندھ لیا تھا اس وقت جس قدر مجمع موجود تھا، انھوں نے سنا اور آئندہ کے لیے نقل کیا کہ ابتداء احرام دوگانہ کے بعد مسجد ہی میں ہوئی ہے اس سے فراغت پا کر پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اونٹنی پر سوار ہوئے جب اونٹنی آپ کو لیکر کھڑی ہوئی اس وقت آپ نے پھر بآواز بلند لبیک پڑھی اس وقت ایک بڑے مجمع نے دور تک سنا جن لوگوں نے پہلے بھی سنا تھا ان کو معلوم تھا کہ یہ لبیک دوسری مرتبہ کی ہے لیکن جن حضرات نے یہی سنی ہے انھوں نے یہی نقل کیا کہ حضورؐ نے اونٹنی پر سوار ہونے کے بعد احرام کی ابتدا فرمائی۔ مجمع کی کثرۃ کی وجہ سے نہ تمام مجمع تک حضورؐ کی آواز جا سکتی تھی نہ سب ایک یا دو مرتبہ میں حضورؐ سے مل سکتے تھے اس لیے جماعتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے اور مسائل معلوم کرتے تھے۔ بالآخر حضورؐ کی اونٹنی یہاں سے بیداء کی بلندی پر پہنچی حضورؐ نے (چونکہ حاجی کے لیے ہر بلندی پر لبیک کہنا مستحب ہے اس لیے) وہاں بھی لبیک بآواز کہی اس وقت جو مجمع قریب ہوگیا تھا اس نے سنا اور یہی سمجھا کہ حضورؐ نے بیداء پر احرام باندھا حالانکہ خدا کی قسم حضورؐ نے اپنے مصلے ہی پر احرام باندھا تھا البتہ لبیک سب جگہ کہی۔" انتہیٰ چونکہ سعید بن جبیر نے مختلف روایات سنیں اس لیے ان کو تحقیق کی ضرورت پیش آئی اور حسن اتفاق کہ عبداللہ بن عباسؓ اس سب قصہ سے واقف تھے۔ اس لیے نہایت وثوق سے تصحیح حقیقی ابتداء بتلادی اور چونکہ فقیہ اور مجتہد بھی تھے اس لیے ان روایات مختلفہ کے اختلاف کی وجہ اور ان کی جمع کی صورت بھی بتلادی لیکن جس عامی کے سامنے ان سب متعارض روایات کا صرف لفظی ترجمہ ہو وہ بیچارہ بجز تحیر و پریشانی کے اور کیا کر سکتا ہے اور بحال پریشان ہوگا اور مختلف انواع اشکالات پیش آویں گے۔

اختلاف روایات کی پانچویں وجہ | کبھی اس کے قریب قریب ہے کہ نبی کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم

کو مختلف گروہ نے ایک کام کرتے ہوئے دیکھا۔ بعض لوگوں نے اس فعل کو اتفاق خیال کیا، اس لیے امور طبعیہ عادیہ میں سمجھا، دوسرے بعض نے اس کو مقصود اور فعل ارادی خیال فرمایا۔ انھوں نے اس کو سنت اور مستحب نقل فرمایا۔ اس کی بہت سی امثلہ کتب حدیث کے ناظرین کو معلوم ہوں گی۔ نمونہ کے طور پر حجۃ الوداع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام ابطح کو دیکھا جائے کہ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ حضور نے وہاں قیام فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے ہو کہ یہ بھی افعال مناسک حج سے ہے اور حاجی کے لیے وہاں کا قیام سنت ہے لیکن حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے یہ ہے کہ یہ قیام اتفاقی تھا، اس کو مناسک حج سے کوئی سروکار نہیں، خدام نے وہاں خیمہ نصب کر دیا تھا اس لیے حضور نے وہاں قیام فرمایا، نیز مدینہ منورہ روانگی کے لیے بھی وہ سہل تھا کہ ادھر سے ادھر قافلہ کی روانگی بسہولت ہو جاوے گی۔

یہاں اب مجتہد اور فقیہ کی ضرورت ہے کس کو انکار ہو سکتا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ اس قیام کے متعلق دیگر صحابہ کی روایات اور آراء کو جمع کر کے ان دونوں قولوں میں سے کسی کو ترجیح دے۔ چنانچہ ائمہ نے ایسا ہی کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی بنا پر کہ منزلنا غدا ان شاء اللہ بخیف بنی کنانۃ حیث تقاسموا علی الکفر۔ یعنی ہم کل ان شاء اللہ خیف بنی کنانہ میں منزل کریں گے۔ جہاں ابتداء عہد نبوت میں کفار مکہ نے حضور کی مخالفت پر آپس میں معاہدہ کیا تھا، یہ الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ اس جگہ قیام اتفاقیہ نہیں بلکہ قصداً شعار کفار کے موقع پر شعار اسلام کے اظہار کا حکم تھا۔ اب اس کے ساتھ اگر اور مصالح بھی منضم ہو جاویں کہ مثلاً مدینہ منورہ کا راستہ بھی چونکہ اسی طرف کو ہے اس لیے واپسی میں سہولت ہو وغیرہ وغیرہ تو اس کو مقتضی نہیں کہ وہاں قیام قصداً نہیں تھا۔

اختلاف روایات کی چھٹی وجہ

بسا اوقات روایات حدیث میں اختلاف علت حکم کے اختلاف کی وجہ سے بھی پیش آتا ہے۔ مثلاً یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ ایک کافر کا جنازہ قریب سے گزرا، آپ فوراً کھڑے ہو گئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان ملائکہ کی تعظیم کی وجہ سے کھڑے ہوئے تھے جو جنازہ کے ساتھ تھے۔ اس صورت میں مومن کا جنازہ اگر گزرے تو بطریق اولیٰ کھڑے ہونا چاہیے، اور

جن لوگوں کے نزدیک قیام کی یہ علت ہے وہ کافر کا لفظ روایت میں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، اس لیے کہ ان کے نزدیک صاحب جنازہ کے کافر یا مسلمان ہونے کو اس میں دخل ہی نہیں۔

لیکن دوسری بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ اس لیے کھڑے ہوئے کہ کافر کا جنازہ مسلمانوں کے سر سے اونچے کو نہ گزرے کہ اس میں مسلمانوں کی اہانت ہے، اس صورت میں قیام صرف کافر کے جنازہ کی ساتھ مخصوص تھا، اور روایت میں کافر کے ذکر کرنے کی خاص طور سے ضرورت ہے۔

اسی طرح سے رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ بٹائی پر زمین دینا ہم لوگوں کے لیے نافع تھا مگر حضور نے منع فرمادیا اللہ و رسول کی اطاعت سب منافع پر مقدم ہے، عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ ہم بٹائی پر زمین کا معاملہ کیا کرتے تھے، اور اس میں کچھ نقصان نہیں سمجھتے تھے، مگر جب رافع بن خدیجؓ نے یہ بتلایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا تھا، ہم نے چھوڑ دیا۔

رافع بن خدیجؓ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ ہمارے چچا وغیرہ زمین بٹائی پر دیا کرتے تھے اس طرح پر کہ جو ڈول یعنی نالیوں کے قریب وجوار میں پیدا ہو وہ مالک کا بقیہ کاشت کار کا یا کوئی اور خاص حصہ زمین کا مستثنیٰ کر لیتے تھے۔ حضور نے اس کو منع فرمادیا، کسی نے رافع سے پوچھا کہ اگر روپیوں سے لگان مقرر کر کے دے؟ انھوں نے کہا اس میں کوئی نقصان نہیں۔

لیکن ان سب کے خلاف عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے طاؤس سے کہا کہ تم بٹائی پر زمین دینا چھوڑ دو صحابہؓ اس سے روکتے ہیں، انھوں نے کہا کہ مجھ سے اعلم الصحابہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بتلایا کہ حضور نے اس کو منع نہیں فرمایا، بلکہ حضور نے تو یہ ارشاد فرمایا تھا کہ زمین اپنے مسلم بھائی کو مفت کاشت کے لیے دیدے۔ یہ بہتر ہے اس سے کہ اس پر کچھ معاوضہ لے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق اس ممانعت کی علت حسن سلوک ہے۔ ایک مسلم کی ساتھ نہ کہ نفی عدم جواز، لیکن رافع کے نزدیک ممانعت کی علت عدم جواز ہے ایسی ہی کتب حدیث میں اس کی سینکڑوں مثالیں نکلیں گی، نہ انحصار ہو سکتا ہے نہ مقصود، غرض یہ ہے کہ روایات میں بسا اوقات حکم کو کسی ایک روایت کرنے والے نے کسی علت پر محمول سمجھا۔ دوسرے روایت کرنے والے نے کسی دوسری علت پر معلل سمجھا، وہ دونوں اپنی اپنی فہم کے موافق اس کو اسی طرح نقل فرمائیں گے جس طرح ان کے ذہن میں ہے، لیکن جس شخص کے سامنے دونوں طرح کی روایات

ہیں اور اصول وجوہ وہ یقیناً ایک علت کو ترجیح دیکر کسی ایک روایت کو راجح قرار دے گا اور دوسری کے لیے کسی توجیہہ کی فکر کرے گا، مگر کون؟ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کے سامنے ہر ہر مضمون کی سیکڑوں روایات موجود ہوں ہر ہر حدیث کے مختلف الفاظ مستحضر ہوں، بخلاف اُس شخص کے کہ جس کے سامنے صرف ایک ہی حدیث کا ترجمہ ہو نہ اُس کو دوسری حدیث کے تعارض کا علم نہ وجوہ ترجیح کی خبر وہ کیا علت کے رجحان کو سمجھ سکتا ہے اور کیا کسی حدیث کو ترجیح دے سکتا ہے۔

اختلاف روایات کی ساتویں وجہ

روایات حدیث کے اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے الفاظ کلام میں ایسے مستعمل ہوتے ہیں جن کے لغوی معنے بھی مستعمل ہیں اصطلاحی بھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معنی کے لحاظ سے کوئی کلام ارشاد فرمایا جس کو بعض سننے والوں نے دوسرے معنی میں استعمال سمجھا، اس کی ایک دو مثالیں نہیں، سیکڑوں نہیں، ہزاروں بلکہ لاکھوں ملیں گی، مثلاً وضو کا لفظ اصطلاحی معنی کے لحاظ سے متعارف وضوء کے معنی میں ہوتا ہے لیکن معنی لغوی کے لحاظ سے نظافت، ستھرائی، پاکیزگی اور ہاتھ دھونے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ شمائل ترمذی کی روایت ہے کہ سلمان فارسیؓ نے حضور سے عرض کیا کہ میں نے توراۃ میں پڑھا ہے کہ کھانے کے بعد وضو کرنا برکت طعام کا سبب ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ کھانے سے قبل اور کھانے کے بعد دونوں وقت وضوء کرنا برکت طعام کا سبب ہے، اس جگہ پر سلمانؓ کے کلام میں بھی اور حضور کے ارشاد میں بھی وضوء کا لفظ بالاتفاق ہاتھ دھونے کے معنی میں ہے۔

ایسے ہی ترمذی شریف میں عکراش کی ایک طویل حدیث ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ اس کھانے سے فراغت پر پانی لایا گیا۔ حضور نے اپنے دست مبارک دھوکر ہاتھوں کو منہ پر اور بازوؤں پر پھیر لیا۔ اور فرمایا کہ عکراش آگ کی پکی ہوئی چیزوں سے جو وضو کا حکم ہے وہ یہی وضو ہے روایت اگرچہ متکلم فیہ ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس حدیث میں وضو اصطلاحی مراد نہیں۔

ایسے ہی جمع الفوائد میں بروایۃ بزار نقل کیا ہے۔ حضرت معاذ سے کسی نے پوچھا کہ تم آگ کی پکی ہوئی چیزوں سے وضو کیا کرتے تھے انھوں نے فرمایا کہ ہاتھ منہ دھو لیتے تھے اور اس کو ہی وضوء سے تعبیر کیا کرتے تھے ان ہی روایات کی بنا پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ آگ کی پکی ہوئی چیزوں کے

بات میں جہاں جہاں روایات حدیث میں وضوء کا حکم آیا ہے اُس سے یا وضوء لغوی مراد ہے یا وہ حکم منسوخ ہے۔

اسی طرح حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ بعض اعضاء وضوء کو دھو کر یہ ارشاد فرمایا کہ ھذا وضوء من لم یحدث یہ اُس شخص کا وضوء ہے جو پہلے سے باوضوء ہو، اب یقینی امر ہے کہ بعض اعضاء کے دھونے کو شرعی وضوء نہ کہا جائے گا۔ یہ مثال کے طور پر وہ مواضع گنوائے ہیں جہاں قطعی وضوء اصطلاحی نہیں جس سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ وضوء اور ایسے ہی بعض دیگر الفاظ بھی معنی لغوی و اصطلاحی دونوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اب اختلاف کا سبب اس سے خود واضح ہو جائے گا۔ بسا اوقات ایسی صورت بھی پیش آئے گی کہ ایسے مواقع میں بعض نقل کرنے والے اُس کو وضوء اصطلاحی پر محمول فرمائیں گے وہ یقیناً توضیح کے لیے کوضوئہ للصلوٰۃ کا لفظ بھی اضافہ کریں گے تاکہ اشتباہ کا شک نہ رہے اور سننے والے کو خلجان نہ ہو۔ اور اس کے بالمقابل جس شخص کی تحقیق کے موافق یہ وضوء اصطلاحی نہیں بلکہ لغوی ہے۔ وہ یقیناً اس کو ہاتھ منہ دھونے کی توضیح کے ساتھ نقل کرے گا۔ اسی خیال سے کہ سننے والے کو اشتباہ نہ ہو اور حدیث کے ساتھ اُس کی تفسیر بھی ہو جاوے۔ اب اس جگہ اختلاف روایات بھی لابدی ہو گیا اور اس کی وجہ سے اختلاف صحابہؓ اور تابعین اور اس کے بعد اختلاف فقہاء بھی لازمی ہو گیا۔ یہی وجہ ہوئی کہ اول زمانہ میں آگ کی پکی ہوئی چیزوں کے کھانے سے وضوء کا واجب ہونا مختلف فیہ رہا لیکن اخیر دور میں اکر ائمہ کے زمانہ میں چونکہ روایات وضوء کے نہ توڑنے والی زیادہ تھیں اس لیے عدم وجوب کو ترجیح ہو گئی اور ائمہ اربعہ کا وضوء نہ ٹوٹنے پر اتفاق ہو گیا۔ لیکن سینکڑوں مسئلے ایسے ہیں کہ جن میں اس اختلاف کی وجہ سے ائمہ متبوعین اور اہل مذاہب میں اختلاف باقی رہا۔ مثلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ نمازی کے سامنے سے عورت، کتا، اور گدھے کے گزرنے سے نماز قطع ہو جاتی ہے بعض سننے والوں نے اس کو اپنے ظاہر پر رکھا اور نماز قطع ہونے سے نماز کا حقیقۃً فاسد ہو جانا سمجھا، اُن کے نزدیک نماز فاسد ہو گئی لیکن دوسرے بعض صحابہ اور اہل فقاہت لوگوں کی رائے ہے کہ نماز کے فساد کو ان چیزوں سے کوئی خاص تعلق نہیں اس لیے یقیناً اس کے معنی حقیقی مراد نہیں بلکہ نماز قطع ہو جانے سے نماز کا خشوع قطع ہو جانا مراد ہے اور اس کے لیے ایک

دو نہیں متعدد قرائن موجود ہیں جو اپنے اپنے مواقع پر مذکور ہیں۔ اختصاراً ہم نے ترک کر دیا۔

اختلاف روایات کی آٹھویں وجہ

جو ساتویں وجہ کے قریب ہے جس کی طرف اجمالاً اشارہ ہو بھی گزر چکا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کام کے کرنے کا حکم دیا یا کسی کام کی ممانعت فرمائی۔ حکم ہر زبان میں مختلف الانواع ہوتا ہے۔ بعض سننے والوں نے اس کو قطعی اور واجب الاطاعت قرار دیا۔ ان کے نزدیک اس کام کا کرنا واجب اور ضروری بن گیا۔ دوسرے بعض نے اس کو بہتری اور افضلیت کے لیے سمجھا۔ اور تیسری جماعت نے مثلاً صرف اجازۃ کا درجہ سمجھا۔ اسی قبیل سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وضوء کے ساتھ ناک میں پانی ڈالنے کے بارے میں ہیں کہ ایک جماعت نے ظاہر حکم کے لحاظ سے اس کو واجب قرار دیا۔ اور دوسرے گروہ نے اور قرائن کی وجہ سے اس کو افضلیۃ اور استحباب پر محمول فرمایا۔ ایسے ہی سو کر اٹھنے کے بعد وضوء سے قبل ہاتھ دھونے کا حکم ایک گروہ کے نزدیک اپنے ظاہر پر ہے اور ہاتھ دھونا اس وقت واجب ہے۔ دوسری جماعت کے نزدیک استحباب و سنیت کا درجہ ہے اور درحقیقت یہ وجہ اختلاف زیادہ طویل البحث ہے اور اس کے دفع کے لیے بجز مجتہد از فقیہ کے چارہ کار ہی نہیں اس لیے کہ مجرد حکم سامنے ہونے کی صورت میں ہر شخص مجبور ہے کہ اوامر اور دوسرے احکامات کو دیکھ کر یہ رائے قائم کرے کہ یہ حکم کس درجہ کا ہے۔

اگر ایک حدیث میں التحیات میں بیٹھنے پر تشہد پڑھنے کا حکم ہے تو دوسری حدیث میں اقتلوا الاسودین فی الصلوٰۃ الحیۃ والعقرب نماز میں دو چیز سانپ اور بچھو کے قتل کرنے کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں حکم ایک درجہ کے نہیں اور اسی بنا پر خود ائمہ مجتہدین میں اس موقع پر زیادہ اختلاف ہوا ہے کہ یہ امر وجوب کے لیے ہے یا استحباب و افضلیت کے لیے۔ اور اسی ذیل سے ائمہ میں اختلاف ہے کہ نماز میں تکبیرات انتقالات کا حکم رکوع و سجود میں اطمینان کا حکم نیز ان میں تسبیحات کا حکم التحیات پڑھنے کا حکم یہ سب احکام وجوب کے لیے ہیں یا استحباب و افضلیت کے لیے۔ ہر مجتہد نے رحمہم اللہ تعالیٰ نہایت جانفشانی اور عرق ریزی سے دوسری روایات حضور کے افعال صحابہ کے افعال اور اصول ترجیح کو مد نظر رکھتے ہوئے ان میں تفریق فرمائی اور ہر حکم کو اپنی تحقیق کے بعد اس کے موقع پر چسپاں کیا۔ یہاں محسوس ہوتا ہے کہ مجتہد کی کیوں ضرورت

پیش آتی ہے اور تقلید بغیر کیوں چارہ نہیں۔ صرف بخاری شریف کے ترجمہ میں کسی کام کے کرنے کا حکم دیکھ لینے سے نہ وجوب معلوم ہو سکتا ہے نہ استحباب و جواز۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے حدیث پڑھنے کے لیے اصول فقہ اصول حدیث پہلے پڑھنا ضروری قرار دیا ہے اور اسی وجہ سے علماء نے ضروری قرار دیا ہے کہ مجتہد کم از کم علم قرآن یعنی اس کے احکام خاص عام مجمل مفسر محکم مؤول ناسخ منسوخ وغیرہ جانے اور علم حدیث سے کماحقہ واقف ہو کہ روایت کے مراتب متواتر غیر متواتر مرسل متصل صحیح معلل ضعیف قوی نیز رواۃ کے درجات کو جانتا ہو اس کے علاوہ لغات کا ماہر احکام نحویہ سے واقف ہو نیز اقوال صحابہ و تابعین سے واقف ہو کہ کس مضمون پر اجماع ہے اور کس میں اختلاف ان سب کے بعد قیاس کے انواع و اقسام سے بھی واقف ہو۔

اختلاف روایات کی نویں وجہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار گوہر بار سے بسا اوقات بعض احکام تشحیذاً للاذہان یعنی غور و فکر کے لیے صادر ہوتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ٹخنوں سے نیچے لنگی لٹکائے نماز پڑھتے دیکھا تو آپ نے وضو اور نماز کے اعادہ کا حکم فرمایا۔ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بری طرح جلدی جلدی نماز پڑھی۔ حضور نے فرمایا کہ جاؤ پھر کر نماز پڑھو۔ تمہاری نماز نہیں ہوئی وہ دوبارہ نماز پڑھ کر حاضر ہوئے۔ حضور نے پھر بھی ارشاد فرمایا تیسری دفعہ کے بعد انھوں نے عرض کیا کہ مجھے سمجھا دیجئے میری سمجھ میں نہیں آیا تو پھر آپ نے اطمینان سے نماز پڑھنے کا طریقہ بتلایا۔ ایسے مواقع میں بھی اختلاف لازمی ہے مگر پہلے ذہن کو اپنے ہی حل پر چسپاں کرنے پہ ضروری نہیں اس کی جزئیات اگرچہ زیادہ نہ ہوں لیکن اسباب اختلاف میں داخل ضرور ہیں۔

اختلاف روایات کی دسویں وجہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اگر امت کے لیے نبی مرسل تھے تو خدام کے لیے طبیب جسمانی اور عشاق کے لیے طبیب روحانی اور علماء کے لیے مربی بھی تھے۔ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ماں باپ سے زیادہ شفیق و مہربان تھے تو استاد شیخ سے زیادہ تربیت و تہذیب فرمانے والے تھے۔ اگر شفقت کے باب سے سینکڑوں احکام ملتے ہیں تو تشدید و تنبیہ کے مواد پر بھی بہت سے ارشادات ملیں گے۔ یہ ایسے امور ہیں کہ جن میں ذرا بھی شائبہ اشکال و شبہ نہیں اس کی بداہت ہر شخص پر ظاہر ہے۔ اس بناء

پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر اوامر و ارشادات جو ایک حیثیت سے وارد تھے دوسری حیثیت کے ساتھ ملتبس ہو جانے لازمی تھے۔ اگرچہ یہ امور ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو مستقل وجہ قرار دے کر اس کو علیحدہ پیش کیا جاتا مگر مضمون بلا ارادہ طول پکڑتا جا رہا ہے گو اس کی اہمیت اس سے زیادہ تفصیل کی محتاج ہے۔ مگر ناظرین کی بددلی کے خیال سے جو طول کا اکثری نتیجہ ہوتا ہے ان سب وجوہ کو ایک ہی میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اختصار کے ساتھ چند اشارے پر اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مستحاضہ یعنی جس عورت کو تسلسل خون کا عارضہ ہو حضور نے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ ظہر عصر کے لیے ایک غسل کرے اور مغرب عشاء کے لیے دوسرا اور صبح کے لیے تیسرا۔ علماء کا اختلاف ہے کہ یہ غسل تشریعی ہے یا علاجی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمگاہ کے چھونے پر وضو کا بھی حکم ہوا اور یہ بھی ارشاد ہو کہ وہ تو ایسے ہی بدن کا جز ہے جیسے اور اجزاء بدن جس طرح اور کسی عضو کے چھونے سے وضو واجب نہیں ہوتا اسی طرح یہ بھی ہے۔ علامہ شعرانی فرماتے ہیں کہ حکم عامۂ مسلمین کے لیے ہے اور پہلا حکم خاص ہے اکابر اُمت کے لیے اسی طرح بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے چھونے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے۔ دوسری بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وضوء نہیں ٹوٹتا علماء کے اس میں بھی مختلف اقوال ہیں اور مختلف وجوہ سے ان دونوں میں ترجیح یا نسخ کیا گیا ہے۔ علامہ شعرانی کی رائے یہاں بھی وہی ہے کہ ایک حکم اکابر امت کے لیے دوسرا عوام کے لیے ہے۔ اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جنگ میں ارشاد ہے من قتل قتیلا فلہ سلبہ۔
جو کسی کافر کو قتل کر دے اس مقتول کے پاس جس قدر سامان ہے وہ اس قاتل کو مل جاوے گا ائمہ کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ یہ حکم سیاسی اور انتظامی ہے۔ حضور نے بحیثیت بادشاہ کے یہ حکم فرمایا تھا لہٰذا امیر کو یہ اختیار ہے کہ جس جنگ میں مصلحت سمجھے اس کا اعلان کر دے۔ دوسرے ایک گروہ کی رائے ہے کہ یہ حکم تشریعی ہے ہمیشہ کے لیے معمول بہ ہے، امیر کے کہنے پر موقوف نہیں کتاب الجہاد کی ہزاروں حدیثیں اس اختلاف کی اشارے سے پر ہیں۔ ایسے ہی مزارعت کے بارے میں اکثر روایات میں ممانعت کی وجہ مزدوروں پر شفقت ہے جو روایات دیکھنے والوں پر ظاہر ہے اسی طرح باب الصوم میں بہت سے لوگوں کو کثرت سے روزہ رکھنے کی ممانعت اُن پر شفقت سے تھی عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا مجھے اس کی اطلاع ملی ہے کہ تم ہمیشہ دن بھر روزہ

رکھتے ہو اور رات بھر نفلیں پڑھتے ہو۔ انھوں نے عرض کیا کہ بیشک۔ حضور نے فرمایا ایسا نہ کرو۔ کبھی روزہ کبھی افطار لیتے ہی رات کے بعض حصہ میں نوافل ادا کرو۔ اور کچھ حصہ رات کا سو بھی رہا کرو اس لیے کہ بدن کا بھی تم پر حق ہے۔ اس صورت میں تکان نہیں ہوگا۔ اہل وعیال کا بھی حق ہے کہ اُن کے لیے بھی کچھ وقت دن رات کا فارغ کرنا چاہیئے۔ دوست احباب، ملاقات کرنیوالوں کا بھی حق ہے ہر مہینہ میں تین روزے اور ایک ماہ میں ایک ختم قرآن کافی ہے۔ میں نے عرض کیا حضور اس سے تو بہت زیادہ طاقت ہے (مکرر سہ کرر عرض کرنے پر) ارشاد فرمایا کہ اچھا صوم داؤدی سے زیادہ کی اجازت نہیں کہ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار اسی طرح قرآن شریف کو سات راتوں سے کم میں ختم کی اجازت نہیں فرمائی۔ اس روایت کے الفاظ کتب حدیث میں کچھ مختلف وارد ہوئے ہیں اس حدیث کے موافق جو مشکوٰۃ میں بخاری مسلم کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے۔ دائماً روزہ کی ممانعت ابتداءً اسی طرح صوم داؤدی پر زیادہ کی ممانعت آخر حدیث میں اُن پر شفقت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے اس لیے عبداللہ بن عمرو اپنے ضعف و پیری کے زمانے میں افسوس کیا کرتے تھے کہ اُس وقت میں حضور کی رخصت کو قبول کر لیتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ اسی طرح تنبیہ و تشدد کے قبیل سے بہت سے ارشادات کتب حدیث میں ملتے ہیں۔ حضور کا ارشاد ہے کہ لا صام من صام الدھر جو عمر بھر روزہ رکھتا ہے اُس کا کچھ بھی روزہ نہیں۔ ایک جماعت کے نزدیک یہ ارشاد تنبیہ اور ڈانٹ کے طور پر ہے یہ مطلب نہیں کہ اس کو روزہ کا ثواب نہیں ہوگا یا اس کا روزہ ہی سرے سے نہ ہوگا۔ اسی طرح حضور کا ارشاد کہ زانی زنا کے وقت مومن نہیں ہوتا اور سارق سرقہ کے وقت مومن نہیں ہوتا۔ اسی طرح حضور کا ارشاد ہے کہ جو شراب پیوے چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ (تلک عشرۃ کاملۃ)

مثال کے طور پر یہ چند وجوہ بیان کی گئی ہیں ورنہ ان میں انحصار نہیں صرف اس امر کو ظاہر کرنا تھا کہ روایات میں اختلاف کی حقیقتہً وجوہ ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے اختلاف لازمی تھا اور ہونا چاہیے تھا۔ یہ وجوہ اختلاف نہ کسی مختصر تحریر میں آ سکتی ہیں نہ مجھ سے بے بضاعت کے امکان میں ان کا انحصار ہے۔ مقصود ان اوراق سے اجمالاً حاصل ہو گیا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ارشادات کا اختلاف کن انواع کا موجب ہے اور اس کے وجوہ کثیرہ میں سے مثال کے طور پر چند وجوہ ہیں جو ذکر کر دی گئیں۔

ہندوستان میں علم حدیث

(۷)

از مولانا تقی الدین صاحب ندوی مظاہری
(مقیم حال مدرسہ مظاہر علوم، سہارن پور)

مولانا فخر الدین زرادی مولانا دلی کے قریب سامانہ کے رہنے والے تھے؛ بچپن ہی میں تحصیل علم میں مشغول ہو گئے، اور دلی آکر مولانا فخر الدین ہانسوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، قاضی کمال الدین ہانسوی اور شیخ نصیر الدین چراغ ان کے رفیق درس تھے۔ انھیں ابتداءً تصوف وصوفیاء سے کوئی مناسبت نہیں تھی، شیخ نصیر الدین محمود کی ترغیب پر حضرت سلطان الاولیاء کی مجلس میں حاضر ہوئے، اور اس کے بعد اللہ کی توفیق نے انھیں اس درجہ پر پہونچایا کہ حضرت کے خلفاء میں ہوئے اور اپنی درس وافادہ کی مشغولیت کے باوجود حضرت سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد حرمین شریفین کا سفر کیا اور حج وزیارت سے فارغ ہو کر بغداد آئے اور یہاں کے مشائخ سے علم حدیث کو حاصل کیا، پھر ہندوستان واپس ہوئے، لیکن اثنائے راہ ہی میں کشتی ڈوب جانے سے شہید ہوئے، ان کی متعدد تصنیفات ہیں۔ مدرسوں میں علم صرف کی ایک کتاب زرادی انہی کی طرف منسوب ہے، میر خورد کرمانی جنھوں نے مدرسۂ نظامیہ کے علماء کی نگرانی میں تعلیم وتربیت حاصل کی ہو، انھوں نے سیر الاولیاء میں جو کچھ لکھا ہے دیکھ کر، یا مستند طریقے سے سُن کر لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"کاتب الحروف کے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان المشائخ کی خانقاہ کے نزدیک ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا، جہاں درس دیا کرتے تھے۔ اور اچھے طلباء کو جمع کر لیا تھا تاکہ اس طرح کاتب الحروف کچھ پڑھ لے۔" [۱]

---

[۱] سیر الاولیاء ص ۲۰۵

میر خورد آگے لکھتے ہیں کہ مولانا فخر الدین زرادی چاشت کی نماز کے بعد ہدایہ کا اسی مدرسہ میں درس دیا کرتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ جو خود ان کا چشم دید ہے، بیان کرتے ہیں کہ مولانا حسب دستور ہدایہ پڑھا رہے تھے، ایک عالم ربانی مولانا کمال الدین سامانی جو مشاہیر علماء میں سے تھے سلطان المشائخ کی زیارت کے لیے تشریف لائے، وہاں سے جب واپس ہوئے تو اس تعلق کی وجہ سے جو انھیں مولانا فخر الدین سے تھا، اس مجلس میں حاضر ہوئے۔"[1]

معلوم نہیں کہ مولانا کمال الدین شافعی تھے یا کیا قصہ تھا، اس زمانے میں دیگر مذاہب کے علماء بھی دلی میں موجود تھے، بہر حال کوئی وجہ ہو، مولانا کمال الدین کو دیکھ کر مولانا فخر الدین نے ہدایہ پڑھانے کا طریقہ عجیب طور پر بدل دیا، میر خورد لکھتے ہیں:۔

جب مولانا کمال الدین کی تشریف آوری دیکھی تو ہدایہ کی حدیثوں سے استدلال ترک کر کے صحیحین کی احادیث سے استدلال کرنے لگے۔	"چوں خدمت مولانا کمال الدین دید احادیث تمسکات ہدایہ را ترک، وادہ باحادیث صحیحین تمسک داد۔"[2]

اس ایک واقعہ ہی سے حدیث میں مولانا فخر الدین کے مقام اور کمال و تبحر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، آج شاید ہی کوئی ایسا محدث ملے کہ اس کے سامنے ہدایہ پیش کیا جائے اور بغیر سابقہ تیاری کے ہدایہ کے الفاظ کو چھوڑ کر اس کے مفاد کو صحاح کی احادیث سے ثابت کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ الا ماشاء اللہ۔

مولانا شمس الدین اودھی آپ اودھ کے شیخ الاسلام مولانا فرید الدین شافعی کے تلامذہ میں ہیں۔ اودھ سے تحصیل علم کے لیے دہلی تشریف لائے، دلی میں مولانا ظہیر الدین بھکری، جو دلی شہر کے مشاہیر علماء میں تھے، کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان کی مشارق الانوار پر ایک شرح بھی لکھی ہے، حضرت سلطان الاولیاء سے مرید ہوئے، اور ترقی کر کے اجل خلفاء میں شامل ہوئے، شیخ نصیر الدین محمود ان کے تلامذہ میں ہیں، شیخ نصیر الدین محمود نے ان کے تبحر علمی کو اس طرح خراج پیش کیا ہے:۔

---

[1] سیر الاولیاء، ص۲۶۸ [2] سیر الاولیاء، ص۹۳

ع ۔ سألت العلم من احیاک حقاً فقال العلم شمس الدین یحییٰ

سلطان محمد تغلق نے ان کو کشمیر اشاعتِ اسلام کے لیے بھیجنا طے کیا تھا، مگر ابھی اس پر عمل نہیں ہو سکا تھا، جانے کی تیاری میں تھے کہ ان کے سینے میں پھوڑا نکل آیا، سلطان نے یہ سمجھا کہ یہ نہ جانے کا بہانہ ہے، اسی تکلیف میں انھیں اپنے دربار میں بلایا، اور جب مرض کی تحقیق ہوگئی، توان کو واپس بھیج دیا، اور چند ہی دن کے بعد ان کا انتقال ہوگیا[۱]

میر خورد نے ان کو "دریائے علم" اور "گنج زہادت" بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ شہر کے بیشتر علماء آپ ہی سے تلمذ رکھتے تھے۔ "بیشتر علماء شہر منسوب بہ شاگردی ایں بزرگ اند"۔
مولانا آزاد بلگرامی نے لکھا ہے، کہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے وصال کے چند سال بعد ان کا انتقال ہوا۔[۲]

علامہ جلال الدین رومی | نامور اور مشہور اساتذہ میں آپ کا شمار ہے، آپ نے شیخ قطب الدین رازی شارح شمسیہ سے علم حاصل کیا، اور ہندستان تشریف لائے، فیروز شاہ تغلق نے دار السلطنت دلی میں اپنے مدرسہ کی تدریس آپ کے سپرد کی، چنانچہ اس مدرسہ میں فقہ، حدیث و تفسیر اور دیگر علوم کا درس دیتے تھے، بہت سے لوگوں نے آپ سے استفادہ کیا، ان کے تلامذہ میں شیخ یوسف بن جمال ملتانی ہیں، آپ کا سنِ وفات معلوم نہ ہو سکا[۳]

علامہ جلال الدین حسین بخاری | آپ شب برأت ۷۰۷ھ میں شہر اُچ میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو و نما پائی، اور قاضی بہاء الدین اُچی سے ابتداء سے ہدایہ تک ساری کتابیں پڑھیں، قاضی صاحب کے انتقال کے بعد ملتان کا سفر کیا، اور شیخ رکن الدین ابو الفتح کی خدمت میں حاضری دی، شیخ نے اپنے پوتے موسیٰ اور مجد الدین ملتانی سے پڑھنے کا حکم دیا، چنانچہ ان دونوں سے تمام درسی کتابوں کو ایک سال میں پڑھ کر اپنے وطن اُچ واپس آئے اور یہاں سے حرمین شریفین کا سفر کیا، مدینہ منورہ میں دو سال شیخ عفیف الدین عبد اللہ مطری کی خدمت میں قیام کیا، اور اُن سے عوارف المعارف پڑھی، پھر وہاں سے مصر، عراق وغیرہ کا سفر کیا، اور بڑے بڑے مشائخ سے استفادہ کیا، اور خرقۂ اجازت

(آگے تین صفحوں کی ترتیب غلط ہوگئی ہے نمبر سے دیکھ کر مضمون ملاحظہ فرمائیے)

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند ص۸۰ و سیر الاولیاء ص۲۸۳ و اخبار الاخیار ص۹۴-۹۵ [۲] سبحۃ المرجان ص۲۹ [۳] نزہۃ الخواطر ص۲۷/۲

بعد اپنے وطن واپس آئے۔ تقریباً تیس سال خلوت و تنہائی میں گزارنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ اپنی مخلوق کو فائدہ پہونچانا چاہا، تو خدا کی مخلوق نے ان کی طرف رجوع کیا، اور تقریباً نصف صدی سے زائد کا زمانہ خلقِ خدا کی ہدایت و ارشاد اور طالبین کی تعلیم و تربیت میں گزارا، ایک لاکھ سے زائد انسان آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، ۶ شوال ۷۸۲ھ میں وصال ہوا [1]

حضرت کے ملفوظات و مکتوبات میں بکثرت احادیث ملتی ہیں، کبھی اصل عبارت بھی لکھتے ہیں، اور زیادہ تر فارسی ترجمہ، فوائد المریدین .... جو شیخ کا مختصر رسالہ ہے، وہ تمام تر احادیث نبویؐ کے حوالوں سے لبریز ہے، اس کے شروع میں ایک جگہ مسند ابو یعلیٰ کا حوالہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسند ابو یعلیٰ کی احادیث بھی آپ کی نظر سے گزری تھیں، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "حدیث برادرم فخر الدین نوشتہ بود" [2] علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں، کہ اس سے میرے گمان میں مولانا فخر الدین زرادی مراد ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ حدیث کا فیض اسی نظامی جماعت سے ان کو پہونچا تھا — نیز فرماتے ہیں کہ — مجھ سے میرے ایک بزرگ نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت حسین نوشۂ توحید بہاریؒ جو حضرت شیخ شرف الدین کے معتقد اور شیخ کے مرید و جانشین امام مظفر بلخی بہاری کے مرید تھے، اور سفر حجاز میں ان کے رفیق تھے، معدن المعانی میں لکھا ہے، کہ امام نووی المتوفی ۶۷۶ھ کی شرح صحیح مسلم شیخ کے مطالعہ میں تھی، مکتوبات ..... دو صدی کے جامع نے جس نے ۷۶۹ھ میں اس کو جمع کیا، دیباچہ میں آپ کی نسبت لکھا ہے۔ "محیِ سنن نبوی مظہر آثار مصطفوی قامع دینِ اہل البدع، بانی دینِ اہل الورع" [3]

مخدوم بہاری کے حالات میں صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ دیوہ کے ایک بزرگ جو خود بھی فقہ و حدیث میں کمال رکھتے تھے، جب بہار حضرت سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے، تو ان کی خدمت میں جو تحفہ پیش کیا تھا وہ کوئی تصوف کی کتاب نہیں تھی بلکہ،

"اھدی الیہ صحیح مسلم بن الحجاج النیشاپوری" [4]	تحفہ میں ان کے سامنے صحیح مسلم بن الحجاج نیشاپوری پیش کی۔

---

[1] دعوت و عزیمت جلد سوم [2] مکتوب ہفتم بنام امام مظفر [3] مقالاتِ سلیمانی صفحہ ۲۳ [4] نزہۃ الخواطر صفحہ ۲۴ ج ۲

شیخ علی بن شہاب حسینی ہمدانی | علی بن شہاب بن محمد بن علی حسینی ہمدانی۔ آپ اسماعیل بن علی بن محمد بن علی بن حسین السبط علیہ وعلیٰ جدہ السلام کی اولاد میں ہیں، ۱۲ رجب ۷۱۴ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، شیخ نجم الدین اذکانی سے علم حدیث حاصل کیا، اور سلوک کی تکمیل شیخ شرف الدین مزدقانی اور شیخ تقی الدین علی دوسی سے کی، یہ دونوں شیخ رکن الدین احمد بن محمد کے شاگرد ہیں جو علاء الدولہ سمنانی کے نام سے مشہور ہیں، کہا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے والد سے بھی علم حاصل کیا، پھر مختلف شہروں کی سیاحت کے لیے گئے اور بڑے بڑے مشائخ سے ملاقات اور اُن سے استفادہ کیا، ان کے اساتذہ کی تعداد چودہ سو بتائی جاتی ہے۔ جب خراسان واپس آئے تو ان کے اور وہاں کے حاکم امیر تیمور کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا، اس لیے وہاں سے سات سو ساتھیوں کے ہمراہ ۷۷۴ھ یا ۷۸۱ھ میں کشمیر تشریف لائے، ان کے ہاتھ پر اکثر کشمیر کے باشندے مسلمان ہوئے، شیخ ہمدانی کی متعدد تصنیفات ہیں، جن میں ایک رسالہ مناقب اہلبیت میں ہے، اور ایک رسالہ "اربعینیہ" ہے، جس میں چالیس احادیث اپنے شیخ شیخ نجم الدین ذکانی سے لے کر حضرت انس بن مالک تک کی سند کے ساتھ جمع فرمائی ہیں۔

کشمیر سے نکل کر پاغستان کے قریب پہونچے تھے، اور یہیں ان کا انتقال ۷۸۶ھ میں ہوا......۔

مولانا عبد العزیز اردبیلی | آپ کو فقہ وحدیث میں کامل دستگاہ تھی، دمشق میں شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ حرانی، برہان الدین برکج، جمال الدین مزی، شمس الدین ذہبی وغیرہ علماء سے تعلیم پائی تھی پھر ہندوستان تشریف لائے اور محمد شاہ تغلق کے مقربین میں داخل ہوئے، بادشاہ نے ان کے ساتھ سلوک کیا، اور بڑی عزت کی۔

ابن بطوطہ کے حوالے سے صاحب نزہۃ الخواطر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ مولانا عبد العزیز نے بادشاہ کے سامنے ایک دن بنو عباس کے بارے میں کچھ حدیثیں سنائیں، بادشاہ کو بے حد پسند آئیں، اتنا خوش ہوا کہ جوشِ مسرت میں اُن کے دونوں قدم بادشاہ نے چوم لیئے، اور حکم دیا کہ سونے

---

[1] نزہۃ الخواطر ج۲ ص۸۵۔

حاصل کیا، زہد و تقوی، اور خیر و خیرات میں بہت اونچے مقام پر فائز تھے "کان فقیہاً محدثاً" فقیہ و محدث تھے، اور اصول و فروع میں حنفی المسلک تھے، امام ابو حنیفہ کے قول پر فتوی دیتے تھے، البتہ بعض مسائل میں مذہب حنفی سے ان کے تفردات بھی ہیں، بہت سے فضلاء کی جماعت اُن سے فیضیاب ہوئی، ہندوستان میں ان کی ذات گرامی مرجع بن گئی، سلطان محمد شاہ تغلق نے سندھ کا شیخ الاسلام بنایا، فیروز شاہ تغلق نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، آپ اُس کے عہد میں کئی مرتبہ دلی تشریف لائے، ان کی وفات ۷۰۸ھ میں ہوئی [۱]۔

شیخ محدث محمود بن یوسف کرمانی | شیخ محدث محمود بن یوسف بن علی کرمانی ہندی حنفی نصیر الدین، آپ کا مکہ مکرمہ میں عرصہ تک قیام رہا، اس لیے نزیل مکہ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، انھوں نے صحیح ابن حبان کا رضی طبری، زین طبری اور جمال مطری، اور شیخ خلیل مالکی وغیرہ سے سماع حاصل کیا، مکہ مکرمہ سے ہندوستان واپس آرہے تھے، راستہ میں انتقال ہوا [۲]۔

مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری | مخدوم الملک بہاری خطاب، احمد نام، شرف الدین لقب، والد کا نام شیخ یحییٰ تھا، جو زبیر بن عبد المطلب کی اولاد میں تھے، اس لیے آپ کا خاندان ہاشمی قریشی تھا، شعبان کے آخری جمعہ ۶۶۱ھ میں قصبۂ "منیر" میں آپ کی پیدائش ہوئی، "شرف آگیں" تاریخ ولادت ہے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، اس کے بعد یہاں سے تکمیل علم کے لیے سنارگاؤں (نزد ڈھاکہ) کا سفر کیا، اور وہاں مولانا شمس الدین ابو توامہ جو اپنے دور کے بے نظیر عالم تھے، اُن سے پوری جد و جہد اور انہماک کے ساتھ اپنے علم کی تکمیل کی، یہاں تک کہ اپنے وطن کے خطوط وغیرہ بھی مطالعہ میں نہیں پڑھتے تھے، کہ اس سے یکسوئی میں فرق آئے گا، علم سے فراغت کے بعد شیخ ابو توامہ نے اپنی صاحبزادی سے ان کا نکاح کردیا، جس سے تین اولادیں ہوئیں، مگر اس کے بعد بیوی اور دو بچوں کا انتقال ہوگیا، اپنے ایک صاحبزادے ذکی الدین کو لے کر منیر ۶۹۰ھ یا ۶۹۱ھ میں واپس آئے، ا[؟] کچھ دن قیام کرکے دلی کا سفر کیا، دلی کے مشائخ اور حضرت سلطان الاولیاء کی زیارت کی، اور یہاں سے پانی پت کا بھی سفر کیا، پھر واپس اپنے وطن آئے، دوبارہ پھر طلب و شوق میں دلی کا سفر کیا، اور [؟] نجیب الدین فردوسی کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اُن کے اجل خلفاء میں ہوئے اور اس کے

---

[۱] نزہۃ الخواطر ص ۲۶، ۲۷ ج ۲　[۲] نزہۃ الخواطر ص ۱۵۱ ج ۲

کی سینی میں دو ہزار تنکے لائے جائیں، خود بادشاہ نے اُٹھ کر ان پر ان تنکوں کو نچھاور کیا (تنکہ اُس زمانے کا ایک سکہ تھا) اور کہا کہ مع سینی کے یہ تنکے آپ کے ہیں ؎

غور کرنے کی بات ہے کہ جس ملک میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ و علامہ ذہبی کا شاگرد ہوئے، اور بادشاہ بھی اُن کا قدردان ہو، بھلا اُس ملک میں علم حدیث کا چرچا نہیں ہوا ہوگا۔

سلطان محمود شاہ بہمنی م ۷۹۹ھ اور علم حدیث بہمنیوں نے سب سے پہلے دکن میں اپنی حکومت قائم کی، ان میں سلطان محمود بن حسن بہمنی بڑے عادل اور علم کے قدردان تھے، عربی و فارسی دونوں سے واقف تھے، ان کے ارد گرد اہلِ علم و فضلاء کا ایک بڑا حلقہ جمع ہوگیا تھا ان کا زمانہ ۷۸۰ھ سے ۷۹۹ھ تک ہے، صاحب نزہۃ الخواطر ان کے کارناموں میں لکھتے ہیں:۔

"جعل الارزاق السنية للمحدثين	محدثین کی اس بادشاہ نے بڑی بڑی تنخواہیں
ليشتغلوا بالحديث بجمع الهمة	مقرر کیں، تاکہ باطمینان قلب کامل توجہ کے
وفراغ الخاطر وكان يعظمهم	ساتھ علم حدیث کی اشاعت میں مصروف
غاية التعظيم ؎	رہیں، بادشاہ محدثین کی بڑی تعظیم کرتا تھا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دور میں محدثین کی ایک پوری جماعت پوری یکسوئی سے علم حدیث کی خدمت میں مشغول تھی۔

(باقی)

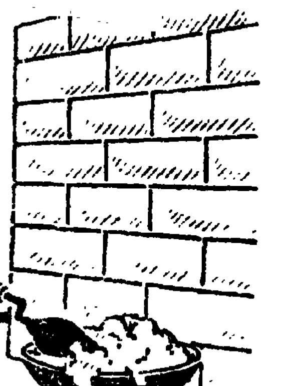
؎ نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۵۰ ؎ نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۲۶

ایک نئی صحت کی بنیاد رکھئے!

TIBBIYA COLLEGE DAWAKHANA ALIGARH

مَاءُ اللحم خاص

قبل از وقت بوڑھوں اور غیر صحت مند نوجوانوں کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ تازہ پھلوں قیمتی دواؤں اور بہترین غذاؤں سے جدید طریقہ پر تیار کیا جاتا ہے



دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

(بقیہ بوئے گل در برگ گل)

خیر خیریت دیگر بندے کو مسرت بخشی ـــــ یہ عجیب بات ہے کہ آپ نے اپنے وطن رامپور کو چھوڑ کر نواب نصر اللہ خاں کے متوسلین کی ملازمت اختیار کر لی ہے۔ یہ بات آپ کی شان کے مناسب نہیں ہے۔ اس میں سلف کی بدنامی بھی ہے۔ والدہ ماجدہ کا پاس خاطر ایک روز ہو دو روز ہو نہ کہ مدتوں (اُن کے کہنے پر یہ سلسلۂ ملازمت جاری رکھا جائے) رامپور میں آپ کے مستفیدین بہت تھے (وہاں رہیں) ورنہ دہلی۔ جائے پیرانِ کرام ہے۔ اگر اپنے باطن کے تنور اور دوسرے لوگوں کے دلوں کے تنور کو گرم رکھنا منظور ہے تو دہلی سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر جگہ رزاق ہے۔ یہ بندۂ لاشی اس جگہ منکرین بسیار کے باوجود بھوک اور فاقے سے مرا نہیں ہے۔ (آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے) یہ وعدۂ الٰہی کے صدق کی بات ہے۔ والسلام۔



نئی مطبوعات

تفسیر ماجدی جلد دوم

از مولانا عبدالماجد دریابادی، مدیر صدق جدید
ناشر صدق بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ

قریباً ۸۰۰ صفحات، بڑا سائز، کتابت، طباعت اور کاغذ بہتر، قیمت مجلد ۱۷/- بلا جلد ۱۵/-

جلد اول کا تعارف بہت پہلے آچکا ہے، اس دوسری جلد کو چھپے ہوئے بھی کافی دن ہو گئے۔ ہمارے پاس آئے ہوئے بھی اچھا خاصا وقت گزر گیا۔ مگر اور بہت سی کتابوں کے ساتھ اس کا تعارف و تذکرہ بھی اپنی مجبوریوں کے باعث رکا پڑا رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج اس فرض سے سبکدوشی کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔

یہ جلد سورۂ نساء سے سورۂ توبہ کی اُن آیتوں تک کی تفسیر پر مشتمل ہے جو دسویں پارہ میں آگئی ہیں۔ یعنی کوئی ساڑھے چھ پاروں کی تفسیر ـــــ خصوصیات وہی ہیں جن کا ذکر پہلی جلد کے تبصرے میں قدرے تفصیل سے آچکا ہے یعنی با محاورہ ترجمہ۔ کتب سابقہ سے متعلق اشاروں کی محققانہ تشریح اور اُمم سابقہ کے قصص و واقعات اور عادات و اطوار کی مستند تفصیل۔ مغربی افکار اور قرآن پر ان مفکرین کے اعتراضات کا اس خاص انداز میں رد جس سے مولانا کے ہفتہ وار "صدق" کے ناظرین خوب واقف ہیں۔ اسی ضمن میں مغربی اور دوسری غیر مسلم قوموں کے عقائد و نظریات اور رسوم و عادات کے مقابلے میں قرآنی تعلیمات کی برتری کا اثبات اور اُن کے منجانب اللہ یا فوق البشری ہونے پر استدلال بھی موقع موقع سے ہوتا گیا ہے۔ جدید سائنس سے قرآن کے ٹکراؤ کا جو ایک خیال پھیلا دیا گیا ہے اُس کے ازالے کی طرف بھی مولانا کی توجہ پوری رہی ہے۔

تفسیر حواشی (یا فٹ نوٹس) کی شکل میں ہے جن میں تشریح طلب الفاظ اور جملوں سے

متعلق لغوی توضیحات بھی ائمہ فن کے حوالے سے ہوتی ہیں، مفسرین کے بیان کردہ مطالب اور نکات بھی آتے ہیں اور فقہاء، اہل کلام اور ارباب تصوف کے ارشادات و استنباطات بھی۔ کمی صرف اتنی پہلی جلد میں بھی محسوس ہوئی تھی اور اس جلد کے مطالعہ میں بھی محسوس ہوتی ہے کہ نظم قرآن یا آیات کے مضمونی ربط کو ظاہر کرنے کی طرف مولانا نے کوئی خاص توجہ نہیں فرمائی ــــ اپنے اوپر ذمہ داری کم سے کم لینے کی جو احتیاط مولانا نے اس تفسیر میں اپنائی ہے عین ممکن ہے یہی احتیاط مولانا کو اس کام سے روکنے کا باعث ہوئی ہو، جس میں زیادہ ذمہ داری اپنے ہی پہ آتی ہے۔

رویت ہلال کا مسئلہ
عصر حاضر کے وسائل و ترقیات کی روشنی میں

از مولانا محمد برہان الدین سنبھلی۔ استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء

ناشر:۔ مجلس تحقیقات شرعیہ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ

کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ۔ درمیانہ کتابی سائز

صفحات ۱۲۴ قیمت ... تین روپے

خبر رسانی کے ریڈیو اور ٹیلیفون جیسے وسائل کی ایجاد سے دوسرے حادثات و واقعات کی طرح رمضان اور عیدین کا چاند ہو جانے کی اطلاع بھی آن کی آن میں ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچنے لگی ہے۔ یہ اطلاع جب ملک کے اندر ہی کی ہوتی ہے تو جن مقامات پر چاند دیکھنے میں نہیں آیا ہوتا وہاں کے لوگوں کے ذہن میں اس سے یہ سوال قدرتی طور پر کھڑا ہو جاتا ہے کہ وہ بھی روزہ رکھیں یا نہ رکھیں یا عید کریں نہ کریں؟ کیونکہ ایک ہی ملک یا جغرافیائی وحدت کے اندر یہ بات کہ کہیں چاند نظر آئے اور کہیں نہ آئے عموماً ابر یا غبار وغیرہ کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس بنا پر یہ خیال ہوتا ہے کہ چاند ہوا یہاں بھی ہوگا مگر اس عارض کی وجہ سے نظر نہیں آیا۔ علاوہ ازیں کچھ بعد میں مقامی اور قریب جوار کے ذرائع سے عموماً یہ اطلاع مل ہی جاتی ہے کہ بعض لوگوں کی شہادت پر چاند کا ثبوت ہوا۔ لہٰذا لوگ چاہتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ بعد میں ایک روزہ قضا کرنا پڑے یا پتہ چلے کہ ہم نے عید ایک دن دیر سے کی، یا بجائے شام کے صبح کو معلوم ہو کہ آج عید ہے اور روزہ توڑنا پڑے وغیرہ وغیرہ (لہٰذا) ریڈیو یا ٹیلیفون کی خبروں پر اعتماد کر کے روزہ رکھیں اور عید منائیں۔ یعنی علم و اطلاع کے جدید وسائل سے فائدہ اٹھائیں۔

زیر نظر کتاب میں وقت کے اسی مسئلہ سے بحث کی گئی ہے۔ اور کتاب و سنت خاص کر فقہاء کے ارشادات کی روشنی میں بہت واضح اور قطعی فیصلے کئے گئے ہیں کہ کن شرائط کے ساتھ ریڈیو

خبریں چاند کے معاملے میں معتبر ہوں گی، اور کن صورتوں میں ان کا اعتبار نہیں ہو سکتا۔

مصنف نے بڑی محنت سے اپنے نقطۂ نظر کے دلائل پیش کیے ہیں اور جو بات کہی ہے اُسے حتی الامکان دلیل کے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ اور دلائل بھی مستند حوالوں کے۔ جن لوگوں کی سمجھ میں مسئلے کی شرعی نوعیت سے ناواقفی کی بنا پر یہ بات نہیں آتی ہے کہ مطلع ایک ہونے کے باوجود کسی جگہ سے چاند ہونے کی خبر ریڈیو پر آجانے کے بعد خصوصاً کسی پڑوسی اسلامی ملک کے ریڈیو کی خبر کے بعد چاند کیوں نہیں مان لیا جاتا، اُن کا ذہن امید ہے کہ اس کتاب سے بالکل صاف ہو جائے گا۔ اسی طرح جو لوگ ریڈیو پر کسی خلیفۃ المسلمین یا علماء دین کا تصرف نہ ہونے کی بنا پر کسی ایسی شکل کا تصور نہیں کر پاتے ہیں جس سے ریڈیو کی خبر فقہاء کے طے کردہ شرائط پر پوری اتر سکے، انھیں بھی امید ہے اطمینان ہو جائے گا کہ بعض شکلیں بحالت موجودہ بھی ایسی نکل سکتی ہیں ــــ البتہ جو لوگ کسی نئے دور کے نئے مسائل کے شرعی حل کا تصور یہ رکھتے ہیں کہ حالات اور حقائق کے ساتھ بھی پورا انصاف ہو اور کسی تکلف و تشدّد کے بغیر ایک صاف سیدھی اور قابل فہم عملی راہ سامنے لائی جائے، انھیں اس کتاب میں اپنا مطلوب نہ مل سکے تو کچھ بعید نہیں۔ اس لیے کہ مصنف اصولاً اگرچہ یہ ذہن رکھتے ہیں مگر عموماً اُن کا جھکاؤ اس مسلک کی طرف زیادہ ہو گیا ہے کہ مسئلہ کیا ہی نو پیدا اور حالات کیسے ہی مختلف ہوں مگر اس کا حکم اگلے فقہاء ہی کے یہاں سے ماخوذ ہونا چاہیے۔ انھوں نے جو حکم کسی مماثل مسئلے میں دیا ہو اسی کے استرداد سے اپنے مسئلے میں کام چلایا جائے، ایسی کوئی تجویز نہیں ہونی چاہیے جو اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ فقہاء کی عبارتوں پر منطبق نہ ہو جائے۔ اس عملی رویہ سے تکلف کی صورتیں پیدا ہونا، تجویزوں میں غیر ضروری پیچیدگی اور ناقابل فہم پابندیوں کا آنا اور حالات و حقائق کے ساتھ انصاف کے تقاضے مجروح ہو جانا ایک ناگزیر سی بات ہے ــــ اس پہلو سے ذیل کی چند مثالیں وضاحت مدعا کے لیے مفید ہوں گی۔

۱۔ ہمارے فقہاء کا دور خلفاء و سلاطین اور قضاۃ کا دور تھا، اس میں رویت ہلال کے اعلان کا سرکاری طور پر انتظام ہوتا تھا، یہ اعلان اگر خلیفہ یا سلطان یا قاضی القضاۃ کی طرف سے ہوتا تو جہاں تک بھی سرکاری ذرائع سے حدود مملکت میں پہونچ جائے واجب العمل تھا۔ اگر قاضی شہر کی طرف سے ہوتا تو اُس ایک شہر اور اس کے مضافات میں واجب العمل تھا۔ والی مملکت یا قاضی القضاۃ

اور قاضی شہر کے حدودِ اختیارات کے فرق کی بنا پر یہ تقسیم ایک معقول اور قدرتی بات تھی، لیکن آج، جبکہ ایک سعودی عرب کو چھوڑ کر کہیں یہ نظام سلطنت نہیں پایا جاتا، خصوصاً ہندوستان جیسے ملکوں میں، اس کی مصنوعی شکلیں فرض کر کے ان میں، یہ تقسیم اختیارات جاری کرنا ایک کھلا ہوا تکلف محسوس ہوتا ہے۔ ایک مقامی رویت ہلال کمیٹی جو مصنف کی بیان کردہ شرائط کے مطابق ہو یا ایک معتمد عالم اگر رؤیت کا فیصلہ کر دیتا ہے اور پھر ضروری شرطوں کے مطابق ہی ایک ریڈیو اسٹیشن اس فیصلہ کی اطلاع نشر کرے تو شرعاً کوئی وجہ اس کی نظر نہیں آتی کہ دوسرے مقامات کی کمیٹیاں یا علماء اگر اس عالم یا کمیٹی کو قابلِ اعتماد جانتے ہیں اور (اطلاع کی صداقت کا بھی ظن غالب ہے) تو اس کے فیصلے کی بنا پر اپنے یہاں کے لیے رؤیت کا فیصلہ نہ کر سکیں۔ بلکہ ان کی ذمہ داری نہ ہو کہ وہ ایسا فیصلہ کریں۔ ـــ لیکن زیرِ نظر کتاب کے مطابق یہ فیصلہ اس وقت تک جائز نہیں ہوگا جب تک کہ کئی ریڈیو اسٹیشنوں سے کئی جگہ کی ایسی ہی اطلاع نہ آجائے۔ یعنی فقہاء کی اصطلاح میں "استفاضۂ خبر" کی صورت پیدا ہو جائے ـــ جبکہ ریڈیو کی ایسی ہی اطلاع اگر ایک ملک گیر نمائندگی والی کمیٹی یا ملک بھر کی مسلّمہ دینی شخصیت کے فیصلے کی بابت ہو تو پھر اس پر عمل درآمد کے لیے کوئی مزید قید نہیں لگائی گئی ہے، یعنی ایک کا حکم سلطان اور خلیفہ کا حکم ہے اور دوسرے کا محض قاضی شہر کا۔ حالانکہ یہ ایک بالکل مصنوعی اور فرضی تقسیم ہے۔ نہ کوئی قاضی ہے نہ سلطان، کہ اُن کے حدودِ اختیار پر مسئلہ چلے، یہاں صرف فتویٰ اور فیصلہ ہے امر و تنفیذ کا کوئی منصب نہیں، لہٰذا اس منصب کے فرقِ مراتب کی بنیاد پر حکم رویت کے دو الگ الگ دائرۂ اثر اور اُن کے جداگانہ احکام جو کسی زمانے میں بامعنیٰ تھے آج اُن کے کوئی معنی نہیں معلوم ہوتے، اب یا تو دونوں صورتوں میں استفاضۂ خبر کی شرط لگے، یا دونوں ہی سے ساقط ہو۔

۲۔ اس فرق کے مسئلے سے قطع نظر یوں بھی ریڈیو کے مذکورۂ بالا نوعیت کے نشریہ کی صورت میں "استفاضۂ خبر" کی شرط محض ایک تکلف اور تشدد نظر آتی ہے، جس کے پیچھے فقہاء کی لفظی پیروی کے سوا اور کچھ نہیں، ریڈیو کے جس طرح کے نشریے کو مصنف محدود اور وسیع دائرے میں قابلِ اعتبار ٹھیراتے ہیں وہ در اصل اسی وقت قابلِ اعتبار ہوگا جبکہ یا تو کچھ مدت کے تجربے سے اس معاملہ میں ریڈیو کی صداقت اور ذمہ داری کا بھروسہ ہو جائے اور یا وزارتِ اطلاعات و نشریات (جس کا ایک شعبہ ریڈیو ہے)

سے کوئی باقاعدہ اور مشتہر قرارداد ہو کہ ریڈیو پر چاند کی خبر اس خاص ضابطے کی تکمیل کے بعد اور اس خاص طریقہ ہی پر نشر کی جائے گی جسے اس کتاب میں لازم قرار دیا گیا ہے' ورنہ ان دونوں میں سے کوئی بھی بات اگر نہ ہو تو اس طرز کی خبر میں جو آج کل ہمارا ریڈیو دیتا ہے' اور اس طرز کی خبر میں جسے مصنف یا دوسرے علماء تجویز کرتے ہیں' اعتبار و قبول کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں مانا جا سکے گا ——
ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ریڈیو کا نشریہ محض ایک "خبر" نہیں رہے گا جس کے پیچھے صداقت کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی۔ اور ظن غالب پیدا ہونے یا یقین کرنے کے لیے متعدد ذرائع سے متعدد خبروں کی ضرورت ہوتی ہے، فقہاء جس خبر کے "استفاضے کی شرط لگاتے ہیں وہ اس عام" خبر" یا ریڈیو کی آج کل کے ضابطے اور انداز والی خبر کے لیے تو بالکل صحیح ہے لیکن ریڈیو کے جس نشریے کو ہم ایک جگہ "منادی سلطان" کے درجے میں معتبر مان لیں دوسری جگہ اُسے محض" ایک خبر" کے درجے میں ڈال کر استفاضۂ خبر کی ضرورت بتانے میں کیونکر حقیقت پسند ہو سکتے ہیں؟

۳۔ ریڈیو کا نشریہ جن شرائط کے ساتھ قابلِ قبول ہوگا اُن میں سے ایک لازمی شرط کتاب میں یہ بتائی گئی ہے کہ اناؤنسر (نشر کرنے والا) مسلم ہو۔ ہمیں یہ بھی ایک غیر ضروری تشددہی محسوس ہوتا ہے، اس کی سب سے مضبوط دلیل کتاب میں یہ بتائی گئی ہے کہ "فقہاء کے کلام سے اس کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی، بس فاسق مسلمان تک کی اجازت نکلتی ہے، کیونکہ انھوں نے سرکاری دعلانچی (منادی سلطان) کے بارے میں یہ تو کہا کہ فاسق بھی ہو تو اس کا اعلانِ رویت مقبول ہوگا لیکن یہ نہیں کہا کہ کافر بھی ہو تب بھی۔ اور اُن کے یہاں قیود عام طور پر احترازی ہوتی ہیں اتفاقی نہیں، لہٰذا "عاد لاً کان او فاسقاً" کہہ کر اُن کا رک جانا دلیل ہے اس بات کی کہ کافر کی گنجائش نہیں ہے" —— لیکن معاملہ کا ایک پہلو یہ بھی تو قابلِ توجہ ہے کہ اُس دور میں (خلفاء و سلاطین کے دور میں) اس کا سوال ہی کیوں پیدا ہونے لگا تھا کہ غیر مسلموں کی خدمات اس کام کے لیے حاصل کی جائیں۔ یہ ایک دینی نوعیت کا کام صرف مسلمانوں ہی تک محدود رہنا بالکل قرینِ قیاس ہے۔ اس لیے مسئلہ صرف عادل و فاسق ہی کا درپیش ہو سکتا تھا اور اس بنا پر فقہاء کے اس قول میں تو اسلام کی مضمر قید کو قید اتفاقی ہی ماننا کچھ زیادہ مناسب ہے۔
اس جزئیہ کے علاوہ فقہاء کا یہ کلیہ کہ "دینی اُمور میں کافر کے قول کا اعتبار نہیں کیا جائے گا"

اس میں بھی غور کیا جانا چاہیئے کہ اس میں کسی صورت کو بھی مستثنیٰ نہ کرنا کہاں تک صحیح ہوگا؟ خود ریڈیو ہی کے معاملے میں مصنف قائل ہیں کہ رؤیت ہلال کی موجودہ طرز کی خبر جو ریڈیو اپنے طور پر دیتا ہو اگر "استفاضے" کے درجہ میں آجائے تو مقبول اور معتبر ہوگی۔ اس میں انھوں نے اناؤنسر کے مسلم ہونے کی پابندی نہیں لگائی ہے۔ اور غالباً یہ کوئی بھول چوک نہیں بلکہ جان بوجھ کر ہے، جیسا کہ ہونا بھی چاہیئے۔ لیکن ایسی ہی خبر پانچ چھ یا دس بیس غیر مسلم مختلف اطراف سے آکر دیں تو کوئی بھی اس پر فیصلہ کر لینے کی اجازت نہیں دے گا۔ اس لیے کہ ریڈیو کے اناؤنسر غیر مسلم اور ایک عام غیر مسلم میں فرق ہے، اناؤنسر سرکاری ملازم ہے وہ اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں جھوٹ بولنے یا غیر ذمہ داری برتنے کی جرأت آسانی سے نہیں کر سکتا، خصوصاً جب کئی ایک اناؤنسر کئی ایک مقامات سے اسی جیسی خبر نشر کر رہے ہوں تب تو یہ قوی قرینہ ہے کہ خبر سچی ہو اسلیے اسے مان لیا جائے گا۔ لیکن عام غیر مسلم کئی ایک کی تعداد میں بھی ہوں تب بھی ہر طرح کے شک وشبہ کی گنجائش رہے گی۔ اس لیے ان کی بات پر فیصلہ نہیں کیا جا سکے گا۔ — الغرض غیر مسلم غیر مسلم میں فرق مصنف کو بھی کرنا پڑا ہے، اور اس فرق کو مان لینے ہی کا تقاضہ ہے کہ جب ریڈیو کا محکمہ یہ مان لے کہ چاند کی خبر مسلمانوں کے طے کردہ ضابطہ کے مطابق ہی نشر ہوگی یا تجربے سے یہ ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہوتا ہے تو پھر یہ مطابق ہو! البتہ خبر نشر کرنے والا چاہے غیر مسلم ہی ہو اس کا اعتبار کیا جانا چاہیئے۔ یہ عام معنیٰ میں غیر مسلم کی خبر یا "قول کافر" نہیں ہے، یہ ایک سرکاری ذریعہ کی خبر ہے جس پر عام معنیٰ کے مسلم و غیر مسلم کا انطباق نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کے پیچھے اعتماد کی وہ گارنٹی بھی ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ اور بھی کچھ رُخ ہیں جن سے اس نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے مگر اب بے ضرورت طوالت ہو جائے گی۔

۴۔ اناؤنسر کے لیے مسلم ہونے کی شرط سے بھی زیادہ غیر ضروری شدت پسندی اور حالات وحقائق سے بے اعتنائی اس شرط میں نظر آتی ہے کہ اناؤنسر جو رویت ہلال کمیٹی وغیرہ کسی اتھارٹی کا اعلان نشر کرے تو پوری تفصیل کے ساتھ نشر کرے اور اس اتھارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے نشر کرے۔ اعلان کرانے والا اگر صاحب امر و حکومت ہو تب تو یہ سب باتیں آسانی سے ہو سکتی ہیں، بلکہ نمائندگی تو لازماً ہی ہوگی۔ لیکن اعلان کرانے والے کی حیثیت یہ نہ ہو تو ایک سرکاری ملازم اپنی ڈیوٹی انجام دینے

کے وقت میں کسی دوسرے کا نمائندہ کیسے بن سکتا ہے؟ اور تفصیل میں تھوڑی سی کمی رہ جائے تو اس سے کیا بڑا فرق پڑتا ہے؟ مقصد تو اعتبار اور اعتماد پیدا ہونا ہے اور اسے پیدا کرنے کے لیے وہ باتیں کافی ہیں جن کا اوپر کے نمبروں میں ذکر آچکا ہے! پھر یہاں تو فقہاء کی کوئی عبارت بھی نہیں پیش کی گئی ہے جو ان قیود کو لازم کرتی ہو بلکہ یہ قیود اُن کے زمانہ کی مروجہ صورتوں سے از خود اخذ کیے گئے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بڑی ہی شدت پسندی اور حالات کے فرق سے بے اعتنائی ہے۔

ان چند نمبروں میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس کی گنجائش ایک حد تک ہمیں خود مصنف کے کلام ہی میں ملی ہے۔ اور اسی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ خود ان کا ذہن حالات اور معاملات کے فرق سے بے نیاز ہو کر فقہاء کی عبارتوں میں محصور رہنے کا نہیں ہے، بلکہ وہ اس ذہن کے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش میں اس طرف جھک گئے ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ یہ باتیں ان کے لیے قابلِ غور ہوں گی۔

ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلا دینا شاید مفید ہوگا، فقہ اور قانون کی زبان میں الفاظ کی جو اہمیت اُس کا لحاظ کتاب میں پوری طرح نہیں رہ سکا ہے۔ مثلاً ایک بات جسے ایک جگہ واجب العمل یا واجب الاعتبار لکھا گیا ہے دوسری جگہ اسی کو قابلِ عمل یا قابلِ اعتبار لکھ دیا گیا ہے، دعویٰ واجب ہونے کا کیا گیا ہو اور سند میں قول وہ پیش کیا گیا ہے جو جائز ہونا بتاتا ہے۔ یہ خاص طور سے ریڈیو ہی کی بحث میں ہوا ہے۔

ٹیلیفون کی بحث کے بعض نکات بھی از سرِ نو توجہ کے قابل نظر آتے ہیں۔ خصوصاً حضرت گنگوہی اور حضرت تھانوی کے ارشادات (ص۶۸ اور ص۷۳) کی روشنی میں اس موقف سے زیادہ وسعت کی گنجائش نظر آتی ہے جو کتاب میں اختیار کیا گیا ہے۔

کتاب کی اس خصوصیت کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس مسئلہ پر اب تک ہندوستان و پاکستان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب مصنف کے پیشِ نظر رہا ہے۔ اور اس لیے مسئلہ پر غور و فکر کرنے والے حضرات کو اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔

البتہ ایک الجھن عام لوگوں کو پیش آسکتی ہو کہ کتاب مجلس تحقیقاتِ شرعیہ نے شائع کی ہو جس کا اپنا فیصلہ بھی اس مسئلہ پر کئی سال پیشتر آچکا ہو اور اس کتاب میں درج بھی ہو، مجلس کا یہ فیصلہ اور مصنف کا موقف کئی باتوں میں مختلف ہے۔ اس سے الجھن پیدا ہو جانا اس لیے ناگزیر ہے کہ ایک طرف معروف اور متعدد اکابر علماء ہیں دوسری طرف گو مصنف کا شخصی وزن آنا نہ سہی مگر انھوں نے دلائل پیش کیے ہیں اور

مجلس کے فیصلے میں دلائل کا اظہار نہیں ہے۔ پھر اس پر مجلس کے صدر (مولانا سید ابوالحسن علی دامت برکاتہم) کا مقدمہ بھی ہے جو کتاب اور اُس کے طرز فکر و استدلال کے حق میں تحسین و ستائش کا پورا وزن ڈال رہا ہے۔ مصنف جو خود بھی اس مجلس کے ناظم ہیں نہ اُن کا اپنی "تمہید" میں اس طرف التفات کرنا نہ صدر مجلس کا توجہ فرمانا کچھ عجیب سی بات معلوم ہو رہی ہے۔

اختلاف الائمہ | از شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم
ناشر: کتب خانہ اشاعت العلوم۔ محلہ مفتی سہارنپور

صفحات ۹۶۔ سائز خورد۔ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ۱/۵۰

اسلامی فقہ کے ائمہ اربعہ کا مأخذ ایک ہی ہے۔ یعنی کتاب و سنت اور آثار صحابہ، پھر ان ائمہ کے مابین اختلاف کیوں ہوا ہے؟ یہ سوال بہت سے ذہنوں کو پریشان کرتا ہے۔ اور اس کی کھوج میں جب یہ حقیقت ایک عام آدمی کے سامنے آتی ہے کہ ان تین مأخذوں میں سے سنت اور آثار صحابہ کی روایتوں کا اختلاف، اس اختلاف کی زیادہ تر بنیاد ہے تو پھر اس دوسرے اختلاف کے بارے میں اشکال ہونے لگتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ آنحضرتؐ کے قول و فعل کی روایتیں مختلف کیوں ہیں اور آپ سے استفادہ کرنے والے صحابہ کے طرز عمل اور طرز فکر میں اختلاف کیوں ہوا؟ ــ یہ اشکالات بعض لوگوں کے لیے بڑا دینی ابتلا اور موجب ضلال و حرمان ہونے لگتے ہیں۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ نے اب سے کوئی ۴۵ سال پہلے مدرسہ کے ماہنامے میں اس موضوع پر ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا تھا جو ایک رسالے کی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔ بلا شبہ ما قل و دل کا مصداق اور حضرت مصنف کے رسوخ علم، وسعت نظر اور کمال بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ شیخ الحدیث کے جن عزیز محترم نے اس گنج گرانمایہ کو پرانے کاغذات کی تہ سے نکال کر استفادہ عام کیلیے شائع کیا۔ انھوں نے اپنے حسن انتخاب کا بھی ثبوت دیا اور طالبان علم پر ایک بڑا احسان بھی کیا ہے ــ کاش انھوں نے کچھ خدمت بھی اس نئی اشاعت کے موقع پر اس کی کر دی ہوتی یا کسی دوسرے آدمی سے یہ کام لے لیا ہوتا تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ کتبخانہ اشاعت العلوم کی اس سے پہلے کی ایک کتاب "تذکرۂ خلیل" پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی اس کا بڑا احساس ہوا تھا کہ ہمارے بزرگوں کی تصانیف جو بہو اپنی پرانی ہیئت ہی میں اب تک شائع کی جا رہی ہیں جبکہ مذاق جدید کے کچھ تقاضے تو ضروری ہی قابل رعایت ہیں اور وہ ایسی ترقی کے زمرہ میں آتے ہیں جس سے ہم آہنگی اختیار کیجانی چاہیے۔

مولانا نعمانی کی تالیفات

جو قرآن و حدیث کی تعلیمات کی ترجمان اور دینی اصلاح کا مکمل نصاب ہیں

اسلام کیا ہے؟ نہایت آسان زبان اور سنجیدہ دلنشین انداز میں اسلامی تعلیمات کا مکمل خلاصہ جو دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ کافی ہے۔ ۲/۵۰

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اس کتاب میں سیکڑوں عنوانات کے تحت قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، جو پڑھنے والے کو قرآنی دعوت اور تعلیم کے ساتھ اس کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہو، غیر مسلموں کے لیے خاص تحفہ
قیمت مجلد ۵/۰ انگریزی ایڈیشن ۱۲/-

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس رح جن لوگوں نے حضرت مولانا محمد الیاس رح کو نہیں پایا وہ اس کتاب کے مطالعہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو پوری طرح جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لیے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔
مجلد ۲/۵۰ غیر مجلد ۲/-

تذکرہ مجدد الف ثانی رح اس کتاب میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رح کی سوانح حیات آپ کی عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم کارنامے کی تفصیل بیان کی گئی ہے جس نے سلطنت مغلیہ کا رخ الحاد سے اسلام کی طرف موڑ دیا۔ قیمت ۵/-

مکتوبات خواجہ محمد معصوم رح یہ کتاب حضرت خواجہ رح کے ارشاد و ہدایت کے پورے کام کا آئینہ ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم رح حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ اور خلیفہ ہیں۔ آپ ہی کی تربیت نے اورنگ زیب عالمگیر کو ایک مثالی حکمراں بنا دیا تھا۔ قیمت مجلد ۴/۵۰

کلمہ طیبہ کی حقیقت توحید اور رسالت کی شہادت کا کیا مطلب ہے اور اس کے کیا تقاضے اور کیا مطالبے ہیں۔ ۵۰/-

نماز کی حقیقت اپنی نماز کو حقیقی نماز بنانے اور اس میں روح پیدا کرنے کے لیے اس کا مطالعہ ضرور کیجیے۔ شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی اور دیگر اکابر کے افادات کا نچوڑ ہے۔ قیمت ۱/-

برکات رمضان اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ ۱/-

دین و شریعت اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت، اور احسان و تصوف پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۳/۵۰

معارف الحدیث احادیث نبوی کا ایک جامع انتخاب اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ۔ اس کتاب میں صرف وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن میں امت کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے اور جن کا انسانوں کی عملی و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے۔
جلد اول ۵/-، جلد دوم ۵/۵۰، جلد سوم ۵/-، جلد چہارم ۵/۲۰ جلد پنجم ۶/۵۰ مجلد کے لیے ۲۵ فی جلد مزید

صحبتے با اہل دل (مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) حضرت شاہ محمد یعقوب بھوپالی (پیر جی میاں) آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ہم آج بھی ان کی اصلاحی مجالس میں شریک ہو سکتے ہیں اور ان کے ارشادات سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب ان کی عرفانی و اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان کے ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ہے۔
قیمت مجلد ۶/-

انسانیت زندہ ہے یہ مولانا نعمانی کے چار چھوٹے چھوٹے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پر تاثیر واقعہ اور تجربہ نہایت سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔ قیمت ۵۰/-

شاہ اسمٰعیل شہید حضرت شاہ اسمٰعیل شہید پر لگائے گئے معاندین اہل بدعت کے الزامات کا مدلل اور مسکت جواب۔ قیمت ۱/-

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مستند تفاسیر و علومِ قرآنی

تفسیر ماجدی از مولانا عبد الماجد دریابادی
قرآن مجید کی یہ تفسیر متعدد حیثیتوں سے منفرد و ممتاز اور بیحد قابلِ قدر ہے۔ عربی کی تمام مستند تفاسیر اور مغربی اور انگریزی لغوی تحقیقات کا عطر کشید کر دیا گیا ہے۔ ایک عام آدمی کامل اعتماد کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔
قیمت مجلد اول -/۱۵ ، دوم مجلد -/۱۶

تفسیر ابن کثیر محشّٰی (اردو) علامہ ابن کثیر کی عظیم الشان تفسیر جس کو جدید و مفید حاشیہ اور مسائل کی وضاحت کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ نہایت ہی جامع و مفید کتاب ہے۔ چار جلدوں میں مکمل غیر مجلد -/۶۰ مجلد -/۶۵

تفسیر بیان القرآن حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی مشہور زمانہ تفسیر تین جلدوں میں مکمل سٹ مجلد -/۶۳ ۔ مکمل سٹ کی خریداری پر رعایتی قیمت -/۶۰

تفسیر حقانی مکمل مولانا عبد الحق حقانی دہلوی کی مشہور آفاق تفسیر الٓمّٓ ۔ الٓمّٓ پاروں میں ۲۷ قسطوں میں مکمل ہوئی ہے جس میں مقدمہ بھی شامل ہے۔ مجلد پانچ جلدوں میں مکمل ہے۔ قیمت کامل مجلد -/۷۰

تفسیر موضح القرآن شاہ عبد القادر محدث دہلوی کی مشہور و مقبول تفسیر جو تفاسیر میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بڑے سائز کی ایک ہی جلد میں مکمل ہدیہ مجلد -/۲۶

کشف الرحمٰن مع تیسیر القرآن و تسہیل القرآن (از مولانا احمد سعید صاحب دہلوی) قرآن شریف کا ترجمہ اور تیسیر القرآن و تسہیل القرآن کی ترتیب و تالیف، مولانا موصوف کی ۱۸ سالہ محنت اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ قیمت مکمل -/۳۰

تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی یہ تفسیر اب تک عربی زبان میں چھپتی رہی۔ اب اسے اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ نہایت معتبر اور مشہور و مقبول تفسیر ہے۔ ۱۳ پاروں کی تفسیر چھپ کر آ چکی ہے۔
قیمت .... /۹۰

قصص القرآن (از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم) جس میں امم سابقہ کے سلسلے میں قرآن کے بیانات پر تاریخ و حدیث اور علوم عمرانی کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ان واقعات کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔
قیمت جلد اول -/۱۰ جلد دوم -/۵ جلد سوم -/۷ چہارم -/۸
(مجلد کے لیے -/۲ فی جلد مزید)

ارض القرآن یعنی قرآن مجید کی تاریخی آیات کی تفسیر، سرزمین قرآن (عرب) کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا تذکرہ ہے ان کی تاریخی اور اثری تحقیق مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قیمت مکمل غیر مجلد -/۱۵

قرآن اور تعمیر سیرت (از ڈاکٹر میر ولی الدین) اس کتاب میں سیرت و کردار سازی کے جامع نقطۂ نظر سے قرآن کی بعض اہم تعلیمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب متعدد مقالوں پر مشتمل ہے۔ قیمت صرف -/۶

قرآن اور تصوف یہ بھی ڈاکٹر میر ولی الدین کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی جدید تعلیم کے باوجود تصوف کے حامل اور داعی ہیں۔ اس کے مطالعہ سے تصوف کے بارے میں بہت سے شکوک رفع ہو جاتے ہیں۔ قیمت -/۳

قاموس القرآن (نیا ایڈیشن) تالیف مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ اس میں الحمد سے لے کر والناس تک بہ ترتیب حروف تہجی تمام الفاظ قرآنی کے معانی اور ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح درج کر دی گئی ہے۔
طباعت و کاغذ اعلیٰ صفحات آٹھ سو، قیمت مجلد -/۱۱

لغات القرآن قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب حل کرنے اور سمجھنے کے لیے اردو زبان میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ ایک عام آدمی اسکے پڑھنے سے قرآن کا ترجمہ اچھی طرح سے کر سکتا ہے۔
قیمت کامل غیر مجلد -/۳۲ ، مجلد -/۴۰

فہم قرآن قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنا کن علوم و شرائط پر موقوف ہے؟ قیمت -/۲

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

علم حدیث اور فقہ پر اہم اور مستند کتابیں

کتاب الزہد والرقائق
امت کے جلیل القدر امام عبداللہ بن مبارک کی مقبول و مشہور تالیف

جو عرصہ سے نایاب تھی اس کو ہمارے ملک کے مایۂ ناز محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ایڈیٹ کر کے نہایت مفید اور ایمان افروز مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا ہے کوئی کتب خانہ اور لائبریری اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں قیمت مجلد صرف -/۳۰

ترجمان السنہ مکمل
(تالیف: مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی) اردو زبان میں ضروری تشریح و مباحث کے ساتھ ارشادات نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ ہے۔ حدیث کے مستند لٹریچر میں یہ کتاب بلاشبہ عدیم النظیر ہے۔

قیمت جلد اول -/۱۲ جلد دوم -/۱۰ جلد سوم -/۱۲ جلد چہارم -/۱۲
(مجلد کے لیے فی جلد -/۲)

نصرۃ الحدیث
کیا حدیث بھی قرآن کی طرح واجب العمل ہے؟ ہمارے وطن کے مشہور صاحب نظر فاضل اور محقق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اپنی اس کتاب میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور حدیث کی حجیت کے منکروں کو بے غبار کر دیا ہے۔ قیمت -/۲/۵۰

محدثین عظام اور انکے علمی کارنامے
مؤلفہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری

اس کتاب میں ائمہ اربعہ اور ارباب صحاح ستہ اور امام بخاری کا تفصیلی تذکرہ اور تاریخ تدوین حدیث اور محدثین عظام کی کوششوں کا ذکر ہے نیز محدثین عظام کے علمی کارناموں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے قیمت -/۵/۵۰

فن اسماء الرجال
یعنی تاریخ رجال حدیث کی تدوین و تحقیق کتب اسماء الرجال سے استفادہ کا طریقہ

اہم مشہور کتب رجال پر تبصرہ و تعارف۔ مؤلفہ مولانا تقی الدین ندوی
قیمت -/۱/۷۵

مظاہر حق (اردو مع متن عربی)
حدیث کی مشہور و مقبول ترین کتاب "مشکوٰۃ شریف" کی اردو زبان میں شرح۔ پانچ جلدوں میں مکمل۔ قیمت غیر مجلد کامل -/۶۵

ایضاح البخاری
احادیث کی سب سے مستند کتاب (بخاری شریف) کی اردو شرح۔ افادات حضرت مولانا فخر الدین صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) سولہ حصے طبع ہو چکے ہیں۔ قیمت فی حصہ -/۲/۲۵

زاد سفر
ریاض الصالحین کا اردو ترجمہ۔ از امۃ اللہ تسنیم۔ یہ کتاب بہترین مصلح و مرشد کا کام کرتی ہے عنوان کے نیچے پہلے قرآن مجید کی آیات مع ترجمہ پھر احادیث ہیں۔

قیمت جلد اول -/۲/۵۰

شمائل ترمذی و خصائل نبوی (اردو)
شمائل ترمذی کی عالمانہ و فاضلانہ شرح جس میں احادیث کی روشنی میں حضور کی سیرت و صورت، عادات و خصلتیں، معمولات و لباس وغیرہ کی تفصیل ہے۔ قیمت -/۶

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند
افادات حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ۔ دارالعلوم دیوبند سے پوچھے گئے ہزارہا فقہی سوالات اور اُن کے جوابات کا یہ بے نظیر مجموعہ جو اب تک بلون اوراق میں محبوس تھا مولانا ظفیر الدین صاحب نے ۹ جلدوں میں مرتب کیا ہے قیمت کامل سٹ -/۵۶

فتاویٰ رشیدیہ
حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی شخصیت علمی حلقہ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کو تمام علوم اسلامیہ میں منصب امامت حاصل تھا مگر خصوصی مناسبت آپ کو فقہ و حدیث میں تھی۔ زندگی کے تمام ضروری مسائل کے بارے میں آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ -/۸

فتاویٰ مولانا عبدالحی فرنگی محلی (اردو)
مولانا عبدالحی لکھنوی کا مجموعہ فتاویٰ جو فقہی اور اعتقادی مسائل کا ایک نادر ذخیرہ ہے۔ اردو فتاویٰ کے ساتھ عربی و فارسی فتاویٰ کا نہایت سہل و سلیس اردو میں ترجمہ بھی ہے۔
تینوں حصے یکجا، قیمت مکمل مجلد -/۱۶

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

سیرت نبوی پر چند منتخب کتابیں

سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندوی کی مشہور و مقبول تالیف ۔۔۔ یہ رسول اللہؐ کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشادات کا ذخیرہ ہے سیرت کے موضوع پر ایک عظیم شاہکار ہے چھ جلدوں میں مکمل قیمت مکمل غیر مجلد ۸۵/-

رحمۃ للعالمین از علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری یہ کتاب جامعیت و کاملیت اور تاریخیت میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ حوالہ جات مستند، دلائل مضبوط، انداز بیان شگفتہ اور عشق نبوی میں ڈوبا کر لکھنے والا ہے تین ضخیم جلدوں میں مکمل حسین و رنگین گرد پوش سے مزین۔ قیمت کامل سیٹ ۔۔ ۔۔ ۳۰/-

سیرت طیبہ از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی سیرت نبوی کے موضوع پر ایک عظیم شاہکار۔ حدیث کی مستند کتابوں کی بنیاد پر جدید انداز تعبیر کے ساتھ۔ ۵۰۰ صفحات قیمت صرف ۵/۰

رحمت عالم علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت کے موضوع پر یہ کتاب خاص طور سے مدارس کے طلباء کے لیے لکھی ہے قیمت صرف ۲/-

محسن انسانیت اس میں سیرت رسول ایک نئے اور دلآویز انداز میں بیان کی گئی ہے۔ آپ کے عہد کی ایک مکمل تاریخ ہے ایک مفید ترین کتاب۔ قیمت ۔۔۔ ۱۰/-

خطبات مدراس حیات نبوی کے مختلف پہلوؤں پر علامہ سید سلیمان ندوی کے خطبات جو مرحوم کے علم و تحقیق کا نچوڑ ہیں۔ قیمت ۳/۰

مقالات سیرت سیرت نبوی پر آٹھ گرانقدر مقالات کا مجموعہ۔ از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ قیمت ۵/۰

تقریر سیرت سیرت پاک پر مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی دو معرکۃ الآرا تقریریں۔ پہلی تقریر سیرت ۱/۷۵ دوسری تقریر سیرت ۲/۷۵

نبی عربیؐ اس کتاب میں متوسط استعداد کے بچوں کیلئے سیرت نبوی کے تمام واقعات کو اختصار کیساتھ سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد ۔ ۱/۰۵ مجلد ۔۔ ۲/-

ہمارے حضورؐ سیرت نبوی کے صحیح اور مستند واقعات پر مبنی یہ کتاب خاص طور پر بچوں اور طالب علموں کے لیے نہایت شیریں و آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ قیمت ۔۔۔ ۱/۸۰

سیرت صحابہ و تابعین

حیاۃ الصحابہ حضرت جی حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی حیاۃ الصحابہ کا اردو ترجمہ صحابہ کرامؓ کی دعوت اسلام کے لیے محنت و جدوجہد، ان کے سرفروشانہ مجاہدات مخصوص صفات و کمالات پاکیزہ حالات، فقر و صبر، زہد و قناعت اور ایمان و یقین سے متعلق احادیث و قصص کا دلکش مجموعہ ہے۔ تین جلدوں میں مکمل قیمت مکمل سیٹ ۴۴/-

سیرت خلفاء راشدین سیرت خلفاء راشدین پر مولانا عبدالشکور لکھنوی کی عظیم تصنیف جس میں اس دور کے اہم تاریخی واقعات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ قیمت مجلد ۲/۵۰

صدیق اکبرؓ اس کتاب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مفصل سوانح حیات اور ان کے عہد کے تمام حالات کا محققانہ اور فاضلانہ تذکرہ ہے اس کتاب نے ایک بڑے خلاء کو پر کر دیا ہے۔ از مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ قیمت ۹/-

الفاروق علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے اس کتاب میں حضرت عمر فاروقؓ کے مفصل سوانح حیات عادات و خصائل، علمی کمالات ان کے عہد کے تمام ملکی اور فوجی انتظامات اور ان کے مجاہدانہ کارناموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قیمت مجلد ۶/-

سیرت عائشہ از علامہ سید سلیمان ندوی۔ اس کتاب میں حضرت عائشہؓ کے واقعات زندگی اور اخلاق و عادات کی تفصیل اور ان کے علوم و مجتہدات پر بحث کی گئی ہے۔ قیمت صرف ۔۔ ۷/-

خلفاء راشدین از مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی اس کتاب میں خلفاء راشدین کے سوانح حیات اور انکے سیاسی انتظامی، مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کا تفصیلی تذکرہ ہے قیمت ۷/۵۰

مہاجرین اس میں بقیہ حضرات عشرہ مبشرہ و اکابر بنی ہاشم اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے اکثر صحابہ کرام کے حالات مجاہدات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں قیمت اول ۸/- دوم ۶/-

سیر الانصار اس کتاب کے پہلے حصے میں پچاس انصار کرامؓ اور دوسرے حصہ میں ۶۴ انصار کرامؓ کے سوانح حیات اور ان کے فضائل و کمالات کا تذکرہ ہے۔

قیمت اول ۸/- دوم ۵/-

نوٹ:۔ تفصیلات کے لیے کتب خانہ کی مکمل فہرست مفت طلب کیجئے

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

BOMBAY ANDHRA TRANSPORT CO.

Transport Contractor

113, Bhandari Street (Chakla)

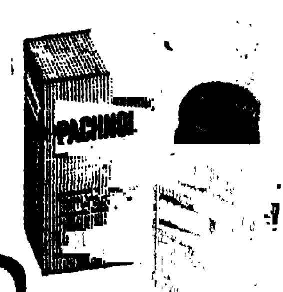
BOMBAY-3

پیٹ میں بھاری پن اور سینے میں جلن سے

جلد آرام کے لیے

پچنول

لیجیے



پچنول پیٹ کے درد، کھٹی ڈکاریں، اپھارا، جلن، متلی، بھوک کی کمی اور کھانے کے بعد طبیعت کی سستی وغیرہ جیسی شکایتوں میں
نہایت مفید ہے۔

ہمدرد

Monthly **'ALFURQAN'** Lucknow.

VOL 40 NO.2 APRIL 1972 Regd. No. L-353

پکوان کے
عمدہ تیلوں میں
آپ کی خاص پسند۔

پوسٹ مین برانڈ
صاف کیا ہوا مونگ پھلی کا تیل

عمدہ وناسپتی

سٹولا، تل کا تیل

خالص ناریل کا تیل

کوکوجار
صاف کیا ہوا ناریل کا تیل

اے سلاڈ تیل

احمد سنز بمبئی ۵

Receipt No. 37/
M.2.4/

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سالانہ چندہ
ہندوستان اور بنگلا دیش سے
۸ روپئے
ضخامت ...... ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی .... ۷۵ پیسے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۴ | بابت ماہ ربیع الاوّل سنہ ۱۳۹۲ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۷۲ء | شمارہ (۳)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو' براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں' یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں' چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ مئی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری :- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت :- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، پاکستان کے آئینی صدر بن گئے۔ بہت دھوم دھام سے نئے عارضی دستور کے ماتحت انھوں نے اپنے عہدہ کا حلف ۲۱ اپریل کو جمعہ کے دن اٹھالیا۔ مارشل لا رخصت ہوگیا اور آئینی زندگی کا پہلا دروازہ اس بدنصیب ملک پر کھل گیا جو عزت و عظمت کے کیسے کیسے خوابوں کے ساتھ وجود میں آیا تھا اور نکبت و ذلت کے اُن حقائق سے دوچار ہوا جنھوں نے ان خوابوں کا سارا طلسم ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

اس ذلت اور نکبت کی ذمہ داری میں مسٹر بھٹو کا کتنا حصہ ہے اسے کوئی تاویل اور کوشش چھپا نہیں سکتی۔ جنرل ایوب خاں کے مقابلے میں ایسی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے بعد کہ انھیں چند ہی مہینوں کے اندر اقتدار سے دست برداری کا فیصلہ کرلینا پڑا۔ اور پھر ۱۹۷۰ء کے الکشن میں اپنی اس طاقت کو ووٹروں کی باضابطہ حمایت سے بالکل غیر مشکوک کردینے کے بعد، مسٹر بھٹو قطعی طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ پاکستان کے خوابوں کا کفن سینے والے جو اقدامات، جنرل یحییٰ خاں کی حکومت کی طرف سے، مشرقی پاکستان کے بحران پر پے بہ پے کیے جارہے تھے، ان کے راستے میں اگر چاہتے تو رکاوٹ بن سکتے تھے ——— لیکن واقعات کی جو شکل اب تک سامنے آئی ہے، اس کی رو سے مسٹر بھٹو ان لوگوں میں تھے، بلکہ نمایاں طور پر اکیلے وہی تھے جنھوں نے یحییٰ خاں کو ان اقدامات پر، اگر مجبور نہیں کیا، تو ایک فنکارانہ اسلوب میں اُن کے لیے راہ ہموار کرنے کا کام ضرور انجام دیا۔

جنرل ایوب خاں سے ٹکراؤ کے میدان میں، وہ اُن کی جگہ لینے کے جس خواب سے سرشار ہوکر اترے تھے ۱۹۶۵ء کے الکشن بہت بھاری کامیابی کے باوجود بھی جب اس کی تعبیر میں انھیں اپنے بجائے

مشرقی پاکستان کے شیخ مجیب الرحمٰن کا چہرہ ابھرتا ہوا نظر آنے لگا تو جنرل یحییٰ خاں کو مجبور کر کے یا ان سے ساز باز کر کے مسٹر بھٹو نے حالات کو اس ڈگر پر ڈالنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جس سے شیخ مجیب الرحمٰن کا کانٹا اُن کے راستے سے نکل جائے حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل حالات کے اس رُخ سے پیدا ہونے لگی، ہندوستان سے ٹکراؤ کے آثار کھلے طور پر نظر آنے لگے، اس ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی شکست و ذلت کی تصویریں صاف ابھر ابھر کر پہلے ہی سامنے آنے لگیں، سارا عالم محسوس کرنے لگا کہ کیا ہونے جا رہا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ آخری لمحات تک میں وقت باقی رہا کہ جو کچھ ہونے سے رہ گیا ہے اسے نہ ہونے دیا جائے۔ لیکن مسٹر بھٹو کا دل اپنے ملک اور اس کی عزت کے اس عالم نزع میں بھی پسیج کے نہیں دیا۔ اپنی معروف فنکاری کے ساتھ، بس کچھ پاؤں انھوں نے سیکورٹی کونسل کے عالمی اسٹیج پر اپنا درد و اضطراب دکھانے کے لیے پٹکے، لیکن جو کچھ کرنے کا انھیں موقع تھا اور جس کی توقع اُنکی اہلیت اور ذہانت سے، ہر جاننے والا کر سکتا تھا اس کو کسی شکل بھی اُنھوں نے کر کے نہیں دیا۔ اس لیے کہ انھیں مشرقی پاکستان کے لیڈر سے مکمل اطمینان درکار تھا۔ اور یہ اس کی بہترین شکل بن رہی تھی۔

اگر مغربی پاکستان کے تمام یا اکثر لوگ بھی اسی طرز عمل کے حامی تھے، تو مسٹر بھٹو سے بڑھ کر ان کی صدارت کے منصب کا کوئی حقدار نہیں رہ جاتا۔ لیکن اگر ایسا نہیں تھا۔۔۔ اور عقل باور نہیں کرتی کہ ایسا ہوگا۔۔۔ تو یہ اُن کی قسمت کی ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ جس نے اُن کی محرومی اور رسوائی کی بدترین شکلوں کے اسباب پیدا کیے، اسے اُن کی قیادت کے عالی ترین مقام پر جگہ ملی ہے!

لیکن اس ستم ظریفی کو برداشت کر کے پاکستان کے لوگوں نے بظاہر ایسی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے جس پر انھیں مبارکباد دینی چاہیے! مسٹر بھٹو نے جو کردار مشرقی پاکستان کے بحران میں ادا کیا اس سے قطع نظر یہ واقعہ ہے کہ اُن کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس بچے کھچے پاکستان میں نہیں تھا جس کی طرف قیادت کے لیے اشارہ کیا جا سکے۔ جس قسم کے بھنور میں اس ملک کی کشتی آ پھنسی ہے کوئی دوسرا آدمی اُن بھنور میں سے کشتی کو نکال لیجانے کی اہلیت رکھنے والا نظر نہیں آتا۔ یحییٰ خاں کے ہاتھ سے صدارت کی منتقلی کے فوراً بعد ہی سے جو پے بہ پے اقدامات مسٹر بھٹو نے اس مقصد کے لیے کیے ہیں، اُن میں سے جہاں اندرونی رُخ پر کیے جانے والے بعض اقدامات اندرونی مسائل سے نپٹنے کے سلسلے میں اُن کی ناتجربہ کاری اور خامکارانہ جلد بازی کا تاثر دیتے ہیں وہاں بیرونی سیاست کے رُخ پر اُن کے

اکثر اقدامات اُن کی دوربین ذہانت، اعلیٰ مہارت، اندازوں کی صحت اور خود اعتمادی سے بھرپور جرأت و ہمت کا لوہا منوا لینے والے ہیں۔ چند مہینوں کے اندر اندر انھوں نے جتنا میدان صاف کر لیا ہے دوسرا کوئی ہوتا تو مسائل کے اس انبار کو دیکھنے اور طریق کار طے کرنے کے دائرہ سے بھی شاید اُس کا قدم ابھی نہ نکلا ہوتا۔ مصر و شام کی مثال سامنے ہے، ۶۷ء میں اسرائیل کے ہاتھوں اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونے کے بعد، آج تک ان کے لیڈر وہیں ہیں جہاں پہلے دن تھے۔ ناصر چلے گئے سادات آگئے، عطاسی چلے گئے، اسد آگئے، مگر ایک انچ زمین بھی جو یہ صاف کر پائے ہوں۔ ایک ٹانگ سے کھڑے ہوئے وہیں گھوم گھوم کر تقریریں جھاڑ رہے ہیں جہاں اسرائیل نے انھیں کھڑا کر دیا تھا۔ پشت پر ساری عرب دنیا کے وسائل بھی ہیں، شعلے اور مذاکرے بھی ہیں۔ مگر اتنے بے بسی، بلکہ ناراضی؟ کچھ تو کر کے دکھا سکیں! اس لیے مسٹر بھٹو کا قیادت کے لیے انتخاب یا اس پر رضامندی، چاہے اس میں کتنی ہی اندرونی اذیت ان لوگوں کے لیے ہو، بظاہر حالات بہت سمجھداری اور معاملہ فہمی کا کام ہے اور اسی طرح مسٹر بھٹو کی بیرونی سیاست کے اقدامات میں سراسر جذبات کے خلاف چلنے کا جو رجحان ہے اس کو منظور کر کے بھی پاکستانی قوم نے یکایک عاقبت بیں ہو جانے کی ایک مثال قائم کی ہے۔

پاکستانیوں کے جذبات کے بارے میں ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ وہ حکومت ہند اور حکومت روس کیلیے کیسے تلخ ہوں گے قاعدے سے اُن کو مسز اندرا گاندھی اور مسٹر کوسیگن کا نام سننے کیلیے بھی تیار نہیں ہونا چاہیے لیکن مسٹر بھٹو اختیارات سنبھالتے ہی دونوں سے سلسلہ جنبانی ہو جاتے ہیں اور خفیہ نہیں علانیہ! ممکن عجلت کیساتھ بذات خود ماسکو پہنچتے ہیں۔ شکایت کرنے اور بگڑنے نہیں بلکہ اُن تعلقات کو بحال کرنے جو روس نے اپنے رویے سے خراب کیے ہیں! مسز گاندھی سے ملنے اور دہلی کی دعوت پانے کے لیے بار بار بے چینی کا اظہار کرتے ہیں، دوسرے دن سے زور ڈلواتے ہیں، راہ ہموار کرنے والے بیانات اور انٹرویو دیتے ہیں۔ غرض ہر وہ جتن کرتے ہیں جو اہل پاکستان کے زخموں پر نمک بن کر لگے۔ مگر قوم یہ سب قبول کرتی ہے۔ ایک آواز بھی اس کے خلاف نہیں اٹھتی! کیونکہ حالات کا تقاضہ یہی ہے۔

اور ہندوستانی مسلمان؟

پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ دونوں نے مل کر پاکستان بنایا ... ایک ہی قیادت کے پیچھے دونوں چلے تھے، ایک ہی علَم سے دونوں

نے سبق لیا۔ یہ حالات کا فرق تھا کہ دونوں ودا الگ الگ اور باہم حریف ملکوں کے شہری آخر میں بنے ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

پاکستان کے باسیوں نے فکر و نظر کا جو زاویہ تحریک پاکستان سے اخذ کیا تھا وہ اُس پر جتنے بھی پختہ نہ ہو جاتے کم تھا کیونکہ اس کی زندہ کرامات "پاکستان" انھیں کے حصے میں آئی تھی اور کسی طرح کے نقصان کا انھیں اس زاویۂ نظر سے تجربہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اسے سینے سے لگائے رہے حتیٰ کہ اسی عشق میں انھوں نے اس پاکستان کا بڑا اور مشرقی بازو کھو دیا۔ ہندوستان سے معتدل تعلقات کی خواہش کی بنا پر عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمٰن کو ہندوؤں کا ایجنٹ اور غدار ٹھہرایا گیا جیسا کہ تقسیم سے پہلے موقر نیشنلسٹ مسلمان کے بارے میں یہ سبق پڑھا دیا گیا تھا۔ ہر بُری سے بُری بات کو ان کے متعلق نہایت آسانی سے قبول کیا گیا، معمولی باتوں کے بھی بھیانک معنی لیے گئے۔ اور جذبات کے بادبان اُن کے خلاف بھی ٹھیک اسی طرح بھر گئے جس طرح مسلم لیگ کے مخالف مسلم لیڈروں کے خلاف جذبات کا ایک طوفان ہندوستان میں دیکھا جاتا تھا اور حق و انصاف اور حقیقت و صداقت کی لاشیں اسمیں ہر طرف تیرتی پھرتی تھیں۔ غیر بنگالی مسلمانوں پر بنگالیوں کے ظلم و ستم کی ہر کہانی سولہ آنے قابل تسلیم تھی۔ مگر ان بنگالیوں کے ساتھ پاکستانی فوج اور ان غیر بنگالی مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ "کفار اور مرتدین کے ساتھ" ان کا کرنا تھا جسمیں کوئی بات "بری ہو ہی نہیں سکتی۔" حتیٰ کہ زناکاری بھی اگر ہوئی تو گویا ٹھیک تھی! اور لاکھوں لاکھ اگر سر پر پاؤں رکھ کے ہندوستان کو بھاگے تو وہ "سب کے سب" اسی کے مستحق تھے۔ سرزمین پاکستان کا "اُن سے پاک ہو جانا ہی اچھا تھا۔"

یہی زاویۂ نظر تھا جس نے پاکستان کو ڈبویا[ع۵]۔ لیکن داد کے قابل بات یہ ہے کہ چوٹ تو اگرچہ پاکستان والوں نے بھرپور کھائی، مگر پہلی ہی کھا کر، بلا تاخیر عقل پکڑ لی۔ اور جذبات کی اس تباہ کن روش کو یک لخت ایسے چھوڑ دیا جیسے کبھی اس کے عادی ہی نہ رہے ہوں! کم از کم اب تک کی بات تو یہی ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان اس روش کو کب چھوڑنے

ع۵ یوں ایسے بے وقوفوں کی کمی نہیں جو سارا الزام ہندوستان اور ہندوؤں کے سر رکھ کر اپنا دل مطمئن کر لیں گے، کہ قصور پاکستان والوں کا کچھ نہیں تھا۔

اور اس سبق کو کب بھلانے کا فیصلہ کریں گے؟ کیا خوش نصیبی تمام تر ہمارے پاکستانی ہم مکتبوں ہی کے حصے میں آئی ہے؟ کہ پاکستان بھی انھیں کو ملا اور چوٹ کھائی تو فوراً عقل بھی پکڑ لی! اور بدقسمتی تمام تر ہمارا نصیب بن گئی ہے؟ کہ پاکستان میں بھی ہمارا کوئی حصہ نہ لگا اور پھر اسکے بھگتان کے مسائل سے نپٹنے اور ہندوستان میں اپنی زندگی کی راہ ہموار کرنے کے لیے جو طرز فکر و عمل ہمیں اختیار کرنی تھی اُس کی بھی توفیق چوبیس برس کی مسلسل چوٹوں کے باوجود آج تک ہمیں نہ ملی؟ کیا کیا اس چوبیس برس کی مدت میں ہم نے نہیں دیکھا؟ اوروں کی ستم طرازیوں اور اپنی پیہم محرومیوں اور ناکامیوں کے کیا کیا ذائقے ہماری زبان نے نہیں چکھے؟ لیکن اللہ رے پختگی! کہ کبھی بھولے سے بھی جو اس بات کو قابل غور سمجھا ہو کہ دوسروں کی تنگ دلی اور ناانصافی کے ساتھ ہماری اپنی بھی کسی غلطی اور غلط روی کے تو یہ برگ و بار نہیں ہیں؟ کسی کی منت و خوشامد سے بھی جو یہ سوچنا گوارا کیا ہو، کہ سوائے کسی خاص مصلحت الٰہی کے اُس دنیا کا بھی عام قانون آخرت کی طرح یہی ہے کہ جو کچھ کوئی بوئے گا وہی کاٹے گا۔ اور جو کرے گا اُس کا پھل ملے گا۔ کوئی دوسرا نہ کسی کی صحیح روش کے اچھے نتائج کو روک سکتا ہے نہ اس کی غلط روی کے کڑوے پھلوں کو میٹھے پھلوں میں بدل سکتا ہے! حالات جگاتے جگاتے تھک گئے، ہمدرد سمجھاتے سمجھاتے شکستہ دل ہو گئے۔ مگر ـــــ شاعر سے معذرت کے ساتھ ـــــ ع

اک بے رُخی ہے بس وہاں سب کے جواب میں

آخری درجے کی اور بالکل تازہ بتازہ یہ ہے کہ عین ان دنوں میں بھی، جبکہ ہمارے پاکستانی ہم سبق جذبات فراموشی کا ایک حیرت انگیز مظاہرہ کر رہے ہیں، ہم بنگلہ دیش کے بہاری مسلمانوں کے سوال پر الکشن کا چیلنج مسز اندرا گاندھی کو دیتے ہیں اور اُن کی پارٹی کی مخالفت کا میدان، جہاں ہم سے ممکن ہوتا ہے گرم کر دیتے ہیں! ـــــ نتیجہ کیا ہوا اس سے بحث نہیں، کچھ بنا، یا اور بگڑ گیا؟ اس سے بھی مطلب نہیں۔ بس جذبات نکل گئے، جو ہمارا فلسفۂ عمل ہے! ـــــ کیا ہم پر جذبات کی غلامی کی لعنت اسی طرح مسلط رہے گی؟ یا اس شب سیاہ بختی کی کوئی سحر بھی ہے؟۔

خدایا ہمیں بھی عقل دے اور اس بدنصیبی کا طوق اب گلے سے نکال دے۔

بوئے گل در برگ گل

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ اپنے مکتوبات کے آئینے میں

(تلخیص و ترجمہ - مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

(قسط نمبر ۱)

مولانا خالد رومیؒ کو ایک مکتوب گرامی میں بطور نصیحت تحریر فرماتے ہیں۔

کسی سے انتقام لینا ہمارے اور آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ صبر و عفو، صوفیہ کی ایک ادنیٰ عادت و خصلت ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس آیت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ (برائی کی مدافعت عمدہ خصلت اور اچھائی کے ذریعے کر) ___ ہر بات کا انجام خوب سوچ لیا کریں تاکہ طائفۂ درویشاں، بدنام نہ ہو۔ اپنی نظر، ارادۂ الٰہی پر یا تقدیر الٰہی پر یا فعلِ حق تعالیٰ پر رکھنا، ملکۂ راسخہ بن جانا چاہیے ___ (یعنی یہ بات دل میں بیٹھ جانی چاہیے کہ جو کچھ پیش آتا ہے وہ مشیتِ الٰہی کے تحت ہے) والسلام ___

ایک مکتوب گرامی میں جامعِ مکتوبات شاہ رؤف احمد صاحب مجددیؒ کو ارقام فرماتے ہیں۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ ___ عنایت نامہ پہونچا۔ مضمون سے آگاہی ہوئی ___ تحریر مطالب میں منشی گری اور شاعری کرنا چھوڑ دیں۔ صاف صاف عبارت میں اپنے اور اپنے مستفیدین کے احوال و واردات لکھا کریں۔ جو کوئی بیعت ہونا چاہے اُس کو بیعت کرنے میں توقف نہ کیا کریں (ایسے موقع پر) استخارہ بھی معمول ہے اور فقط شہادتِ قلبی بھی کافی ہے۔ مجھے بھی دعائے خیر میں یاد رکھیں۔ والسلام

اپنے ملفوظات کے سلسلے میں شاہ ابو سعید مجددیؒ کو ازراہِ انکساری یوں تحریر فرماتے ہیں:-

.... فقیر غلام علی عفی عنہٗ کی طرف سے بعد سلام مسنون واضح ہو کہ خط ملا۔ مضمون سے واقفیت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ زیادہ سے زیادہ توفیقِ نیک عنایت فرمائے ..... (میرے) خرافات و مزخرفات جو حضرت رؤف احمد نے جمع کیے ہیں اُن کا ذکر کرنا مناسب و درست نہیں ہے۔ اُنکو پانی سے دھوکر پارہ پارہ کردیں۔ نفحات، رشحات، عوارف اور کلام حضرت امام غزالیؒ کا مذاکرہ بہت مناسب ہے۔ ان کتابوں سے اتنا ہوگا کہ غیرت و عبرت میسّر آئے گی اور (اعمال میں) سُستی و کاہلی رخصت ہوگی نیز درویشی و مسکینی اور اندوہگینی و حضوری لازم حال ہو جائے گی۔ صاحبزادوں کی خدمت میں سلام۔ رؤف احمد کہاں چلے گئے۔ اب تو وہ سلام سے بھی یاد نہیں کرتے ..... (آخر میں یہ نصیحت ہے کہ) تحریر میں مبالغہ (و تکلف) نہیں ہونا چاہیے (سیدھی سادی بے تکلف عبارت ہونا چاہیے)۔ والسلام ......

مولانا بشارت اللہ بہرائچی کی نوشدامن کے نام ......

مشفقۂ مہربان کی خدمت میں۔ فقیر غلام علی عفی عنہٗ بعدِ سلام و التماسِ دُعا تحریر کرتا ہے ..... دو عنایت نامے ملے۔ ان خطوط کے آنے سے مسرت ہوئی ..... ان میں مولوی بشارت اللہ صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ کی طلبی مرقوم تھی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وہ عنقریب آپ کی خدمت میں پہونچیں گے۔ اگرچہ میں (اُن کے یہاں پر نہ ہونے کی وجہ سے ظاہری اعتبار سے) بے کار اور بے مددگار ہو گیا ہوں اور مولوی حسن علی[عہ] جیو نے بھی اُن کے چلے جانے کے بعد مجھے بہت کچھ ملامت کی کہ آپ نے اُن کو کیوں جدا کر دیا؟ لیکن آپ کی خاطر داری مقدم تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہر جگہ خوش و خرّم رکھے اور مُروّج طریقۂ بزرگان نیز مُروّج علوم دینیہ بنائے (آمین) اُن کے اور

عہ مرزا حسن علی شافعی لکھنویؒ۔ لکھنؤ کے مشہور محدث ہیں۔ حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی اور حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے بھی اجازت حاصل کی تھی۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ۱۲۵۵ھ میں وفات پائی۔

نزھۃ الخواطر جلد ہفتم

مجھ عمر ضائع کردہ بوڑھے کے حق میں دعائے خیر فرماتی رہیں۔

مولوی ہادی احمد[عہ] کے نام ——

..... فقیر غلام علی بعد سلام مسنون عرض کرتا ہے کہ نامۂ سامی نے مسرت بخشی۔ بندے سے ملاقات کا شوق اس میں مرقوم تھا (اس کے جواب میں لکھتا ہوں) کہ مولوی بشارت اللہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کا دیکھنا (اور ان سے ملاقات کرنا) بندے کے دیکھنے (اور ملاقات کرنے) سے بہتر ہے۔ ان کی صحبت کے التزام سے اور ان کے بتائے ہوئے اذکار و اشغال سے مرتبۂ احسان ..... حاصل کریں۔ ایسی صورت بن جائے کہ دل میں سوائے محبتِ الٰہی کچھ باقی نہ رہے ... اور واقعات کو تقدیرِ الٰہی یا فعلِ الٰہی سے جان کر راضی بقضا ہو جائیں ...... والسلام۔

قاضی شمشیر خاں کے نام ——

..... بعد سلام واضح ہو کہ آپ کا خط ملا مسرت ہوئی ... حضرت حق سبحانہ کی یاد میں اپنی عمر اور اپنے انفاسِ متبرکہ کو صرف کریں۔ ذکر، دوام توجہ اور نیازمندی و انکسار کو لازم سمجھیں۔ مراقبہ اور تلاوت سے اپنے اوقات معمور رکھیں ..... دوستوں کو سلام پہونچائیں اور تاکید کریں کہ نماز و ذکر، استغفار و درود اور تلاوت قرآن کی پابندی کریں ....

شاہ احمد سعید مجددی کے نام (تقسیم اوقات کی تاکید) ——

برخوردار احمد سعید —— اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور ان کو کمالِ آبا و اجداد نصیب فرمائے اور عافیت کے ساتھ سلامت رکھے —— بعد دعا معلوم کریں، تمہارا خط پہونچا، مسرور کیا (مجھے خط لکھا کرو تو) خطاب اور القاب میں تکلف نہ کیا کرو —— اپنے اوقات کو اعمالِ حسنہ، دوامِ تہجد، اشتغالِ نسبتِ باطن، تحصیل علم —— اپنے بزرگوں کے مکتوبات کے مطالعے میں اور قدمائے صوفیہ کی کتابوں کے مطالعے نیز عوارف المعارف اور آداب المریدین کے مطالعے سے

عہ یہ غالباً ہادی علی لکھنوی ہیں۔ تذکرۃ العلماء مولفہ رحمٰن علی میں بھی ان کا نام ہادی علی لکھا ہے۔ شیخ قمر الدین شہید کی نسل سے تھے۔ بکنور علاقہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مفتی سعد اللہ مرادآبادی اور دیگر علماء سے تعلیم حاصل کی۔ صاحب تصنیف تھے۔ سنہ ۱۲۰۰ھ میں وفات پائی۔ نزہۃ الخواطر جلد ہفتم۔

ثمائے الٰہی اور اشتیاق لقا کو حاصل کرو۔ مجھ کو بھی دُعائے خیر میں یاد رکھنا۔
ذب میں دہشتم میں ایک صاحب کو تعمیر اوقات کا پورا نظام لکھنے کے بعد آخر میں تحریر

. . . ان باتوں پر حتی الامکان عملدرآمد ہونا چاہیے۔ ہر لحظہ توجہ بدل ذکر حضرت حق
یں۔ صحبت فسّاق وغافلان سے پرہیز۔ گفتگو میں نرمی۔ مناظرے اور مباحثے سے
ینے میں عداوت وکینہ کو جگہ نہ دینا۔ واقعات کو تقدیر الٰہی سے جان کر (کسی سے) پرخاش
اق حسنہ کو کسب کرنا۔
رت شاہ ابوسعید مجددیؒ کو ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہوئے آخر میں شاہ احمد
یہ ارقام فرماتے ہیں۔
ن احمد سعید صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ کو بعد سلام واضح ہو کہ تمہارا خط پہونچا مضمون سے
۔۔۔۔۔ تم کو لازم ہے کہ شغل باطن اور شغل حدیث میں اپنے اوقات مصروف رکھو۔
ضرت شاہ ابوسعید مجددیؒ وغیرہ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔
. . فقیر غلام علی عفی عنہ بعد سلام لکھتا ہے کہ رقیمۂ کریمہ رام پور بخیریت پہونچنے کے بارے
ں سے انتظار رفع ہوا۔ طریقۂ آبائے کرام رحمۃ اللہ علیہم پر مستقیم اور یادِ حق مشغول رہیں
ت احمد کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ ارادۂ دہلی کر رہے ہیں۔ استخارہ کر کے آئیں ورنہ
خت نسبتِ باطن کرتے رہیں اور لوگوں کو طریقہ سکھائیں۔
شاہ رؤف احمد مجددیؒ کو تحریر فرماتے ہیں۔
حضرت سلامت ... فقیر عبداللہ معروف بہ غلام علی عفی عنہ بعد سلام لکھتا ہے کہ عنایت
با جس کی عبارت رنگین اور اشارت دقیق تھی اُس کے مضمون پر آگاہی ہوئی۔ شاعری اور
ں کو چھوڑ کر صاف اور عام فہم عبارت لکھنی چاہیے۔ اپنے احوالِ باطن اور جو توجہ حاصل
ے لیے آتا ہے اُس کے حالاتِ باطن بھی لکھنے چاہئیں۔ اوقات کو ذکر و فکر سے معمور رکھیں۔ والسلام
شاہ ابوسعید مجددیؒ کو ایک مکتوب میں یوں ارقام فرماتے ہیں۔
حضرت سلامت۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

زکام اور کھانسی کی شکایت ڈیڑھ ماہ تک رہی جس سے بہت ضعف ہوگیا تھا۔ وسطِ بارہ دن سے ایک دوسری بیماری لاحق ہوگئی ہے۔ جاں فرسا درد، ہر گھڑی ذبح کیے دیتا ہے، اٹھنا، بیٹھنا اور کھانا پینا حتیٰ کہ تلاوتِ قرآن بھی موقوف ہے۔ (اس وقت) ایک وظیفے کے علاوہ، کہ وہ زمانۂ گزشتہ پر تاسف و انفعال (افسوس و شرمندگی) ہے، اور کوئی وظیفہ نامۂ اعمال میں نہیں ہے ——— اللہ تعالیٰ بواسطہ پیرانِ کبار ——— کہ اُن کے آستانے پر برائے حصولِ سلامتیٔ ایمان و دوام عافیت و مغفرت پچاس سال سے بیٹھا ہوا ہوں ——— میرے گناہوں کو معاف فرمائے اور ہر مشکل کو آسان کرے۔

جامع مکتوبات حضرت شاہ رؤف احمد مجددیؒ کو مخاطب کرکے یوں رقم طراز ہیں:

حضرت سلامت ——— (سلام مسنون)۔ یہ فقیر ناچیز غلام علی عفی عنہ اس کی لیاقت نہیں رکھتا کہ کوئی اس کے پاس برائے طلب طریقہ آئے۔ حضرت ستار سبحانہٗ کی محض ستاری ہے اور درویشوں کی عیب پوشی کی بات ہے کہ اس ناشائستہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ یہ "کمترین سگان کوئے مجددیہ" چاہتا ہے کہ صاحبزدگان (از اولادِ حضرت مجددؒ) برائے طلب نسبت مجددیہؒ ——— جو بیرنگ و بے کیف نسبت ہے ——— یہاں آئیں۔ میں ان حضرات کا آنا غنیمت سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ (باطن کی درستی کا) کام آہستہ آہستہ ہوا کرتا ہے اسمیں مجھے معذور سمجھیں۔ خود ہی کام میں (اچھی طرح) مشغول رہیں اور نسبتِ تمام طریقہ کو واہب العطیات سبحانہٗ سے طلب فرمائیں۔

ایک مکتوب گرامی میں جامع مکتوبات کو تحریر فرماتے ہیں۔

..... بعد سلام تحریر کرتا ہوں۔ الحمد للہ تادمِ تحریر خیریت حاصل ہے اور یہ انتہائی ضعف جو ہے وہ لازمِ کبرسنی و پیرانہ سالی ہے ——— اللہ میں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ ارذل و ناقص عمر کی طرف لوٹایا جاؤں ——— میرے لیے حسنِ خاتمہ اور مغفرتِ گناہانِ گزشتہ و آئندہ کی دعا اور باری تعالیٰ سے بواسطہ مشائخ کرام رحمت کی التجا کرتے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے تمام دوستوں کے لیے عموماً اور آپ صاحبزدگان کے لیے خصوصاً صحت و سلامتی، عافیت و استقامت اور توفیقات نیک کی دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ——— آپ نے رامپور سے جو خط بھیجا ہے وہ بھی مل گیا..... کارِ ما مور میں [illegible] سے ناامیدی اور حق تعالیٰ سے اُمید کے ساتھ عمر گزار رہے

نئے مسائل اور بدلے ہوئے حالات کے لیے احکام شرعی کا مسئلہ

(از مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ)

[مسلم پرسنل لا کی موجودہ بحث میں نئے مسائل اور بدلے ہوئے حالات کے لیے احکام شرعی کا مسئلہ ایک اہم موضوع بحث ہے، مولانا منت اللہ صاحب نے مسلم پرسنل لا پر اپنے ایک مقالے میں اس موضوع پر ایک فکر انگیز بحث فرمائی ہے۔ ذیل میں اسی کو اپنے ناظرین کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔]

قرآن مجید کی رہنمائی

قرآن کا مطالعہ اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ راہیں صرف دو ہیں۔ یا تو شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی اتباع۔ یا اپنی خواہشات کی پیروی۔

اول الذکر ہدایت ہے اور آخر الذکر ضلال و گمراہی، ان کے علاوہ کوئی تیسری راہ نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَھْوَآءَھُمْ	پھر اگر وہ آپ کے کہے پر عمل نہ کریں تو آپ سمجھ لیں کہ وہ محض اپنی خواہشات کی پیروی

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (قصص ع ۵)

اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہو سکتا ہے جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی اتباع کرے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جب حضرت داؤد علیہ السلام کو خلافتِ ارضی بخشی تو یہ حکم دیا کہ آپ فیصلہ "حق" یعنی وحی کی روشنی میں کیجیے اور "ہویٰ" یعنی مخالفِ وحی کی پیروی نہ کیجیے۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ۔ (ص۔ رع ۲)

اے داؤد ہم نے تجھ کو ملک میں نائب بنایا۔ پس تم فیصلے کرو۔ لوگوں کے درمیان حق کی بنیاد پر اور خواہشات کی اتباع نہ کرو۔ ورنہ وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیگی۔ یقیناً جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اس سبب سے کہ انھوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا۔

اسی طرح ایک تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو راہیں بتائیں ایک تو اس کی نازل کردہ شریعت کی راہ ہے جو بذریعہ وحی نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی اور دوسری صورت ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی ہے جو وحیِ الٰہی پر یقین نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اور ان کی امت کو اپنی نازل کی ہوئی شریعت پر چلنے کا حکم دیا اور خواہشات پر چلنے سے منع فرمایا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا۔ (جاثیہ۔ رع ۲)

پھر ہم نے تجھ کو دین کے معاملے میں ایک راستہ پر رکھا سو تو اسی پر چل اور نادانوں کی خواہشات کی اتباع نہ کر۔ وہ ہرگز اللہ کے مقابلے میں تجھے کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکیں گے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں صاف صاف فرما دیا گیا کہ آپ کے رب کی طرف سے جو شریعت آپ پر اتاری گئی ہے۔ آپ اس پر عمل کیجئے۔ اس سے گریز اللہ کو چھوڑ کر دوسرے "اولیا" کی پیروی کے مرادف ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ (اعراف۔ ع ۱)	اسی پر چلو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر اترا ہے۔ اور نہ چلو اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے۔ تم بہت کم دھیان کرتے ہو۔

اسی طرح ایک اور آیت میں اللہ اور رسول کی اطاعت کو ضروری قرار دیا گیا اور نزاعات کی شکل میں اللہ و رسول کی طرف لوٹنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسے تقاضائے ایمانی قرار دیا گیا۔ ارشاد ہوا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (نساء۔ ع ۸)	اے مومنو! اطاعت کرو اللہ کی اور حکم مانو رسول کا، اور ان کا جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہو۔ یہی بات بہتر ہے۔ اور انجام کے لحاظ سے بھی اچھی ہے۔

اسی طرح قرآن نے یہ بات واضح کر دی کہ اللہ اور رسول کے کسی فیصلہ کے بعد مومن کو آگے کوئی دوسرا اختیار باقی نہیں رہتا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (احزاب۔ ع ۵)	اور کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کو طے کر دے۔ تو ان کو ان کے (اس) کام میں اختیار باقی رہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان

اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کا سب سے بڑا فتنہ ان لوگوں کو

قرار دیا جو وحی الٰہی سے نظر پھیر کر اپنی رائے اور خواہشات کی بنیاد پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے رہتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

تفترق امتی علیٰ بضع وسبعین فرقۃ اعظمھا فتنۃ قوم یقیسون الذین برأیھم یحرمون بہ ما احل اللہ ویحلون ما حرم اللّٰہ۔ (اعلام الموقعین بروایۃ عوف ابن مالک اشجعی ج ۱ ص ۵۳)	میری امت ستّرسے اوپر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ان میں سب سے بڑے فتنہ والے وہ لوگ ہوں گے جو دین میں اپنی رائے سے قیاس کریں گے۔ اللہ تعالےٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیں گے اور حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرائیں گے۔

شریعت میں من مانے قوانین کی گنجائش نہیں!

اس طرح قرآن کریم کی آیات اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس پر شاہد ہیں کہ بحیثیت مسلمان ہمارے لیے شریعت سے گریز اور روگردانی کرکے اپنے من مانے قوانین کی اتباع کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چاہے سیکولرازم اور متحدہ قومیت کے تقاضے جو کچھ بھی ہوں اور میں نہیں سمجھتا کہ عقیدہ اور فکر کی آزادی' زبان اور رسم الخط کے تحفظ اور مذہب و ثقافت کی آزادی کیلیے بلند بانگ دعوؤں کے بعد تہذیبوں' زبانوں' عقیدوں اور مذہبی تعلیمات کے فنا کرنے کا جواز کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے۔

زمانہ کے تغیّرات اور شرعی احکام

رہا دوسرا سوال اور وہ یہ کہ عصری رجحانات اور زمانے کے تغیرات اور سیاسی وسماجی انقلابات کے نتیجے میں احکام شرع کے اندر تبدیلی کی کوئی گنجائش ہو کہ نہیں؟ اور اگر ہو تو اس کے لیے طریقہ کار کیا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اولاً تو اس بات کو پوری طرح سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت اسلامیہ کے بنیادی اصول قرآن وسنت کے قائم کردہ حدود کو توڑ کر جو راہ بھی اختیار کی جائے گی وہ دین سے روگردانی اور گمراہی کی راہ ہوگی۔ علامہ ابن قیمؒ نے رائے کی تین قسمیں بتائی ہیں۔

رأي باطل بلا ريب. ورأي صحيح. و رأي هو موضع الاشتباه.

بلا شبہ باطل رائے، صحیح رائے۔ اور ایسی رائے جس میں تردد ہو۔

رائے باطل کی انھوں نے چند قسمیں کی ہیں اور فرماتے ہیں:۔

احدها الرأي المخالف للنص وهذا مما يعلم بالاضطرار من دين الاسلام فساده وبطلانه ولا تحل الفتيا به ولا القضاء ان وقع فيه من وقع بنوع تأويل وتقليد.

پہلی وہ رائے جو نص کے مخالف ہو اور اس کا فساد و بطلان بالکل واضح ہے۔ اس سے فتویٰ دینا درست ہے اور نہ فیصلہ کرنا، اگرچہ کوئی اسے کسی بھی قسم کی تاویل و تقلید کے سبب کیوں نہ اختیار کرے۔

اسی طرح رائے باطل کی چند اور صورتوں کی وضاحت کرتے ہوئے ایک اصولی بات یہ فرمائی ہے کہ رائے کو وحی پر مقدم کر دینا اور خواہش نفس کو عقل پر مقدم کر دینا ہی سارے بگاڑ کی جڑ ہے۔

وكل من له مسكة من عقل يعلم ان فساد العالم وخرابه انما نشأ من تقديم الرأي على الوحي والهوى على العقل.

اور جسے بھی کچھ عقل ہے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی بربادی اور اس کا بگاڑ صرف رائے کو وحی پر اور خواہشات کو عقل پر مقدم کرنے اور ترجیح دینے کے سبب پیدا ہوا۔

اور آگے یہ فرماتے ہیں کہ جہاں یہ صورت حال پیدا ہو جائے کہ وحی پر رائے اور عقل پر خواہش نفس مقدم کر دی جائے تو حق کی جگہ باطل اور ہدایت کی جگہ گمراہی پیدا ہو گی۔

وما استحكم هذان الاصلان الفاسدان في قلب الا استحكم هلاكه وفي امة الا فسد امرها اتم فساد فلا اله الا الله كم نفي بهذه الآراء من حق و اثبت بها من باطل و اميت

اور جب یہ دونوں فاسد بنیادیں کسی دل میں جاگزیں ہو جاتی ہیں تو اس دل کی ہلاکت بھی مستحکم ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی قوم میں یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا معاملہ بھی پوری طرح تباہی کے کنارے پہونچ جاتا ہے، پس خدا شاہد ہے کہ اس قسم کے

بھا من ھدی واحیی بھا
من ضلالۃ وکم ھدم
بھا من معقل الایمان و
عمر بھا من دین الشیطان
(اعلام الموقعین ج۱ صفحہ ۶۷، ۶۸)

کی غلط آراء سے کتنے ہی حق مٹ چکے ہیں اور کتنے ہی باطل وجود میں آئے ہیں۔ اور اسی قسم کی آراء سے بہت سی ہدایتیں دفن کی گئی ہیں اور گمراہیوں کو زندگی ملی ہے اسی پر بس نہیں بلکہ اس قسم کی آراء ایمان کے قلعوں کو منہدم کرنے اور شیطان کے طریقہ کو آباد کرنے کا ذریعہ بنی ہیں۔

اس لیے دین کے بارے میں نصوص شرعیہ سے آزاد ہو کر قواعد شرعی کو نظر انداز کر کے کوئی راہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین کے مقاصد فوت ہو جائیں گے اور دین اور احکام الٰہی سے بغاوت کی راہ کھل جائے گی۔

بہر حال جس طرح یہ ایک عظیم الشان غلطی ہے اسی طرح عصری رجحانات، زمانے اور حالات کے تغیر اور ضرورت وحرج کو نظر انداز کر دینا بھی کچھ کم غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ شریعت اسلامیہ اگر نئے حالات کی رعایت نہ کر سکی اور علماء اسلام زمانہ کے پیدا کردہ نئے مسائل کا جواب نہ دے سکے اور شریعت کی جزئیات پر جمود کی راہ اختیار کی گئی تو آہستہ آہستہ دین سے بیزاری کے رجحانات پیدا ہوں گے۔

نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہوگا

ان حالات کی بنیاد پر میرے نزدیک صحیح راہ یہ ہے کہ ایک طرف مقاصد شریعت اور اور روح احکام پر پوری نگاہ رکھی جائے، دوسری طرف اصول وکلیات اور اشباہ ونظائر کو سامنے رکھ کر نئے مسائل کا حل نکالا جائے اور زمانے کے تغیر کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات کو دور کیا جائے۔ یہی وہ راہ ہے جسے صحابہ کرام اور اکابر علماء نے ہر دور میں اختیار کیا ہے۔

سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا طریقہ

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہے کہ اگر ان کے سامنے کوئی مسئلہ

آتا تو اولاً وہ کتاب اللہ میں اس کے حکم پر غور کرتے، پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاش کرتے اور اگر یہاں بھی مسئلہ کا حل نہ مل پاتا تو علماء صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ لیتے اور ان کی رائے کے مطابق فیصلہ فرماتے۔

قال ابو عبيد في كتاب القضاء حدثنا كثير بن هشام عن جعفر بن برقان عن ميمون بن مهران قال كان ابو بكر الصديق رضي الله تعالى عنه اذا ورد عليه حكم نظر في كتاب الله تعالى فان وجد فيه ما يقضي به قضى به وان لم يجد في كتاب الله نظر في سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم فان وجد فيها ما يقضي به قضى به فان اعياه ذلك سئل الناس هل علمتم ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قضى فيه بقضاء فربما قام اليه القوم فيقولون قضى فيه بكذا وكذا فان لم يجد سنة سنها النبي صلى الله عليه وسلم جمع رؤساء الناس

ابو عبید نے کتاب القضاء میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کوئی معاملہ آتا تو وہ سب سے پہلے قرآن حکیم میں دیکھتے اگر اس میں ایسی بات مل جاتی جس کی روشنی میں فیصلہ کیا جا سکتا ہو تو فیصلہ فرما دیتے۔ اور اگر کتاب اللہ میں اس کی نظیر نہ ملتی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں ڈھونڈھتے اگر ان میں کوئی نظیر مل جاتی تو اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیتے اور اگر انھیں سنتِ رسولؐ میں بھی کوئی اصل نہ ملتی تو لوگوں سے دریافت فرماتے کہ کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے معاملے میں کوئی فیصلہ فرمایا ہے؟ تو ان کے دریافت فرمانے پر بسا اوقات لوگ کھڑے ہو جاتے اور عرض کرتے کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ایسا فیصلہ فرمایا تھا۔ اور اگر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی سنت کا کچھ پتہ اس میں نہ چلتا تو وہ سردارانِ قوم کو جمع فرماتے اور ان سے مشورہ کرتے پھر جب ان تمام لوگوں

فاستشارهم فاذا اجتمع رأيهم على شيئ قضى به (اعلام الموقعين ص ۶۲)

کی رائیں کسی بات پر متفق ہو جاتیں تو اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیتے۔

سیدنا عمر بن الخطابؓ کا طرز عمل

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ اور قضایائے ابی بکرؓ کے بعد وہی راہ اختیار کرتے تھے جو سیدنا ابو بکرؓ نے اختیار کی۔

وكان عمرؓ يفعل ذلك فاذا اعياه ان يجد فى الكتاب والسنة سئل هل كان ابو بكر قضى فيه بقضاء فان كان لابى بكر قضاء قضى به، والا جمع علماء الناس واستشارهم فاذا اجتمع رأيهم على شيئ قضى به۔ (اعلام الموقعين ص ۶۲)

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی یہی فرمایا کرتے اور جب انھیں کتاب و سنت میں کوئی اصل و بنیاد نظر نہ آتی تو دریافت فرماتے کہ کیا حضرت ابو بکرؓ نے اس طرح کے کسی معاملے میں کوئی فیصلہ فرمایا ہے؟ پس اگر حضرت صدیقؓ کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیتے۔ ورنہ پھر علماء کو جمع فرماتے اور ان سے مشورہ کرتے اور جب ان کی رائے کسی نقطہ پر جم جاتی اور طے پا جاتی، تو اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیتے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ جو صحابہ میں اپنے تفقہ اور دینی فہم کے اندر ممتاز ترین شخصیتوں میں سے ایک ہیں انھوں نے بھی اس طریقِ کار کی وضاحت فرما دی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اسلام کے آنے سے پہلے ہم پر ایسا وقت گزرا ہے جہاں کسی معاملے کے فیصلہ اور قضا کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اور اب اللہ نے ہمیں اس مقام پر پہونچایا ہے جہاں ہم ان امور کے ذمہ دار ہیں۔ اب ہمارے لیے راہِ عمل یہی ہے کہ ہم کتاب اللہ کو رہنما بنائیں۔ اگر کوئی مسئلہ کتاب اللہ میں نہیں ہے تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کی طرف متوجہ ہوں اور تیسرے نمبر پر صالحین کے فیصلوں سے روشنی حاصل کریں اور

اگر یہاں کوئی شکل حل نہ ہو تو پھر راہ اجتہاد لی ہے۔

وقال ابو عبيد حدثنا ابو معاوية عن الاعمش عن عمارة عن عمير عن عبد الرحمن بن بن يزيد عن ابن مسعود قال اكثروا عليه ذات يوم فقال اتى علينا زمان ولسنا نقضي ولسنا هنالك ثم ان الله تعالى بلّغنا ما ترون فمن عرض عليه قضاء بعد اليوم فليقض بما في كتاب الله فان جاءه امر ليس في كتاب الله ولا قضى به نبيه صلى الله عليه وسلم فليقض بما قضى به الصالحون فان جاءه امر ليس في كتاب الله ولا قضى به نبيه صلى الله عليه وسلم ولا قضى به الصالحون فليجتهد رايه۔

(اعلام الموقعين ص ۶۲ ج ۱)

ابوعبید نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا کہ ایک زمانہ ہم پر ایسا گزرا ہے کہ نہ ہم فیصلہ کرتے تھے اور نہ اس کے اہل تھے پھر اللہ جل شانہٗ نے ہمیں اس مرتبہ تک پہنچایا جہاں تم ہمیں دیکھ رہے ہو۔ پس جس شخص کے سامنے کوئی معاملہ آئے تو اسے کتاب اللہ میں موجود نظیر کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔ اور اگر اس کی نظیر نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ اس کے مطابق کوئی فیصلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو تو پھر اُسے صلحاء کے فیصلے پیش سامنے رکھنے چاہئیں اور اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جو نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ اُس کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا ہو اور نہ صلحاء نے تو اپنی رائے سے اجتہاد کر کے فیصلہ کرنا چاہیے۔

سیدنا عبداللہ ابن عباسؓ کا بھی یہی حال تھا۔

ذكر سفيان ابن عيينة عن عبيد الله ابن ابي يزيد قال سمعت ابن عباس رضي الله تعالى عنهما اذا سئل عن شئ فان كان

عبیداللہ ابن یزید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ کو دیکھا کہ جب ان سے کسی بات کے بارے میں پوچھا جاتا تو اگر اس کا جواب کتاب اللہ میں مل

فی کتاب اللہ قال بہ وان لم	جاتا تو اسی کے مطابق فرمادیتے۔ ورنہ حضور
یکن فی کتاب اللہ وکان عن	صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں نظیر مل
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	جاتی تو اس کے مطابق فتوی دیتے۔ اور اگر
قال بہ فان لم یکن فی کتاب	ان دونوں میں کہیں کچھ نہ ملتا تو حضرات ابوبکر
اللہ ولا عن رسول اللہ صلی اللہ	و عمر رضی اللہ عنہما کے واقعات میں کوئی بنیاد مل جاتی
علیہ وسلم وکان عن ابی بکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ	تو اسی کے مطابق فیصلہ فرمادیتے اور اگر مذکورہ
عنہما قال بہ فان لم یکن فی کتاب اللہ و	جگہوں میں کہیں کچھ نہ مل پاتا تو اجتہاد فرماتے۔
لا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	

ولا عن ابی بکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اجتہد رایہ (اعلام الموقعین ص۶۲)

اور سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھتے ہوئے طریق اجتہاد کی طرف بھی اشارہ فرمادیا اور فرمایا:۔

الفہم الفہم فیما یختلج فی صدرک	جو چیزیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ
مما لم یبلغک فی الکتاب و	میں نہ ملیں تو ان پر بار بار غور کرو اور فہم
السنۃ اعرف الامثال والاشباہ	سے کام لو پھر مثالوں اور نظیروں کو معلوم
ثم قس الامور عندک فاعمد الی	کرو۔ اس کے بعد قیاس کرو۔ اور پھر ایسا پہلو
احبہا الی اللہ واشبہہا بالحق فیما	اختیار کرو، جو تمہارے خیال میں اللہ کے
تری۔	نزدیک زیادہ پسندیدہ اور حق کے زیادہ
(الاشباہ والنظائر للسیوطی ص۶)	قریب ہو۔

اس طرح سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہر دور میں پیدا ہونے والے نئے مسائل اور نئے حالات میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ایک واضح طریق کا تعین فرمادیا اور وہ یہ کہ شریعت میں مختلف مسائل پر احکام کی جو نظیریں منصوص اور منقول ہیں ان پر نگاہ رکھی جائے تاکہ غیر منصوص مسائل کو منصوص مسائل پر قیاس کیا جاسکے اور ساتھ ہی ساتھ اس طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ ان نظائر کے درمیان جو بار یک فرق ہیں ان پر بھی نگاہ رکھی جائے تاکہ اشتباہ نہ پیدا ہونے پائے۔ اور پھر اس بنیادی اصول کی طرف بھی رہنمائی فرمادی کہ احکام کی روح اور مشروعیت کے

مقاصد کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے تاکہ نئے مسائل میں احکام کے استخراج کے وقت مصالح شرعی فوت نہ ہونے پائیں اور شارع کی نظر کسی حکم کی مشروعیت کے وقت جن حکمتوں پر رہتی ہے وہ فوت نہ ہو جائیں۔

آثارِ صحابہ اور ائمہ مجتہدین کے فیصلے

آثارِ صحابہ کے تتبع سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بہتیرے مسائل میں صحابہ نے یہی راہ اختیار کی ہے اسی طرح علماء مجتہدین اور ہر دور کے علماء اپنے وقت کی نزاکتوں اور اصول شریعت کو سامنے رکھ کر اپنے دور کے مسائل کا حل کرتے رہے ہیں جن کے نظائر سے فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ خود سیدنا عمر فاروق رضؓ نے اپنے بہت سارے فیصلوں میں قرآن و سنت کی روح اور وقت کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر احکام جاری کیے ہیں مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ کے دور میں عورتیں مسجد جایا کرتی تھیں لیکن سیدنا عمر فاروق نے سیکڑوں برس پہلے فتنہ کی بو محسوس کر لی اور زمانہ کی تبدیلی اور حالات کے انقلاب نے انھیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ نگاہوں کی عصمت جو زمانہ نبوت میں تھی وہ باقی نہیں رہی ہے مسجد کی فضیلت اور فتنے کے دروازوں کو بند کرنا دونوں کے درجوں میں جو فرق ہے اسے سامنے رکھا۔ اور عورتوں کو مسجد کی حاضری سے حکماً روک دیا۔ اسی طرح مجاہدین کے بارے میں حکم دیا کہ وہ چار ماہ سے زیادہ باہر نہ رہیں ایک طرف جہاد اور جنگی حالات کا تقاضا اور دوسری طرف مسلمانوں کی معاشرت اور ان کے سماج کو فتنوں سے محفوظ رکھنا۔ دونوں حالات پر غور کر کے سیدنا عمر فاروق رضؓ نے چار ماہ کی حد مقرر فرما دی۔ اسی لیے ... القضاء فی الاسلام کے مصنف نے لکھا ہے۔

فکان عمرؓ یجتهد فی تعرف الحکمة	حضرت عمر رضی اللہ عنہ آیت کے نزول
التی نزلت فیها الآیة ویحاول	کی حکمت کو جاننے کی سعی فرماتے۔ اور
معرفة المصلحة التی جاء من	اس مصلحت کو معلوم کرتے جس کے
اجلها الحدیث ویاخذ بالروح	سبب حدیث وارد ہوتی تھی۔
لا بالحرف . (القضاء فی الاسلام ص۔ کتاب قضاء عمرؓ)	

ائمہ کرام کے فتاویٰ میں تجربہ کا اثر ۔ چند مثالیں

(۱) اسی طرح بعد کے بعد علماء نے حالات اور زمانہ کے تقاضوں کو ہمیشہ نگاہ میں رکھا چنانچہ امام ابوحنیفہؒ مدعاعلیہ کی حاضری، سماعِ دعویٰ، سماعِ شہادت اور فیصلہ ان تینوں اوقات میں ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور اگر ان تینوں اوقات میں سے کسی وقت بھی مدعاعلیہ غیر حاضر ہو جائے تو اسے قضا علی الغائب قرار دیتے ہیں۔ اور ایسا فیصلہ نافذ تسلیم نہیں کرتے۔ بخلاف اس کے امام ابویوسف علیہ الرحمہ جن کو امورِ قضاء سے زیادہ سابقہ پڑا۔ فرماتے ہیں کہ مدعاعلیہ کی حاضری صرف دعویٰ اور شہادت کے وقت ضروری ہے۔ بعد کے علماء نے جب یہ محسوس کیا کہ بعض اوقات مدعاعلیہ حاضر نہیں ہوتا اور نہ اس کا حاضر کیا جانا ممکن ہے۔ اور اگر اس شرط کی پابندی کی جائے تو سیکڑوں انسانوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے اور نظامِ قضا کی بنیادی مصلحت یعنی حقوق کی حفاظت اور عدل کا قیام ختم ہو جائے گا اور احکام معطل جائیں گے تو انھوں نے اس معاملہ کو قاضی کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا کہ وہ واقعات کی اصل نوعیت پر غور کرے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور حرج و ضرورت کا خیال رکھے۔ اور پھر ان سارے حالات و مسائل کو پیشِ نظر رکھ کر قاضی فیصلہ کرے۔ اور مفتی فتویٰ دے۔ شامی نے جامع الفصولین کے حوالہ سے لکھا ہے:۔

قال فی جامع الفصولین قد	صاحب جامع الفصولین نے لکھا ہے
اضطربت آراؤهم وبیانهم	کہ مفقود الخبر کے حق میں یا اس کے خلاف
فی مسائل الحکم للغائب وعلیه	فیصلہ کرنے میں لوگوں کی رائیں اور ان
ولم یصفو ولم ینقل عنهم اصل	کے بیانات مختلف ہیں اور ان سے کوئی
قوی ظاهر یبنی علیه الفروع	ایسی مضبوط بنیاد نہیں نقل کی گئی ہے جس
بلا اضطراب ولا اشکال فالظاهر	پر بلا اضطراب کے فروع کی بنیاد رکھی جاسکے
عندی ان یتامل فی الوقائع	اس لیے میرے نزدیک واضح بات یہ ہے
ویحتاط ویلاحظ الحرج والضرورات	کہ مفتی واقعات میں غور و فکر کرے، احتیاط

فيفتى بحسبها جوازا وفسادا مثلا
لو طلق امرأته عند العدل
فغاب عن البلد ولا يعرف مكانه
او يعرف ولكن يعجز عن احضاره
او عن ان تسافر اليه هي او وكيلها
لبعده او لمانع آخر وكذا
المديون لو غاب وله نقد في
البلد او نحو ذلك ففي مثل
هذا لو برهن على الغائب وغلب
على ظن القاضي انه حق لا
تزوير ولا حيلة فيه فينبغي
ان يحكم عليه وله وكذا
للمفتي ان يفتي بجوازه دفعا
للحرج والضرورات وصيانة
للحقوق عن الضياع مع انه
مجتهد فيه ذهب اليه الائمة
الثلاثة وفيه روايتان
عن اصحابنا وينبغي ان
ينصب عن الغائب وكيل يعرف
انه يراعي جانب الغائب ولا
يفرط في حقه. واقره في نور
العين قلت ويؤيد ما يأتي قريبا في
البحر وكذا اما في الفتح من باب المفقود

برتنا اور تنگیوں، دشواریوں اور ضرورتوں
کو مدنظر رکھے پھر اسی کے مطابق جواز یا عدمِ
جواز کا فتویٰ دے۔ مثلاً اگر کسی نے اپنی بیوی
کو شاہد عادل کی موجودگی میں طلاق دیدی
گواہ شہر سے کہیں اور چلا گیا۔ اور اس
جگہ کی کوئی خبر نہیں۔ یا اُسے حاضر کرنے
سے عاجز ہے یا خود عورت یا اس کا وکیل
بُعدِ مسافت یا کسی اور مانع کی بناء پر اس
کے پاس جانے سے قاصر ہے۔ اسی طرح
قرضدار کا حال ہے کہ اگر وہ غائب ہو گیا
اور اس کا کچھ مال نقدی شہر میں ہے
تو اس قسم کی صورتِ حال میں اگر مفقود الخبر
کے خلاف شہادتیں قائم کر دی گئیں اور
قاضی کو ظنِ غالب حاصل ہو گیا کہ وہ صحیح
ہے تو مناسب یہ ہے کہ مفقود الخبر کے خلاف
یا اس کے حق میں فیصلہ کر دے۔ اور اسی
طرح مفتی، مجتہد، بن کر رفعِ حرج، صیانت
حقوق، اور ایفاء ضرورت کے لیے جواز
کا فتویٰ دے یہی قول ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ
کا ہے اور ہمارے ائمہ کے اس بارے میں
دو قول ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ مفقود الخبر
کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک وکیل مقرر
کیا جائے ۔۔۔ اور ایسا ہی فتح القدیر میں

لایجوز القضاء علی الغائب الا اذا رای القاضی مصلحۃ فی الحکم له وعلیه فحکم فانه ینفذ لانه مجتهد فیه۔ قلت وظاهرہ ولو کان القاضی حنفیا ولو فی زماننا ولاینافی ما مر لان تجویز ھذا للمصلحۃ والضرورۃ۔ (شامی ص ۳۵۲ ج ۴)	مفقود الخبر کے بارے میں ہے کہ قضاء علی الغائب جائز نہیں مگر جبکہ قاضی اس کے موافق یا مخالف فیصلہ کرنے میں کوئی مصلحت دیکھے۔ اور یہ فیصلہ نافذ ہوگا کیونکہ وہ اس مسئلہ میں مجتہد ہے۔ میرے نزدیک اگرچہ قاضی حنفی ہو۔ اور ہمارے ہی زمانہ کا ہو۔ پھر بھی وہ مصلحت اور ضرورت کے پیش نظر مفقود الخبر کے معاملے میں مذکورہ بالا نہج پر فیصلہ کر سکتا ہے اور مفتی فتویٰ دے سکتا ہے۔

(۲) اسی طرح استیجار علی الطاعات کا مسئلہ[عہ] ہے جس کے بارے میں متقدمین کا فتویٰ عدم جواز کا تھا لیکن جب نظام بیت المال فاسد ہوا اور حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ یا تو اس کی اجازت دی جائے یا پھر تعلیم قرآن کے ضیاع کا خطرہ مول لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ عظیم الشان نقصان تھا جسے کسی طرح گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ علماء نے وقت کی اس ضرورت کو محسوس کیا اور دیکھا کہ بیت المال سے وظائف کا کوئی نظم نہیں اور لوگوں میں بطورِ خود اپنے عطیات کے ذریعہ اس کو چلانے کا کوئی جذبہ نہیں۔ ایسی صورت میں دو ہی شکلیں تھیں یا تو معلمین کے بال بچے ضائع ہوں اور ان کے معاش تباہ ہو یا پھر قرآن کی تعلیم ختم ہو جائے۔ پہلی شکل ممکن نہ تھی اور نہ درست۔ اور دوسری صورت ناقابل برداشت۔ ایسے حالات میں شارح بلخ نے تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز قرار دیا۔ اور پھر بعد کو اذان و امامت جن کی حیثیت شعائرِ دین کی ہے جب ان کے فوت کا بھی خطرہ محسوس کیا گیا تو علماء نے اذان و امامت پر بھی اجرت کو جائز قرار دیا۔۔۔۔ الضرورات تبیح کی روشنی میں اپنے قدیم فتووں میں ترمیم کی اور اس یقین کے ساتھ کی کہ اگر امام ابوحنیفہؒ بھی ان حالات سے دوچار ہوتے تو یہی رائے دیتے۔

عہ دینی خدمات پر معاوضے کا مسئلہ (الفرقان)

وانما افتی المتاخرون بجواز ذلك على التعليم بالضرورة المذكورة التي لو وقعت في زمن ابي حنيفة واصحابه لافتوا بذلك فلذلك افتى المتاخرون بجواز ذلك مخالفا لمذهب الصريح ولو زالت الضرورة بان انتظم امر بيت المال واعطى المعلمون ما كان له فيه كفاية لم يسع احد المتاخرين ان يخالفوا المذهب لزوال العلة التي سوغت لهم الخروج عن اصل المذهب (فتاویٰ حامدیہ ص۵ ج۲)	متاخرین نے استئجار علی التعلیم کے جواز کا فتویٰ ضرورت کی بنا پر دیا تھا، کہ اگر یہ صورت حال امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے زمانہ میں پیش آئی ہوتی تو وہ بھی یہی فتویٰ دیتے۔ اسی بنا پر متاخرین نے صریح مسلک کے خلاف جواز کا فتویٰ دیا۔ اور اگر بیت المال کا نظم استوار ہو جائے اور معلمین وغیرہ کو بقدر کفالت وظیفہ ملا کرے تو ضرورت ختم ہو جائے گی، اور کسی کے لیے اپنے مسلک و مذہب سے ہٹ کر فتویٰ دینے کی گنجائش باقی نہ رہے گی، کیونکہ وہ سبب ہی باقی نہ رہا جس کی بنیاد پر اپنے مسلک کے خلاف فتویٰ دینے کی اجازت ہوئی تھی۔

کتب فقہ کے تتبع سے اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں کہ علماء نے عرف کے بدل جانے کی بنیاد پر احکام میں تبدیلی کا فتویٰ دیا ہے اور عرف کو اصول تقنین میں خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اور عرف کے مختلف مدارج اور اس کے مفصل احکام کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔ امام سرخسیؒ نے مبسوط میں لکھا ہے:۔

الثابت بالعرف کا لثابت بالنص (جو بات عرف سے ثابت ہو وہ نص سے ثابت ہونے کے برابر ہے)

رسائل ابن عابدین میں ہے:۔

الثابت بالعرف ثابت بدلیل شرعی۔	جو بات عرف سے ثابت ہے وہ گویا شرعی دلیل سے ثابت ہے

قنیہ میں ہے:۔

لیس للمفتی ولا للقاضی ان	مفتی اور قاضی کے لیے ظاہر مذہب کے

یحکم علی ظاہر المذھب و یترک العرف۔	مطابق فیصلہ کرنا اور عرف کو نظرانداز کردینا درست نہیں ہے۔

(۳) اسی طرح بیسویں صدی کے اوائل میں جب ہندوستان میں شرعی امارت کا سوال اٹھا تو بہار و اڑیسہ میں امارتِ شرعیہ کے ساتھ ساتھ دار القضاء کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اور ہمارے قضاۃ کے سامنے پرسنل لاء سے متعلق مختلف قسم کے مقدمات پیش ہوئے۔ اور انھیں بہت سارے مسائل میں زمانہ کے تغیر، حالات کی تبدیلی، رفع حرج اور سدباب فتن کی خاطر کچھ نئی راہیں اختیار کرنا پڑیں۔ مثلاً اس قسم کے بے شمار مقدمات سامنے آئے جہاں شوہر کسی بھی وجہ سے بیوی کو چھوڑ دیتا ہے۔ نان نفقہ حقوقِ زوجیت سے محروم رکھتا ہے۔ اور اس طرح جوان عورت برسہا برس تک تکلیف مالایطاق جھیلتی رہتی ہے۔ اس کے میکہ کی طرف سے بھی اس کے نفقہ کا کوئی نظم نہیں۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ارشادات:-

فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ	اور تم انھیں معلق چھوڑ دو[عـه] (نساء ع ۱۶)
یا	
فَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (بقرہ ع ۲۸)	اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق۔
اور	
اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ	مرد حاکم ہیں عورتوں پر (نساء ع ۶)

کی وجہ سے جو ذمہ داریاں مرد پر عائد ہوتی ہیں وہ ان سے قطعاً غافل ہے۔ اور زمانہ فتنہ کا ہے جبکہ گمراہیوں کی کشش زیادہ ہے اور عفت و آبرو کا باقی رکھنا مشکل کام ہے۔ نکاح کی مشروعیت کے جو مقاصد ہیں وہ پوری طرح فوت ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف اگر قضاۃ یہ فیصلہ کریں کہ عورت شوہر کے نام پر قرض لے اور اس طرح پر نفقہ پورا کیا جائے تو ظاہر ہے کہ آج کے حالات میں اس کی کیا گنجائش ہے؟ جبکہ حنفی فقہاء کا یہی فیصلہ ہے کہ اعسار و نفقہ میں تنگی تفریق کا سبب نہیں۔

عـه یعنی (ایسا مت کرو) (الفرقان)

ومن اعسر بنفقة امرأته لم يفرق بينهما ويقال لها استديني عليه۔

(ہدایہ ج۲ باب النفقۃ ص۴۱۹)

جو شخص اپنی بیوی کا نفقہ ادا کرنے سے قاصر ہو جائے تو ان دونوں میں تفریق نہیں کی جائے گی بلکہ عورت سے کہا جائے گا کہ وہ قرض حاصل کرے جس کی ادائیگی اس کے شوہر کے ذمہ ہوگی۔

صاحب ہدایہ نے اس پر یہ استدلال کیا ہے کہ تفریق کی صورت میں مرد کا حق بالکلیہ باطل ہو جاتا ہے اور تفریق نہ کرکے اگر عورت کو قرض لینے کا حکم دیا جائے تو حق عورت کا متاخر ہو جاتا ہے اور حق کو ختم کر دینے کا نقصان حق کے مؤخر کر دینے سے بڑھا ہوا ہے۔ اس لیے قوی ضرر دور کیا جائے گا۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ شوہر اگر حقوقِ جنسی کے ادا کرنے کے لائق نہ ہو تو نکاح فسخ کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مالی حق کی ادا کاری کے لائق نہ ہو تو نکاح فسخ ہونا چاہیے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے صاحب ہدایہ کہتے ہیں کہ جنسی حقوق کو نکاح میں مقصدیت کا درجہ حاصل ہے اور مالی حق تابع کا درجہ رکھتا ہے اس لیے یہ صحیح نہ ہوگا کہ ثانوی درجہ کی چیز کی بربادی کو اصل اور مقصود کی بربادی پر قیاس کیا جائے۔ (ہدایہ ص۴۱۹ باب النفقہ)

لیکن آج کے حالات میں ظاہر ہے کہ اس جزئیہ پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے جبکہ مقاصدِ نکاح میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ اس سے طرفین کی نگاہوں میں عصمت پیدا ہوتی ہے۔ اور آبرو محفوظ رہتی ہے۔ اس فتنہ کے دور میں ایک ایسی عورت جو معلقہ پڑی ہوتی ہے اس کی معاشی ضرورتیں اسے آسانی کے ساتھ گمراہی کے گڑھوں میں دھکیل سکتی ہیں۔ پس مقاصدِ نکاح کو فوت ہوتے ہوئے اور احکامِ قرآن کی صریح خلاف ورزی دیکھتے ہوئے مصالح شرعی کے تحفظ، سدِ باب فتن کی خاطر نفقہ نہ دینے کی شکل میں ہمارے قضاۃ کو تفریق کا فیصلہ کرنا پڑا۔

نئے عہد میں مسائل کے حل کی راہ

بہرحال آج بہت سارے نئے مسائل اور نئے حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کا تقاضہ یہ ہے کہ علماء فقہ کی روشنی میں اس کا جواب دیں۔ اس سلسلہ میں اگر تجزیہ کیا جائے تو مسائل ۲ قسم

منے آتے ہیں۔

(۱) کچھ تو وہ مسائل ہیں جن سے قدیم فقہاء کو دو چار ہونا نہیں پڑا۔ اور کتاب و سنت اجماع ں مجتہدین اس مسئلہ میں ساکت ہیں۔

(۲) دوسری قسم ان مسائل کی ہے جن کے احکام فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن آج لے ہوئے حالات کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اول الذکر مسائل کو شریعت کے اصول کی روشنی ں کرنا ہوگا۔ اور ثانی الذکر مسائل میں مصالح و حکم شرعی کی رعایت کرتے ہوئے اور نصوص ح کو محفوظ رکھتے ہوئے نئے حالات کے مطابق حکم استخراج کرنا پڑے گا۔

یہ دوسری قسم کے مسائل جن پر اپنے اصولِ اجتہاد کے پیشِ نظر مجتہدین نے اپنی رائے ظاہر ہے لیکن آج کے بدلے ہوئے حالات کا تقاضا کچھ اور ہے اور موجودہ دور میں ان جوابات پر شوار نظر آتا ہے۔ ایسے مسائل کے حل کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی خاص فقہی مکتب فکر کی پابندی طع نظر کر کے دوسرے مسلمہ فقہی مکاتب فکر میں اس کا جواب تلاش کیا جائے۔ اگر کسی فقہی مسلک س کا جواب مل جاتا ہے تو اسے قبول کر لیا جائے جیسا کہ "زوجہ مفقود الخبر" کے معاملہ میں علماء نے حنفی مسلک چھوڑ کر مذہب مالکی اختیار کیا اور اسی پر فتویٰ دیا۔ اور آج اس عورت کے لیے ا شوہر مفقود ہے۔ انتظار کی مدت یوم اطلاع سے چار سال ہے۔ زیادہ نہیں۔

مسلمہ فقہی مکاتب فکر یعنی ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے مسلک کو کسی مسئلہ میں اختیار کر لینا تو درست) ضرورت کی بنیاد پر کسی مرجوح قول کو بھی قبول کیا جا سکتا ہے اگر مفتی کے سامنے کوئی مسئلہ آیا' ں کا جواب بھی ائمہ اربعہ میں کسی کے مذہب میں موجود ہو لیکن وہ جواب مسلم معاشرہ میں وقت کی زدہ واقعی ضرورت کو پورا نہیں کرتا' یا زمانہ اور حالات کے تحت اس مسئلہ میں سہولت اور بل کی ضرورت ہے جو ائمہ اربعہ کے مذاہب کے ذریعہ نہیں ہوتی تو مفتی فقہائے اسلام میں سی کے مرجوح قول کو بھی اختیار کر سکتا ہے اور اس پر فتویٰ دے سکتا ہے۔

کتب فقہ میں ایک بحث یہ ہے کہ اگر مقروض سے ادائے قرض کی کوئی امید اور راہ نہ ہو ین خواہ کے لیے مقروض کے مال میں سرقہ کر کے اپنے قرض کو وصول کر لینا درست ہو یا نہیں؟ حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ سرقہ کر سکتا ہے اور اس سے دیانتہً اپنے قرض کو وصول کر سکتا

ہے لیکن قرض اور مال سرقہ ایک ہی جنس کا ہونا چاہیے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "اگر دو جنس کا ہو جب بھی اس حالت میں اپنے قرض کی وصولی کے لیے سرقہ درست ہے۔

اسی مسئلہ پر "صاحب درمختار" نے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے

واطلق الشافعیؒ اخذ خلاف الجنس للمجانسة فی المالیة قال فی المجتبیٰ وهواوسع فیعمل به عند الضرورة۔ (کتاب السرقہ مطلب یعذر بالعمل بمذہب الغیر عند الضرورۃ علیٰ حاشیہ ردالمختار ص ۲۰۷ ج ۳)	اور امام شافعی نے مالیت میں اشتراک کی بنا پر ایسے مال کا لینا بھی جائز قرار دیا ہے جو قرض کی جنس سے نہ ہو۔ المجتبیٰ میں اسی کو "اوسع" کہا گیا ہے۔ لہٰذا اس پر ضرورت کے وقت عمل کیا جائے گا۔

درمختار کی اس عبارت پر علامہ شامیؒ (م ۱۲۵۲ھ) نے لکھا ہے جس سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے وقت اور وسعت و تسہیل کی خاطر دوسرے فقہی مسلک پر عمل کرنا اور فتویٰ دینا بالکل درست ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علامہ شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسائل و احکام میں زمانہ کے بدلے ہوئے حالات کی ممکن رعایت نہ صرف مستحسن بلکہ ضروری سمجھتے ہیں۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:۔

قال القهستانی وفیه ایماء ان له ان یأخذ من خلاف جنسه عند المجانسة فی المالیة وهذا اوسع فیجوز الاخذ به وان لم یکن مذهبنا فان الانسان یعذر فی العمل به عند الضرورة کما فی الزاهدی (قال الشامی)	قہستانی نے فرمایا کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے لیے مجانست مالیہ کے موقع پر خلاف جنس کو لینا جائز ہے اور یہی "اوسع" ہے۔ پس اسے اختیار کرنا اگرچہ ہمارا مسلک نہ ہو جائز ہے۔ اس لیے کہ انسان ضرورت کے وقت اس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہے جیسا کہ زاهدی میں ہے۔ (شامی)

رأيت في شرح النظم ان	فرماتے ہیں) میں نے شرح النظم میں دیکھا
عدم جواز الاخذ من	ہے کہ خلاف جنس لینے کا عدم جواز ان لوگوں
خلاف الجنس كان في زمانهم	کے زمانہ میں اس بناء پر تھا کہ وہ لوگ ادائیگی
لمطاوعتهم في الحقوق والفتوى	حقوق میں پیش پیش تھے لیکن آج کل فتویٰ
اليوم على جواز الاخذ عند القدرة	جواز ہے۔ خصوصاً ہمارے دیار میں چونکہ
من اي مال كان لاسيما في ديارنا	لوگ حق تلفی کے عادی ہیں۔ شعر
لمداومتهم للعقوق ـ شعر	
عفاء على هذا الزمان فانه	اس زمانہ میں معاف ہے اس لیے کہ یہ حق
زمان عقوق لا زمان حقوق	تلفی کا زمانہ ہے نہ کہ ادائے حقوق کا۔ آج
وكل رفيق فيه غير مرافق	کل نہ کوئی رفیق ہمدرد ہے اور نہ کوئی دوست
وكل صديق فيه غير صدوق	مخلص۔
(رد المحتار ص ۲۰۰ ج ۳ کتاب السرقة)	

بہرنوع مسائل واحکام کی دو قسمیں جو اوپر بیان کی گئیں۔ ایک تو وہ جن سے قدیم فقہاء کو دوچار ہونا نہیں پڑا۔ دوسرے وہ مسائل جن کے احکام کتب فقہ میں تو موجود ہیں لیکن بدلے ہوئے حالات میں ان پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

پہلی قسم کے مسائل کو اسلام کے اصل اصول قرآن وحدیث کی روشنی میں حل کرنا ہوگا۔ اور دوسری قسم کے مسائل میں نصوصِ شرعیہ کی روح کو محفوظ رکھتے ہوئے بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر شرعی حکم معلوم کرنا پڑے گا۔

اجتہاد

ظاہر ہے کہ دونوں قسم کے یہ کام اجتہاد کے کام ہیں، اور اجتہاد کے لیے جو شرائط کتب فقہ میں مذکور ہیں ان کا کسی ایک شخص میں پایا جانا آج کے دور میں مشکل ہے۔ شامی نے اجتہادِ مطلق کے شرائط بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

وشرطه الاسلام والعقل والبلوغ	اور اس کی شرط اسلام، عقل، بلوغ، فقیہ
وكونه فقيه النفس اى شديد	النفس یعنی فطری وطبعی طور پر خوب سمجھدار

الفهم بالطبع وعلمه باللغة العربية وكونه حاويا لكتاب الله تعالى فيما يتعلق بالاحكام وعالما بالحديث متنا وسندا وناسخا ومنسوخا وبالقياس.	ہونا' عربی زبان پر عبور' کتاب اللہ کے اس حصہ پر حاوی ہونا جو احکام سے متعلق ہو' حدیث کے متن' سند اور ناسخ ومنسوخ سے واقف ہونا اور قیاس سے آگاہ ہونا ہے۔

(شامی جلد ۴ صفحہ ۳۰۸ باب کتاب القضاء)

ان شرائط کی مزید تفصیلات دوسری کتابوں میں درج ہیں۔

موجودہ دور میں اجتہاد کی عملی شکل

آج جبکہ استخراج احکام کی ضرورت ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ جدید مسائل پر ایسی رائیں لے رہے ہیں جو کتاب وسنت سے متعارض ہیں اور اپنی پشت پر اصول شرع سے کوئی استناد نہیں رکھتیں جن سے سخت گمراہی اور فتنہ کا خطرہ ہے۔ ایسے حالات میں کسی خاص فرد کو تو یہ فرض سونپ دینا درست نہیں لیکن علماء اور اصحاب نظر کی ایک جماعت جو دین کے متعلق ضروری علوم میں پوری مہارت رکھتی ہو اور اس کی نگاہ زمانۂ حال اور اس کی ضروریات' ملک کے تمدنی وثقافتی معاملات پر گہری ہو' نیز تاریخ اسلام' فقہ اسلامی کے مختلف ادوار اور ان تاریخی عوامل پر نگاہ ہو جو مختلف مراحل میں قانون پر اثر انداز ہوئے ہوں۔ ایسے لوگ جمع ہوں اور کتاب وسنت' آثار صحابہ' اجماع متقدمین اور اجتہادِ فقہاء کو سامنے رکھ کر اپنی پوری صلاحیتیں اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ صرف کریں تو امید ہے کہ ان مسائل کا حل نکل سکے گا۔ اور ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو شریعتِ خداوندی کی طرف سے موجودہ حالات میں ہم پر عائد ہوتی ہے۔ . . . . .

معرکۂ ایمان و مادیت

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ــــ سورۂ کہف کا مطالعہ تفسیر' حدیث قدیم تاریخ' جدید معلومات اور حالات حاضرہ کی روشنی میں' قیمت مجلد: ۵/ ۳

ملنے کا پتہ :- کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

شاہ نعمت اللہ کے تین قصیدے اور پیشینگوئیاں

از ——— محمد منظور نعمانی

پچھلے مہینے مارچ کے آخری ہفتہ میں سورت جانا ہوا وہاں گجرات کے ۸۰ سالہ مشہور مسلم رہنما اور بزرگ صحافی، منادی صاحب کی خدمت میں بھی عیادت کی نیت سے حاضری ہوئی، عرصہ ہوا موصوف پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا، اس کے اثر سے مدت تک معذوری رہی! اب الحمد للہ کافی بہتر حالت ہے بس خفیف سا اثر باقی رہ گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بھی زائل فرمائے اور کامل صحت و عافیت عطا فرمائے۔

منادی صاحب نے کسی اخبار میں راقم سطور کا وہ مضمون پڑھا تھا جو شاہ نعمت اللہ کے ایک قصیدے اور اسکی پیشنگوئیوں سے متعلق "الفرقان" کے محرم سنہ ۱۳۹۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا تھا اور بہت سے دوسرے اخبارات نے بھی اس کو نقل کیا تھا ... الفرقان کے اس مضمون کا تذکرہ کرتے ہوئے ___ اور میری اس رائے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے کہ یہ پیشینگوئیاں موضوعات ومفتریات کے قبیلہ سے ہیں اور ان میں سے بہت سی واقعات کے بعد گڑھی گئی ہیں ___ منادی صاحب نے فرمایا کہ میرے پاس تو ان "شاہ نعمت اللہ ولی" اور ان کے قصیدوں، پیشینگوئیوں کا ایک پورا فائل ہے، پھر وہ فائل منگوایا اور مجھے ہی عنایت فرما دیا۔

اس فائل کی خاص اہم چیز ماہنامہ "اعلان" کراچی کے دو شمارے ہیں، ایک ۲۷ دسمبر سنہ ۴۷ء کا شمارہ ہے، دوسرا ۴ نومبر سنہ ۴۸ء کا ہے ___ ۲۷ دسمبر سنہ ۴۷ء کے شمارہ پر جلد اول نمبر ۴ لکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ماہنامہ قیام پاکستان کے فوراً بعد ستمبر سنہ ۴۷ء سے جاری ہوا تھا۔ "اعلان" کے ان شماروں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ایسے قصیدے تین ہیں، جو "شاہ نعمت اللہ ولی" کی طرف منسوب ہیں ... ...

... ایک قصیدہ تو وہی ہے جس پر دو مہینے پہلے الفرقان میں تبصرہ کیا گیا تھا۔ ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے کہ یہ قصیدہ قریباً ساٹھ شعروں کا ہے اور الفاظ و معنیٰ ہر لحاظ سے نہایت مہمل اور جاہلانہ ہے اور اس کے بہت سے شعر خود بول رہے ہیں کہ ان کو کسی بہت ہی کم پڑھے لکھے آدمی نے گڑھا ہے ـــــ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ہمیں اس کا علم پھلواری شریف (بہار) سے شائع ہونے والے ایک ہفتہ[۱] وار (غمخوار) کے تراشہ سے ہوا تھا۔

ماہنامہ "اعلان" کراچی کے دسمبر ۱۹۴۸ء کے شمارہ میں یہی قصیدہ "شکست ہندوستان" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، تعارف اور تمہید کے ساتھ اس کے شائع کرنے والے کوئی صاحب ڈاکٹر عمر علی خاں ہیں اُردو میں اشعار کا ترجمہ اور تشریح کرنے والے بھی غالباً وہی ہیں، ترجمہ اور تشریح قریباً لفظ بلفظ وہی ہے جو ہفتہ وار غمخوار میں شائع ہوئی ہے، سوائے اُن چند تصرفات کے جو کسی وجہ سے اس ترجمہ اور تشریح میں کیے گئے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ اس شکل میں یہ سب سے پہلے "اعلان" ہی میں شائع ہوا تھا، بعد میں وہی دوسرے اخبارات یا رسائل میں نقل ہوتا رہا ہے ـــــ راقم سطور کا قیاس ہے کہ اس کے وہ اشعار جن میں ہندوستان کی تقسیم اور اُس کے بعد کے بعض واقعات کی پیشین گوئی کی گئی ہے اسی زمانے کے گڑھے ہوئے ہیں، اور بیچارے سادہ لوح مسلمانوں کا جو ذہن اس زمانے میں بنا دیا گیا تھا اُس کی پوری عکاسی کر رہے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ قصیدہ کے بعض اشعار کی تشریح میں بعض باتیں جو ماہنامہ "اعلان" میں اب سے ۲۵ سال پہلے ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی تھیں اور اب اتنی مدت گزر جانے کے بعد جن کا جھوٹ اور خرافات ہونا بالکل ظاہر ہو چکا ہے اُن کو "غمخوار" میں نہیں پایا گیا۔ اسی طرح بعض ایسے شعر ہی سرے سے غائب ہیں یا کچھ تبدیلی کے ساتھ ہیں۔ مثلاً قصیدہ کا ایک شعر ہے جس کا محرم کے الفرقان کے سابق مضمون میں بھی ذکر کیا گیا تھا۔

از گشش حرد فی نقال کینہ پرور مسلم شود بخاطر از لطف آں یگانہ

"اعلان" میں اس کا مطلب لکھتے ہوئے نہایت بے تہذیبی کے ساتھ گاندھی جی کا نام لکھ کر

---

[۱] یہ ہفتہ وار غالباً تھوڑے ہی عرصہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے کہ یہ بہار مسلم لیگ کا ترجمان ہے۔

صراحت کی گئی تھی کہ یہ پیشین گوئی "اسی کے بارے میں ہے اور جیسا کہ اس شعر میں کہا گیا ہے وہ خدائی مہربانی سے مسلمان ہوجائے گا"۔ بلکہ اس کی مزید تائید میں "اعلان" میں ایسے ہی ایک کسی اور بزرگ "شیخ تنوسی" کی ایک پیشین گوئی یہ بھی ذکر کی گئی ہے کہ وہ (یعنی گاندھی) مسلمان ہو کر حج و زیارت کے لیے مکہ و مدینہ بھی جائے گا"۔[۵]

(اعلان کراچی دسمبر ۴۷ء صد ۱۹)

لیکن اب جبکہ اس پیشین گوئی کا سراسر جھوٹ اور خرافات ہونا ظاہر ہو چکا ہے تو تشریح سے گاندھی جی کا نام حذف کر دیا گیا ہے اور حج و زیارت اور مکہ و مدینہ جانے کا ذکر بھی نہیں ہے۔ اسی طرح "اعلان" میں جو قصیدہ چھپا تھا اس میں گاندھی جی کے متعلق مندرجۂ بالا شعر کے بعد متصلاً پنڈت نہرو سے متعلق یہ شعر مندرجۂ ذیل تشریح کے ساتھ چھپا تھا جس میں اُن کے بھی "حقیقی مسلمان" ہونے کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔

مسلم شود حقیقی از شوقِ شائقانہ — واں دیگرے کہ باشد با نہرو داد وصفی

یہ نہرو ہے جو اگر مارا نہ گیا تو بہ شوقِ خاطر مسلمان ہو جائے گا۔

ماہنامہ "اعلان" دسمبر ۴۷ء صد ۱۹

چونکہ اس شعر سے اب اس قصیدہ اور اس کی پیشین گوئیوں کا سراسر خرافات اور لغو و بیہودہ بکواس ہونا بالکل ہی ظاہر ہو جاتا تھا اس لیے اب ۷۲ء میں جب اس کو نقل کیا گیا تو اس شعر اور اس کی تشریح کو سرے سے حذف کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح کی ایک تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ قصیدہ میں ایک شعر ہے :-

سازند از دلِ خود تفسیرِ فی القرآنہ — دو کس بنام احمد گمراہ کنند بے حد

اس کی تشریح "اعلان" میں اس طرح کی گئی تھی۔

"وہ ایسے شخص ہوں گے جن کے نام میں لفظ احمد شریک رہے گا یہ اپنے دل سے قرآن کی تفسیر بنا کر مسلمانوں کو گمراہ کریں گے۔"

(آگے لکھا تھا۔ ایک تو) مولانا آزاد ہیں جن کا اصل نام احمد ہے، دوسرے صاحب کے

---

۵ اور اس کے بعد کچھ اور بھی لکھا گیا ہے جس کا ذکر بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

متعلق میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا۔" (ماہنامہ اعلان کراچی دسمبر ۷۱ء صفحہ ۱۵)

لیکن اب شرح کی عبارت کا یہ آخری حصہ جس میں صراحت اور قطعیت کے ساتھ مولانا آزاد کو نامزد کیا گیا تھا حذف کر دیا گیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ تصرفات غمخوار کے ادارہ نے کیے ہیں یا ان کے کسی پیش رو نے۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ اس طرح کے تصرفات خود بتاتے ہیں کہ اس قصیدہ کی اور اس کی پیشین گوئیوں کی حقیقت اور نوعیت کیا ہے۔

ادارۂ اعلان نے ۱۱ مہینے کے بعد نومبر ۷۱ء کے شمارہ میں اس قصیدے کو دوبارہ شائع کیا تھا اس میں قریباً ۱۰ اشعروں کا اضافہ ہے۔

اس کے علاوہ نومبر ۷۱ء کے اس شمارہ میں انہی شاہ نعمت اللہ کی طرف منسوب کر کے ایک دوسرا فارسی قصیدہ اسی طرح اردو ترجمہ یا مطلب کے ساتھ شائع کیا گیا تھا اور اس کی خاص پیشین گوئیوں کا مصداق "مظہر" مسٹر محمد علی جناح کو بتایا گیا تھا۔ اعلان کے اسی شمارہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی بعض کتابوں میں اس قصیدہ کی پیشینگوئیوں کا مصداق اور مظہر اپنے کو بتایا ہے۔

اس قصیدہ میں ۴۹ شعر ہیں اس کی خاص پیشین گوئی یہ ہے کہ تیرھویں صدی ہجری سے بہت بڑے انقلاب کا دور شروع ہوگا، دنیا کے حالات بہت خراب ہو جائیں گے، ظالموں کا دور دورہ ہوگا۔ مگر اسکے بعد خدا کی طرف سے اس کا ایک مقبول اور محبوب بندہ "ید بیضا" اور "ذوالفقار" کے ساتھ اٹھے گا۔ وہ "امام معصوم" ہوگا اور حق دشمن طاقتوں کو شکست دے گا۔ اس کے دم سے اسلام کے گلستان میں بہار آجائے گی۔ خدا کے اس مقبول و محبوب بندے اور "امام معصوم" کا دور چالیس سال کا ہوگا۔ ایک شعر میں اس کے نام کی طرف بھی مبہم اشارہ کیا گیا ہے، شعر یہ ہے۔

میم، حا، میم و دال میخوانم نام آں نامدار می بینم

اس شعر کا مطلب "اعلان" میں یہ لکھا گیا ہے۔ "اس نامدار قائد کا نام محمد ہوگا" (اعلان نومبر ۷۱ء صفحہ ۱۰)
آگے "اعلان" کے ادارہ نے یہ نوٹ بھی لکھا ہے۔

"نوٹ۔ مرزا صاحب (مرزا غلام احمد قادیانی) کی کتاب نشان آسمانی میں یہ مصرع یوں درج ہے۔ "اح م و دال مے خوانم"۔ میں نے اس شعر کے بارے میں ذاتی طور پر تحقیق کی اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ صحیح مصرع "میم، حا، میم و دال می خوانم" ہے۔" صفحہ ۱۱۔

اس کے آگے "اعلان" کے قریباً ڈیڑھ صفحہ پر مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوے کی تردید کرنے کے بعد لکھا ہے پس ظاہر ہوا کہ یہ پیشینگوئی قائدِ اعظم کے بارہ میں ہے.... اور آج زندگی کے اس نازک دور میں حضرت قائدِ اعظم کی ذات ہی عوام کی امیدوں کا مرکز ہے۔

"اعلان کراچی" بابت نومبر ۴۸ء ص ۱۱۹

جہاں تک اس قصیدے کے اپنے الفاظ اور اشعار کا سوال ہے' ان میں واقعی طور پر کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے لغویت اور خرافات کہا جائے۔ اس کی پیشینگوئی میں کسی خاص سنہ و سال اور کسی نامزد شخص و مقام اور ملک کا تعین نہیں ہے۔ نہ مستقبل کے واقعات کی کوئی منجمانہ فہرست ہے۔ بنیادی طور پر کوئی اسے امام مہدی کی پیشینگوئی کا شاعرانہ چربہ کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے۔ اس کی زبان بھی بالکل الگ ہے جس سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ تینوں قصیدے کسی ایک آدمی کے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اتفاق سے اسی قصیدے کی شاہ نعمت اللہ ولی کی طرف نسبت کو' تحقیق کرنے والوں نے صحیح بھی مانا ہے' باقی سب کو وہ بھی جعلی بتاتے ہیں۔ مگر ذوق و مزاج کا فساد دیکھئے کہ اس میں بھی تشریحات اور ترجمہ کے ذریعہ وہی تعین اور وہی خرافاتی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اول الذکر قصیدہ میں تھا اور آگے ذکر کیے جانے والے ایک تیسرے قصیدہ میں پایا جاتا ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اسے اپنے اوپر چسپاں کیا تو بانیٔ پاکستان مسٹر محمد علی جناح کے ماننے والے اس کا مظہر و مصداق اپنے ہیرو کو بتانے میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ الفاظ کسی پر بھی صادق نہیں آتے۔

جس مقصد کے تحت ان قصیدوں پر گفتگو کی جا رہی ہے اور جس موٹی بات کی طرف عام مسلمانوں کی توجہ دلانا مقصود ہے اس کی رو سے زیادہ باریکیوں میں جانے کا نہ یہ موقع ہے نہ اس کی ضرورت۔ لیکن پڑھے لکھے لوگوں کو اس قسم کی ایک بات کی طرف اس قصیدے کے بارے میں بھی توجہ دلا دینا ضروری ہے جس کی اصلیت بتائی جاتی ہے کہ اس میں "امام معصوم" جیسے الفاظ صاحبِ قصیدہ کے بارے میں کیا بتاتے ہیں؟

"اعلان کراچی" کے اسی شمارہ (بابت نومبر ۴۸ء) میں "شاہ نعمت اللہ" کے ایک

.... [illegible] رمز حروف ہیں، جن کی مراد ظاہر ہی ہے۔

تیسرے قصیدہ کا بھی تذکرہ ہے اُس کا صرف ایک شعر بھی نقل کیا گیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

پانصد و ہشتاد ہجری بود چوں ایں گفتہ شد
در ہزار و سہ صد و ہشتاد آں پیدا شود

اور اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

ص۱۱۹ "یعنی ۵۸۰ھ میں یہ پیشینگوئی کی گئی اور ۱۳۸۰ھ میں یہ سب کچھ ظہور میں آجائے گا۔ اعلان کے اس شمارہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ "یہ پورا قصیدہ آئندہ شمارہ میں شائع کیا جائے گا۔" —— اس اعلان کے مطابق دسمبر ۴۰ء کے شمارہ میں وہ شائع ہوا ہوگا، لیکن وہ شمارہ نہیں مل سکا۔ مگر منادی صاحب کے فائل ہی میں اس پورے قصیدہ کی بھی قلمی نقل مل گئی، اور سورت ہی کے ایک دوسرے صاحبِ ذوق بزرگ جناب عبدالقادر صاحب کی ایک قدیمی بیاض سے بھی حاصل ہوگئی۔

اس قصیدہ میں ۴۷ شعر ہیں عہد تیمور سے لے کر دہلی پر نادر شاہ کے حملہ اور سکھ گردی تک کے حوادث و واقعات کے بارہ میں پیشینگوئیاں ہیں۔ کئی مشہور بادشاہوں کے نام بھی آگئے ہیں آخری تین شعر یہ ہیں۔

پانصد و ہفتاد ہجری بود تا ایں گفتہ شد
در ہزار و دو صد و ہشتاد آں پیدا شود

غلبۂ اسلام باشد تا چہل در ملک ہند
بعد ازاں دجال ہیں در اصفہاں پیدا شود

از برائے رفع آں دجال مے گویم شنو
عیسیٰ آید مہدی آخر زماں پیدا شود

اس پیشینگوئی کی رو سے ۱۲۸۰ھ سے لے کر چالیس سال یعنی ۱۳۲۰ھ تک ہندوستان

ملے منادی صاحب کے فائل سے اور جناب عبدالقادر صاحب کی بیاض سے جو نقلیں حاصل ہوئیں ان میں یہ شعر اسی طرح ہے یعنی پہلے مصرع میں "پانصد و ہفتاد ہجری" اور دوسرے میں "در ہزار و دو صد و ہشتاد" لکھا گیا ہے۔

میں مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے تھی، اس کے بعد اصفہان سے دجال کا خروج اور آسمان سے حضرت عیسیٰؑ کا نزول اور پھر مہدی آخر الزماں کا ظہور ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اب تک کہ ہجری ۱۳۹۲ھ ہے اور چودھویں صدی کے صرف ۸ سال باقی رہ گئے ہیں ان میں سے کوئی بات بھی وقوع میں نہیں آئی ۔۔ اور سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ ان تین میں کا پہلا شعر قصیدے کو ۵۸ھ میں کہا ہوا بتا رہا ہے جبکہ شاہ نعمت اللہ کا سنہ ولادت محققین نے ۷۳۰ھ یا ۷۳۱ھ بتایا ہے۔ یعنی ۵۸ھ کے ڈیڑھ سو برس بعد۔

بہرحال اصل واقعہ یہی ہے کہ پیشنگوئیاں محض جعلی ہیں اور بعض لوگوں کا یہ اسی طرح کا ایک شیطانی کھیل ہے جیسا کہ کچھ دنوں پہلے تک "فرمان مصطفوی" کے اشتہارات روضۂ نبوی کے کسی فرضی خادم "شیخ احمد" کے نام سے شائع ہوا کرتے تھے، بلکہ اب بھی شائع ہوتے ہیں۔

اگر مسلمانوں میں شعور ہوتا تو وہ ان قصیدوں کے پھیلانے والوں کا احتساب کرتے لیکن افسوس ہے کہ قریباً پورے عالم اسلامی میں مسلمانوں کی اکثریت کا حال عرصہ سے وہ ہے جو قرآن مجید کی اس آیت میں بنی اسرائیل کا بیان کیا گیا ہے۔

إِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ	جب اُن کے سامنے حق و فلاح کا راستہ آتا ہے تو وہ اس پر نہیں چلتے اور جب گمراہی اور نامرادی کی راہ آتی ہے تو اس پر رواں دواں ہو جاتے ہیں۔

فالی اللہ المشتکیٰ وھو المستعان

صدر یار جنگ

(تالیف، شمس تبریز خاں صاحب۔ رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ)

نواب صدریار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شیروانی مرحوم کی سوانح حیات جس کا ابتک مرتب نہ ہونا ہمارے اسلامی کتب خانہ کی بڑی کمی تھی، موصوف کے ذہنی، اخلاقی، علمی، ادبی اور دینی کمالات، ملی زندگی کے ان تمام گوشوں میں ان کی خدمات امتیازات کا مرقع ــــ مقدمہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے۔ صفحات ۵۰۰۔ قیمت مجلد -/۱۲

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مُراسلات

شاہ نعمت اللہ کے قصیدۂ "شکستِ ہندوستان" پر
کچھ اور روشنی

محترمی۔ السلام علیکم

آپ کا مضمون جو الفرقان میں شائع ہوا تھا اور یہاں نقیب۔ پٹنہ نے ۲۰ مارچ کی اشاعت میں اس کی نقل شائع کی ہے نظر نواز ہوا۔ آپ نے شاہ نعمت اللہ ولی کے قصیدہ کا صحیح تجزیہ کیا ہے۔ تقریباً یہی باتیں میں مجمع احباب میں کہتا رہا ہوں۔ لیکن اس موضوع پر کسی عالم کا قلم اٹھانا زیادہ ضروری تھا تاکہ مذہبی نقطۂ نظر سے پیشین گوئی یا نجومِ دانی کی حیثیت اُجاگر ہو سکے۔

۱۹۴۲ء میں انگارہ کلکتہ میں جو قصیدہ چھپا تھا وہ آپ نے نہیں دیکھا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے۔ میں اس وقت دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ فارسی بھی پڑھتا تھا۔ میری زندگی کا یہ سب سے پہلا واقعہ تھا کہ میں نے جانا کہ اب میں ایک فارسی قصیدہ بغیر کسی استاد کے بتائے ہوئے سمجھ سکتا ہوں بلکہ فارسی نہ جاننے والوں کو سمجھا بھی سکتا ہوں۔ میں اس وقت تک اتنا ہی جانتا تھا کہ بود اور شد لگا دینے سے فارسی اور ان کی جگہ ہے اور تھا وغیرہ لگا دینے سے اردو ہو جاتی ہے۔ اور ماشاء اللہ پورے قصیدہ میں بود اور شد موجود ہے میں نے اس قصیدے کو اپنے دوست کے بڑے بھائی کے پاس سے حاصل کر کے نقل کیا تھا اور اسے اس وقت تک بار بار دیکھا کیا جب تک کہ میں کالج کا طالب علم نہیں ہوا تھا جب مجھے اس کے خرافات ہونے کا یقین ہو گیا تو ایک دن پوری کاپی کو چولھے میں جھونک دیا۔

انگارہ میں مصنف کا نام "شاہ نعمت اللہ بخاری" چھپا تھا۔ اب بخاری کی جگہ ولی ہو گیا ہے۔ "از گ مشش حروفی" والے شعر میں اُس مرتبہ "مسلم شود باآخر" تھا۔ اب باآخر کی جگہ "بخاطر"

نے لے لی ہو۔ اس مرتبہ فاتحین کے نام میں "عبداللہ از کاشمر میر عثمان از دکن تھا" اب کی "عثمان" اور "حبیب اللہ" کا ذکر خیر ہے۔ اُس بار "شہر عظیم" میں جو خون خرابے کی بات تھی اُس کی وضاحت دہلی کے فرقہ وارانہ فسادے کی گئی تھی۔ اشعار کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ افسوس کہ اس وقت نہ اصل ہے اور نہ نقل ورنہ میں دونوں قصیدوں میں جو بقیہ اختلافات ہیں اُن کی وضاحت کر دیتا۔

غمخوار پھلواری شریف کے علاوہ شبستان ڈائجسٹ نے بھی اس کو شائع کیا ہے۔ اور شاید کئی اور رسالوں اور اخباروں نے شائع کیا ہے۔ یہاں ایک ڈاکٹر صاحب نے چار پانچ پرچے اور رسالے جمع کر رکھے ہیں جن میں وہ پیشین گوئی ہو ان میں سے ہر پرچہ والے نے اس قصیدے کے علم الغیب ہونے پر زور دیا ہے اور بہت سی روایتوں کے ذریعہ اس کا حق ہونا ثابت کیا ہے۔ افسوس ہے کہ۔ ع

یہ اُمت خرافات میں کھو گئی

بنگلہ دیش سے کسی کا خط آیا تھا جو پٹنہ کے اخبار "سنگم" میں شائع ہوا تھا، اس میں بھی یہ جملہ ہے:-

"ایک پیشین گوئی کی رو سے آئندہ محرم میں جہاد ہونے والا ہے۔ اگر جہاد ہو گیا تو شاید ہمارے لیے اور بھی برا دن ہو گا۔" ملت کی اکثریت اس پر ایمان کامل رکھتی ہے۔ اب تو مسجدوں میں نمازیوں کی صف میں اس کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ ہاں محرم کے گزر جانے کے بعد پختگیٔ یقین میں کچھ کمی آئی ہے۔ امید ہے مزاج عالی بخیر ہو گا۔ والسلام ونیاز

نیاز کیش۔ سمیع الحق

(ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ آف اردو اینڈ پرشین۔ رانچی کالج۔ رانچی ۸)

مسلمانوں کو حقائق بتانے کی اور ضرورت

مکرمی و محترمی مولانا منظور احمد صاحب

سلام مسنون۔ ماہنامہ "الفرقان" "نشیمن" کے تبادلے میں آتا ہے اور پورے دفتر میں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اللہ پاک اس رسالے کو قائم و دائم رکھے اور آپ کے ملک و قوم کی خدمت کرنے کے جذبۂ نیک میں وسعت عطا فرمائے آمین ـــــ نعمت اللہ شاہ کے نام نہاد قصیدے پر

آپ نے جو تبصرہ کیا ہے اسی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے یہ خط لکھا جا رہا ہے۔ اللہ پاک اس عظیم خدمت کے لیے آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔ نشیمن میں کئی مضامین اس کے خلاف شائع ہو چکے ہیں آپ نے اس کا صحیح تجزیہ کر کے اور عوام کو صحیح صحیح بات بتا کے ہماری تحریروں کو سچا ثابت کر دیا مسلمانوں کو افیون کی گولیاں کھلانے میں دہلی کے .... دہلی کا .... بہار کا .... اور پٹنہ کے ایک .... برابر کام کر رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کی قبریں کھود رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ آپ نے جس طرح پاکستان کے حکمرانوں کی احمقانہ سیاست پر گزشتہ شمارے میں کھل کر تبصرہ کیا تھا۔ اسی طرح آئندہ شماروں میں بھی مسلمانوں کی ٹھیک ٹھیک رہنمائی کریں اور انھیں اصل حقائق سمجھائیں۔ آپ کی زبان اور قلم دونوں کو اللہ پاک نے طاقت بخشی ہے۔ لہذا آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ دونوں سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کی اس نازک وقت میں صحیح رہنمائی فرمائیں۔ فقط

شاہ امیر اللہ نظامی۔ نائب مدیر نشیمن

(ہفت روزہ نشیمن۔ بنگلور)



ایک جعلی قصیدہ

[صدق جدید ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء میں ایک مراسلہ اور ایڈیٹر صدق جدید مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا تبصرہ۔]

ایک بات عرصہ سے عرض کرنے والا تھا کہ پہلی جنگ عظیم سے دیکھ رہا ہوں کہ جب کوئی ایسی بڑی جنگ (جس میں ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہو) ہوتی ہے شاہ نعمت اللہ صاحب کا قصیدہ بہت امید افزا پیشین گوئیوں کے ساتھ مشہور ہوتا ہے۔ پہلے اس کی بحر دوسری تھی اب دوسرا ردیف و قافیہ ہے۔ ایک نسخہ مجھے بھی ملا ہے جس میں ترجمہ بھی ہے۔ بہت سے مسلمان بھائی بڑی امیدیں لگائے ہیں یہ کون نعمت اللہ صاحب تھے اور اس کی کیا اصلیت ہے۔ اگر صدق کے ذریعہ جواب مرحمت ہو تو اور لوگوں کا بھی غالباً بھلا ہو جائے۔

.... از لکھنؤ

صدق : یہ قصیدہ اپنے علم میں سب سے پہلی بار پہلی جنگ یورپ (۱۹۱۴ء–۱۹۱۸ء) میں آیا اور ایک ہی نہیں شاید دو یا تین قصیدے تھے۔ زبان کے اعتبار سے بھی تقریباً مہمل اور مضمون کے اعتبار سے بھی لغو۔ شاہ نعمت اللہ "ولی" کا نام نہ کسی معتبر تذکرہ صوفیہ میں نظر آیا نہ کسی تاریخ میں، ان کے زمانہ شخصیت کا پتہ چلا۔ اور نہ کسی "ولی" کا کام کاہنوں اور جوتشیوں کے انداز میں آئندہ کے واقعات کی پیش گوئی ناموں کی صراحت کے ساتھ کرنا ہے اور حضرات صحابہ تو خیر بڑی چیز ہیں۔ اس کاہنانہ انداز کی نظیر نہ شیخ جیلانیؒ کے ہاں ملتی ہے نہ ملائے سبامیؒ کے ہاں۔ نہ خواجہ اجمیریؒ کے ہاں۔ اور پھر پیش گوئیاں اور پیش خبریاں جن کثرت سے جھوٹی نکل چکی ہیں ان کا ذکر ہی نہیں۔

اس جاہلانہ خوش عقیدگی کو دین و مذہب سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ خیال پڑتا ہے کہ سالہا سال ہوئے کسی صاحب نے بڑی کرید کے بعد ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں کچھ اتے پتے لکھے۔ بہرحال یہ لغویت کی وبا اس قسم کی ہے جیسے ایک زمانہ میں کسی فرضی خادم روضۂ نبوی شیخ احمد کے نام سے اُن کا خواب ہندوستان کے مسلمانوں میں تقسیم ہوا کرتا تھا ۔۔۔۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا

نقوش رفتگاں

——— از عتیق الرحمٰن سنبھلی

پچھلے مہینے ملت کے بچے کھچے خزانے سے دو قیمتی جوہر اور کم ہو گئے۔ ۲۰ ر-۲۱ صفر مطابق ۵ ر ۶ را پریل کی درمیانی شب میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحب نے اپنے وطن مرادآباد میںعہ وفات پائی۔ اور آپ سے دو دن بیشتر انڈین مسلم لیگ کے صدر جناب محمد اسمٰعیل صاحب نے یہی سفر آخرت اختیار کیا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مولانا سید فخرالدین احمد علیہ الرحمۃ کی عمر پچاسی سال بتائی گئی ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے طویل مرض الوفات (۱۹۵۸ء) میں آپ کی مسند درس کو آباد رکھنے کے لیے، آپ ہی کی خواہش پر مولانا (سید فخرالدین احمد صاحب) نے مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مرادآباد کی اپنی دیرینہ مسند اور حلقہ احباب و دابستگان اور عیال و خدام کو خیرباد کہہ کر دارالعلوم دیوبند کا قیام اختیار فرمایا۔ اور وفات سے بس چند ماہ بیشتر تک یہاں کی مقدس مسند حدیث آپ کے دم سے اُسی شان سے آباد رہی جو آپ کے پیشروؤں کی جلالت اور خدا کی نظر عنایت نے اسے بخش رکھی ہے اور جس کے ساتھ اس درسگاہ کا نام اپنے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے حلقۂ تعارف میں وابستہ ہے۔

مولانا مرحوم، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، پھر...

عہ آبائی وطن تو ہاپڑ (ضلع میرٹھ) ہے لیکن مولانا نے مرادآباد ہی کو وطن بنا لیا تھا۔

خاتم المحدثین حضرت علامہ انور شاہ صاحب کے چشمۂ فیض سے بھی خوب خوب استفادہ کیا تھا۔ شروع ہی سے دارالعلوم کے بہت چمکتے ہوئے فضلاء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ دارالعلوم دیوبند ہی کی طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم منصوبے کے ماتحت مرادآباد کی سرزمین پر شاہی مسجد میں وجود پانے والی عربی درسگاہ جامعہ قاسمیہ کی مسند حدیث ایک مدت تک آپ کی ذات سے رونق پاتی رہی۔ ۱۹۴۷ء کے جن دنوں میں مغربی یوپی سے مغربی پاکستان کے دور دراز خطوں تک ہنگامہ کشت و خون برپا تھا، یہی دن عربی مدرسوں میں تعلیمی سال کے آغاز کے تھے۔ راقم سطور کا یہ سال حدیث کی تعلیم یعنی فراغت حاصل کرنے کا سال تھا۔ لکھنؤ سے دیوبند جانا تھا جہاں تین سال پہلے سے تعلیمی سلسلہ تھا، مگر راستے مسدود۔ والد ماجد کی رائے سے، اُس وقت تک کے لیے جب تک کہ دیوبند کا راستہ قابل سفر ہو، مرادآباد میں اپنے تایا جناب مولوی محمد حسن بدر سنبھلی کے یہاں قیام کر کے حضرت مولانا فخرالدین صاحب کے حلقۂ درس میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا۔ اور اس طرح کوئی دو مہینے اسی شاہی مسجد کی درسگاہ میں آپ سے استفادے اور تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ اور غالباً یہی آپ کو پہلی بار دیکھنے کا بھی اتفاق تھا۔

عمر شریف اُس وقت بھی ساٹھ کا خط تو پار کر ہی چکی ہو گی۔ سر کے بالوں میں تو سیاہی کافی تھی مگر داڑھی جہاں تک یاد آتا ہے بالکل سفید تھی، قویٰ میں بھی ضعف کے آثار۔ مگر کیا حسنِ صورت و قد و قامت تھا کہ کہیں سے بھی آب، جیسے نہیں گئی تھی۔ کھدر پوشی کے باوجود لباس کی نظافت، سپیدی اور سر سے قدم تک سلیقے اور قرینے کی گلکاری اس سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی۔ مسند پر جیسے ایک مرقع نور جلوہ افروز ہو! تکلم کی شیرینی، لہجے کی تمکنت بیان وادا کی وضاحت و فصاحت اور آواز کی کھنک اور لطافت سے، درس کی تقریر یوں لگتی جیسے نرم و نازک ہونٹوں سے پھول جھڑ رہے ہوں تقریر حشو و زوائد سے بالکل پاک، جچے تلے افادات پر مشتمل ہوتی۔ دیوبند کی بالعموم لمبی لمبی تقریروں کے چسکے کے باوجود یہ نیا ذائقہ زیادہ پسند آیا۔ اور اور اس لیے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے درس کی سب سے بڑی خصوصیت آج بھی بس یہی یاد ہے اسی کے ساتھ اُس وقت کا یہ تاثر بھی کہ مولانا کے پائے کے استاد کے لیے طلباء کی جیسی جماعت

ہونی چاہیے، نہ کمیت کے اعتبار سے وہ یہاں ہے نہ کیفیت کے اعتبار سے، اس لیے مولانا کی طبیعت کچھ کھلتی نہیں، کوئی شایانِ شان حلقہ میسر ہو تو طبیعت کے انشراح سے اس درس کا رنگ کچھ اور ہی نکلے۔

مولانا کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ شایانِ شان کوئی مسند اور مدرسہ انھیں ملے۔ مگر ہماری اس پیڑھی کے بزرگوں کی شان یہ نہ تھی کہ وہ اپنے مرتبے کے ایسے تقاضوں کے پیچھے دوڑا کریں۔۔۔ وضعداری اور بزرگانِ رفتہ کے ایماء کی پاسداری بھی ان کے یہاں بڑی چیز تھی، جہاں بٹھا دیے گئے وہاں سے از خود اٹھنے کی بات یہ اس بنا پر بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ چنانچہ دس سال مولانا کو اور وہیں گزر گئے، اور وہ اسی مختصر سی درسگاہ اور چھوٹی سی جماعت طلباء پر قانع رہے جو ۴۷ء میں راقم حروف نے دیکھی تھی۔ لیکن اُن کے لیے شایانِ شان جگہ مقدر تھی، ایسی بے نفسیاں بھی کچھ نہ کچھ اثر رکھتی ہی ہیں، جن بزرگوں کے حکم سے وہ مدرسہ شاہی کی ۔۔۔۔ تدریس پر قانع ہوئے بیٹھے تھے اُن ہی کے مسلّمہ جانشین کی نظرِ انتخاب کا فیصلہ ہوا کہ اُس کی جانشینی اور بزرگوں کی مسند کو آباد رکھنے کی ذمہ داری مولانا قبول کریں ــــــ اب مولانا اُس مسند کی رونق تھے جس سے اونچی مسند کا تصور برصغیر ہند کا کوئی عالم نہیں کر سکتا۔

قویٰ میں بہت ضعف آ چکا تھا، امراضِ چشم خاص طور سے لاحق ہو گئے تھے، مگر جس احساسِ ذمہ داری اور بلند ہمتی سے مولانا نے یہ بارِ امانت اٹھایا وہ ایک مثال ہے۔ دارالعلوم کے دورۂ حدیث کی گرانباری کا تصور باہر کے لوگ نہیں کر سکتے۔ شیخ الحدیث اور شوقین طلباء کے لیے یہ ایک مجاہدہ کا سال ہے۔ کمر تختہ ہو جاتی ہے، آنکھیں پوری نیند کو ترسی ہوئی رہتی ہیں، کھانے پینے کو ٹھیک سے وقت نہیں ملتا اور ملے بھی تو اس دماغ سوزی میں غذا اور اس کا نفع آپ سے آپ کم ہوتے جاتے ہیں۔ آخری بار زیارت گزشتہ سال اگست میں دیوبند کی قیام گاہ پر ہوئی۔ نقاہت کا یہ عالم تھا کہ انبساط و شفقت کے تجربوں کے باوجود دیر تک خدمت میں حاضر رہنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ بات چیت سے ضعف، خصوصاً دماغی ضعف، انتہا کو ٹپک رہا تھا۔ مگر "چکّی کی مشقت" اس عالم میں بھی اپنی جگہ تھی، درس بدستور ہو رہا تھا۔

اس سے مولانا کے احساسِ ذمہ داری اور عالی ہمتی ہی پر روشنی نہیں پڑتی کہ تنہا یہ

دونوں چیزیں کسی درجہ کی بھی ہوں، اس عالم ضعف و پیری میں، دارالعلوم کے روایتی درس حدیث کا بوجھ اٹھائے رکھنے کی قوت عطا نہیں کر سکتیں۔ اس سے مولانا کے اندر کسی ذوق و شوق کی اس کیفیت کا بھی اظہار ہوتا ہے جس کی کرشمہ کاری سے بہت سے بزرگوں کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ مثلاً یوں ایک منٹ بھی کھڑے نہیں رہ سکتے تھے مگر جماعت میں لاکر کھڑے کر دیے جاتے تو پھر پوری نماز تندرستوں کی طرح ادا کرتے۔ عمر بھر کی خدمت، بے نفسی اور اخلاص نیت کی برکت سے حدیث نبوی کے ساتھ مولانا کے ذوق و شوق کی بھی بظاہر ایسی ہی بلند نسبت قائم ہو گئی تھی کہ ادھر مسند پر جا کر بیٹھے اور اُدھر ضعف و نقاہت کے تمام احساسات دب گئے۔ اور جو لوگ دوسرے مقام پر چند کلمات کی ادائیگی میں بھی تکلف محسوس کرتے، وہ دیکھتے کہ

بلبل چہک رہا ہے ریاض رسولؐ میں

آخر ۱۹۷۰ء میں باقاعدہ امراض حملہ آور ہو گئے اور تاب مقاومت جواب دے گئی تو مرادآباد لے آئے گئے۔ لیکن خدا کے کرم سے افاقہ ہوا تو پھر یہاں کا قیام گوارا نہ تھا اور اسی احساس ذمہ داری اور ذوق شوق نے ایک بار پھر دیوبند پہنچا دیا۔ لیکن اب مشیئت یہی تھی کہ یہ چشمۂ فیض جاری رہے۔ ناچار پھر مرادآباد تھوڑے ہی دن بعد واپس آنا پڑا اور مختلف علاجوں اور صحت و مرض کے نشیب فرازوں کا مقررہ حصہ پورا کر کے بندہ اپنے رب سے جا ہی ملا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین و بعثہ فی زمرۃ عبادہ المنتخبین الغر المحجلین ——— دارالعلوم دیوبند کے لیے اب مولانا کا بدل تلاش کرنا بڑا مسئلہ ہے۔ دیکھئے مشیئت الٰہی کا کیا فیصلہ سامنے آتا ہے۔

دارالعلوم کی صدارت کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کی صدارت میں بھی، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد آپ کی جانشینی مولانا کے حصہ میں آئی۔ اور یہ منصب بھی آخری دم تک ہی آپ کے ساتھ وابستہ رہا۔ ذہنی اعتبار سے جمعیۃ کے مسلک سے آپ کو پوری ہم آہنگی بھی تھی۔ آزادی کی تحریک میں اس جماعتی نظام کے تحت آپ کا عملی حصہ بھی رہا۔ قید و بند کے مرحلے بھی طے کیے۔ مگر اصل ذوق علمی اور تدریسی ہی تھا۔ اس لیے نہ پہلے کبھی اس معاملہ میں زیادہ نمایاں ہوئے نہ جمعیۃ کی صدارت کے بعد کوئی خاص عملی سرگرمی اختیار کی۔ بس ایک اعزازی نوعیت کے صدر تھے۔ اسلیے

اس پہلو کا بس تذکرہ ہی اُن کی یاد کے اس موقع پر کیا جا سکتا ہے، کوئی تبصرہ بامعنی نہیں۔

صدر انڈین مسلم لیگ جناب محمد اسماعیل صاحب مرحوم

جناب محمد اسماعیل صاحب نے بھی عمر طبعی کو پہنچکر وفات پائی۔ پارلیمنٹ کے اجلاس کے سلسلے میں نئی دہلی میں قیام تھا کہ مرض کا حملہ ہوا۔ قریباً ایک ہفتہ موت و حیات کی کشمکش رہی مگر وقت آچکا تھا، بہتر سے بہتر طبی وسائل کے باوجود جانبر نہ ہوسکے۔

مرحوم، جنوبی ہند، خصوصاً مدراس اور کیرالا کے مسلمانوں کے متفق علیہ لیڈر تھے اور ان صوبوں کی سیاست میں ایک وزن رکھتے تھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندوستان کے ناسازگار حالات میں مسلم لیگ کی تنظیم آپ سے آپ ختم ہوگئی تو محمد اسماعیل صاحب نے انڈین مسلم لیگ کے نام سے اُس کی تجدید کی لیکن عملاً اسے اپنے علاقے ہی تک محدود رکھا۔ اور سیاسی اہلیت کے لحاظ سے انھیں (اور ان کے رفقاء کو) جتنی بھی داد دی جائے کم ہے، کہ نہ صرف اس تنظیم کو مؤثر طریقہ پر برقرار رکھنے میں وہ کامیاب رہے، بلکہ اس کا وقار اتنا بڑھا دیا کہ شمالی، شمالی مشرقی، اور جنوب مغربی ہند کے مسلمانوں میں بھی قدر کے ساتھ اُن کی طرف دیکھنے والے پیدا ہوگئے اور آج ان سب علاقوں میں مسلم لیگ قائم ہی نہیں ہوگئی ہے بلکہ مہاراشٹر اور بنگال میں اس کے ایم۔ ایل۔ اے بھی ہیں ان علاقوں (یا ان میں سے بعض کے حالات کے لحاظ سے ان میں مسلم لیگ کا قیام یہاں کے مسلمانوں کے لیے کیسا ہے؟ یہ الگ بحث ہے۔ یہاں مرحوم کی صرف اس اہلیت کا ذکر ہے جو انھوں نے اپنی اس جماعت کو جمانے اور ترقی دینے میں ثابت کی جس کی برائے نام بقاء کا تصور بھی ہندوستان میں مشکل تھا۔

اب سے چھ سات سال پہلے، شمالی، اور شمالی مشرقی ہندوستان میں مرحوم اسماعیل صاحب کا کوئی عوامی تعارف تھا نہ یہاں کے کارکن حلقوں سے کوئی ربط۔ پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے بس نئی دلی تک اُن کی آمد و رفت تھی۔ ۱۹۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت کے قیام نے انھیں جنوبی ہند سے باہر ربط و تعارف کے مواقع فراہم کیے۔ راقم حروف نے بھی ان کو پہلی بار مجلس مشاورت کی تاسیس کے موقع پر لکھنؤ میں دیکھا۔ بڑے سیدھے سادے مسلمان نظر آئے۔ چہرے پر داڑھی اور صلاح و تقویٰ کے آثار، طبیعت سے سادگی اور خاموشی کا اظہار اور کچھ محویت کے سے انداز، لباس میں شیروانی اور شرعی پاجامہ، ہاتھ میں چھڑی۔ یہ تھے انڈین مسلم لیگ کے صدر محمد اسماعیل صاحب۔ قدرت نے

کی بات تھی مگر اس سے آگے جانے کا راستہ بند۔ اُن کی رابطہ کی زبان انگریزی تھی اور ہم نے یہ اتنی سیکھی نہیں۔ بہرحال دیکھ کر ہی جی خوش کر لیا کہ سیاسی فکر جو کچھ ہو، وضع قطع سے ایک "مسلمان لیڈر" کا نمونہ ہیں، معلوم ہوا کہ اندر بھی گہری مذہبیت ہے اور اُن کی جڑیں خاندانی ہیں۔ اپنے علاقے میں صرف ایک سیاسی رہنما ہی کی حیثیت سے نہیں دیکھے جاتے بلکہ دینی پیشواؤں کے سلسلہ کی عقیدت و احترام کا بھی مرجع ہیں اور یہی ان کی اس قدر مقبولیت اور مضبوطی کا راز ہے۔ غالباً تحریک خلافت کا بھی اثر ان کی اس کی کھلی مذہبی رنگت میں تھا۔

مسلم لیگ کا نام اختیار کیے رہنے کے باوجود اندازہ یہ ہے کہ انھوں نے تقسیم کے بعد کے سیاسی حالات سے اپنے آپ کو بہت کچھ ہم آہنگ کر لینے کی کوشش کی تھی۔ سب سے بڑی بات جس کی ضرورت ہو وہ پاکستان کو ذہن سے بالکل الگ رکھ کر اور اس کے ساتھ جذباتی تعلق سے یکسر آزاد ہو کر اپنا طرز عمل متعین کرتے تھے۔ اور اس پہلو سے اُن کے الفاظ اور اُن کا رویہ کسی بناوٹ، مجبوری اور تضاد کی کیفیت سے اس قدر دور رہتا تھا کہ پاکستان نوازی کا شبہ ان پر شاید ہی کبھی کیا گیا ہو جبکہ اس سے زیادہ عام اور سستا الزام مسلمانوں کے حق میں یہاں کوئی دوسرا ہے ہی نہیں

ہندوستان کی سیاست میں جسے کوئی کام مسلم مفاد کے لیے کرنا ہو یا اس پر اثر ڈالنے کی خواہش ہو اُس کے لیے مرحوم اسماعیل صاحب اور اُن کی مسلم لیگ کے اس ذہنی اور عملی رویہ سے مختلف رویے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن یہاں اس خدمت کے لیے دوسرے اٹھنے والے یا تو اس نکتے کو سمجھنے ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے، یا حقیقت پسندی کی اس غیر جذباتی سطح تک اٹھنے کا حوصلہ اُنھیں میسر نہیں آتا چنانچہ تھوڑے ہی دن چل کر ناکامی و نامرادی کی تصویر بنے کسی گوشے میں پڑے ہوئے ملتے اور مایوسیوں کو فروغ دینے کا باعث بنتے ہیں۔ اسماعیل صاحب نے اپنی مسلم لیگ کو شمالی اور شمالی مشرقی ہند تک نہیں پہنچا دیا جبکہ دوسرے کتنے ہی سیاسی بلبلے اس پچیس ۲۵ برس میں جہاں اٹھے تھے وہیں گھوم پھر کر چند دن میں بیٹھ گئے۔ کوئی فاتحہ خوانی کو بھی اب آسانی سے نہیں آتا۔

مسلم لیگ اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کے لیے اسماعیل صاحب کی وفات، جماعتی اور سیاسی حیثیت سے شاید ایک ناقابل تلافی نقصان ہے اور اُن کی جن خصوصیات کا یہاں ذکر کیا

گیا اُن کی رو سے یہ پوری ملت کا نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں آخرت کی راحتیں دے اور اُن سے بہتر اُن کا جانشین پیدا کرے۔

ان دونامور اور مختلف حیثیتوں سے قابلِ تذکرہ ہستیوں کے ساتھ ایک تیسری ایسی شخصیت کا ذکر بھی یہاں کرنا ہے جس سے ہمارے ناظرین میں معدودِ چندہی شاید واقف ہوں۔ راقم سطور کو بھی نام اور صورت سے آگے زیادہ واقفیت نہ تھی لیکن والد ماجد کی اُن سے واقفیت اپنے زمانۂ طالبعلمی سے تھی اُن کی بعض خصوصیتوں کی بنا پر وہ اُن کو ملت کی منتخب ہستیوں میں شمار کرتے اور بڑی خاص وقعت و محبت ان کے لیے اپنے دل میں رکھتے تھے ۔ یہ تھے لائلپور (پاکستان) کے

مولانا حکیم حافظ عبدالمجید صاحب نابینا

جو لائلپور کے ایک مؤقر عربی مدرسہ اشاعت العلوم کے مہتمم اور شہر کی بیحد محترم شخصیتوں میں تھے۔ حکیم صاحب کا انتقال ۱۲ فروری ۷۲ء مطابق ۲۶ ذی الحجہ ۹۱ھ کو ہوا۔ جس کی اطلاع آج کل کے خاص حالات کی وجہ سے کہاں کہاں ہوتی ہوئی مدتوں بعد لکھنؤ پہنچی۔ اور والد ماجد کو ۹ مارچ سے یکم اپریل تک مسلسل سفر میں رہنے کی وجہ سے اور بھی دیر میں ملی۔ ۵ اپریل کو جب وہ اس سے بھی کئی گنے لمبے سفر پر ملک سے باہر روانہ ہو رہے تھے (جہاں سے واپسی غالباً جون میں ہوگی) تب اپنے پاس وقت نہ ہونے کی وجہ سے میرے سپرد یہ خدمت فرمائی کہ حکیم صاحب مرحوم پر اسی الفرقان میں ایک نوٹ لکھوں، جس کا مواد بھی سب اُنھیں کا دیا ہوا ہے۔ اور اُن ہی کی ترجمانی کے طور پر ذیل میں اسے درج کیا جا رہا ہے۔

فرمایا کہ:-

۴۵-۱۳۴۴ھ میں جب میں دیوبند میں دورۂ حدیث کا طالبعلم تھا، حکیم صاحب وہاں مجھ سے ایک سال پیچھے تھے۔ اُن کو ذہانت اور حافظے کی وہاں بڑی شہرت تھی۔ میرے چلے آنے کے بعد اگلے سال انھوں نے دورہ پڑھا (یاد نہیں کہ دیوبند ہی میں پڑھا تھا یا ہمارے استاذ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اُسی سال ڈابھیل منتقل ہو جانے

پڑ یہ بھی وہاں منتقل ہو جانے والوں میں اور وہیں جاکر شاہ صاحب سے دورہ پڑھنے والوں میں تھے)
بہر حال قابل اعتماد اور ثقہ حضرات سے سنا ہے کہ بخاری شریف کے سبق میں نابینائی کے باوجود قرأت کرتے تھے۔ کل جو سبق ہونے والا ہوتا اُن کے ایک رفیق خاص ہم سبق، اس سبق کی عبارت حکیم صاحب کو پڑھ کر سناتے۔ حکیم صاحب فرماتے کہ ایک دفعہ اور پڑھیے وہ دوبارہ پڑھتے۔ اور اب میری باری خود حکیم صاحب حافظہ سے وہی عبارت پڑھ کر اپنے رفیق کو سناتے، جو دو چار غلطیاں ہوتیں اس قرأت میں ان کی تصحیح ہو جاتی اور اگلے دن صبح کو حکیم صاحب بخاری شریف کی وہ عبارت اپنے استاد کے سامنے حفظ پڑھتے۔

درس نظامی سے فراغت کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان دیا اور اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد طب پڑھی۔ انگریزی میں بی۔ اے کا امتحان دیا اور اس میں بھی اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کی۔ طبیب نہایت حاذق تھے۔ انگریزی اتنی اچھی تھی کہ بی اے اور ایم اے کے طلباء باقاعدہ استفادے کے لیے آتے۔ ان علمی اور ذہنی کمالات کے ساتھ عمل میں صلاح و تقویٰ اور بزرگانِ سلف کا نمونہ تھے۔

ملک کی تقسیم کے بعد بھی حکیم صاحب نابینائی کے باوجود صرف بزرگوں اور دوستوں سے ملاقات کے لیے ایک مرتبہ ہندوستان تشریف لائے۔ لکھنؤ میں بھی دو تین دن قیام فرمایا۔ ہم مذاقی اور ہم مشربی کی بنا پر طبیعت کو خاص طور پر اُن سے بڑا اُنس تھا۔ گزشتہ سال رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے نام آیا ہوا اُن کا ایک خط یادگار ہے۔ شاید مولانا کے پاس محفوظ بھی ہو۔ یہ خط حکیم صاحب نے پاکستان کے ان عام انتخابات کے بعد لکھا تھا جن سے زیادہ نامبارک انتخابات شاید کسی ملک میں نہیں ہوئے۔ انتخابات کے نتائج پر اپنا تاثر ظاہر کرنے کے لیے حکیم صاحب نے غالباً ازراہ احتیاط عربی زبان کا سہارا لیا، انداز اظہار بھی بڑا لطیف اور پردہ دارانہ تھا، لکھا کہ مولانا! ایک تاریخی کتاب سے ایک عبارت کبھی سنی تھی ذرا توثیق فرمائیے کہ وہ مجھے صحیح یاد ہے۔ وہ عبارت میری یاد کے مطابق یہ تھی کہ .... الخ۔ عربی کے ان چند جملوں میں حکیم صاحب نے جو بات بہت لطافت اور پردوں کے ساتھ کہی تھی وہ یہ تھی:۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہمارے پاکستانی حصے (چھوٹے حصے) نے ہندوستانی

حصے کے مسلمانوں سے پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے۔ یہاں سے جواب ملا کہ الحمد للہ ایمان بخیر ہے!
اور تمہارا حال کیا ہے؟ اس کا جواب پاکستانی حصے نے دیا کہ ایمان کی خیر تو اپنے یہاں
نظر نہیں آتی لیکن اور سب بخیر بلکہ بہت بڑھ چڑھ کر ہے

اس کے بعد ایک وقت آیا کہ اس "چھوٹے حصے کے ساکنوں سے عام رائے
لی گئی کہ روٹی اور شکم سیری چاہتے ہو یا ایمان و اسلام۔ اس کا جواب بھاری اکثریت نے
ایک آواز ہو کر دیا کہ روٹی اور شکم سیری؏ — اس جواب کے بعد اس کی قسمت کیا ہوگی اس
اللہ ہی بہتر جانے!

خط اس وقت سامنے نہیں اُس کا یہ مفہوم مجھے یاد ہے۔

افسوس کہ حکیم صاحب کو جس انجام کا ڈر تھا وہ بدترین شکل میں اُن کی زندگی ہی میں پیش
آگیا۔ انتقال کا ظاہری سبب اُن کا یہ نجی صدمہ بنا کہ بہت ہی صالح اور مخیر چچا زاد بھائی اور
بہنوئی حاجی نذر محمد خاں صاحب دو تین مہینے بیمار رہ کر فوت ہو گئے۔ حکیم صاحب بیماری ہی سے
بہت غمگین تھے۔ یہ حادثہ ۱۰ فروری کو پیش آیا۔ اور حکیم صاحب اسی رنج و الم کے ماحول میں تیسرے
دن تعزیت کرنے والوں کی مجلس میں بس بیٹھے بیٹھے جاں بحق ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ دونوں حضرات
کی مغفرت فرمائے اور اپنے مقبول بندوں میں جگہ دے۔ اپنے ناظرین سے بھی مخلصانہ طور پر اس دعا
کی درخواست ہے۔

؏ حکیم صاحب کا اشارہ اس طرف تھا کہ جیت پاکستان کے دونوں بازوؤں میں اُن پارٹیوں کی ہوئی جن کو
ملک کی دینی حالت سدھارنے سے کوئی مطلب نہ تھا صرف اقتصادی نعرے اُن کے پاس تھے۔ بلکہ نظام حکومت کو
دین سے بیگانہ رکھنا بھی اُن کا نصب العین تھا۔

اطلاع جیسا کہ صفحات بالا میں ذکر آیا مولانا نعمانی مدظلہٗ بیرون ملک کے ایک طویل سفر پر
ہیں، واپسی کی امید وسط جون تک ہے، مراسلت کرنے والے حضرات کے لیے یہ
بات دوبارہ وضاحت کے ساتھ لکھی جا رہی ہے ——— (مرتب)

نئی مطبوعات

تذکرہ قاریان ہند (جلد اول و دوم) | از جناب کرنل بسم اللہ بیگ (مقری قرأت عشرہ)
شائع کردہ انجمن اسلامیہ حیدرآباد دکن

قرأت علوم اسلامی کا ایک عظیم شعبہ ہے۔ کتاب اللہ کے ساتھ امت کے ذوق و ارتباط کی برقراری اور اس کی آبیاری میں اس علم اور فن کا حصہ کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عالم اسلامی کے دوسرے حصوں کی طرح ہندوستان میں بھی بڑے پایے کے قاری پیدا ہوئے یا باہر سے آکر یہاں کے ہو گئے، جن کے چراغوں سے برصغیر کے ہر ہر گوشے میں تجوید و قرأت کے چراغ جلے اور فضاء کلام الٰہی کی تجلیوں سے معمور ہو گئی۔

کرنل بسم اللہ بیگ صاحب نے، جو اس فن میں بڑا علمی اور عملی درجہ رکھتے ہیں، اپنی اس کتاب کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کے آغاز سے لے کر ۱۳۸۰ھ تک کے قرآء سے واقفیت کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ پہلی جلد میں فن کا تعارف، اس پر عالم اسلام میں لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ کر کے ہندوستان میں اس کے مختلف دور بیان کیے گئے ہیں۔ دوسری میں قرآء کرام کا انفرادی تعارف ہے، جس کی طویل فہرست کو دیکھ کر کرنل صاحب کی اُس محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی داد واجب ہو جاتی ہے جو انھیں اس کام میں کرنا پڑی ہوگی۔

یہ علمی ذوق کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کی مثالیں کثیر ہونے کی دعا کی جانی چاہیے۔ ڈاکٹر عبداللطیف صاحب مرحوم نے اسے اپنی تقریظ میں "علم قرأت کی ایک ہلکی پھلکی انسائیکلو پیڈیا" کا نام بجا طور پر دیا ہے۔ علمی اور دینی دونوں ہی طرح کے فائدوں کی جامع ہے، ہمیں

افسوس ہے کہ اس کا تعارف کرانے میں بڑی دیر اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ہوئی۔

دوسری جلد میں جن سیکڑوں اشخاص کا تذکرہ ہے وہ صرف خادمان فن ہی تک محدود نہیں ہیں، ایسے مشاہیر بھی ان میں شامل ہیں جنھوں نے اس فن کو بس حاصل کیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھکر ڈاکٹر اقبال تک کا نام اس میں نظر پڑا جنھیں کلام اللہ سے محض اُن کے غیر معمولی شغف کی بنا پر اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن پتہ نہیں شاہ عطاء اللہ شاہ بخاری کو مصنف کیسے بھول گئے جن سے زیادہ مسلمانوں کو قرآن سنانے اور دل آویزی کے انداز میں سنانے کی سعادت اس برصغیر میں شاید ہی کسی دوسرے کو میسر آئی ہو!

مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی ایک تیسری جلد بھی شائع ہونا ہے جو خاص اُن قرّاء کے حالات پر مشتمل ہوگی جن سے مصنف کو ملاقات کا موقع ملا ہے۔

دونوں جلدوں میں سے کسی پر بھی نہ قیمت درج ہے نہ پتہ۔ دونوں ۲۰×۳۰/۸ سائز کی مجلد ہیں پہلی کے صفحات ۲۴۸ اور دوسری کے ۳۶۶ ہیں۔

جنرل سائنس | از جناب عزیز احمد قاسمی۔ بی اے جامعہ استاذ سائنس و ادبیات انگریزی دارالعلوم دیوبند۔ ناشر:- کمال بکڈپو دیوبند۔ قیمت۔ چار روپے

عربی مدارس کے طلباء اور فضلاء میں جدید علوم سے ناواقفیت کے نقصانات محسوس کرکے دارالعلوم دیوبند نے کچھ عرصے سے اس تعلیم کا شعبہ بھی اپنے یہاں قائم کردیا ہے مولانا عزیز احمد صاحب جو دارالعلوم سے فراغت حاصل کرکے جامعہ ملیہ کے بی اے ہوئے، اس شعبہ کے اساتذہ میں ہیں۔ سائنس کی یہ ابتدائی کتاب انھوں نے خاص کر اپنے یہاں کے اور ایسے ہی دوسرے عربی مدارس کے طلباء کو سامنے رکھ کر مرتب کی ہے۔ قابل اعتماد رائے تو اس فن کا کوئی استاذ ہی دے سکتا ہے، لیکن ایک عام آدمی کی نظر سے اپنے مقصد میں بہت کامیاب کتاب ہے، مسائل کا بیان بہت صاف اور سلیس ہے جیسا کہ ایک درسی کتاب میں ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی یہ التزام بھی ہے کہ ان مسائل سائنس سے جن دینی عقائد اور مسائل کی سائنٹفک توجیہہ کی جاسکتی ہے اس کی طرف بھی طلباء کو توجہ دلادی جائے۔ یہ چیز اپنے اصل فائدے کے علاوہ عربی مدارس کے طلباء

میں اس کتاب اور اسکے نامانوس موضوع سے دلچسپی پیدا کرنے کے لحاظ سے بھی ہمارے خیال میں بہت مفید ہوگی لیکن کہیں کہیں بات اس کتاب کے فطری حدود سے نکلی ہوئی بھی معلوم ہوتی ہے اور بالکل نظری مسائل کو مادّی سائنس سے ثابت کرنے کی کوشش مصنف نے کر ڈالی ہے جو قدرتی طور پر دلپذیر نہیں محسوس ہوتی۔ مثال کے طور پر "زمین کی قوت جاذبہ" کے مسئلے سے "صراط مستقیم" کا اثبات۔ علیٰ ہذا دین کے عقائد و مسائل سے بڑھ کر جب "مسائل تصوف" کا سائنٹفک اثبات بھی اس کتاب میں نظر پڑتا ہے تو خیال ہونے لگتا ہے کہ اس سے کہیں کتاب کے اصل مقصد کو نقصان نہ پہنچ جائے۔

یہ دو باتیں درمیان میں صرف مصنف کے لیے قلم پر آگئیں ورنہ کہنا یہ تھا کہ ہمارے عربی مدارس کو اس کتاب کی قدر کرنی چاہیے۔ مولانا عزیز احمد صاحب نے انھیں ایک بہت کام کی چیز پیش کی ہے سائنس کے اتنے مبادیات ضرور ہی ہر فاضل علم دین کو آنے چاہئیں۔

مسلم پرسنل لا

از مولانا منت اللہ صاحب رحمانی (امیر شریعت۔ بہار و اڑیسہ)
ناشر:۔ مکتبۂ امارت شرعیہ پھلواری شریف (پٹنہ) صفحات ۔، قیمت ۱/۲۵

جناب مولانا منت اللہ صاحب رحمانی ان بزرگوں میں ہیں جنکے خیالات "مسلم پرسنل لا" کے معاملے میں اہمیت کیساتھ سنے جانے چاہئیں۔ صوبہ بہار و اڑیسہ کی "امارت شرعیہ" مسلمانوں کے ایک ایسے آزاد نظام قضاء کا نام ہے جس سے انگریزوں کے عہد میں ختم کر دیے جانے والے اسلامی نظام قضاء کی خالی جگہ کو پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور مسلمانوں کے باہمی نزاعات خصوصاً شرعی مقدمات اس نظام کے قاضیوں کے ذریعہ فیصل کیے جاتے ہیں۔ ایک ایسے نظام کے سربراہ کی حیثیت سے مسلم پرسنل لا کے باب میں مولانا کے خیالات کی اہمیت ظاہر ہے۔

مولانا نے اس رسالے میں اولاً مسلم پرسنل لا کے موجودہ مسئلے کی وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد مسئلے کی شرعی نوعیت بیان کرتے ہوئے ترمیم و تغیر کے اس سوال پر بحث کی گئی ہے جو اس وقت اٹھا ہوا ہے۔ مولانا کی یہ بحث ہماری نظر میں صرف مسلم پرسنل لا ہی کے مسئلے پر قابل توجہ رہنمائی نہیں دیتی بلکہ اصولی طور پر وقت کے تمام ایسے مسائل میں فیصلوں کی راہ ہموار کرتی ہے جو یا بالکل نئے ہیں یا زمانے کے تغیرات نے ان کے قدیم حکم پر نظر ثانی کا موا

اظہار کیا ہے۔ اسلامی فقہ میں جمود اور لکیر کی فقیری کے اصول کا جو تصور عام ہوگیا ہے، اور جس میں اچھا خاصا دخل اس فقہ کی نمائندگی کرنے والوں کے بالعموم طرز عمل کو بھی ہے؛ مذکورہ بالا بحث کے مواد میں اس تصور کی مستند تردید کا سامان گو مصنف کے کسی خاص قصد و ارادہ کے بغیر آیا ہے مگر یہ بجائے خود اس رسالے کا ایک قیمتی پہلو ہے۔ پڑھے لکھے مسلمانوں کو اس کی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینی چاہیے۔ اسی احساس کے ماتحت اس کا ایک حصہ الفرقان کی اس اشاعت میں بھی شامل کیا جا رہا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ کی
خود نوشت سوانح حیات ــــ اور ــــ آپ کے ملفوظات

یادِ ایّام

جلد اول ۱ و ۲ میں آپ کے مختصر حالات زندگی، طفولیت تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ ساتھ ہی بعض عادات مبارکہ، حوادث و شادیوں میں آپ کا طرز عمل نیز اپنے بعض اکابر کے حوادث، انتقال کا تذکرہ قیمت مجلد ریگزین -/۶

جلد دوم اس میں موصوف نے تحدیث بالنعمۃ کے طور پر بعض اہم واقعات ذکر کیے ہیں۔ قیمت مجلد ریگزین -/۵

جلد سوم۔ اس جلد میں موصوف نے تقسیم ہند کے اہم واقعات، اکابر سلسلہ کے متفرق حالات نیز نسبت کے اقسام اور خلافت و بیعت کے متعلق اہم مضامین تحریر فرمائے ہیں۔ قیمت مجلد ریگزین -/۴

صحبتے با اولیاء

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ کے وہ مجلسی ارشادات و ملفوظات گرامی جن میں زندگیوں کی اصلاح کا پیغام، ایمان و یقین و کیفیت احسانی پیدا کرنے کا وافر سامان ہے۔

دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لیے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ ملفوظات اپنے شایان شان مقام رکھتے ہیں۔

مرتبہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری

اعلیٰ کتابت و طباعت۔ قیمت مجلد صرف -/۵

صحبتے با اہلِ دل

حکیم عارف باللہ حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی (عرف پیر ننھے میاںؒ) کی عرفانی اور اصلاحی مجلسوں کا مرقع اور حکیمانہ ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ جسے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے عقیدت و احترام کے ساتھ مرتب کیا ہے، اور دو سال میں دو بار شائع ہو چکا ہے ــــ مجلد ۲۰۰ صفحات، قیمت -/۶

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

BOMBAY ANDHRA
TRANSPORT CO.



Regd No L-353

Monthly 'ALFURQAN'

MAY

الفرقان

لکھنؤ

Page No. 3/—
Date 16-6-72

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
بنگلادیش سے ۸/00
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی .... ۷۵ پیسے

جلد ۴۰ | بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ مطابق جون ۱۹۷۲ء | شمارہ (۴)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جون تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت :- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۵ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ———————— عتیق الرحمٰن سنبھلی

گزشتہ ماہ کے ان صفحات کی گفتگو کا آخری حصہ، جو اصل مقصد تھا، جگہ کی تنگ دامانی سے تشنہ رہ گیا۔ ضرورت کچھ تفصیل و وضاحت کی تھی، مگر بات چند سطروں میں لپیٹ دینا پڑی۔ آج کی گفتگو کو اسی "مافات" کی تلافی سمجھئے اور گزشتہ سے مربوط کر کے پڑھیئے!

عوام کی بات تو دوسری ہوتی ہے لیکن تھوڑا بہت دماغ رکھنے والے کسی آدمی کے لیے یہ بات سمجھنا ذرا بھی مشکل نہیں ہونا چاہیئے کہ

۱۔ جب ہم نے یہ کہہ کر پاکستان بنوایا کہ وہاں ہم اپنی مرضی کے مطابق نظامِ حکومت قائم کریں گے اور یہاں ہندو اپنی آرزوؤں اور امنگوں کو پورا کرنے میں آزاد ہوں گے، جیسا کہ اُس زمانے کے ہر چھوٹے بڑے لیڈر کے بیانوں اور تقریروں کے ریکارڈ میں آج بھی دیکھا جا سکتا ہے ———— تو یہ اُن تمام حقوق کا پاکستان کے بدلے سودا تھا جو عام حالات میں از روئے جمہوریت کسی اقلیت کو حاصل ہوتے ہیں اور اس پوزیشن کو اپنے لیے قبول کرنا تھا کہ حق کوئی نہیں، کچھ مل گیا تو رحم و کرم ہے۔

اور (۲) یہ کہ پاکستان جب ہندو لیڈر شپ کی مرضی کے خلاف لڑ بھڑ کر بنوایا گیا اور "ڈائرکٹ ایکشن" کا ہتھیار چلا کر سیاسی لڑائی کو عوامی قتل و غارت کی راہ پر چل پڑنے کا موقع دے دیا گیا، جو کلکتہ سے پشاور تک آگ اور خون کا سمندر بنائے بغیر رُکنے میں نہیں آسکی، تو رحم و کرم اور فیاضانہ حُسن سلوک کے امکانات بھی مدتوں تک کے لیے اسی سمندر میں غرق ہو کر رہ گئے۔

جن کی بازیافت کے لیے ایک مدت کی دانشمندانہ اور صبر آزما جد و جہد کی ضرورت تھی یا پھر کوئی معجزہ ہو سکتا تھا جو یہ کام انجام دیدے۔

ان کھلی ہوئی باتوں کو عوام کی ناسمجھی خاطر میں نہ لائے تو وہ قابل معافی ہے لیکن جن کا شمار عقل والوں میں ہو وہ اگر انکار اور اعراض کا رویہ اختیار کرتے اور یوں کہتے ملیں کہ نہ تو پاکستان کا مطالبہ کر کے ہم نے اپنے حقوق کی پوزیشن کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر دیا تھا اور نہ وہ نفرت اگلتی ہوئی فضا جو اس مطالبے کے سلسلے میں رونما ہونے والے واقعات سے ہمارے خلاف یہاں پیدا ہوئی تھی ٹھنڈا کیے بغیر ہماری یہ خواہش غلط ہو سکتی ہے کہ عام حالات والا سلوک ہمارے ساتھ کیا جائے، تو اس رویے کے صرف دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں۔ یا یہ لوگ اپنی پسندیدہ راہ پر چلنے کے ہوشربا نتائج سے دوچار ہو کر عقل کھو بیٹھے ہیں یا اپنے عمل کے اُن نتائج کی ذمہ داری اُٹھانے کی جرأت نہیں رکھتے جن سے اُن کے ہمراہی عوام بے خواب و خیال دوچار ہو کر بلبلا اُٹھے۔ اس لیے جو کچھ ہونے لگا اُس کی ذمہ داری ہندوؤں کی اُسی تنگ دلی کے سر ڈال دینے میں عافیت سمجھتے ہیں جسے بہت ہی مضبوطی کے ساتھ ان ہمراہی مسلمانوں کے دل میں بٹھا دیا گیا تھا اور جسے اب اور بھی مضبوط کر دینا بہت آسان تھا۔

ہندو تنگ نظری میں بحث کی ضرورت نہیں، جتنا بھی چاہے انھیں تنگ دل اور تنگ نظر مان لیجئے۔ لیکن یہ تقسیم کے بعد جو یکلخت آپ کی کیفیت بدلی۔ مزاحمت و منافرت کا پارہ ۱۰۸ ڈگری سے گر کر سیدھا صفر پر آگیا، لب بند ہوئے، ترکی بہ ترکی تو درکنار حرفِ شکایت تک کا یارا نہ رہا، مبارزت کے تمام دم خم زبان بھول گئی۔ یہ سب کیوں ہوا اگر یہ احساس آپ کو نہیں تھا کہ کچھ کہنے سننے اور لڑنے بھڑنے کے قابل آپ نے اپنے آپ کو نہیں رکھا ہے؟ اور کوئی بڑا عظیم فرق آپ کی پوزیشن پر پاکستان بن جانے سے پڑ گیا ہے؟

ہندو تنگ نظری تو تقسیم سے پہلے بھی تھی، مگر یہ آپ کا جوشِ مبارزت بڑھاتی تھی۔ ایک کے جواب میں چار آپ سناتے تھے۔ لڑائی کی ٹھن جائے تو کسی سے آپ نہیں گھبراتے تھے۔ آپ کے "سردار نشتر" کو غصہ آتا تو ہندوؤں کے "سردار پٹیل" پر ہاتھ تک کھینچنے میں باک نہیں رکھتے تھے کوئی

فیروز خاں نون تھے جو ہٹلا کو اور چنگیز بن جانے کی آگاہی دے ڈالتے تھے، پھر یہ ہندو تنگ نظری ایک رات میں ایسی کیسی قیامت ہوگئی کہ نظر ملانا محال؛ جو جو فتنے چاہے جگائے، محشر پہ محشر اٹھائے، مگر یاں تاب شکایت تک نہیں۔ ع ـــــ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔ کوئی بات تو بتانا پڑے گی جس نے یہ انقلاب حال کر دیا! بتائیے ایک پاکستان بن جانے کے سوا وہ کون سی بات پیش آئی جسے آپ کہہ سکیں کہ آپکی طاقت گویائی تک سلب کر کے لے گئی؟ رحم و کرم کی تلاش میں کانگریس کی کیفیت کے فارم جس کے سبب بھرے جانے لگے؟ مسلمانوں کے جداگانہ پلیٹ فارم کا نام بھلا دیا گیا؟ متحدہ قومیت کے سوا کسی دوسری قومیت کا نام زبانوں پر آنا بند ہوگیا؟ ہر وہ بات جس سے ہندو اکثریت کی ناگواری کا اندیشہ ہو اپنے پر حرام کر لی گئی؟ قائد اعظم نے انتقال فرمایا تو سارا غم دو دن میں گھونٹ کر رکھ لیا؟ قائد ملت کو گولی ماری گئی تو ایک آہ کیلئے بھی زبان ترس کر رہ گئی؟ ـــــ لیکن اس پر بھی اندر کی بے اطمینانی کا عالم یہ رہا کہ جس کو موقع ہوا وہ پاکستان سدھار تا گیا۔ حد یہ ہے کہ آج صبح کو پارلیمنٹ میں حلف وفاداری اٹھایا اور دوسری صبح کو خبر آئی کہ پاکستان پہونچ گئے! ـــــ کوئی فرق اگر اپنی پوزیشن میں ہم نے خود نہیں ڈال لیا تھا اور وادنیٰ سا احساس بھی اگر ہمیں اپنے ویسے ہی حقوق کے باقی رہنے کا تھا جو اس جمہوری دور میں ایک اقلیت کے لیے مانے جاتے ہیں، تو یہ کیفیت ہمارے اندر کیوں پیدا ہوئی؟ جو صرف ایک ایسے انسانی گروہ ہی کی ہو سکتی ہے جو اپنے کسی حق کی کوئی بنیاد ایک ملک میں نہ پا رہا ہو اور خودداری کے ساتھ اس ملک میں رہنے کی جدوجہد کے لیے احساسات واعتقادات کا کوئی چشمہ اس کے اندر موجزن نہ ہو!

آزادی کا دیا ہوا اقتدار اکثریت کو آپ کے حق میں سخت سے سخت تر اور خطرناک سے خطرناک تر بنا سکتا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں آپ اپنی مزاحمت و مقاومت کا پارہ کچھ گرانے پر بھی مجبور ہو سکتے تھے۔ لیکن دل کا دھڑکنا ہی رک جائے اور زندگی موت کی تصویر بن جائے، تب یا تو اگر آپ کو یہ ماننا اچھا لگے تو مانیے کہ آپ سے بڑھ کر کوئی بزدل اور بے شرم مخلوق اس زمین پر پیدا نہیں ہوئی جو انگریز کے ہٹتے ہی ہر اس ذلت پر ہندو کے سامنے راضی ہو گئی جس کے خلاف لن ترانیوں کا ایک طوفان کل تک اس نے اٹھا رکھا تھا! اور یا اس حقیقت کو تسلیم کر لیجئے کہ پاکستان بنانے کے لیے ہم نے ان تمام حقوق کا سودا کر لیا تھا جن سے خالی ہاتھ ہو جانے پر یا پاکستان چلے جانے کی راہ

تھی یا اس سر افگندگی اور سپر اندازی کی جسے یہاں رہنے میں اختیار کیا گیا!

پاکستان بنانا ٹھیک تھا یا غلط اس سے بالکل بحث نہیں۔ بحث فقط اتنی ہے کہ جب پاکستان
ے لیا گیا تھا اور اس کے عوض ہندوستان میں اپنے جملہ جمہوری حقوق تج دینے کا اعلان کیا گیا تھا
پھر یہاں رہنے کے راستے دو ہی تھے۔ یا تو (خدانخواستہ) اُس ذلت و محرومی کی زندگی پر راضی رہنا
جسے شروع میں اختیار کیا گیا اور ایک مدت تک اُسی میں بسر ہوئی۔ اور یا نئے سرے سے اُن
حقوق کی بنیاد ڈالنے کے لیے اتنی حکمت و دانائی اور اتنے صبر و ضبط کے ساتھ کمربستہ ہونا تھا جتنی
پنے آپ سے دی ہوئی ایک متاعِ گرانمایہ کی بازیافت کے لیے ان باتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔
"اپنے کیے ہوئے" کے بارے میں بالکل صحیح کہاوت ہے کہ "اس کا علاج نہیں ہوتا" لیکن
حسن خوش قسمتی تھی کہ ہندوستان کے دستور سازوں نے ہندوستان کی مصلحت میں ایک سیکولر
ہوریہ کے قیام کا فیصلہ کیا اور دستور میں یہاں کے تمام باشندوں کے لیے بلاکسی تفریق کے
ان شہری حقوق رکھ دیے گئے۔ اس واقعہ نے ہماری اس مشکل کو آسان کر دیا کہ اپنے آپ سے دیئے ہوئے حقوق کی
یابی کیسے کی جائے۔ لیکن یہ دستور سازوں کی صرف اپنی مصلحت کی بات تھی۔ ہندوستان کا استحکام اس پر موقوف تھا کہ
ہوریت کیساتھ سیکولرزم بھی نظام حکومت کی بنیادوں میں شامل ہو ورنہ اکثریت کے اختلافات یہاں
نے کے بجائے بری طرح توڑنے کا باعث بنجاتے جو لوگ اکثریت کی سیاست پر زیادہ حاوی تھے وہ قائل بھی سیاست
بیشت کے معاملات میں سیکولرزم ہی کے تھے۔ مذہبیت سے یا تو دور تھے یا مذہب کو ان باتوں سے
علق ماننے والے تھے۔ اس طرح یہاں سیکولرزم کا حقیقی تعلق اولاً ان مذہبی اختلافات سے
ا جو اکثریت کے درمیان پائے جاتے ہیں اور ثانیاً اس کا مدعا نفس مذہب سے کاروبارِ حکومت
بے تعلقی تھی۔ سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ یہ اصول اسی سیاق و سباق میں اختیار کیا گیا
ا۔ لیکن کانگریس اور گاندھی جی نے مدتوں جس بلند آہنگی کے ساتھ انسانی حقوق، احترام
سانیت اور بلا تفریق جمہوریت پر اپنے عقیدے کا اظہار کیا تھا اُس کے بعد دنیا کی نظر
ں کوئی عزت باقی نہیں رہ سکتی تھی اگر آزاد ہندوستان کے دستور میں کوئی تفریق یہاں
کسی انسانی گروہ کے ساتھ برتی جاتی۔ اور قطع نظر دنیا کی رائے کے یوں بھی یہ بات آسان

نہیں ہوتی کہ اپنے بلند بانگ دعووں کو کوئی جماعت یا شخصیت پس پشت ڈال کر کھڑی ہو جائے۔ خصوصاً جبکہ مسلمانوں کا ایک گروہ آخر دم تک کانگریس کے ساتھ رہا بھی ہو۔ اس بنا پر دستور کی یہ سیکولر جمہوریت ایسے الفاظ میں درج ہوئی جن میں مسلمان اور غیر مسلمان سب ہی یکساں طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔ ورنہ کوئی سنجیدہ جذبہ اور ارادہ (دو چار آدمیوں کے امکانی استثناء کے ساتھ) ان الفاظ کے پیچھے ہونے کا سوال نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ اس نوعیت کے دستوری الفاظ ہماری اُس پوزیشن کو بحال کر دینے کا کام تو نہیں کر سکتے تھے جو ہم نے پاکستان پر قربان کر دی تھی۔ البتہ اس کی بحالی اور بازیابی کی جدوجہد کا راستہ کھول دینے کے لیے بالکل کافی تھے۔ اور یہی ان کا اچھا پہلو تھا جس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہمیں سب سے پہلا سیاسی ظاہرداری کے ساتھ (جسے اور مختلف شکلوں میں ہم برابر برتتے تھے) دستور کی اس ساخت کی پر زور تحسین کرتے ہوئے اظہار کرنا چاہیے تھا کہ ہم اس کو کوئی بناوٹ یا تصنع نہیں بالکل مخلصانہ سمجھتے ہیں۔ اس آغاز کے ساتھ ہمیں یہ اعتراف بھی (ظاہرداری ہی کے طور پر) کرنا چاہیے تھا کہ ہم نے ہندوؤں کو سمجھنے میں غلطی کی اور اُن کی طرف سے کانگریس کے دعووں پر اعتبار نہ کر کے ملک کو تقسیم کرانا غلط فہمیوں کے ماتحت ہوا ہمیں پورے زور سے اظہار کرنا چاہیے تھا اور اس اظہار کو ہر معیار پر سچا کر کے بھی دکھانا چاہیے تھا کہ اس دستور کے بعد تقسیم سے پہلے کا باب ہماری طرف سے بھی بند ہوا اور اب بالکل ایک نئے ذہن اور نئے طرز عمل کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز ہم اس ملک میں کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ہر طرح سے دستور کے اُن الفاظ میں جان ڈالنی تھی جو بظاہر بالکل بے جان اور رسمی پھولوں کے قائم مقام تھے۔ اور اس کی کوئی تدبیر اس طرز عمل کے سوا نہیں تھی۔ اس سے اُن لوگوں کے عملی فرار کے راستے تنگ ہوتے جو محض دکھاوے کے لیے ان الفاظ پر راضی ہوئے تھے۔ اور اُن لوگوں کو صدق عمل کی ترغیب ملتی اور اس کے لیے ہاتھ بھی مضبوط ہوتے جو کوئی انتقامی جذبہ مسلمانوں کیلیے نہیں رکھتے تھے اور پچھلے ابواب کو فراموش کر دینے کی وسعت اُن کے دلوں میں تھی۔ نقصان تو بہر حال اس میں کوئی نہیں تھا۔ پاکستان کوئی مذہبی عقیدہ نہیں تھا جس کی حمایت کو غلطی مان لینے سے کفر لازم آجاتا ہو۔ نہ ہندوؤں پر اعتبار کا اظہار کر دینے سے دین اسلام میں کوئی خلل آیا جاتا تھا۔ دنیاوی نقصان بھی کوئی نہیں تھا، امکان اگر

تھا تو فائدوں ہی کا تھا۔ بلکہ کوئی دوسری صورت دستور کی اس ساخت سے فائدہ اٹھانے کی اس کے سوا تھی ہی نہیں۔

بہرحال ایسے عالم میں کہ مسلّمہ حقوق کی پوزیشن ہم اپنے ہاتھوں سے ختم کر کے اور رحم وکرم کے امکانات سے ہندو مسلم قتل وغارت کے نتیجے میں محروم ہو کے، حال ومستقبل کی ہولناک تاریکیوں میں گھرے ہوئے یاس دہراس کا المناک نمونہ پیش کر رہے تھے " آزاد ہندوستان کے دستور کی یہ روشنی جھلملائی اور صورت حال کو بدلنے کی جد وجہد کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کا ایک سہارا پیدا ہو گیا جس سے دانشمندی کے ساتھ کام لے کر حالات کی تبدیلی کا راستہ بنایا جا سکتا تھا۔

لیکن جن لوگوں کو یہ کام انجام دینا تھا یعنی وہ لوگ جنھوں نے مسلم عوام کو پاکستان کی حمایت پر جمع کیا تھا (اور پاکستان نہیں جا سکے تھے) اور انہی کے طرز عمل سے اب بھی ان عوام کو رہنمائی حاصل کرنا تھی، اُن کے متعلق پھر وہی بات دوہرانا پڑتی ہے کہ یا تو پاکستان کی قیمت کا عملی رنگ دیکھ کر اُن کے ہوش حواس اُڑ گئے تھے کہ وقت کے تقاضوں کو سمجھ سکیں اور یا مذکورہ بالا قسم کا طرز عمل اختیار کر کے ان عوام کو یہ سمجھنے کا موقع دینے کی اخلاقی جرأت ان میں نہیں تھی کہ ان کی غلط رہنمائی سے یہ بُرے دن اُنھیں دیکھنا پڑے! مزید برآں ایک بات شاید۔ بلکہ یقیناً یہ بھی تھی کہ اس نئے طرز عمل میں اُن نیشنلسٹ مسلمانوں، اہل جمعیتہ وغیرہ سے بڑی خفت رہتی جنھیں پاکستان کی مخالفت پر ہر ہر طرح سے ذلیل کیا اور کرایا گیا تھا۔ ان مختلف ذہنی الجھاووں کے زیر اثر یہ لوگ باوجود اس کے کہ عام طور پر کانگریس کو دامانِ عافیت سمجھنے کا عملی ثبوت دیتے رہے، اس کو مسلمانوں کے ووٹ دلاتے رہے۔ بہت سے اُس میں باقاعدہ شامل بھی ہوتے رہے، لیکن اسی طرح کی ظاہرداری کے طور پر اُن باتوں کی جرأت اپنے اندر نہیں پیدا کر سکے جن سے فضا بدلتی۔ اکثریت کے دل ودماغ کی وہ سخت گرہیں کھل سکتیں جو تقسیم کی بحرانی کشمکش اور خونی آویزش نے ڈال دی تھیں اور نہ ان لوگوں کے لیے میدان تنگ ہوتا جو تقسیم کے بعد اس سرزمین پر مسلمانوں کے لیے کسی حق اور عافیت کا تصور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بس اُن باتوں پر اکتفا کی جو مجبوری کا دباؤ ان سے کراتا تھا اور جن کے بغیر عافیت کا سانس لینا محال سمجھتے تھے۔ حالانکہ ان میں سپر اندازی اور

سرافگندگی کے سوا کوئی ایک بھی دوسرا پہلو نہ تھا! لیکن جو باتیں مجبوری کی نہیں محض دوربینی اور مصلحت و تدبر کی تھیں اور اُن کا مطلب لازماً سپر اندازی اور سرافگندگی ہی نہیں بلکہ رائے پر نظرِ ثانی اور حقیقت پسندی بھی دوسروں کی نظر میں ہو سکتا تھا، ان باتوں اور ان لوگوں کے درمیان میں اتنا ہی فاصلہ رہا، جتنا ایک جرأت نہ رکھنے والے یا ضرورت نہ سمجھنے والے سے ان باتوں کا فاصلہ ہو سکتا ہے! تقسیم سے پہلے کے اپنے طرزِ عمل اور ذہن و فکر کو غلط کہہ دینے کی کوئی مجبوری ان پر مسلّط نہیں ہوئی لہٰذا انھوں نے اپنی ساری عزیمت و استقامت اسی میں دکھائی کہ یہ کام نہیں کریں گے چاہے قوم کا مستقبل اسی پر اٹکا ہوا کیوں نہ ہو اور کیسا ہی خوبصورت موقع (دستور کی ساخت سے) اس کے لیے پیدا ہو گیا ہو۔ گویا یہ کوئی توحید و رسالت کا عقیدہ تھا جس سے زبان کو پھیرنے کی بات اسوقت تک جائز نہیں ہوتی جب تک کہ گلا کٹنے نہ جا رہا ہو!

ہرگز کوئی خواب مسلمانوں کو دکھانے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ دستور اُن کی مایوسی کے اندھیروں میں چاند سورج اُگائے گا اور محرومی کی ساری تلخیاں مٹھاس کی لذتوں سے بدل جائیں گی لیکن جب آپ کے ہاتھ ہی بے ہتھیار نہیں ہو چکے تھے بلکہ سینوں میں حق کا احساس اور اس کی حوصلہ تخنیاں تک ناپید تھیں اور حریف کی شرافت و معقولیت کے سوا عالمِ اسباب میں کوئی دوسری سبیل آپ کی عزت و عافیت کی فی الوقت موجود نہ تھی۔ تو پھر سوائے اس کے عقل کی بات کیا تھی کہ حریف دکھاوے کے دریا دلی بھی دکھائے تو آپ اُس پر اعتماد کا اظہار کریں اور شریفانہ تحسین و منت گزاری کے ساتھ اُس کی عطا کو قبول کر کے اپنی عزت اور وقار کی حفاظت کے ساتھ مسلسل ایسا رویہ رکھیں جو اُسے اپنی بات کا پاس نہ رکھنے سے شرم دلائے، جو لوگ اُس کی صفوں میں اس طرزِ عمل کو ناپسند کرنے والے ہوں اُن کے لیے اپنی رائے کو پھیلانے کی گنجائشیں تنگ ہوں اور شریف دلوں کو اپنے رجحان میں پختگی اور اُسے عام کرنے میں سہولت حاصل ہو جائے؟ مگر ہم نے تو جیسے قسم کھائی تھی کہ کانگریس کو ووٹ دلوا لو۔ اُس کی ممبری کے فارم بھی بھروا لو، وزیروں کی پارٹیاں کر ڈالو۔ انھیں الیکشن کے چندے دلوا لو غرض دفع الوقتی کے کیسے ہی خوشامدانہ کام کرا لو[عہ] مگر

عہ ایسے لوگوں کے وجود سے انکار نہیں ہے جنھوں نے یہ گھٹیا پن نہیں اختیار کیا۔ بیشک ایسے لوگ بھی تھے کہ انھوں نے اگر عقل کی بات نہیں کی تو یہ گراوٹ کی باتیں بھی نہیں کیں۔

مسلمانوں سے یہ کہنا ممکن نہیں کہ جب ہندو اکثریت نے ایک ایسا سیکولر دستور بنا کر جس میں ہمارے لیے بھی ہر طرح کے مساوی حقوق تسلیم کیے گئے ہیں، ماضی کی آویزشوں کو فراموش کر دینے کی پہل کر دی ہے، تو چاہے وہ دکھانے ہی کے لیے ہو، ہماری شرافت کا بھی تقاضا ہے اور مصلحت بھی یہی ہے کہ ہم اب ایک مثبت رویے کے ساتھ سامنے آئیں، ہندو کے وعدوں اور اعلانوں کو فراڈ کہنا اور قطعی طور پر ایسا ہی سمجھنا چھوڑ دیں۔ ہندو نے اگر دکھاوے کا ہاتھ بھی بڑھایا ہے تو اسے سچائی میں بدل جانے دو ورنہ کم از کم امکان رکھنے پر اسے مجبور کر دو۔ کوئی ایسی بات بجا طور پر کہنے کا موقع مت دو کہ مسلمان نے اس ہندوستان میں بھی ہمارے اظہار معقولیت کی قدر نہیں کی جس میں ہم کوئی سا بھی طرز عمل اختیار کرنے کے لیے آزاد تھے! — یہ باتیں ان لوگوں کے منہ سے نہیں نکلیں۔ بلکہ اس کے برعکس وہی سبق پختہ کرایا جاتا رہا کہ سب فراڈ ہے۔ ایک بات بھی بھروسے کے قابل نہیں۔ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ اردو مٹا دی جائے گی سو مٹائی جا رہی ہے۔ خون مسلم کی ارزانی ہے۔ فوج، پولیس، حکام، اور افسران سب تماشائی ہیں۔ دیکھو پٹیل کا رویہ دیکھو، مولانا ابو الکلام کو کیسا سبق مل رہا ہے۔ ایک ایک بات جو ہمارے لیڈروں نے کہی تھی صحیح ہو رہی ہے۔ رہے فلاں کے ایڈیشن اور بیانات، یہ سب دنیا کو دکھانے کے لیے ہیں۔

یہ طرز گفتگو اور انداز فکر حکومت سے کم و بیش اظہار وفاداری یا کم از کم محتاط روی کے ساتھ اندر اندر چلتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۶۴ء میں بعض مقتدر کانگریسی مسلمانوں کا سہارا لے کر ان لوگوں کو کانگریسی حکومت کے خلاف لب کشائی کے میدان میں آنے کا موقع ملا۔ ان "کانگریسی مسلمانوں" کے خلاف بھی نفرت و بدظنی ان کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے تھی، مگر مصلحت کا احساس کر کے اُن کی قیادت ماننا گوارا کیا۔ چند ہی مہینے گزرے تھے کہ ۱۹۶۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک ناشدنی واقعہ سے چھاگلا گردی کا شکار ہو گئی۔ اس موقع پر یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہونے کے رشتے سے کچھ اور کانگریسی مسلمان بھی ان کو آگے کرنے کے لیے مل گئے۔ اور اب ان بہت سے کانگریسی مسلمانوں کی چھتری میں پورے تحفظ کے احساس کے ساتھ انھوں نے خوب جی بھر کر دکھانے کی مشق بہم پہنچائی۔ کھنچتے کھنچتے ۱۹۶۷ء کے جنرل الیکشن کا وقت آ گیا۔ اب انھیں

اس چیتھڑی کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ پورے ملک میں کانگریس مخالف ہوائیں اٹھ پڑی تھیں، اور اس طوفان میں ان کی حفاظت کا پورا سامان تھا، چنانچہ اس الیکشن کے سلسلے میں پالیسی پر اختیارِ رائے ہوا تو سب نے بے تامل اس چیتھڑی کو اٹھا کر ایک کونے میں ڈال دیا۔ اب یہ اپنے نامدار آپ ہی تھے۔ جو باتیں اندر کیا کرتے تھے، الفاظ کی ضروری تبدیلی کے ساتھ اسٹیج پر کرنے لگے۔ کچھ شیڈولڈ کاسٹس کے مقرر ہاتھ آ گئے تھے، اپنے الفاظ کی کمی ان سے پوری کرائی جانے لگی۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کے خلاف وہ وہ بے نقط تقریریں اس مسلم اسٹیج سے ان مقرروں کی ہوئیں کہ تقسیم سے پہلے کا دور پھر گیا اور جو تھوڑا بہت اس دور کا سبق، حالات کی رفتار سے مسلم عوام بھول گئے ہوں گے وہ پورا کا پورا ہی تازہ ہو گیا۔ اپنا یہ سراسیمہ تانا بانا پھر سے نئے جذبوں کے ساتھ آراستہ کر کے یہ نامدارانِ ملت پوری سج دھج کے ساتھ میدانِ سیاست میں گامزن ہوئے۔ وہی بولیاں جو تقسیم سے پہلے کی معرکہ آرائی میں بولی جاتی تھیں، بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ ہر طرف سنائی دینے لگیں۔۔۔ یہ مسلمانوں کے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد تھی، وہ حقوق جو دستور میں درج تھے مگر عمل بہت کم رہے تھے۔

ذرا غور کیجیے! کہ کیا یہ حقوق جن کے بارے میں خود آپ کا یقین ہے کہ محض دکھاوے کے لیے دستور کی کتاب میں درج کیے گئے تھے، عملاً دینے مقصود نہیں تھے، محض زوردار تقریروں اور لعنت ملامت سے حاصل کیے جا سکتے تھے؟ حقوق تسلیم کرانے ہوں یا تسلیم شدہ پر عملدرآمد کرانا ہو، تو دو ہی طریقے اس کے لیے جمہوریت میں کارگر ہو سکتے ہیں: کوئی ایجی ٹیشن چلا کر حکومت کو مجبور کر دیجیے، یا رائے عامہ کو اپنے حق میں کر لیجیے جو حکومت بناتی اور بگاڑتی ہے، ایجی ٹیشن کرنے کا آپ میں دم نہیں، اس لیے کہ حکومت سے پہلے اکثریت کے عام لوگ آپ کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں گے۔ اپنے گھروں سے نکل کر دس بیس قدم بھی عام شہروں میں چلنا آپ کے لیے مشکل ہے۔ اپنی اس مجبوری کو آپ اتنی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ تمام پیچ و تاب کے باوجود مشکل ہی سے ایجی ٹیشن کا نام زبان پر لاتے ہیں۔ اور لے بھی آتے ہیں تو اسے عمل میں نہ لانے کی بات پہلے ہی سے طے رکھتے ہیں۔ چنانچہ نوبت اس کی ایک بار بھی نہیں آ سکی، بہرحال، یہ راستہ آپ کے لیے بند ہے۔ رہ جاتا ہے ملک کی رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کا معاملہ تو اس کی کٹھنائی کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ یہ رائے عامہ ہی ہے جس کے خوف سے آپ حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن بھی نہیں کر سکتے۔ اس رائے عامہ کے ہمنوا بنانے کو بلا مبالغہ پہاڑ کاٹ کر راستہ بنانے

سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ لیکن ہمارے مسئلے کے حل کا واحد راستہ یہی ہے۔ اس کوہ کنی میں کتنے ہی فرہاد جان سے بھی گزر جائیں تو یہ ان کی جان کا ضیاع نہیں ہے۔

اس رائے عامہ کے مسئلے کو حل کرنے کا ایک وقت تو وہ تھا جب ملک کے دستور میں ہمارے حقوق درج کیے گئے۔ اور اس سے بھی پہلے جب گاندھی جی نے مسلمانوں کے تحفظ کے مسئلے پر برت رکھا اور اسی راہ میں جان دی۔ اس وقت اگر وہ طرز عمل اختیار کر لیا جاتا جیسے اوپر بیان کیا گیا ہے تو بہت کچھ یہ مسئلہ اسی وقت حل ہو گیا ہوتا مگر ـــ ایک بار پھر اتمام کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ ـ ہمیں تو اپنا یہ مسئلہ حل ہونے کے بجائے یہ زیادہ پسند تھا کہ جو کچھ خیالات ہم نے ہندوؤں کے بارے میں قائم کیے اور ظاہر کیے تھے وہ غلط نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ جو باتیں ان خیالات کے برعکس سامنے آئیں انھیں بھی فریب اور مکاری ثابت کرنے کی فکر ہمیں زیادہ رہی، چہ جائیکہ ایسی مزید باتیں پیدا کرنے کی ہم کوشش کرتے اور ہندوؤں کے اندر تبدیلی کے اس خداداد موقع سے بھرپور فائدہ اٹھا لیتے!

دوسرا موقع ۱۹۶۴ء میں راوڑکیلا اور جمشید پور کے دردناک قتل و غارت کے بعد آیا تھا جس میں مجلس مشاورت رونما ہوئی جو اپنے بانی صدر کے خیالات کے مطابق یہی کام اس موقع سے کرنا چاہتی تھی۔ مسلمانوں کا رجوع بھی اس اتحاد کی جانب ایسا ہوا تھا کہ اس کی آواز تمام مسلمانوں کی آواز مانی جا سکتی تھی اور ہندوؤں پر اس وزن کے ساتھ اثر انداز ہونے کی اہلیت رکھتی تھی۔ مگر مسلمانوں کی یہ پرجوش حرکت اور اجتماعیت دیکھ کر ان لوگوں کے منہ میں پھر پانی بھر آیا جو ایسی ہی اجتماعیت کو لے کر ایک بار ہندوستان بٹوا چکے تھے۔ ہندوؤں کے ایک بڑے اور بااثر طبقے کے اندر ندامت اور انفعال پذیری کا جو ماحول ایک پوری نسل کے خلاف تشدد اور مسلمانوں سے متعلق ان کا انداز نگاہ بدل دینے کی وہ تعمیری حکمت عملی جو مشاورت کے صدر کا نقطۂ نظر تھی ان لوگوں پر اس حوصلہ انگیز ماحول میں بار ہونے لگی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے واقعے نے اردو کے جذبات بھی برانگیختہ کیے۔ اور اس طرح کچھ حالات کی سازگاری کے باعث اور کچھ بیرونی انگیخت نے ان لوگوں کو اس پر بھی آمادہ کر دیا کہ صدر مشاورت کے نقطۂ نظر کو پس پشت ڈال کر مسلمانوں کی اس پرجوش اجتماعیت کو ـــ کانگریس کے عنوان سے ہندو اقتدار کے خلاف صف آرائی کی شکل دے دی جائے۔ یہ اپنی جگہ پر واقعہ ہے کہ ہندوؤں کے عامہ مسلم مخالف ذہن کو بدل ڈالنے اور اس وقت کی کمزور حیثیت ندامت

کی گرمی سے نرم لوہے کو انسانیت اور معقولیت کے سانچے میں ڈھال لینے کا جو اصولی راستہ صدرِ مشاورت نے اپنے خطبۂ صدارت میں تجویز کیا تھا، اپنی تقریروں میں وہ اپنے ذاتی خیالات و تأثرات کے تحت اس سے تجاوز کر جاتے تھے اور اس بات کی رعایت نہیں رکھ پاتے تھے کہ ان کے قافلے میں اُن سے بہت مختلف خیالات اور بہت مختلف ماضی رکھنے والے لوگ بھی ہیں، بلکہ زیادہ تر وہی ہیں۔ یہ صدرِ مشاورت (ڈاکٹر سید محمود مرحوم) کے وہ خیالات و تأثرات تھے جو مدتوں گاندھی جی کی عقیدت مندانہ رفاقت اور عمر بھر کی مخلصانہ کانگریسیت سے اُن کے دل و دماغ میں رچ بس گئے تھے — ڈاکٹر صاحب کے اس تجاوز کر جانے پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس سے اس بات کا جواز بھی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ اصل لائن ہی ترک کر دیا جائے۔ لیکن اس بار نے کانگریسیت اور لیگیت کے نفرت انگیز تنازعات کو زندہ کیا اور کھلی دھاندلی، بے اصولی اور جماعت سازی تک کے ساتھ یکسر مختلف راستے پر چلنا طے کر کے اُن بہترین امکانات کو تباہ کر دیا گیا جو ڈاکٹر صاحب کے تجویز کردہ راستے سے متوقع تھے — خرابی مجلس مشاورت کے انداز ترکیب و تأسیس کی بھی تھی کہ بغیر کوئی جامع و مانع ضابطہ وضع کیے ہوئے مختلف الخیال لوگوں کا کنبہ جوڑ لیا گیا جس میں چو طرفہ کھینچا تان اور چھین جھپٹ کی بڑی گنجائشیں تھیں۔ لیکن مسائل کا شعور اور مصالح کو جذبات پر تقدم حاصل ہوتا تو آغاز کے لیے یہ بھول بھی دورانِ کار میں نکل جانا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی مگر یہاں تو بدقسمتی نے ایسی مضبوطی سے ڈیرے ڈال رکھے ہیں کہ سادہ تحفظات کے ساتھ بھی بات شروع کی جاتی تو شاید انجام یہی ہوتا — بہرحال یہ نادر موقع بھی تھوڑی بہت نہیں زمین کی آخری گہرائیوں تک لے جا کے دفن کیا گیا اور جتنی کیلیں اپنے ہاتھ آ سکتی تھیں ایک ایک کر کے سب اُس کے تابوت میں ٹھونک دی گئیں! مگر افسوس! صد بار افسوس!! عقل دشمنی اور جذبات پسندی کا مزہ بھی ایسا چکھنا پڑا کہ اگر ایمانداری کو زبان ہو جائے تو کسی کو ایک حرفِ عبرت کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں۔ مسلم مجلس کا جو دلفریب محل اس قبر پر تعمیر کیا گیا تھا وہ تمام حوصلوں اور خوش فہمیوں کا مزار ہی بنتا چلا گیا۔ اس محل کے مکینوں کے پاس اب ایک "داستانِ درد" سنانے کے سوا کچھ اور نہیں۔ جلسے کرتے ہیں تو اپنی غریب خستگیوں اور دوسروں کی وعدہ خلافیوں کی داستان سنا کر قصور معاف کرانے کے لیے اور احساسات کی چبھن کو تھپکی

سلیوں سے آرام ہو جانے کے لیے !! ۔۔ مگر "صفاتِ توبہ" کی توفیق؛ یہ الطاف ہر انسان کے حصے کی چیز ہے ہی نہیں، وہ "قاتل" اور ہوتے تھے، وہ "پشیمانی" اور ہوتی تھی!

مجلس مشاورت کے صدر اور بانی مبانی کی دی ہوئی لائن کو چھوڑ کر جو لائن اختیار کی گئی اسکی کچھ تفصیل مذکور ہے۔ یہ لائن تھی انتخابی دباؤ کے ذریعے کانگریس کو جھکانے اور خوشامد کی پوزیشن میں لانے کی۔ کانگریس نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ غصے میں طے کر لیا گیا کہ اب کانگریس کے مخالف پارٹیوں کی حمایت کر کے اقتدار سے ہٹانا ہے۔ یہ اتفاق سے سارے ملک ہی کا موڈ بن گیا تھا۔ کانگریس نے بری طرح کی ہار اٹھائی لیکن مخالف پارٹیوں نے بھی اس حمایت کی قیمت میں جو وعدوں کے چیک دیئے تھے، اقتدار پا کر اُن کی ادائیگی میں وہی کیا جو کانگریس کیا کرتی تھی اور یہ بھی صاف نظر آ گیا کہ اپنے لیے کسی کا عالم یہاں بھی وہی ہے جو کانگریسی حکومتوں کے مقابلے میں تھا۔

یہ تجربہ اس بات کو سمجھا دینے کے لیے بالکل کافی تھا کہ ہمارے لیے اپنے دستوری حقوق پانے اور وعدے پورے کرانے کا راستہ انتخابی حمایت اور مخالفت نہیں ہے۔ لیکن غصے کا پارہ تو اب انتہا کو پہنچ رہا تھا۔ کانگریس کے بعض صوبائی لیڈروں نے موقع کو تاڑتے ہوئے وعدوں کی جھڑی ڈال سامنے کی اور ایک جست میں پلٹ کر یہ ناراض لیڈر اُس پر جا پڑے۔ اگرچہ اسمبلی کے جن ممبران کو یہ اپنا ممنونِ احسان اور تابع فرمان سمجھتے تھے اُن میں سے مسلمان اور غیر مسلمان کوئی بھی اس قلابازی میں ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوا۔ غصہ اب کسی پیمانے سے ناپنے والا نہیں رہ سکتا تھا۔ حالات بھی ایک نئے الیکشن کے بن رہے تھے۔ لہٰذا ایک نئی ٹھانی: پسماندہ ہندوؤں کے ایک طبقے کو ساتھ ملا کر ایک فیڈریشن بنائی جس کے ذریعے آنے والا الیکشن خود لڑا جا سکے۔ مگر بمشکل چار پانچ آدمی ۴۲۵ کی اسمبلی میں پہنچائے جا سکے اور یہ بھی اس شان سے کہ بہ کاعث اپنی پارٹی چھوڑتے چھوڑتے بس ایک صاحب کُل جمع میں رہ گئے ہیں جو اس فیڈریشن اور مسلم مجلس کی نمائندگی کرتے ہیں۔

یہ غصے کی حالت یوں رہی تھی کہ ملک کے سیاسی سمندر میں ایک طوفان پرورش پا کے اُٹھا۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اپنی پارٹی پر چھائے ہوئے لیڈروں سے اندرونی کشمکش کے بعد کھلی لڑائی کا فیصلہ کیا۔ اور یہ لڑائی پورے ملک کے لیے مرکزِ توجہ بنتی ہوئی تھوڑے ہی دنوں میں مسز گاندھی کی شاندار جیت پر ختم ہوئی۔ اس لڑائی میں کانگریس والی کی بھاری

کی گرمی سے نرم ہو کر انسانیت اور قومیت کے سانچے میں ڈھال لینے کا جو اصولی راستہ صدر مشاورت نے اپنے خطبۂ صدارت میں تجویز کیا تھا، اپنی تقریروں میں وہ اپنے ذاتی خیالات و تاثرات کے تحت اس سے تجاوز کر جاتے تھے اور اس بات کی رعایت نہیں رکھ پاتے تھے کہ ان کے قافلے میں ان سے بہت مختلف خیالات اور بہت مختلف ماضی رکھنے والے لوگ بھی ہیں بلکہ زیادہ تر وہی ہیں۔ یہ صدر مشاورت (ڈاکٹر سید محمود مرحوم) کے وہ خیالات و تاثرات تھے جو برسوں کا [illegible] کی تعمیر [illegible] رفاقت اور [illegible] کی مخلصانہ کانگریسیت سے اُن کے دل و دماغ میں بیٹھ گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس تجاوز کے باوجود ان پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس سے اس بات کا جواز بھی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ اصل راستہ ہی ترک کر دیا جائے۔ لیکن اس بار نے کانگریسیت و انسانیت کے نعرے [illegible] کو زندہ کیا اور کھلی دعوائے عدل [illegible] بے اصولی اور [illegible] کے ساتھ [illegible] مختلف راستے پر چلنا ہے کہ اُن بہترین امکانات کو تباہ کر دیا گیا جو ڈاکٹر صاحب [illegible] [illegible] مجلس مشاورت کے انداز ترکیب و [illegible] کی بھی کوئی [illegible] مختلف الخیال لوگوں کا کنبہ جو [illegible] گیا جس میں چاروں طرف [illegible] اور [illegible] چھوٹی بڑی [illegible] کا شعور اور رضا [illegible] کو بنیادی [illegible] کے لیے جو ان کو دو [illegible] جانا کوئی [illegible] بات نہیں ہوتی [illegible] نے ایسی مضبوطی سے [illegible] ساتھ بھی یہ طرز کی جاتی تو شاید انجام یہ نہ ہوتا [illegible] بہ حال [illegible] تھوڑی بہت نہیں زمین کی [illegible] دفن کیا گیا اور [illegible] سکتی تھیں ایک ایک کر کے [illegible] تابوت میں ٹھونکی گئیں [illegible] مگر [illegible] عقل دشمنی اور جذبات پسندی کا مزہ بھی ایسا چکھنا پڑا کہ [illegible] کو ایک حرف عبرت کے لیے [illegible] کیا گیا تھا وہ نام نہاد سوشلسٹوں اور [illegible] کا مزار [illegible] "[illegible] کے سوا کچھ اور نہیں، جلسے کرتے ہیں تو اپنی فریب خوردگیوں اور [illegible] [illegible] کر تصور یاد دلانے کے لیے اور احساسات کی چبھن کو تھپکی

تسلیوں سے آرام پہونچانے کے لیے!! ___ مگر "صفاتِ توبہ" کی توفیق تو یہ ابتلا ہر ان کے حصے کی چیز ہے ہی نہیں، وہ "قاتل" اور ہوتے تھے، وہ "پشیمانی" اور ہوتی تھی!

مجلس مشاورت کے صدر اور بانی صاحب کی دی ہوئی لائن کو چھوڑ کر جو لائن اختیار کی گئی اس کی کچھ تفصیل ضروری ہے۔ یہ لائن تھی انتخابی دباؤ کے ذریعے کانگریس کو جھکانے اور مشاورت کی پوزیشن میں لانے کی۔ کانگریس نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ غصے میں طے کر لیا گیا کہ اب کانگریس کے مخالف پارٹیوں کی حمایت کر کے اقتدار سے ہٹانا ہے۔ یہ اتفاق سے سارے ملک ہی کا موڈ بن گیا تھا۔ کانگریس نے بری طرح کی مار کھائی، لیکن مخالف پارٹیوں نے بھی اس حمایت کی قیمت میں جو وعدوں کے چیک دیے تھے اقتدار پا کر ان کی ادائیگی نہیں ہی کیا جو کانگریس کیا کرتی تھی اور یہ بھی صاف نظر آ گیا کہ اپنی بے بسی کا عالم یہاں بھی وہی ہے جو کانگریسی حکومتوں کے معاملے میں تھا۔

یہ تجربہ اس بات کو سمجھا دینے کے لیے بالکل کافی تھا کہ ہمارے لیے اپنے دستوری حقوق پانے اور وعدے پورے کرانے کا راستہ انتخابی حمایت اور مخالفت نہیں ہے۔ لیکن غصے کا پارہ تو اب انتہا [illegible] پا تھا۔ کانگریس کے بعض [illegible] لیڈروں نے موقع کو تاڑتے ہوئے وعدوں کی [illegible] ڈال [illegible] بہت میں [illegible] یہ ناراض لیڈر اس پر جا پڑے۔ مگر اسمبلی کے جن ممبران کو یہ ٹکٹ [illegible] تابع فرمان سمجھتے تھے ان میں سے مسلمان اور غیر مسلمان کوئی بھی ان تلابازیوں [illegible] ان پر اب کسی پیمانے سے ناپنے والا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ حالانکہ بھی ایک [illegible] تھے۔ لہٰذا ایک نئی ٹھانی اور پیمانہ مزدوروں کے ایک طبقے کو ساتھ لے کر [illegible] کے ذریعے آنے والا الیکشن خود لڑا جائے۔ مگر بمشکل چار پانچ آدمی [illegible] میں پہونچائے جا سکے اور یہ بھی [illegible] کا آئی پارٹی چھوڑتے [illegible] ایک صاحب کل جمع میں رہ گئے ہیں جو [illegible] اور مسلم مجلس کی نمائندگی

غصے کی حالت یہی رہی تھی کہ ملک کے سیاسی منظر میں ایک طوفان پرورش پا کے [illegible] وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اپنی پارٹی پر چھائے ہوئے لیڈروں سے [illegible] اندرونی [illegible] کے بعد کھلی لڑائی کا فیصلہ کیا۔ اور یہ لڑائی پورے ملک کے لیے مرکز توجہ بنی ہوئی تھی [illegible] دنوں میں مسز گاندھی کی شاندار جیت پر ختم ہوئی۔ اس لڑائی میں کانگریس والوں کی بھاری

اکثریت کے علاوہ ملک کے عوام نے بھی بے پناہ جوش کے ساتھ اندرا گاندھی کی حمایت کا مظاہرہ کیا اور اس سے اپنی پارٹی کی اس کمزوری کو، بڑی طاقت کو بحال کرنے کے لیے جو نامی موقع پر ۶۷ء کے الکشن میں بہت زیادہ کمزور ہو گئی تھی، پارلیمنٹ کے نئے الکشن کا فیصلہ مسز گاندھی نے کیا۔

جو الکشن ہوئی اندرا گاندھی کے حق میں چل رہی تھی۔ کیا مسلمان اور کیا غیر مسلم، اس سب محو تھے۔ اچھے اچھوں کو اس الکشن کے خیالات سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ مایوسی کے مارے ہمارے لیڈروں کو اس قیامت کے دن میں اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے خیال آیا کہ اندرا گاندھی بہرحال اکیلی ہیں، تمام بڑی پارٹیاں ان کے مقابلے میں متحدہ محاذ بنا رہی ہیں، لہٰذا وہ کسی حمایت کی ناقدری نہیں کریں گی۔ چنانچہ اس گزارش کے ساتھ انھیں حمایت کی پیشکش کی گئی کہ چند سیٹیں ہمارے لیے چھوڑ دی جائیں، کانگریس کا امیدوار وہاں نہ ہو اور فلاں فلاں باتیں جو مسلمانوں سے متعلق ہیں مینی فیسٹو میں درج کر دی جائیں۔ یہ پیشکش قبول ہوئی۔ لیکن اندرا گاندھی کی نظر تو بہت تیز ہے، ان سے بہت کم درجہ کی نظر پر بھی یہ بات مخفی نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ ایک مجبور آدمی کا سودا ہے جو کسی بات پر بھی ایسی آن نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ اس کا کوئی اعلان تک مسز اندرا گاندھی کی طرف سے نہیں کیا گیا کہ یہ سیٹیں مسلم مجلس کے لیے چھوڑ دی گئی ہیں۔ ایسے میں کہاں ایک پٹی ہوئی آواز کوئی اثر دکھا سکتی تھی؟ کوئی سیٹ تو ملنا درکنار سب سیٹوں پر مجموعی ووٹ بھی ایک سیٹ جیتنے بھر کے نہ مل سکے۔ اور اس کے بعد مینی فیسٹو کے وعدوں پر عمل کے لیے تھوڑی بہت بھی مجبور کرنے والی چیز اندرا گاندھی کے لیے کیا ہو سکتی تھی؟

اب الکشن کے حوصلے تو تقریباً بالکل سرد ہیں، بلکہ یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ کوئی زندہ بھی رہ گیا ہے۔ البتہ وعدوں کی یاد دہانی اور شکایتوں کی داستان بیان ہو رہی ہے۔ "برداشت نہ کرنے" کے عزائم کا بھی حسب حالات اظہار ہے۔ ایک آدھ مسئلہ پر "تحریک" چلانے کی کچھ دھمکی بھی ہے۔ لیکن کیا کسی کو یقین آسکتا ہے کہ ان بازوؤں میں اب بھی کچھ کر دکھانے کا دم رہ گیا ہے؟ ہمیں تو ان میں سے کوئی آدمی بھی اب ایسا نہیں ملتا جس کے اندر ٹٹولنے سے بھی کسی دم خم کے آثار ملتے ہوں۔ بجھے بجھے چہرے، لڑکھڑاتی ہوئی زبانیں، کتراتی ہوئی نگاہیں! کوئی کہنا چاہے تو کہہ لے کہ "بس اب ع

بندھا ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

آہ! کیسے کہا جائے کہ

اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے

منع کرنے "میں اپنا بھی ناچیز حصہ ہے۔ زبان سے، قلم سے، جس جس طرح بن پڑا سمجھایا کہ یہ ہ کچھ پانے کا نہیں سراسر کھونے کا ہے! اس کی کوشش سے انکار نہیں مگر سراب کے سوا کچھ اور ں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ وقت پھر آسانی سے نہ آئے گا۔ میں کہتا ہوں کہ جس کام میں آپ اسے لگا ہے ہیں اس سے شکست کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ قدم بقدم منطقی نتائج کو سوچ لیجئے۔ آخری نتیجہ دو دو چار کی طرح صاف ہے! مگر یہاں مجبوری یہ تھی کہ کسی کو تو بس لیڈری کے گھٹے ہوئے حوصلے پورے ے تھے اور اس کے لیے واحد سبیل یہی الیکشن بازی تھی اور کسی کو وہ راستہ اپنے "عقیدوں" کے خلاف ا جو مجلس مشاورت کے مرحوم صدر نے تجویز کیا تھا جبکہ یہ دوسرا راستہ اُن عقیدوں کے عین مطابق۔

الغرض ملک کی اکثریت کو مسلم مخالف جذبات سے ہٹا کر اعتدال پر لانے اور پھر کثرت کم ب [illegible] تر تعداد کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے اُس کے اندر گھسنے کے راستے بنانے کی جدوجہد یہ دوسرا سازگار موقع بھی بری طرح تباہ کر دیا گیا جو ۱۹۶۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور اس کی تباہی باعث بھی وہی ذہنیت بنی جس نے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء کے مواقع برباد کیے تھے۔

یہ ذہنیت آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت نے ترکے میں چھوڑی تھی۔ اس کی رو سے ردو کو ہمیشہ دشمن سمجھنا ایک رکن اسلام تھا۔ ہندو مسلمانوں کو قریب لانے کی ہر کوشش ام ں ہندو کی ہر بات، ہر قدم اور ہر عمل کا کوئی مقصد اور محرک اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کیا جائے۔ اُس کی کوئی دلچسپی اور اس کی زندگی کا کوئی محور اس کے سوا ہے ہی نہیں کہ مسلمانوں کو نابود کرنے کی تدبیریں سوچتا اور اسکیمیں بناتا رہے۔ وہ جاگتا ہے تو اسی ضمن میں سوتا ہے تو اسی خیال میں! یہ ذہنیت پاکستان بنانے والی قیادت نے اپنے پیچھے رہ جانے والوں کے لیے اس ہندوستان میں چھوڑی تھی جو ہندو کی آزادانہ حکمرانی کے لیے ایک تلخ ترین کشمکش کے پس منظر میں ہو کر گئی تھی اور جس میں ۸۶ فیصدی ہندو آبادی ہندو تھے۔ ایک راستہ خدا کی تجربی فرصت دے دو کا تو رو ایسا ہو سکتا تھا کہ ان [illegible] کے مطابق ناز نخرے رکھتے ہوئے بھی عزت عافیت کی زندگی لیتے

نہیں بسر کی جا سکے۔ ورنہ زندگی کا کوئی نقشہ اس طرزِ عمل کے ساتھ ذرا بھی سوچ کر دیکھیے تو ہوا ... بن ہی نہیں سکتا جو پہلے دن سے آج تک بنا ہوا ہے۔ ہندو کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار ہے اور جمہوریت کی رو سے یہ ایک جائز اقتدار ہے۔ ہندو کا کوئی حرج نہیں اور ہم ... طور پر محسوس ہونے والا حرج تو ہے ہی نہیں اگر ہم یہ ذہن اس کے معاملے میں رکھیں۔ لیکن ہمارا ... تو آخر تک نقصان ہی نقصان ہے اگر ہم اس ذہن سے نجات حاصل نہ کریں۔ جمہوریت میں ایک اقلیت و اکثریت وہ ہوتی ہے جو ہر آن بدل سکتی ہے۔ اس کی مثال حکمران کانگریس اور اس کی مقابل پارٹیاں ہیں کہ کسی بھی انتخاب میں ہو سکتا ہے کہ کانگریس اقلیت میں آ جائے اور کوئی مخالف پارٹی اکثریت حاصل کر لے۔ لیکن ہمیں جس اقلیت و اکثریت کے مسئلے سے سابقہ ہے اس کی نوعیت یہ نہیں کہ کسی انتخابی حلقہ میں مسلمان اکثریت بن جائیں اور ہندو اقلیت میں بدل جائیں اس کا کوئی سوال نہیں۔ ایسی صورت میں اقلیت اور اکثریت کے درمیان سخت گرہیں بھی پڑی ہوئی ہوں تو کسی انتخابی یا غیر انتخابی لڑائی کے ذریعہ کچھ نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے جو کچھ بھی امکانات ہیں وہ اکثریت کی گرہیں نکالنے اور اس کی رائے عامہ کو ہموار کر لینے سے وابستہ ہیں ـــــ اور یہ بات اگر ہمارے حلق سے نہیں اتر سکتی تو ہمیں خودکشی کر لینے کا پورا اختیار ہے ـــ جو بہت سے ان لوگوں کی رہنمائی میں کر رہے ہیں جن میں سے کچھ کی ذہنیت کا نقشہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ فی الوقت مسلمانوں میں ان "رہنماؤں" سے پوری مایوسی آ گئی ہے لیکن مستقبل کے بارے میں کوئی اطمینان اُس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس ذہنیت کے بارے میں مسلمانوں کا ذہن صاف نہ ہو جائے جس کی کوشش سے بار بار ان کو مایوس کن اور تباہ کن راستوں پر دوڑایا جاتا ہے۔ آگے اب اسی مقصد سے کچھ اور کہنا ہے۔ (باقی)

مسلم ممالک میں مغرب پسندی
اور اس میں مسلم تجدد پسندوں کا حصہ

از۔ فلپ۔ کے ہٹی

ہمارے تجدد پسندوں کو یہ کہنا برا لگتا ہے کہ وہ اسلام کی تشریح اور تعبیر اس کی واقعی منشاء کے خلاف مغربی افکار سے کرتے ہیں اور ایسا کرنے میں وہ مغربی سازش کا شکار یا اس کا آلۂ کار ہیں۔ لیکن ذیل کا مضمون جو ان متجددین کی موجودہ نسل میں سے اکثر کے علمی مرشد اور استاذ مسٹر ہٹی کی تصنیف ہے، صاف طور پر اسی کی شہادت دے رہا ہے۔ اور اسی نقطۂ نظر سے اس کا ترجمہ یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

"مرتب"

"انیسویں صدی عیسوی کی صبح طلوع ہوئی تو اس وقت مسلم مشرقی ممالک میں ابھی قرون وسطیٰ کا.... اندھیرا چھایا ہوا تھا" ایک مستشرق لکھتے ہیں "مگر صدی کے خاتمہ نے دیکھا کہ وہ دورِ جدید کی روشن راہ پر اپنا سفر شروع کر چکے ہیں۔ یہ سفر بیسویں صدی میں مزید تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔ اس زبردست تبدیلی کا سبب مغرب کے ساتھ اسلام کا تصادم ہے۔ وہ مغرب جو پوری انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ نمایاں واحد واقعہ ہے۔ معاشیات، سماجیات، سیاسیات، تعلیم، سائنس، فلسفہ، روحانیات اور مذہب سے متعلق نئے تصورات اور یورپ اور امریکہ کی ٹکنالوجی کے پھیلاؤ

...میں ردعمل کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اب تک جاری ہے۔ اس سے اسلام کو اپنے تحفظ میں جو ... صلیبیوں کا تجربہ ہوا اس کی مثال ہزار برس پہلے یونانی رومی کلچر سے مقابلہ پیش آنے کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔

جدید مغرب کے مشرقی ساحل پر جو تصادم ہوا وہ اصلی طوفان کی محض ایک ہلکی سی لہر تھی جس نے پورے کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے نتیجہ میں مسلم مشرقی دنیا میں جو جدت پسندی پیدا ہوئی وہ اسی عمل کا صرف ایک حصہ تھی جس نے پورے مشرق کو جدت پسند بنا دیا۔ جدت پسندی (Modernisation) ان معنوں میں کہ ان تصورات اور ان طریقوں کو اختیار کیا جائے جو عصر حاضر کے نزدیک قابل قبول ہوں۔ یہ دراصل مغرب پسندی۔ Westernisation کے ہم معنی تھی۔

اس کا سب سے زیادہ بڑھا ہوا اظہار عثمانی ترکوں میں ہوا جنھوں نے مصطفیٰ کمال کی قیادت میں ماضی سے حتی الامکان پوری طرح کٹ کر مغربی اقدار اور طور طریقوں کو لینے کی کوشش کی اور لباس سے رسم الخط تک سب کچھ بدل ڈالا۔ اس کے بعد ترکی لیڈر کے نقش قدم پر دوسرے چلنے والے ایران کے رضا شاہ پہلوی تھے، جن کی کوششیں زیادہ کامیاب نہیں ہوئیں۔ عرب جو اسلام کا مقدس وطن ہے، وہ اپنے قدیم طریقہ پر قائم رہنے پر مصر رہا اور خارجی اثرات کے مقابلہ میں تنہا جزیرہ بنا رہا۔ عرب کے دوسرے سرحدی ممالک اور مصر نے درمیانی راستہ اختیار کیا جو درحقیقت سخت دشوار تھا۔ اور وہ یہ کہ جدید تصورات کا اسلام سے تقابل کیا جائے، اور پھر دیکھا جائے کہ نئے ذخیرہ میں سے کیا کچھ لینے کے قابل ہے اور کن معاملات میں قدیم ہی کی پیروی کرنی ہے اور ان دونوں کو کیسے ملایا جا سکتا ہے۔ عرب سرزمین میں لبنان نے سب سے زیادہ آمادگی قلب کے ساتھ اس کو قبول کر لیا۔ اس نے مغربی راستوں سے بہہ کر آنے والے ثمرات پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے فرزندوں کو خاص طور پر امریکا بھیجنا شروع کیا۔ جس کے بعد مطبوعات، مراسلات اور آمد و رفت کے ذریعہ جدت پسندی کی لہر لبنان میں بہت تیز ہو گئی۔ مزید یہ کہ عربی پریس کا گہوارہ اور اعلیٰ درجہ کی مغربی یونیورسٹیوں کا مقام ہونے کی وجہ سے لبنان آس پاس کے علاقوں کے لیے ذہنی رہنمائی کا مرکز بن گیا۔ اس کے باشندوں

نے محض مال تجارت کے ایجنٹ ہی کا کام نہیں کیا بلکہ مشرق اور مغرب کے درمیان نظریات کے درآمد برآمد کی خدمت بھی انجام دی۔

عرب، جہاں ماضی کا بنجہ سب سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ ترقیات کو روکے ہوئے تھا وہاں ابتداءً اقتصادیات کی راہ سے جدت پسندی داخل ہونا شروع ہوئی۔ یہ اقتصادی عامل خاص طور پر تیل کی دریافت اور اس کا استعمال تھا، جو ۱۹۳۰ء میں امریکہ اور برطانیہ کے ذریعہ وقوع میں آیا، جہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہ تھا، وہاں جدید ترین آرائش کی تمام چیزیں پہنچنے لگیں، پختہ سڑکیں، ریلوے، بندرگاہ اور ہوائی اڈے بننا شروع ہوئے۔ مقامی باشندوں کو تربیت دے کر انھیں جدید اسامیوں پر رکھا گیا۔ بحرین کویت اور قطر کے شیوخ نے راتوں رات اونٹوں کی سواری چھوڑ کر کیڈلک کاروں کی سواری اختیار کرلی اور خیموں کے بجائے ایرکنڈیشنڈ محلوں میں رہنے لگے۔ سعودی شہزادے ذاتی ہوائی جہازوں کے ذریعہ یورپ اور امریکہ کے شہروں کی سیاحت کرنے لگے۔ ان کے پاس اتنا سرمایہ ہوگیا جو اُن کے امکانی خرچ سے بھی زیادہ تھا۔ عرب سوسائٹی کی یہ تبدیلیاں ایسی تھیں جہاں الف لیلیٰ کے داستان گویوں کی خیالی پرواز بھی نہیں جاسکتی اور نہ سماجیات کا کوئی عالم اس کے تاریخ کے بارے میں پیشین گوئی کرسکتا تھا۔ مشرق قریب میں پٹرول کے جو ذخائر ہیں ان کے متعلق ماہرین کا عام اندازہ ۱۸۵ بلین بیرل ہے جو موجودہ پیداوار کے لحاظ سے اتنا ہے کہ ایک سو برس تک اس کی سپلائی جاری رہ سکتی ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ء تک تین سو بلین بیرل تیل نکالا جاچکا ہوگا جو موجودہ نرخ اور موجودہ معاہدوں کے مطابق اس علاقے کو رائلٹی ٹیکس اور منافع حصص کی صورت میں دو سو بلین ڈالر دے گا۔

اسلامی کلچر میں تخریب

جدید اثرات سے جو چیز سب سے پہلے متاثر ہوئی وہ اسلامی کلچر ہے۔ مغربی کلچر کے جو اجزا بظاہر موافق اور مفید معلوم ہوئے، پہلے ان کو اختیار کیا گیا ہے یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز آتی ہے تو اس کے ساتھ دوسری چیزیں بھی آنا شروع ہوجاتی ہیں۔ بے ضرر چیزوں سے آغاز ہوکر نوبت ان چیزوں تک پہنچتی ہے جو پہلے مضر سمجھی گئی تھیں۔ اس طرح اقتصادی اور ٹیکنکل تبدیلیاں

بالآخر سماجی تبدیلیوں تک جا پہونچتی ہیں۔ سماجی اقتصادی تبدیلیاں سیاسی تبدیلیوں تک ممتد ہوتی ہیں۔ ان کا مجموعی اثر ذہن کو بدلنے لگتا ہے یہاں تک کہ روحانی اور مذہبی چیزیں بھی بدل جاتی ہیں۔

کلچر میں تبدیلی عموماً معاشی اسباب سے پیدا ہوتی ہے۔ قدیم روایتی زراعت کے طریقوں کے بجائے جدید ترقی یافتہ ٹریکٹر کا استعمال، زمین کو زرخیز بنانے کے لیے جدید کیمیاوی کھاد اور جراثیم کو مارنے کے لیے جدید دوائیں کوئی سنگین جذباتی کشمکش پیدا نہیں کرتیں۔ یہ اگرچہ صدیوں کی پڑی ہوئی عادتوں کو بازعلوم ہوتی ہیں مگر ان کا معاملہ نسبتاً آسان ہے۔ انیسویں صدی کے عرب کسان جن کی کھیتی اب تک محض گزر بسر کا ذریعہ تھی، اب رفتہ رفتہ اپنی خاندانی ضرورت سے زیادہ پیدا کرنے لگے اور پبلک مارکٹ میں سپلائی کرنے کے قابل ہو گئے، اسی طرح ملکی صنعت میں قدیم اوزاروں کا استعمال اپنے اندر کوئی جذباتی پہلو نہیں رکھتا۔ ریلوے، تار، ٹیلی فون، جب رائج ہوئے تو وہ اونٹ اور خچر اور ہرکارہ کے ذریعہ رسل ورسائل کے مقابلہ میں عام طور پر پسند کیے گئے۔ ان اقتصادی تبدیلیوں نے تاجروں کو یہ موقع دیا کہ قریبی سطح سے گزر کر شہری یا ملکی پیمانے کی سطح پر تعلقات قائم کریں۔ دیہاتوں سے شہروں کی طرف آبادیوں کا ناگزیر انتقال شروع ہوا اور جاری رہا۔

زیادہ تکلیف دہ چیز سماجی ڈھانچہ کی تبدیلی تھی۔ یہاں زیادہ گہری وفاداریاں اور پر فخر روایتی قدریں موجود تھیں۔ تاہم مشترک خاندان جو بائیل کے زمانے سے رائج تھا اور جس میں باپ خاندان کا بزرگ شمار ہوتا تھا، وہ شہر میں منتقل ہونے والوں کے درمیان آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے خاندانوں کی شکل اختیار کرنے لگا اور اس طرح مغربی طرز کے آزاد خاندان وجود میں آنے لگے۔ یہ تمام تبدیلیاں ذہنی تطبیق INTELLECTUAL ADJUSTMENT کے طریقوں کی متقاضی تھیں۔ تعلیمی ادارے اب قانون داں، طبیعیات داں، معلم اور دوسر پیشہ ور اور ذہنی لیڈروں کی ایک نئی قسم پیدا کرنے لگے۔ جو مسلم سوسائٹی کے دو طبقات کا مجموعہ تھے۔ یہ ابھرنے والا درمیانی طبقہ سماج، مالیات اور سیاست پر قابض ہونے لگا۔

مغرب کے عطیات میں سب سے اہم چیز جدید طرز کی تعلیم تھی۔ تعلیم کا تعلق ذہن

سے ہے اور ذہن ہی سے تمام تبدیلیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ جب انیسویں صدی کے بعد بیسویں صدی آئی اس وقت مسلم تعلیمی ادارے ابھی قدیم روایتی انداز کے تھے جو کہ جامد تمدن کے آئینہ دار تھے۔ علم کا حصول محض معلومات کا ڈھیر جمع کرنے پر تمام ہو جاتا تھا۔ اس کی تحقیق نہیں ہوتی تھی کہ چیز حقیقت ہے۔ گویا کہ کائنات محض ایک جامد چیز تھی۔ طالبان علم کا کام ہر جگہ معلمین اور کتب نصاب سے ملنے والی چیز کو لے لینا تھا اور بس۔ علم کی تلاش معلم اور متعلم کی کوئی مشترکہ جد و جہد نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یادداشت پر انحصار تھا۔ تحقیق، تجربہ اور تنقید کے الفاظ لغت سے خارج تھے حافظہ کی طاقت بہت ترقی پر تھی۔ مگر تحقیق کا تصور ناپید تھا۔

اٹھارویں صدی میں بھی چودھویں صدی کی طرح ذہنی سرگرمیاں کلاسیکل ادب، زبان اور دینیات پر مرکوز تھیں اور ان میں جدت کا کوئی عنصر نہ تھا۔ ادبی معیار پچھلی صدیوں سے زیادہ گرا ہوا تھا۔ نظم و نثر میں مضمون سے زیادہ طرز ادا پر زور دیا جاتا تھا۔ سائنس، مذہبی روایات، علم نجوم اور کیمیا، جادو اور قدیم یونانی سائنس کا ایک عجیب و غریب مجموعہ تھی۔

انیسویں صدی میں تصویر بدل گئی۔ ۱۸۲۸ء یا اس کے لگ بھگ محمد علی (شاہ مصر) نے ایک فرانسیسی ڈاکٹر کو بلایا کہ وہ قاہرہ کے باہر ایک طبی اسکول کی نظامت سنبھالے جو اب قصر العینی کے نام سے مشہور رہے، اور جو اس علاقہ میں اپنی نوعیت کا پہلا اسکول تھا۔ یہ اب بھی اپنے اسپتال کے ساتھ اس علاقہ کا سب سے بڑا طبی ادارہ ہے۔ محمد علی نے ایک مصری کو بھی پہلی بار فرانس بھیجا جس کا نام رفاعہ الطحطاوی تھا جو ۱۸۳۱ء میں قاہرہ واپس آیا اور طب اور انجینئرنگ کی درسی کتابوں کے ترجمہ کا کام سنبھالا۔

یہاں جدید تعلیم ابتداءً فرانس، برطانیہ اور امریکہ کی کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مشنریوں کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھی۔ کیتھولک نے اس کام کو سب سے پہلے شروع کیا۔ مگر بہت نچلے تعلیمی معیار سے اور ان کا حلقہ بھی بنیادی طور پر عیسائی اقلیت کا گروہ تھا۔ پروٹسٹنٹ نے اس راہ کو ان کے بعد اختیار کیا، مگر انھوں نے بہت جلد اپنی تعلیم کو سیکولر شکل دیدی اور اس طرح زیادہ سے زیادہ مسلم طلباء ان کی طرف کھنچنے لگے۔ مغرب میں تعلیم پائے ہوئے عیسائی تمام سماج کو ایک نئی نسل میں تبدیل کرنے لگے۔ نیز انھوں نے مقامی تعلیمی اداروں کو بھی متاثر کیا کہ وہ مغربی

کا امتیاز حاصل ہے۔

علاقے کے امریکی اداروں کی رہنمائی رابرٹ کالج قسطنطنیہ (۱۸۶۳ء) اور شامی پروٹسٹنٹ کالج بیروت (۱۸۶۶ء) کرتا تھا۔ دونوں مسیحی مشنریوں کے ادارے تھے۔ رابرٹ کالج نے انجینئرنگ میں نمایاں امتیاز پیدا کیا۔ شامی پروٹسٹنٹ کالج نے امریکن یونیورسٹی بیروت میں تبدیل ہو کر نرسنگ، میڈیکل، انجینئرنگ اور زراعت کے اسکول کھولے۔ یہ امریکہ کے باہر اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ کا سب سے بڑا اور مؤثر ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ علاقے کے اکثر فکری اور علمی رہنما اسی کے تعلیمیافتہ گریجویٹ ہیں۔ بعد کے تعلیمی اداروں میں قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی کو شمار کیا جا سکتا ہے جو کہ ۱۹۲۱ء تک مشرقیات کے مطالعہ کا نمایاں ترین ادارہ رہا ہے۔

اسلام بحیثیت ریاست

اب سیاسی نظام کی اوور ہالنگ کا راستہ صاف تھا۔ وقت کی تمام نام نہاد مسلم ریاستوں (سعودی عرب، یمن اور افغانستان کو چھوڑ کر) نے حکمرانی کے جدید طریقوں کو اپنا لیا۔ کیبنٹ، پارلیمنٹ اور دستور ان کے یہاں نظر آنے لگے۔ مزید انھوں نے دیوانی، مالی اور فوجداری قوانین مغربی کوڈ کے مطابق بنائے۔ ان میں سے بعض اب بھی اپنے دستور میں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ "ان کی ریاست ایک اسلامی ریاست ہے" جیسے پاکستان۔ یا بعض کا دعویٰ ہے کہ اسلام ان کی انتظامیہ کا بنیادی مذہب ہے۔ مگر یہ محض ایک زبانی بات (LIP SERVICE) ہے۔ کیونکہ ایک حقیقی اسلامی ریاست میں شریعت کی بالاتری ناقابل چیلنج ہوتی ہے۔

مغرب سے جو خطرناک قوتیں آئیں ان میں نیشنلزم، جس کے ساتھ حکومت خود اختیاری کا تصور لازمی طور پر شامل تھا، بلا شبہ سب سے زیادہ ہیجان خیز تھا۔ نیشنلزم اپنے جدید لباس میں گویا انسان کے "ارتداد" کا اجتماعی سطح پر ظہور ہے۔ نیشنلزم اس مفہوم میں کہ ایک خطہ زمین کے ساتھ ایسی وفاداری جو تمام دوسری وفاداریوں حتیٰ کہ مذہب سے بھی بالاتر ہو، یہ اسلام کے لیے نہ صرف نئی بلکہ اس کے نظریہ سے ٹکرانے والی تھی۔ ملک کی محبت، جیسا کہ اب تک معلوم تھی، اپنے اندر کوئی سیاسی یا فوجی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ نیشنلزم بعد کو سیکولر تحریک بن گئی جو جغرافیائی دائروں

میں محدود اور معاشی قدروں کی تابع تھی۔ اس کے برعکس اسلام کسی جغرافیائی حد بندی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی قدریں بنیادی طور پر روحانی ہیں، اور وہ صرف اسی کی وفاداری کا قائل ہے۔ ایک عربی مسلمان ساری دنیا کے ہم عقیدہ مسلمان سوسائٹی کا شہری ہے۔ اس کا آئیڈیل اتحاد اسلام (PAN-ISLAM) ہے نہ کہ اتحاد عرب (PAN-ARABISM) الازہر کے شیوخ اور نجف اور کربلا کے مجتہد اب بھی اسلام ہی کی وفاداری کے قائل ہیں۔ یہی حال مسلم عوام کا ہے صرف وہ سیاسی اور فکری رہنما جو مغربی طرز پر تعلیم پائے ہیں، وہی جدید قومیت کی صحیح روح کے حامل ہیں۔ مگر وہ عرب نیشنلزم اور مسلم نیشنلزم کے درمیان گارڈ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

یہ مخصوص طور پر لبنان اور شام کے عیسائی ہیں، جنھوں نے اس مغربی نیشنلزم کو عرب ممالک تک پہونچایا ہے۔ ان کے شاعر اور صحافی جو برطانوی مصر میں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نسبتاً زیادہ آزاد تھے، انھوں نے وہ چنگاری روشن کی جس نے قومیت کی آگ بھڑکائی۔ اس کے نئے تصورات مثلاً حب الوطنی، قوم، مادر وطن، انسانی حقوق وغیرہ کے لیے انھوں نے نئی اصطلاحیں وضع کیں یا قدیم الفاظ میں سے کسی کو رائج کیا۔ عثمانی جوئے سے نجات پانے کے لیے جدوجہد نے جدید نیشنلزم کی پیدائش کے لیے حالات مہیا کیے۔ عرب نیشنلزم کا مقصد بلا امتیاز مذہب، عربی بولنے والے لوگوں کو زبان اور کلچر کی عام سطح پر متحد کرنا تھا جو اپنی قدیم تہذیب کی عظمت اور قدیم تاریخ سے ذہنی غذا حاصل کرتی ہو۔ عرب اتحاد کی یہ کمزور اور ابھرتی ہوئی تحریک مقامی دشواریوں اور علاقائی مسائل سے متصادم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور مصری، لبنانی، شامی یا عراقی قومیت میں بٹ گئی۔ مگر دوبارہ اتحاد کا جذبہ جنگ عظیم ثانی اور اسرائیل بننے کے بعد ابھر آیا۔ اس طرح ابتدائی عرب نیشنلزم جو عثمانی سلطنت کے خلاف جدوجہد سے پروان چڑھی تھی، بالآخر برطانوی اور فرانسیسی تسلط کے خلاف صف آرا ہو گئی۔ اس کے بعد اس کو پنپنے اور برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کا وہ میدان ملا جس کو فلسطین میں صیہونی جارحیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسلام بحیثیت مذہب

اسلام کے مذہبی حصے کی بازیابی سب سے بعد میں آئی۔ منفیہ بالاتمہید بلیاں بلاشبہ

اسلام کے طریق زندگی سے انحراف کے بغیر نہیں آسکتی تھیں۔ مگر یہ تبدیلیاں بنیادی طور پر مذہب کی بیرونی سطح سے متعلق تھیں۔ اسلام کا مغز — دینیات اور قانون شریعت — اس کے بعد بھی کچھ دنوں تک محفوظ رہا۔

ان دونوں میں شریعت سب سے پہلے زد میں آئی۔ شریعت کو قرآن میں خدا کا کلام قرار دیا گیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں نظم حکومت کی واحد بنیاد تھی اور عرب میں ہی مختلف فرقوں کے درمیان وجہ اتحاد رہی ہے۔ اس لیے شریعت پر براہ راست حملہ مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ اس پر اطراف سے حملے شروع ہوئے۔ نئی تعبیر کرنے والے اور اصلاح کے علمبردار اور بالآخر متجددین (MODERNIZERS) نے بہت ہوشیاری کے ساتھ اس کے اجزاء پر ادھر اُدھر سے اعتراضات کرنا شروع کیے۔ وہ حدیثیں جو موضوع ہونے کے باوجود مجموعۂ احادیث میں شامل ہوگئی ہیں اور اجماع ان دو چیزوں نے ان کو مقصد برآری کا اچھا موقع دیدیا۔ اور کسی مرکزی اور متفقہ مستند ترجمان نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اعتراضات کا مؤثر توڑ بھی نہ کیا جاسکا۔ ان مسلم ماڈرنسٹوں کا طریقہ وہی تھا جو پیش رو عیسائیوں کا طریقہ تھا — قدیم متن میں نئے خیالات کو پڑھنا، عبارتوں کو ان کے سیاق وسباق سے الگ کرکے ان کا مفہوم بیان کرنا۔ یہ مصلحین ایران کے جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ — ۱۸۹۶ء) اور مصر کے محمد عبدہ (۱۸۴۹ — ۱۹۰۵ء) کی قیادت میں کام کر رہے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ بات کو اس مقدمہ سے شروع کرکے جدید سائنس اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں۔ اسلامی تعلیمات کی عقلی توجیہات کی جائیں۔ مگر ان کے پرجوش مقلدین مضحکہ خیز انتہا تک پہنچ گئے۔ مثلاً تعدد ازدواج کے متعلق قرآنی حکم (۴: ۳) کے متعلق ان کا استدلال تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ "لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی نکاح کرو۔" اب چونکہ کوئی شخص زیادہ بیویوں سے یکساں برتاؤ نہیں کرسکتا، اس لیے قرآن کے حکم کے مطابق صحیح شادی صرف ایک ہی ہوسکتی ہے۔ سود کے خلاف حکم (۴: ۱۵۷-۱۵) جو کہ سرمایہ کاری بینکنگ کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے، اس کی تشریح یہ کی گئی کہ وہ صرف بڑھے ہوئے سود کے بارے میں ہے۔ خدا کا فرشتوں سے یہ کہنا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" (۲: ۲۸) نظریہ ارتقاء کی تصدیق کرنے والا بن گیا۔ قرآن کے "جن" وہی چیز ہیں جن کو

آج ہم خوردبینی جرثومہ (MICROBES) کہتے ہیں "حجارۃ من سجیل"، جن کو جرثوموں کے غول (۵-۱۰۵-۳) نے مکہ کے باہر حبشہ کی فوج پر برسایا وہ چیچک کی دبا کا پھوٹ پڑنا تھا۔ یہی طریقہ اس سے پہلے مسیحی شارحین نے اختیار کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کتاب مقدس کا یہ بیان (۳۷-۳۶-۱۵) کہ آشوری فوج جس نے یہود پر حملہ کیا تھا، اس کو خدا کے فرشتے نے برباد کر دیا، وہ دراصل طاعون کی دبا تھی۔ متحدہ عرب جمہوریہ (U.A.R) کے وکیل جو کہ سوشلسٹ قانون سازی کے مدعی ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ اس قسم کی قانون سازی قرآنی تعلیمات کے مطابق ہے۔ وہ اور ان کے سعودی اور یمنی مخالفین دونوں کو یکساں طور پر اپنے اپنے دعوے کے لیے قرآن سے دلائل مل گئے۔

ماڈرنزم اور سیکولرزم کی اس مسلسل بوچھار کے بعد شریعت نے ذاتی زندگی PERSONAL STATUS) کے محدود دائرہ میں اپنی آخری جائے پناہ بنائی۔ یعنی شادی، طلاق، وراثت اور ان سے متعلق مسائل جو کہ مذہبی عدالتوں میں فقہا کے ذریعہ فیصل ہوتے تھے۔ ترکی پہلا ملک تھا جس نے اس طرح کی مذہبی عدالتوں کو ختم کیا۔ مذہبی عدالتوں کے خاتمہ کے ساتھ تعدد ازدواج کا خاتمہ ہو گیا۔ تیونس کی نئی سلطنت نے حبیب بورقیبہ کی قیادت میں ۱۹۵۶ء میں اس کی پیروی کی مگر رمضان میں مہینہ بھر کے روزہ کو ختم کرنے کے سلسلہ میں اس کی کوشش ناکام ہو گئی۔ مصر نے ۱۹۵۹ء میں ایک کمتر درجہ کا انقلابی قدم اٹھایا جب کہ اس نے مذہبی عدالتوں کو ختم کر دیا۔ اور یہ حکم دیا کہ تمام مقدمات عام ملکی عدالتوں میں سول ججوں کے سامنے پیش ہوں گے۔ البتہ ذاتی نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ مذہبی قانون کے مطابق کیا جائے گا۔

نامذہبیت (SECULARIZATION)

فکری سطح پر ماڈرنزیشن آدمی کو سیکولرزم تک پہونچاتا ہے۔ سیکولرزم صرف چرچ اور ریاست کی علیحدگی سے کچھ زیادہ معنی رکھتا ہے۔ تاریخی سرگزشتوں اور حال کے واقعات کی تعبیر میں جو مقام خدا کا رہا ہے، وہاں وہ انسان کو لاکر بٹھا دیتا ہے اور ایسی عقلی تعبیر کرتا ہے جس کی بنیاد طبیعاتی اور نفسیاتی قوتوں پر ہوتی ہے۔ کسی عربی اخبار کی تازہ اشاعت مشکل سے خدا کے نام

کی حکایت نامی سے خالی ہے۔ بجز اس ذکر کا تعلق پیدائش اور موت، بیماری اور صحت، خوش قسمتی اور بدقسمتی، ناکامی اور کامیابی وغیرہ چیزوں سے ہوتا ہے یہ گویا گزرے ہوئے فکر کے باقیات ہیں۔ ماڈرنزم کے ذریعہ تباہ شدہ اسلام میں سے اب صرف اس کے بنیادی عقائد (BASIC DOGMAS) باقی رہ گئے ہیں۔ خدا ایک ہے، محمدؐ خدا کے رسول ہیں، قرآن خدا کی کتاب ہے، بعض اعمال گناہ ہوتے ہیں۔ انسان کے اندر ایک دائمی روح ہے۔ ایک انصاف کا دن ہے جبکہ اچھے کو اچھا اور برے کو برا بدلہ ملے گا۔ یہ ہے تجدد پسندوں کا اسلام، اور ایک ماڈرن گریجویٹ کو یہ تمام عقائد چند تحفظات کے ساتھ قابل قبول ہوں گے۔

(الجمعیۃ دہلی بحوالہ اسلام اینڈ دی ویسٹ)



ہندستان میں علم حدیث

(۸)

(از مولانا تقی الدین ندوی مظاہری۔ مقیم حال مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور)

اب تک ہم نے اس ملک میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے آٹھویں صدی ہجری تک ناموَر محدثین کے حالات بیان کیے ہیں۔ نویں صدی کے محدثین کے حالات کا سرمایہ ہم کو جو ملا ہے وہ تمامتر "نزہۃ الخواطر" پر انحصار کرنا پڑا، دوسری جگہ سے ان کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے، اس لیے اسی سے اخذ کر کے پیش کر رہا ہوں۔

شیخ محمد بن یوسف حسینی دہلوی مشہور بہ گیسو درازؒ | آپ کا سلسلہ نسب یحییٰ بن حسین بن زیدؒ تک پہونچتا ہے رجب ۷۲۱ھ میں دار السلطنت دہلی میں ان کی ولادت ہوئی۔ اور چار سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ دولت آباد گئے۔ یہاں اپنے والد و دادا صاحب سے ایک مدت تک تحصیل علم میں مشغول رہے ۱۶ سال کی عمر میں ۷۳۶ھ میں دہلی واپس آئے۔ اس سے چار سال پیشتر ان کے والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا، دلی میں شیخ نصیر الدین محمود دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور شیخ کے حکم سے تعلیم کی تکمیل کی۔ اور علم و عمل کے جامع بن گئے۔ ان کے اخلاق حمیدہ کی وجہ سے لوگوں کے قلوب میں ان سے ایک خاص محبت پیدا ہو گئی۔ بالآخر شیخ محمود سے ان کو وہ قرب و اختصاص پیدا ہوا کہ شیخ نے انھیں خلافت عامہ سے نوازا۔ اس کے بعد یہ درایت و روایت، اور اصلاح و تربیت کا مرجع بن گئے اور اپنے شیخ کے ۷۵۷ھ میں انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ ۸۰۱ھ میں گجرات میں وارد ہوئے۔ اور یہاں سے دولت آباد تشریف لے گئے۔ ۸۱۵ھ میں فیروز شاہ بہمنی نے ان کو گلبرگہ

بلائے۔ وہاں انھوں نے درس و افادہ کا سلسلہ قائم فرمایا۔ بڑے عالم و محدث تھے۔ حقائق و معارف کا ان سے فیضان ہوتا تھا۔ مختلف علوم میں دستگاہ تھی۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد ۱۲۵ ہے۔ ان میں ایک اربعین حدیث بھی تھی۔ اس مجموعہ میں انھوں نے ہر حدیث کے بعد صحابہؓ و تابعین کے آثار، اور سلف صالحین کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔

ان کی وفات ۱۶ ذی القعدہ ۸۲۵ھ میں ہوئی۔ گلبرگہ میں ان کی قبر مشہور ہے، اور زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔

احمد شاہ گجراتی۔ دولتِ گجرات کا بانی مظفر خان جو مظفر شاہ کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا پوتا احمد شاہ اول ۸۱۳ھ میں اس کا جانشین ہوا۔ یہ وہ خوش نصیب بادشاہ ہے جس نے احمد آباد جیسا بارونق شہر آباد کیا، اور اس کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ یہ بڑا علم دوست بادشاہ تھا، اس کے دور میں دو مشہور محدثین کا تذکرہ ملتا ہے جو ہندوستان میں وارد ہوئے، ان میں ایک مولانا نورالدین شیرازی، اور دوسرے شیخ محمد بن ابی بکر دمامینی ہیں۔

مولانا نورالدین شیرازی۔ آپ کی ہندوستان (گجرات) میں آمد غالباً اس زمانے میں ہوئی جب احمد شاہ اول تخت نشین ہوا تھا، اور یہاں کی نئی حکومت قائم ہوئی تھی۔ مولانا نورالدین شیرازی میر سید شریف جرجانی کے شاگرد تھے۔ صحیح بخاری کی سند ان کی اتنی عالی تھی کہ وہ جب حجاز مقدس، اور یمن پہونچے تو بڑے بڑے محدثین نے ان کو ذوق و شوق اور فخر کے ساتھ حاصل کیا۔[1]

شیخ محمد بن ابی بکر دمامینی۔ شیخ امام علامہ بدرالدین محمد بن ابی بکر اسکندرانی ہندی گجراتی۔ یہ ابن الدمامینی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت اسکندریہ میں ۷۶۳ھ میں ہوئی، اور وہاں بہاء الدین دمامینی اور شیخ عبدالوہاب سے علم حدیث کا سماع کیا۔ اس کے بعد قاہرہ میں سراج ابن الملقن وغیرہ سے اور مکہ مکرمہ میں قاضی ابوالفضل نویری سے تحصیل علم کی نحو و ادب میں بھی انھیں کمال حاصل تھا، اس کے بعد اپنے وطن کے مختلف مدارس میں درس دیا۔ اپنے وطن سے قاہرہ آگئے، یہاں کے اہل علم سے بھی حدیث کا سماع کیا، اور نائب قاضی مقرر کیے گئے اور ساتھ ہی درس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس کے

۱۔ نزہۃ الخواطر ۱۳/۳

بعد پھر اپنے وطن واپس آئے اور دوبارہ پھر قاہرہ آئے اور یہاں سے دمشق گئے۔ یہاں سے حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، واپسی پر اپنے وطن آکر، پھر قاہرہ آگئے، اور یہاں فقہ مالکی کے قاضی مقرر کیے گئے اس کے بعد دوبارہ حجاز مقدس کا سفر کیا، اور وہاں مناسک حج ادا کیے، پھر یمن چلے گئے اور یمن میں جامع زبید میں درس کا سلسلہ شروع کیا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد ہندوستان کا رخ کیا۔ اور اواخر شعبان ۸۲۰ھ میں گجرات کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا۔ یہ احمد شاہ اول کا زمانہ تھا، بادشاہ نے قدردانی کی، اور لوگوں نے غایت اکرام و تعظیم کا معاملہ رکھا۔ انھوں نے بادشاہ کے لیے کئی کتابیں لکھیں، انمیں ایک صحیح بخاری کی شرح لکھی ہے جس کا نام انھوں نے مصابیح الجامع رکھا جو جامع صحیح کے ابواب اور بعض مقامات کی تعلیقات پر مشتمل تھی۔ جس میں الفاظ غریبہ اور اعراب کی تشریحات و تنبیہات تھیں، حافظ سخاوی نے "الضوء اللامع" میں ابن الدمامینی کا تذکرہ لکھا ہے، اور ان کی شرح بخاری کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی زیارت کی ہے۔ اکثر اس میں اعراب وغیرہ کی تشریح ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے بستان المحدثین میں ان کی شرح کا ذکر کیا ہے، اور اس کا نام "تعلیق المصابیح علی ابواب الجامع الصحیح" تحریر فرمایا ہے، ابن الدمامینی ۸۲۰ھ میں احمد آباد میں وارد ہوئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸۲۰ھ تا ۸۲۷ھ کے درمیان یہ شرح آپ نے تصنیف فرمائی۔

آپ کا وصال ۸۲۷ھ میں دکن کے مشہور شہر گلبرگہ میں ہوا۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔

شیخ احمد بن عبد اللہ شیرازی | آپ نے سید شریف زین الدین علی جرجانی اور دیگر علماء سے تحصیل علم کی پھر شیخ شمس الدین جزری کی صحبت کو لازم پکڑ لیا، ان سے اور شیخ مجد الدین فیروز آبادی صاحب "القاموس" سے علم کیا، صحیح بخاری کا سماع شیخ معمر بابا یوسف ہروی سے کیا تھا، مشہور ہے کہ شیخ یوسف ہروی نے تین سو سال کی عمر پائی تھی۔ اس طرح شیخ یوسف کا سلسلہ سند بدو واسطہ امام بخاری سے مل جاتا ہے۔

اسی طرح مشکوٰۃ شریف کا سماع شیخ شمس الدین جزری سے حاصل کیا تھا۔ اور بیک واسطہ خطیب تبریزی صاحب مشکوٰۃ سے روایت کرتے ہیں۔

ان سے علم حدیث کو بھی ایک بڑی جماعت نے روایت کیا ہے، ان کے تلامذہ میں علامہ تاج الدین بن عبد الرحمن مرشدی گازرونی، علامہ علاء الدین ابو العباس احمد نہروانی، ہبۃ اللہ حسینی شیرازی مشہور ہیں۔

انھیں سلاسل تصوف کے کئی طریقوں میں خلافت حاصل تھی، ہندوستان کے مشائخ میں ان کے خلفاء کی بڑی تعداد ہے۔

مولانا جمال الدین کشمیری | آپ فقہ، حدیث، اصول و عربیت کے ممتاز علماء میں تھے۔ شیخ علی بن شہاب ہمدانی سے استفادہ کے لیے کشمیر میں حاضر ہوئے۔ اور انھیں کے حکم سے سلطان قطب الدین شاہ مرزا کشمیری کی تعلیم کے لیے کشمیر میں قیام فرمایا اور درس و افادہ میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ ان کی قبر کشمیر میں دریائے بہٹ کے کنارے مشہور ہے۔ اور زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔

شیخ حسین بن معز بلخی | آپ سلسلہ فردوسیہ کے بڑے مشائخ میں ہیں۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی آغوش تربیت میں پرورش پائی تھی، اور انھیں سے بیعت ہوئے، ان کے بعد اپنے چچا شیخ مظفر بلخی سے کسب فیض کیا۔ اور انھیں کے ہمراہ حرمین شریفین کا سفر کیا، حج و زیارت سے فراغت کے بعد مکہ مکرمہ میں چار سال قیام فرمایا۔ اور اس مدت قیام میں مختلف علوم کی تحصیل کی، بالخصوص صحیحین کو اپنے چچا سے بحث و تحقیق سے پڑھا۔ اس کے بعد انھیں کے ہمراہ عدن آئے۔ اور یہاں خطیب عدنی سے حدیث حاصل کی۔ اور عدن ہی میں چچا نے انھیں خلافت سے سرفراز فرمایا مگر کچھ دنوں کے بعد چچا صاحب کا انتقال ہو گیا، تو یہ ہندوستان واپس آ گئے۔ اور علم حدیث کی نشر و اشاعت میں مشغول ہو گئے اور ایک بڑی جماعت ان سے فیضیاب ہوئی۔ ان کی کئی تصنیفات ہیں۔ ۲۴ ذی الحجہ ۸۴۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

مولانا خواجگی کردی | شیخ کبیر شمس الدین خواجگی بن احمد بن شمس الدین عریضی ملتانی، جو اسماعیل بن جعفر صادق کی اولاد میں تھے، انھوں نے علم و معرفت شیخ علاء الدین جیوری سے حاصل کیا، اور ایک مدت ان کی صحبت میں رہے۔ یہ فقہ و حدیث اور تصوف کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کی تصنیف میں "مرید و مراد" مشہور کتاب ہے۔ انھوں نے اربعین حدیثا (چہل حدیث) کو علامہ صغانی کی مشارق الانوار سے منتخب کر کے جمع کیا تھا۔

شیخ احمد بن محمد حسینی کردی نے اپنی بعض تصنیفات میں لکھا ہے کہ ان کے والد خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے تو انھوں نے آپ کے سامنے اپنے دادا مولانا خواجگی کی اربعین حدیثا پڑھ کر تصحیح کرنی چاہی، آپ نے فرمایا کہ یہ حدیثیں کس کتاب سے لی گئی ہیں تو انھوں

نے کہا کہ صغانی کی "مشارق الانوار" سے آپ نے فرمایا۔ مشارق کی ساری احادیث صحیح ہیں۔ اس بشارت پر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اور پوری مشارق از ابتداء تا انتہاء حفظ کر ڈالی۔ مولانا خواجگی کی وفات ۱۸ محرم ۹۰۸ھ میں ہوئی۔ ان کی قبر دریائے گنگا کے کنارے کڑہ (ضلع الٰہ آباد) میں ہے۔ اور اس پر یہ چند اشعار کندہ ہیں۔

برائے خدا ای عزیزان من ۔۔۔ نو لیسید بر گور من این سخن

کہ چون خواجگی در تہہ خاک شد ۔۔۔ نکو شد رخشنو جہاں پاک شد

خضر بن حسن بلخی | آپ علم حدیث کے ممتاز علماء میں تھے۔ ہندوستان میں جونپور تشریف لائے اس کے بعد لکھنؤ میں مسند درس کو رونق بخشی۔ اور شیخ آباد کے قرب وجوار کے کئی گاؤں ان کو بطور جاگیر دیے گئے۔

شیخ رکن الدین ظفر آبادی | آپ اکابر علماء احناف میں تھے۔ فقہ و اصول فقہ اور حدیث و تفسیر میں بڑے اونچے مقام پر فائز تھے' ان کے حالات میں ہے کہ ایک لاکھ احادیث کو زبانی یاد کر لیا تھا' ہمیشہ روزہ رکھتے۔ اکل حلال کا بڑا اہتمام رکھتے تھے' سلوک انھوں نے شیخ اسد الدین ظفر آبادی سے حاصل کیا تھا۔ اور ان کے ساتھ جہاد میں بھی شرکت کی۔ اور ظفر آباد (متصل جونپور) کو اپنا مسکن بنایا۔ ان کی وفات ۸۲۰ھ میں ہوئی۔ ان کے بعض تلامذہ نے تاریخ وفات رکن دین افتاد سے نکالی ہے۔

مولانا نور الدین ظفر آبادی | شیخ نور الدین بن اسد الدین بن تاج الدین حسینی ظفر آبادی کنیت ابو محمد تھی۔ آپ ۷۴۴ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ اور مولانا قیام الدین ظفر آبادی سے علم حاصل کیا۔ اور ایک ہزار چالیس احادیث کو حفظ کر ڈالا۔ فصوص الحکم اور عوارف المعارف کو اپنے والد بزرگوار سے پڑھا' اور انھیں سے سلوک بھی حاصل کیا۔ اس کے بعد درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ آپ تقلیل منام و طعام و کلام میں متقدمین کے طریقہ پر گامزن تھے کہ ۲ صفر ۸۲۶ھ میں ظفر آباد میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

شیخ غوث الدین گجراتی | شیخ غوث الدین قادری بغدادی ثم گجراتی۔ آپ ممتاز مشائخ کرام میں تھے ہندوستان' سلطان محمود کبیر کے عہد میں احمد آباد تشریف لائے۔ اور وہاں ایک بڑا مدرسہ قائم فرمایا اور اس میں مدتوں تک درس دیا پھر حرمین شریفین تشریف لے گئے اور حج و زیارت سے فارغ

ہو کر ہندوستان پھر واپس تشریف لائے۔ بڑے عالم اور محدث و فقیہ تھے۔ درس افادہ کا سلسلہ مسلسل رکھا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ یعقوب بن خوندمیر گجراتی اور ایک بڑی مخلوق ہے۔ صفر ۸۹۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

قطب الدین بن خضر بلخی | آپ علم حدیث کے ممتاز علماء میں تھے۔ اپنے والد خضر بن حسن بلخی سے تحصیل علم کیا تھا۔ اور ان کے بعد درس افادہ کے منصب صدارت پر فائز ہوئے۔ ان کے تلامذہ میں ان کے صاحبزادے عبدالقادر ہیں۔

شیخ محمد بن حسین فتنی | شیخ عالم، محدث و فقیہ محمد بن حسین علوی حسینی سندی گجراتی، آپ مشہور مشائخ میں ہیں۔ دراصل سندھ کے باشندے تھے۔ وہیں پیدائش ہوئی، اور نشو و نما پائی، اور اپنے والد اور شیخ صدر الدین محمد بن احمد حسینی بخاری سے علم حاصل کیا۔ اور فقہ و حدیث اور تصوف میں انفرادی شان پیدا کی۔ مستقیم الحال صوفی تھے۔ گجرات میں پٹن آکر قیام کیا۔ اور وہیں ۵ جمادی الاخری ۸۴۷ھ کو وفات ہوئی۔ اور مدفون ہوئے جیسا کہ مرآۃ احمدی میں مذکور ہے۔ (باقی)



فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ
واقعات ___ و ___ تأثرات

(مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)
(استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

یوں تو اس دنیا میں ہر آنے والا جانے کے لیے ہی آتا ہے، اور وقت مقررہ پر چل دیتا ہے۔ مگر یہ روایت بھی قائم ہو گئی ہے کہ آمد کے وقت لبوں پر تبسم، چہروں پر خوشی کے آثار، اور رخصت کے وقت چہرے غمگین، آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کے آنے پر خوشیاں منانے والے ہی، جانے پر آنسو بہانے والے ہوتے ہیں، اور کوئی اس طرح آتا ہے کہ آتے وقت خوشی میں سرمست بہت تھوڑے، مگر جاتے وقت رنج وغم، کرب و الم سے بے حال ایک عالم ہوتا ہے ___ اور جانے والے کی ذات، ایک عارف ربانی کی نصیحت:

"آں چناں زی کہ وقت مردن تو
ہمہ گریاں شوند تو خنداں"

کا عملی نمونہ، اور آیت قرآنی "وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ" کا مصداق ہوتی ہے۔

یہ "رتبۂ بلند" ہر ایک کو کہاں ملتا ہے، ہزاروں بلکہ لاکھوں کروڑوں میں کوئی ایسا ہوتا ہے جس کی موت "عالم کی موت"، جس کا رخصت ہونا ہزاروں دلوں کے صبر و سکون رخصت ہو جانے،

جس کا چلا جانا بہت سی مسندوں کے سُونا ہو جانے، جس کا انتقال پوری بساط کے اُلٹ جانے، جس کی جدائی بہت سے "نقوش" کے مٹ جانے اور جس کی وفات بہت سی "جگہوں" میں "خلا" پیدا کر دینے کا باعث ہوتی ہے ــــ ایسی ہی نادرۂ روزگار شخصیتوں میں استاذ محترم فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد (رحمۃ اللہ علیہ) کی ذاتِ گرامی بھی تھی [1]

فما كان فخرٌ هلكه هلك واحدٍ
ولكنه بنيان قوم تهدما
(عبدہ ابن الطیب کی روح سے معذرت کرتے ہوئے)

مولانا سے پہلی واقفیت کا آغاز — مولانا مرحوم کی عظمت و عظمت کے اثرات خادم کی لوحِ قلب پر بچپن ہی سے پڑنا شروع ہو گئے تھے کیونکہ گھر کی فضا کو مولانا کے تذکروں سے معمور اور قبلہ والد صاحب کو موصوف کے محاسن میں رطب اللسان پایا۔ والد صاحب (مولانا قاری حمید الدین سنبھلی) جنھوں نے پہلے اپنے وطن، پھر مدرسہ شاہی مراد آباد، اور آخر میں دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، جہاں دورۂ حدیث حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے ۱۳۴۳ھ میں پڑھا، حضرت مولاناؒ سے شرفِ تلمذ کے ساتھ غایت درجہ عظمت و محبت کا تعلق بھی رکھتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت نے ہمارے مکان کو کئی بار شرفِ قدم بھی بخشا۔ احقر نے سب سے پہلی بار غالباً ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں اپنے پرانے مکان کی نشست گاہ میں ہی دیکھا۔ اس کے علاوہ والد صاحب کے ہمراہ مراد آباد حاضر ہو کر بھی بارہا شرفِ نیاز حاصل کیا۔ والدہ مرحومہ کا وطن مراد آباد ہونے کی وجہ سے اکثر وہاں جانا ہوتا تھا۔

دوسری واقفیت کا موقع — "حضرت مولانا کی عظمت کے یہ ابتدائی" دھندلے اور ناپختہ خاکے ۱۳۷۷ھ کے اوائل میں حضرت ممدوح کو دار العلوم دیوبند جیسے گہوارۂ علوم کی عظیم ترین مسند پر جلوہ افروز دیکھ کر اور اس مسند کا حق ادا کرنے والا پاکر، نمایاں، پختہ تر اور نہ مٹنے والے نقوش بن گئے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ نے اوائلِ ذی قعدہ ۱۳۷۶ھ میں معمول کے مطابق، دورۂ حدیث کی جماعت کو بخاری جلد اول پڑھانا شروع کی، جس کا ایک فرد یہ حقیر راقم سطور بھی تھا، کچھ ہی دنوں بعد جلد ثانی بھی حضرت پڑھانے لگے (جس میں کتاب المغازی کا پڑھانا اور اسکے

[1] مولانا فخر الدین کی وفات کسی ایک شخص کی موت نہیں ہے، بلکہ ایک قوم کی قوم گویا ختم ہوگئی ــــ (مفہوم)

درمیان خاص کیف ومستی کا عالم طاری ہونا، نیز اسمائے بدریین کے بعد دعا کا رقت انگیز منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے معلوم ہوتا ہے)

اُس وقت یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ ایسی ابتدا ہے جس کی انتہا نہ ہوگی۔ اور حضرت مدنیؒ کے خزینۂ علوم سے براہِ راست فیضیاب ہونے والی یہی آخری ــ خوش قسمت یا بد قسمت ــ جماعت ہے، اور اسے بھی پورے سال استفادہ کا موقع نہ مل سکے گا۔ لیکن لیل ونہار کی گردش نے دو مہینے کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ حضرتؒ کی علالت ـــ نہ ختم ہونے والی علالت ــ کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور جوں جوں دن گزرتے گئے مرض شدت اختیار کرتا گیا تا آنکہ اواخر محرم ۱۳۷۷ھ میں اس پیکرِ عزم واستقلال کی ہمت بھی جواب دینے لگی، اس پر بھی طلبہ کا حرج گوارہ نہ تھا لیکن مخلصین کے پیہم اصرار کے بعد پڑھانا بند کیا، البتہ سبق بند ہونے کے حرج کا شدید احساس مقتضی ہوا کہ کسی اہل کو اس مسند پر بٹھایا جائے۔

دارالعلوم دیوبند کے طلبہ واساتذہ حضرت مولانا فخرالدین احمدؒ سے ناآشنا نہ تھے، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس سے قبل حضرت مدنی رحمہ اللہ اپنی اسیری اور الکشنی مصروفیت کے دوران دو مرتبہ حضرت مولاناؒ کو اپنا جانشین بنا چکے تھے، اور مولانا نے اپنی صلاحیتوں کا سکہ جما دیا تھا، طلبہ میں تذکرہ قدرتی طور سے مولانا کا ہونے لگا۔

ان تمام باتوں سے اندازہ ہو چلا تھا کہ اس پُر وقار مسند کی زینت کون بننے والا ہے۔ چنانچہ اندازہ صحیح نکلا اور کچھ ہی عرصہ بعد حضرت مولاناؒ کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا، پھر ایک دن وہ آیا کہ اُس مسندِ علم وتقویٰ کے نشستین وہی تھے......

غالباً ماہ صفر ۱۳۷۷ھ کے اواخر میں باب ماذکر فی ذھاب موسیٰ فی البحر الی الخضر سے بخاری پڑھانا شروع کی۔ مدارس کی دُنیا سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ مدرس کے لیے تدریس کے ابتدائی دن کیسے صبر آزما اور اُس کی قسمت کے لیے کتنے فیصلہ کن ہوتے ہیں، اور پھر مدرسہ بھی وہ کہ جس کی عظمت وشوکت کا ڈنکا اس کے دامن فیض میں تربیت پانے والے ہزارہا علماء وفضلاء چار دانگ عالم میں تقریباً ایک صدی سے بجا رہے تھے، اور جس کے افق سے کیسے کیسے آفتاب علم اور ماہتاب تقویٰ نمودار ہو ہو کر عالم کو منور کر رہے تھے، اور جانشینی بھی کس کی؟ اُس ذات گرامی کی جس کے دریائے

علم و فضل اور بحر تصوّف و "احسان" سے عرب و عجم سب ہی سیراب ہوئے اور ہو رہے تھے۔

ہر چند کہ مولانا کوئی غیر معروف نہیں تھے، لیکن جماعت کے طلبہ تو نئے ہی تھے، براہِ راست تجربہ مولانا کے بارے میں نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ جیسا کہ مدارس کے طلبہ کی عادت ہوتی ہے کہ شروع میں ہر مدرس کی گویا "نبض دیکھتے" اور اُسے اچھی طرح "جھنجھوڑ کر" جانچتے" ہیں ـــ حضرت استاذؒ بھی ان تمام مراحل سے ـ بلکہ کہنا چاہیے کہ مدرسہ کے "خارزار" سے گزرے، مگر اس طرح گزرے کہ دامن سے اُلجھنے والے کو بجز خفت و ندامت کے کچھ ہاتھ نہ آتا۔

مولانا کی علمی عظمت ایک مدرس کی حیثیت سے

اس خاص ذہن کے علاوہ بھی سوالات کرنا طلب علم کی راہ میں ایک ناگزیر ضرورت ہے، چنانچہ اس مقصد سے بھی اکثر اہم اور بعض بہت دقیق سوالات کیے جاتے۔ مولانا ان سب کے بلا تأمل ایسے انداز میں جوابات دیتے کہ "ذہنی گرہ" کھل جاتی۔ ایک دن شرکائے سبق میں سے ایک نے سوال کرتے ہوئے تفسیر کشاف اور بیضاوی میں لفظ "دین" کے ماخذ کی نشاندہی کے طور پر پیش کیا گیا حماسہ کا مشہور شعر ؎

"ولم یبق سوی العدوا　　ن دناھم کما دانوا"

پڑھا۔ بس کیا تھا، دوسرے ہی لمحہ مولانا یوں نغمہ بار ہوئے ؎

صفحنا عن بنی ذھل　　وقلنا القوم اخوان

عسی الایام ان یرجعن　　قوما کالذی کانوا

فلما صرح الشر　　فامسا وھو عریان

ولم یبق سوی العدوا　　ن دناھم کما دانوا

اور اس سلسلہ کے تقریباً تمام ہی اشعار برجستہ سنا ڈالے، ساری جماعت غیر معمولی قوتِ حفظ کا یہ مظاہرہ دیکھ کر ششدر رہ گئی، اس لیے اور بھی تعجب تھا کہ عرصۂ دراز ـــ کم و بیش نصف صدی ـ سے مولاناؒ حدیث ہی پڑھاتے آ رہے ہیں، ادب وغیرہ سے زیادہ اشتغال نہیں رہا۔

علامہ انور شاہؒ کا اعتماد ان کے حافظہ پر

کبھی تحدیثِ نعمت کے طور پر خود فرما دیا کرتے "بھائی! حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی میرے حافظہ پر اعتماد تھا" ـــ شاہ صاحبؒ سے مراد، محدث العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ ہوتے، جن سے حضرت مولانا کو تلمذ بھی حاصل تھا، اور غایت درجہ تعلق رہا تھا۔ شاہ صاحبؒ کا

تذکرہ کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ مولانا کو لذت محسوس ہو رہی ہے، اور زبان چٹخارے لے رہی ہے۔ درس میں بھی ان ہی کا رنگ غالب رہتا، آپ کی تحقیقات کا تقریباً روز ہی ذکر فرماتے، حالانکہ بخاری شریف، مولانا نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے (۱۳۲۷-۲۸ھ میں) پڑھی تھی

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ شاہ صاحبؒ کا حافظہ محیر العقول حد تک قوی تھا۔ بعض اہل علم کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کہا کرتے تھے "حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا حافظہ دیکھ کر ہی سلف کے غیر معمولی حافظہ کے واقعات کی تصدیق ہوئی۔ ورنہ ان کے (محدثین وغیرہ کے) ... بارے میں، منقول حکایات پر یقین آنا مشکل ہوتا۔[ع۵]

مولانا، سبق پڑھاتے ہوئے صحیح بخاری — خصوصاً جلد اول کے — رموز و نکات خاص طور پر تراجم ابواب کی موشگافیاں نہیں واقعی۔ حکمتیں اور مصلحتیں اس طرح بیان فرماتے کہ خیال ہونے لگتا کہ خود مصنف ہی کتاب پڑھا رہا ہے۔ بلکہ کبھی تو ذہن، اس طرح غلط یا صحیح۔ سوچنے لگتا کہ امام بخاریؒ بھی شاید ان سے بہتر نہ پڑھاتے۔ ان کے درس میں صرف بخاری ہی نہیں بلکہ دوسری کتب حدیث، ان کی متداول اور غیر متداول شروح، نیز اکابر دیوبند کی تحقیقات کا عطر کشید کیا ہوا ملتا۔ اس کا اندازہ ان کے درس بخاری کی تقریر — ایضاح البخاری — کے مطبوعہ حصوں سے ہر ایک کر سکتا ہے۔

حدیث پر تصنیفات | علاوہ ازیں صحیح بخاری پر مولانا کی دو مستقل تصنیفیں بھی۔ القول الفصیح اور القول النصیح — عربی زبان میں موجود ہیں حدیث ہی کے موضوع پر النور الفائض اور اربعینؑ بھی مولانا کے رشحات قلم کے مجموعے ہیں، ان سے بھی مولانا کے رسوخ فی العلم اور دقت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

ایک ممتاز وصف | مولانا کی ایک خصوصیت جس میں وہ ہم عصر اکثر علماء سے ممتاز تھے، زبان کی فصاحت و بلاغت اور شیرینی بھی تھی۔ کم سے کم احقر کے لیے اس وقت طبقۂ علماء کے بارے میں یہ پہلا تجربہ تھا۔ جب لب کشا ہوتے تو معلوم ہوتا کہ سچ مچ پھول جھڑ رہے ہیں۔ ان کے نرم و نازک گلابی ہونٹوں سے نکلتے الفاظ بکھرتے موتی نظر آتے، شگفتہ حسین گلگوں چہرہ اور اس پر نورانی سفید ڈاڑھی اس منظر کو

ع۵ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی قدوائی نے (جو) مجلس معین مختلف علوم کے ایک بڑے اسکالر، خصوصاً عربی ادب و تاریخ کے ممتاز فاضل حضرت مولانا علی میاں صاحب کے بھی چچا مولانا سید طلحہ حسنیؒ کا یہ مقولہ نقل کیا۔

اور جب یہ دیتے تو سبحان اللہ! ایک سماں بندھ جاتا، جس میں سامع ہمہ تن مستغرق ہو جاتا، کبھی کسی عربی عبارت کے ترجمہ کی ضرورت پیش آجاتی تو ایسا با محاورہ کرتے کہ لطف آجاتا اور مولٰنا کی عربی، اردو، دونوں زبانوں سے گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا، لگے ہاتھوں ایک مثال بھی سن لیجئے!

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی مشہور روایت جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے:۔

انما انا بشر وانکم تختصمون الیّ ولعل بعضکم ان یکون "الحن"
بحجتہ من بعض فاقضی لہ علی نحو ما اسمع منہ ...... الخ

میں مذکور لفظ "الحن" کا ترجمہ "چرب زبان" کیا تھا۔

کاملین فن سے تلمذ | حضرت مولانا نے جس طرح علوم عالیہ اپنے وقت کے ماہر اور چوٹی کے اساتذہ ــــ حضرت شیخ الہندؒ، علامہ کشمیریؒ وغیرہما ــــ سے حاصل کیے، اسی طرح علوم آلیہ ــــ منطق، فلسفہ وغیرہ بھی اس دور کے ماہر فن، مولٰنا ماجد علیؒ (استاذ العلماء مولٰنا لطف اللہؒ کے ممتاز شاگرد) سے اس طرح حاصل کیے کہ اپنے استاذ کے ساتھ سایہ کی طرح ہر جگہ رہے۔ چنانچہ استاذ کی ہمراہی میں گلاوٹھی، مدرسہ حسین بخش، مدرسہ عربیہ فتحپوری دہلی میں تحصیل علم کی غرض سے برسوں رہے۔ مگر ادھر مدت ہوئی کہ ان فنون سے ربط گویا چھوٹ چکا تھا، اور فن حدیث ہی کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتے ہوئے بزبان حال کہتے ؎

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد ــ حکیم سید عالم صاحبؒ سے حاصل کی۔

بیعت واجازت | ان علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی کا فیضان بھی مولٰنا نے حضرت شیخ الہندؒ سے حاصل کیا اور مولٰنا کے صاحبزادہ مولوی حکیم معین الدین صاحب کی روایت کے مطابق اجازت بیعت بھی مرحمت ہوئی۔ مگر کسی کو بیعت نہیں کیا۔

درس و تدریس کی ابتداء و انتہا | تحصیل علم سے رسمی فراغت (۱۳۳۲ھ) کے بعد بھی مادر علمی (دارالعلوم) نے اس ہونہار فرزند کو اپنے آغوش میں ہی رکھا۔ چنانچہ پورے ایک سال یہاں کی دولت ہیں

شانے میں مشغول رہے۔ پھر جب مربیوں نے تجربہ کر کے دیکھ لیا کہ یہ لائق فرزند میراث نبوی اور وراثت قاسمی تقسیم کرنے کا ہر طرح اہل ہے تب مدرسہ شاہی مراد آباد کے امینوں کو (۱۳۲۹ھ میں) یہ قیمتی امانت سپرد کی، کہ یہ مدرسہ بھی "قاسم العلوم والخیرات" کے چشمۂ فیض سے نکلی ہوئی نہر ہے ــــ اگلے ہی سال (۱۳۳۰ھ میں) اس درسگاہ کے سب سے بڑے منصب ــــ شیخ الحدیثی ــــ پر فائز ہوئے[۵] اور وہاں علوم و معارف کے وہ دریا بہائے کہ یہ معمولی نہر بڑے بڑے دریاؤں کی ہمسری کرنے لگی، اور مکین کے ساتھ مکان کی عظمت کا پھریرا بھی آسمانوں میں اڑنے لگا۔ تقریباً نصف صدی تک یہ علم و فضل کا آفتاب شاہی کے افق پر ہی چمکتا رہا۔ تا آنکہ ۱۳۷۲ھ مطابق (۱۹۵۲ء) آیا اور وہ حالات رونما ہوئے جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، اس وقت گہوارۂ علوم (دارالعلوم) کے اس زمانہ کے سب سے بڑے مربی، حضرت الاستاذ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ امانت شاہی سے واپس لی۔۔۔ اور اس عظیم جگہ رکھی جہاں وہ خود اپنے مربیوں کے حکم سے بیٹھے ہوئے تھے۔

مولانا مدنیؒ سے ربط محبت | جس طرح انتخاب کرنے والے کو اپنے "جانشین" پر اعتماد اور حسن انتخاب پر ناز تھا، اسی طرح یہ بھی اپنے جوہر شناس محسن سے بے انتہا ربط و تعلق رکھتے تھے، ایسا کہ استاذ ان کے علاوہ کسی سے بھی نہ تھا؛ اور آخر میں تو یہ تعلق محبت اور عظمت کی تمام حدیں پار کر گیا تھا۔ تذکرہ کرتے تو لفظ لفظ سے عقیدت و محبت ٹپکتی، بلکہ بارہا یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ادھر زبان پر ان کا ذکر آیا اور ادھر آنکھوں سے سیل رواں جاری ہوا۔

حضرت مدنیؒ کی وفات (جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ دسمبر ۱۹۵۷ء) کے بعد پہلے سبق کا منظر تو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا، معلوم ہوتا تھا کہ نہ دل قابو میں ہے نہ آنکھ، اور زبان بے چاری کو تو یارا ہی کیا تھا کہ وہ حرکت کرتی۔ "گھنٹوں ــ بلا مبالغہ ــ اسی کیفیت میں ڈوبے، روتے، رلاتے، گزار دیے" ــــ اور یہ محبت و عظمت بلا وجہ نہیں تھی۔ ہم عصروں سے تو یوں بھی بمشکل عقیدت ہو پاتی ہے۔

---

۵ یہ اور اس کے علاوہ اکثر سنین مولانا کے صاحبزادے کے مکتوب سے ماخوذ ہیں جو موصوف نے احقر کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمایا۔

بلکہ اس کے بہت سے وجوہ تھے، جن میں سے بعض کا تذکرہ سبق میں بھی فرمایا۔ اسی ذیل میں ایک مرتبہ نجیب آباد میں پیش آنے والے حیرت ناک واقعہ کا ذکر نہایت مؤکد قسم کھا کر فرمایا، جس کا تعلق تصوف و تقرب کے بعض خاص حالات سے تھا۔

اور یہ احترام محض ولایت و کرامت ہی کا رہینِ منت نہیں تھا، بلکہ حضرت مدنیؒ کے علم کی وسعت، نظر کی دقت اور تحقیق کی ندرت کا اعتراف بھی اس کا سبب تھا، اسی بناپر موصوف کے علمی اقوال اور اُن کی تحقیقات کو بہت اہمیت دیتے اور اُن کا وزن محسوس کرتے، حالانکہ اگر معاصرین میں کسی اور کا قول نقل کیا جاتا۔ اور مولانا کو اس سے اتفاق نہ ہوتا۔ تو فرمادیا کرتے۔ "ھم رجال ونحن رجال" (غالباً یہ الفاظ امام ابوحنیفہ نے تابعین کے بارے میں ارشاد فرمائے تھے۔)

ایک مرتبہ احقر نے۔ طالبعلمانہ طور پر۔ دریافت کیا کہ حضرت مدنیؒ کا رمضان المبارک کے مہینہ میں قیام لیل کا جس طرح معمول رہا ہے (یعنی جماعت کبیرہ کے ساتھ نوافل پڑھنا) کیا اس کی نظیر سلف کے یہاں بھی ملتی ہے؟۔

مولانا نے جواب دیا:۔ "نظر سے تو نہیں گزرا"۔ اور پھر معاً یہ بھی فرمایا:۔ حضرت (مدنیؒ) نعم السلف تھے۔ اور اسی قرب و تعلق کا اثر تھا کہ "جنگ آزادی" کے بارے میں اول الذکر کے خیالات کے اندر ثانی الذکر کا طرز فکر پوری طرح جھلکتا تھا۔ اور مولاناؒ کے سینہ میں دبی چنگاری حضرت مدنیؒ نے ایسی فروزاں کی کہ باوجود خالص علمی ذوق کے جہادِ حریت میں عملی حصہ لے کر قید و بند کے مصائب بھی۔ ایسے نازک بدن، حساس طبع اور پھول جیسی لطافتِ مزاج رکھنے والے نے۔ برداشت کیے[۱]۔ اسی رشتہ سے مولانا کا جمعیۃ علمائے ہند سے تعلق تادمِ آخر۔ کسی نہ کسی نوع کا۔ باقی رہا۔ اور آخر میں کم و بیش دس سال تک (مولانا احمد سعید صاحبؒ کی وفات کے بعد) اس کی مسندِ صدارت کی بھی زینت تھے، دس پیرانہ سالی میں "جمعیۃ" جیسی ہندوستان گیر جماعت کی سربراہی کی مشقتیں اپنے محبوب کے صاحبزادہ۔ مولانا سید اسعد میاں صاحب مدنی۔ ہی کی خاطر جھیلتے رہے۔

---

[۱] سنہ ۱۹۳۰ء میں مولانا جیل گئے تھے۔

کریمانہ اخلاق | مولانا اپنی صاف گوئی اور صراحت پسند طبیعت کے باوجود، تمام تعلق والوں، حتّیٰ کہ خدام کی صف تک کے لوگوں۔کی دلشکنی گوارا نہ فرماتے، ان کی دلجوئی کے لیے۔ خود بڑی سے بڑی زحمت بطیب خاطر برداشت کرلیتے۔ اسی افتادِ طبع کی بنا پر خادم کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے سخت گرمی (جون ۱۹۵۹ء) میں سفر فرمایا اور یک شبانہ روز قیام کرکے واپس تشریف لے گئے۔ خیر اسوقت تو مولانا کی صحت اتنی گئی گزری نہ تھی، ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی کا واقعہ ہے کہ بعض اہلِ تعلق کی وجہ سے۔ ایسے ہی شدید موسم میں۔ بنگلور کا ڈیڑھ ہزار میل لمبا اور صبر آزما سفر کیا، اس کے علاوہ بھی آئے دن قریب و بعید کے سفر کرتے ہی رہتے، حالانکہ ادھر چند سالوں سے ضعف اس درجہ ہوگیا تھا کہ بات کرنے میں بھی نمایاں ہوتا تھا، اور بسا اوقات ملاقات کے لیے حاضر ہونے والے اپنی غلطی محسوس کرتے کہ آکر کیوں زحمت بن گئے۔

خادم کا اپنے دہلی قیام کے دوران یہ معمول رہا کہ مولانا کی جب بھی تشریف آوری ہوتی۔ اور اکثر دہلی تشریف لایا ہی کرتے۔ اور پتہ چل جاتا تو کم سے کم ایک مرتبہ ضرور حاضرِ خدمت ہوا کرتا۔ بلکہ جب تک جمعیۃ کا مرکزی دفتر۔ نئی دہلی مسجد عبدالنبی منتقل نہیں ہوا تھا۔ گلی قاسم جان میں رہا اسوقت تک دورانِ قیام اکثر روزانہ حاضر ہوتا۔ اور ہمیشہ ہی مسرت و خوشی کے ساتھ علمی فوائد بھی حاصل ہوتے! مولانا کو بھی انتظار رہتا، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ اپنی آمد کی اطلاع مجھے پہلے ہی کردی۔ مگر ان کے آخری سفروں میں حاضری کے وقت کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا کہ یہ ملاقات اور گفتگو کہیں تکلیف کا سبب تو نہیں بن گئی۔

درسِ حدیث کی برکت، روحانی قوت | لیکن عجیب بات ہو کہ یہی ضعفِ پیری، کمزوری، لاغری کا شکار نحیف جثہ، جب مسندِ درسِ حدیث پر بٹھا دیا جاتا تو بلب کی طرح چمکتا نظر آتا، اب نہ آواز میں ضعف نہ حواس میں اختلال، نہ تقریر میں بے ربطی نہ علوم و معارف کے فیضان میں کمی، اس وقت گویا ان کا رُواں رُواں، تابعیِ جلیل حضرت عکرمہ کے قول "من قرأ القرآن لم یرد الی ارذل العمر حتی لا یعلم بعد علم شیئا"[۱] کی صداقت پر شہادت دیتا نظر آنے لگتا۔

---

[۱] جو بھی قرآن مجید سے وابستگی رکھے وہ بڑھاپے میں بالکل حواس کھو نہیں بیٹھتا۔ (مفہوم)

حدیث اور علوم دینیہ کے اشتغال کی برکت اور صاحب حدیث کی کرامت اور روحانی قوت پر اس سے بڑھ کر اور کون سی دلیل ہوگی؟ جیسے ہی سبق ختم ہوتا بس مولانا، مضغۂ گوشت اور ہڈیوں کا بے جان ڈھانچہ نظر آنے لگتے، اور زبان حال یہ کہتی ع ما زندہ ازانیم کہ آرام نگیریم۔

خاتمۂ باب | بایں ہمہ سبق پڑھانے کا سلسلہ بند نہیں کیا تا آنکہ ایک دن وہ آیا کہ مولانا پر غشی طاری ہو کر زبان بند ہو گئی۔ ایسی حالت ہو جانے کے بعد باصرار مولانا کو مراد آباد (وطن ثانی۔ اصل وطن ہاپوڑ اور مولد اجمیر ہے) بھیجا گیا، یہاں پہونچ کر چالیس دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہے، غذا تقریباً بند ہو گئی، صاحبزادہ محترم کے مکتوب میں آخری دنوں کا معمول یہ لکھا ہے:۔ "بمشکل ۲-۴ چمچے صرف شلجم یا مولی کا شوربا بغیر گھی اور مصالحہ کے نوش فرماتے، یرقان کا بہت زور رہا، حکیم محمد صدیق صاحب.... بریلوی کا علاج رہا مگر افاقہ نہ ہوا۔

(وفات سے ایک دن قبل) ۱۹ صفر ۱۳۹۲ھ کو بعد نماز مغرب بہت شدید جاڑا چڑھا، بخار کی شدت سے قلب بہت متاثر ہوا.... مگر اس میں صرف اللہ اللہ کا ورد زبان پر رہا۔ بار بار غفلت ہو جاتی تھی، مگر جب بھی ہوش آتا اللہ اللہ فرماتے...... گھر اور دنیا سے بے تعلقی تھی .... بات چیت کم فرماتے، آب زمزم برابر نوش فرماتے۔ جب تک طاقت رہی کھڑے ہو کر نماز پڑھی، اس کے بعد بیٹھ کر.... آخری ہفتہ میں ضعف و نقاہت کی وجہ سے بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا تھا تو لیٹے لیٹے نماز ادا فرماتے، نماز سے فارغ ہو کر قرآن کی تلاوت کرتے۔"

غور فرمائیے! حالت صحت و اختیار میں سنت رسول ﷺ کی تشریح کرنے والا، مرض و اضطرار کی حالت میں بھی مرض رسول ﷺ کی عملی تفسیر "وجعل یتغشاہ الکرب"[۱] کی تصویر بنا ہوا ہے۔

آخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس کا دھڑکا مدت سے لگا تھا۔ ع ان ما تحذرین قد وقع۔

ماہ صفر ۱۳۹۲ھ کی ۲۰ ویں کو سفر آخرت ہوا ٹھیک اسی وقت قید زندگی سے رہائی پائی جس وقت درس زندگی سے

---

[۱] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی وفات کا حال بتاتے ہوئے فرماتے ہیں آپ مرض کی شدت سے بے ہوش ہو ہو جاتے۔"

فراغت ہوتی[۱] اور بالآخر شب میں پوری نیند قال الرسول کی نوا سنجی اور سحر خیزی کی بدولت ــــ نہ سونے والا، تھکا ماندا مسافر، "نم کنومة العروس" کی لوریاں دیکر آرام سے سلایا جا رہا ہے۔

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ رحمة واسعة واجعل لہ فی الفردوس من الدرجات العلیٰ۔

صبح ہوتے ہی یہ رُوح فرسا خبر، ہوا کے دوش پر ــ سارے عالم میں پھیل گئی۔ مگر کیا کہیئے کہ لکھنؤ پہونچتے، پہونچتے ــ اسمیٰ دور میں بھی ــ ۱۲ گھنٹے لگ گئے۔ احقر نے دارالعلوم ندوة العلماء کے مہمان خانہ میں ۱۱ بجے دن کے قریب اس زبان سے یہ خبر سنی جس نے صدہا علماء و مشائخ کے تذکرے سنا کر قلوب کو گرمایا اور روح کو تڑپایا ہے۔

سنتے ہی، لکھنؤ سے مرادآباد جانے والی پہلی گاڑی کے سہارے ۹ ½ بجے شب کے بعد افتاں و خیزاں "سید غاں کے گھیر" پہونچا، جہاں ادھر پندرہ سال کے اندر نہ جانے کتنی بار جانا ہوا تھا، مگر اکی مرتبہ یہ جانا پہلے سے بالکل مختلف تھا۔ آج سے قبل اس گلی میں ایک عالم باعمل، ایک فاضل بے بدل، حُسن صورت و سیرت کے جامع شستہ لباس میں شگفتہ چہرے کی کشش یہاں کھینچ لایا کرتی تھی، اور جب تک قوت تھی وہ سب سے پہلے معانقہ (اس شارح حدیث ہی کے عمل سے "معانقہ" کی حقیقت بھی معلوم ہوئی) فرما کر آنے والے کا دل بڑھاتے، اس کے بعد دوسرے، میزبانی کے لوازم مہیا فرماتے۔ مگر آہ! آج اس گلی میں منور و بارونق چہرہ کی جگہ، بے رونقی کے تاریک سائے، بابرکت، مسکراتی ہستی کی جگہ ان کے لائق احترام فرزندوں کے اُداس چہرے دیکھے، رات کا معتدبہ حصہ اُس...... کے تذکرے سننے کے بجائے اس ..... کے تذکرے سننے میں گزرا، صبح ہوئی تو اس کی عارضی آرامگاہ سے دائمی آرامگاہ پہونچا، وہاں مٹی کے ایک ڈھیر کے سوا کیا نظر آتا، مگر اس کے نیچے چھپے خزانے کو چشم تصور نے اس طرح دیکھا کہ اس کی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق آنکھوں کے سامنے الٹنے لگا۔ بس تھوڑی دیر ادعیۂ ماثورہ اور آیات قرآنی پڑھ کر باحسرت و یاس واپس آگیا ؎

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مولانا کا سنہ ولادت ۱۳۰۸ھ ہے۔ تاریخی نام مختار اللہ تھا۔

---

[۱] مولانا کی وفات ۱۲ بجے شب کے قریب ہوئی، موسم گرما میں عام طور پر اسی وقت سبق ختم ہوتا تھا اور قرآن مجید میں رسولؐ کی دعوت کو "حیاة" کہا گیا ہے ..... اذا دعاکم لما یحییکم۔ (الانفال)

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیانی تعلق کا مسئلہ آج کے زمانے میں

از ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسلمان —— بحیثیت اُمّتِ مسلمہ —— اس دعوتِ حق کے امین اور اُس کی بقا اور فروغ کے لیے جد وجہد کے ذمہ دار ہیں جس کو لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے۔

آپ نے اس دعوت کے کام کو ایک تکمیلی مرحلے تک پہونچایا! آغاز پکار اور اپیل، اعلان اور تبلیغ اور انذار وتبشیر (آگاہی وخوشخبری) کی دلسوزانہ کاوشوں سے ہوا اور جد وجہد کا یہ مرحلہ کوئی تیرہ سال میں جا کر تمام ہوا۔

اس مرحلے کی بے تابانہ اور ہمہ دم کاوشوں نے معاملے کو اس نقطے تک پہونچایا جس کے بیان میں قرآن پاک نے کہا ہے۔

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ	ہدایت پانی صاف طور پر ظاہر اور گمراہی سے
(البقرہ۔ ۲۵۶)	الگ ہو چکی ہے۔

اور

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ	اب جو چاہے وہ ایمان واطاعت کی راہ اختیار کرے اور جو چاہے کفر وانکار کی راہ پر پڑے

"ایمان" کی راہ پسند کرنے والوں نے ایمان کی راہ اختیار کر لی اور "کفر" جنھیں اچھا لگا انھوں نے کفر کی راہ پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک ہی قوم کے اندر یہ دو الگ الگ جماعتیں پورے شعور اور فیصلے کے ساتھ وجود میں آگئیں۔ ایمان کی جماعت چھوٹی اور کمزور تھی۔ کفر کا جتھہ بڑا اور بھاری۔ ایمان والوں کو وطن سے بے وطن ہونا پڑا۔ اُن کے لیے دیس کی زمین جہنم بنا دی گئی تھی۔ ترکِ وطن کر جانے پر بھی چین کی سانس لینے کی انھیں اجازت نہیں دی گئی۔ اس نئی سرزمین پر اس نئے عقیدے اور ایمان والی جماعت کا آنا اور ایک حلقۂ اثر پیدا کر لینا وہاں کے جن لوگوں کو اچھا نہیں لگا تھا، انھیں اُکسانے کی تدبیریں شروع ہوگئیں، سازشوں کے رابطے اُن سے استوار ہوئے، امداد کے وعدے ہوئے اور اپنی طرف سے بھی یلغار کے منصوبے بن کر حرکت میں آنے لگے۔

قدرتی بات تھی کہ اب دوسری طرف بھی صف آرائی شروع ہو جائے۔ تلوار کی طاقت سے جو جینے نہ دینے کا فیصلہ نافذ کرنا چاہتے تھے، اُن سے تلوار ہی آزما کر جینے کا حق لیا جائے۔ پہلے انھوں نے پورے شعور اور ادراک کے ساتھ کفر و انکار کا فیصلہ کیا تھا پھر ظلم و ستم کا رویہ اپنی راہ سے مخالف چلنے والوں کے ساتھ اپنایا، وہ سرزمین ان لوگوں نے چھوڑ دی جس پر یہ ظالم اپنے رنگ سے جدا کوئی رنگ دیکھنا نہیں چاہتے تھے تو دوسرے دیار میں بھی ان پر چڑھائی کے منصوبے بندھنے لگے اور وہاں کے مخالفوں کو اُکسانے کی تدبیریں شروع ہوئیں۔ اس کے بعد سوائے دشمنی کے ظاہر ہے کوئی رشتہ ان دونوں جماعتوں کے درمیان باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ اب "ایمان والوں" کے لیے عین اُن کے ایمان کا تقاضہ تھا کہ اس دوسری جماعت کو دشمن کی نظر سے دیکھیں، سمجھانے اور اپنانے کے بجائے اسے دبانے اور فنا کر دینے کی تدبیریں سوچیں! سمجھانے کے تمام مرحلے تمام ہو چکے تھے، اپنانے کی تمام کوششیں بے کار جا چکی تھیں، ترا لینے کی امیدوں کے لیے ہر دروازہ بند۔ ایسے میں کوئی دوسرا رویہ دشمن کو کامیابی کا موقع دینے اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال لینے کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

اس صف آرائی کے بعد جنگ آزمائی کی نوبت آئی تو نتیجہ اہلِ ایمان کے حق میں نکلنا شروع ہوا۔ کفر کے جتھے نے جتنا جتنا زیادہ زور لگایا اتنی ہی مایوسیاں اس کا مقدر ہوئیں۔ وہ سارے عرب کی ہم خیال طاقتوں کو بھی ایک مرتبہ جمع کر کے لایا مگر نتیجہ میں کچھ فرق نہ پڑ سکا اور اس کے بعد

ان سب طاقتوں کو زیر کرنا ایمانی جماعت کے لیے ضروری ہوگیا۔ اور یہ کام اصل حقیقہ داروں یعنی کفار قریش کے کمر ہمت ٹوٹ جانے کے بعد چند ہی سال کے اندر کرلیا گیا۔ اب اسلام مکہ فتح کرنے سے پہلے ہی جزیرۂ عرب کی سب سے بڑی طاقت تھا ـــــ ایک نئی طاقت جو آناً فاناً پروان چڑھی تھی۔

جیسا کہ ہوتا ہے، اردگرد کی سیاسی طاقتوں (روم وایران کی شہنشاہیوں) نے اس نئی ابھرتی ہوئی طاقت کو اپنے لیے خطرہ محسوس کیا۔ اور اسے دبا دینے کے اقدامات شروع ہوگئے، یعنی دشمنی کا ایک نیا محاذ پیدا ہوا۔ ان سلطنتوں کے سربراہوں کو آنحضرت نے خطوط لکھ کر دعوت اسلام دی تھی، مگر اس کا کوئی اچھا نتیجہ نکلنے کے بجائے آگے چل کر یہ صورت حال پیدا ہوئی، اور پھر جنگوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو ان سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجائے بغیر ختم نہیں ہوسکا۔ دشمنی اور صف آرائی کا وہ خط جو مدینے اور مکے کے درمیان سے شروع ہوکر پورے عرب میں پھیلا تھا وہاں سے منتقل ہوکر پوری دنیا میں اسی نوعیت کی ایک تقسیم کا خط بن گیا۔ اسلام لے آنے والے اس خط کے اس طرف تھے اور اپنے قدیم دین پر قائم رہنے والے اس طرف تھے۔ ان دونوں میں جو زیادہ سے زیادہ اچھا رشتہ تھا وہ بس ایک بار جلنے والے یا صلح کر لینے والے دشمن کا رشتہ۔ ان غیر مسلموں کو اگرچہ ایمان اور اسلام کی دعوت اس طرح نہیں دی جاسکی تھی جس طرح عربوں کو اور خاص طور پر قریش کو دی گئی تھی مگر ایک تو یہ بات ممکن ہی نہیں تھی۔ ہزاروں میل میں پھیلے ہوئے کروڑوں انسانوں کو اس طرح سے دعوت دینے کی کوئی صورت ان عربوں کے لیے نہیں تھی جو اس کے اہل تھے۔ علاوہ ازیں یہ بات اب ضروری بھی نہیں تھی۔ اسلام کی صداقت اب سمجھانے کی چیز نہیں، آنکھوں سے نظر آنے کی چیز تھی۔ جس چھوٹی سی طاقت کے ساتھ اٹھ کر اس کے لشکروں نے وقت کی عظیم شہنشاہیوں کے تخت الٹ دیے تھے کم ازکم اس وقت کے انسان کے لیے اس کے واحد معنی یہی تھے کہ یہ خدا کی حمایت و مدد کا کرشمہ ہے ـــــ اس کے ماسوا ان لوگوں نے ان لشکروں کی کارروائیوں میں ایسے متفرق واقعات بھی دیکھے یا اپنوں ہی سے سنے تھے جن میں یہ حقیقت اور بھی زیادہ کھلے طور سے نظر آئے۔ ایسے واقعات جنھیں دیکھ کر مقابل لشکر بعض دفعہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ یہ عام انسان نہیں ہیں اور بے ساختہ چلا اٹھے کہ " دیواں آمدند، دیواں آمدند۔" پھر ان لشکروں کا کیرکٹر اور کردار اور ان کی زندگی کا رنگ جو ان لوگوں کے مشاہدے میں آیا وہ تمام دلیلوں سے بڑھ کر ان کے

دین کی صداقت اور خدا سے ان کے سچے رابطے کی دلیل تھی۔ "دشمنوں" کے ایسے لشکر انھوں نے کبھی نہیں دیکھے تھے جو مفتوحین کی جان و مال سے لے کر آبرو تک کو لوٹ ڈالنا اپنا حق نہ سمجھیں۔ مگر ان لشکروں کو انھوں نے اس سے بالکل مختلف پایا۔ یہاں تک مختلف پایا کہ سال بھر کا جزیہ اہل شہر سے وصول کیا جا چکا ہے مگر جنگی مصلحت سے وہ شہر چھوڑ دینا پڑ رہا ہے تو آنہ پائی سے حساب کر کے جزیہ کی یہ رقم اہل شہر کو پہلے واپس کی گئی اور پھر کوچ کیا گیا۔

اور کیا اپنے کیا پرائے، کسی بھی لشکر کے متعلق یہ تصور نہیں کر سکتے تھے — جیسا کہ آج بھی نہیں کیا جا سکتا — کہ اہل لشکر زاہد شب زندہ دار ہوں۔ دن کو تلوار آزماتے، شہسواری کے بانکپن دکھاتے اور بڑے بڑوں کے سر جھکاتے ہوں۔ اور رات کو عجز و نیاز کی تصویر بنے مصلّے پر نظر آتے ہوں! مگر اس لشکر کا یہ نرالا رنگ بھی، انھوں نے دیکھا اور سنا۔ اور اتنی ہی حیرت اور شدت احساس کے ساتھ دیکھا اور سنا جیسے ایک نرالی اور انوکھی چیز دیکھی یا سنی جاتی ہے۔

اس سب کے بعد کون سے شبہے کی گنجائش اس معاملہ میں رہ جاتی تھی کہ یہ اصل خدا پرستی کے وارث ہیں اور جس دین کی دعوت یہ دیتے ہیں نہ ہبیت اور خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے کوئی دوسرا دین اُس کے مقابلے میں اپنانے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

بالفرض کوئی پہلو مزید سمجھنے سمجھانے کا رہ بھی جاتا تھا تو وہ تمام اسباب جمع تھے جن سے اس مزید تلاش و تحقیق کی ذمہ داری خود اُن پر عائد ہوتی تھی۔ اُن کے چاروں طرف ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہے تھے کہ اس "نئے دین" کے بارے میں سنجیدگی سے کوئی فیصلہ کریں۔ اور پھر اس کے لیے تمام آسانیاں بھی موجود تھیں، اس دین کے علمبردار اُن کے درمیان موجود تھے۔ اس لیے جو اس سب کے بعد بھی اپنے پرانے دین پر رہا اور اس "نئے دین" کو نہ ماننے ہی کا فیصلہ کیا تو یہ بھی "قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" کے بعد "غَيّ" کو اختیار کرنے کا فیصلہ تھا اور اس کا جو حکم کفار عرب کے حق میں تھا وہی ان دوسروں کے حق میں بھی، یعنی یہ کہ شعور دادراک کے ساتھ مخالف کیمپ میں رہنے والا انھیں سمجھا جائے اور ایک مخالف اور دشمن گروہ کے افراد جیسا سلوک اُن کے ساتھ کیا جائے — اگرچہ یہ سلوک ہتھیار ڈال دینے یا صلح کرنے والے دشمن کے ساتھ جیسا سلوک ہو۔

اسلام کے ماننے والوں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان تعلق و معاملت کی جو نوعیت پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں قائم ہوئی اس کا اُس وقت تک برقرار رہنا بالکل معقول تھا جب تک کم و بیش اس طرح کے حالات قائم رہے جس طرح کے حالات میں اس کی بنا پڑی تھی۔ کم از کم یہ کہ جب تک اسلام ایک زندہ دعوتِ فکر بنا رہا، جب تک اُس کے ماننے والے کچھ اُن خصوصیات کے بہرحال حامل رہے جو اُن کے دین میں صداقت و حقانیت کے اعلیٰ معیار کا اظہار کرتی تھیں، جب تک اسلام ایک ایسی طاقت بنا رہا جسے سمجھنے اور اس طاقت کا سرچشمہ جاننے کی خود بخود تحریک لوگوں کے اندر پیدا ہو۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے حالات جب تک قائم تھے، بالکل صحیح تھا کہ "قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" کا دور ہی لیے سمجھا جائے اور ہمارے اور غیر مسلموں کے درمیان تعلق کی وہی نوعیت بنی رہے جو اوپر سے آرہی تھی مگر جب یہ حالات قائم نہیں رہے، ہم میں "شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ"[۱] کی صفت باقی نہیں رہی، "تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا"[۲] کا مصداق ہمیں دیکھنے والا مجموعی طور سے نہیں پاتا "سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ"[۳] کا نشانِ حق پرستاری بھی کسی کو ہمارے چہروں پر آسانی سے نظر نہیں آتا۔ لشکر و لشکر تو ہمارے ہیں کہاں لیکن جو کچھ بھی ہیں اُن میں "بالنهار فرسان و بالليل رهبان"[۴] کی انفرادی مثالیں گو اب بھی مل جاتی ہوں مگر لشکر کی امتیازی شان اب یہ ہرگز نہیں ہے۔ اب جو اوروں کا حال ہے وہی ہمارا بھی عام حال ہے۔ بدکاری، فحاشی، شراب نوشی اور بے قیدی جو لشکروں کے خصوصی اوصاف بن کر رہے ہیں۔ ہمارے لشکروں

---

۱ لوگوں پر حق کی حقانیت کے گواہ (سورۂ بقر۔ سورۂ حج) ۲ تم دیکھو گے ان کو رکوع میں اور سجدے میں ڈھونڈھتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشی۔ (سورۂ فتح)

۳ اُن کی پہچان اُن کے چہروں میں ہے۔ سجدوں کے اثر سے۔ (ایضاً)

۴ "دن کے شہسوار اور رات کے سجدہ گزار" یہ ایک رومی کا تاثر و مشاہدہ ہے جو اُس نے شہنشاہ ہرقل سے اسلامی لشکر کے بارے میں بیان کیا تھا۔

کا بھی بالعموم وصف ہیں۔ یہ اپنوں تک کے ساتھ وہ کر گزرتے ہیں جس کی اجازت غیروں کے ساتھ بھی نہ تھی۔ اسلام وہ طاقت اب نہیں رہا جو دنیا کے لیے از خود دعوتِ فکر بنے، بلکہ ہماری شامتِ اعمال سے اب وہ ایک ناقابلِ التفات چیز ہے۔ وہ دنیا بھر میں ذلیل اور پسماندہ لوگوں کا دین ہے کوئی التفات اور توجہ اس کی طرف اگر ہے تو ہماری بداعمالیوں کے ساتھ ساتھ مخالفین کے مؤثر پروپیگنڈے کی وجہ سے، ایک ایسی طاقت کی حیثیت سے جو بدی کی طرف لوگوں کو مائل کرتی ہے جو ظلم اور سنگدلی کی رغبت دلاتی ہے جو ظلمت پرستی اور دقیانوسیت کی داعی ہے۔

اس نئے حال کو ایک مدت ہو چکی ہے۔ صدیاں ہو رہی ہیں۔ خود ہمارے اندر ہر جگہ ایسے لوگ اچھی خاصی طاقت اور تعداد میں اُبھر چکے ہیں جو اسی طرح کا خیال "اپنے" اس دین کے بارے میں رکھتے اور ظاہر کرتے ہیں۔ اسلام کو بدلنے کی دعوت دیتے اور جہاں طاقت پا جائیں اس پر عمل کی بھی ہر کوشش کرتے ہیں۔ اس کا جو اثر غیر مسلموں پر پڑ سکتا ہے اُس کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ایسے میں یہ بات قابلِ غور نظر آتی ہے کہ آیا غیر مسلموں کے ساتھ تعلق اور رویہ کی وہی نوعیت برقرار رکھنا اب بھی صحیح ہے جو بالکل مختلف حالات میں قائم ہوئی تھی؟ کیا اب بھی ہمیں سمجھنا چاہیے کہ حق واضح ہے۔ اور جو کوئی اسلام کو اختیار نہیں کرتا وہ اُس کی حقانیت کو جانتے بوجھتے ایسا کر رہا ہے؟ ان سطور کے راقم کا طالب علمانہ خیال ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اوپر اس مسئلے کو جس طرح سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اُس میں اگر کوئی اہم فرد گزاشت نہیں ہوئی ہے تو پھر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آج بھی غیر مسلموں کے معاملے میں اُسی رویہ کو برقرار رکھا جائے جو اوپر سے چلا آ رہا ہے۔

اوپر کے جائزے کی روشنی میں آج عام غیر مسلم "حق" سے بے خبری کے معاملے میں اصولاً اُسی جگہ ہیں جس جگہ بعثتِ محمدی کے وقت عرب اور غیر عرب دنیا تھی۔ قرآن ضرور موجود ہے، مختلف زبانوں میں اُس کے ترجمے بھی ہیں۔ لیکن تنہا قرآن نازل کر دینا تو اتمامِ حجت کے لیے پروردگار نے اہلِ زبان کے لیے بھی کافی نہیں سمجھا تھا۔ ایک رسول کی بعثت بھی ضروری قرار پائی جو اس ہدایت نامے کی طرف انتہائی دلسوزیوں کے ساتھ اہلِ عرب کو پکارے اور اس دعوتی کیفیت کے ساتھ ساتھ اُس کی عملی زندگی بھی اس کتاب کی صداقت، حقانیت اور منزّل من اللہ ہونے کی شہادت دے۔ عرب سے باہر کے لوگوں پر حجت تمام کرنے کے لیے قدسیوں کا ایک پورا گروہ اس کے

... میں ہو گیا جو قرآن کی قوت اور اسلام کی کیمیا گری کا ناقابلِ انکار ثبوت تھا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا — اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک امت معتدل بنایا
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۤءَ عَلَى النَّاسِ — تاکہ تم ہو شہادت دینے والے لوگوں پر اور رہو
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا — شہادت دینے والا تم پر

(البقرہ ع ۱۷)

یہی بات سورۂ حج میں ترتیب بدل کر فرمائی گئی کہ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۤءَ عَلَى النَّاسِ۔ اسی طرح کچھ دوسرے الفاظ میں بھی جماعتِ صحابہ کی یہی حیثیت قرآن نے کئی جگہ واضح کی ہے جن کا ذکر کرنے کی اہلِ علم کے لیے ضرورت نہیں۔

پس جب اُس زمانے میں تنہا قرآن کا موجود ہونا (بغیر زندہ داعیوں اور عملی نمونوں کے) لوگوں پر حق واضح ہو جانے اور حجت پوری ہو جانے کے لیے کافی نہیں تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ قرآن یا اُس کے تراجم اور اسلامی لٹریچر اِس زمانے میں کافی سمجھ لیے جائیں اور اُس نظر سے غیر مسلموں کو دیکھا جائے جس کی منزل حق پوری طرح واضح ہونے اور پھر بھی ان کے کفر و انکار پر جمے رہنے کے بعد آتی ہے۔

سوال کسی جہاد وغیرہ کے جواز اور عدمِ جواز کا نہیں ہے، یہ تو باب ہی بند ہے۔ سوال اُس ذہن اور نظریے سے متعلق ہے جس سے ہم آج غیر مسلموں کے بارے میں کام لیتے ہیں۔ ہم نے انہیں "اعداء اللہ" کے زمرے میں شمار کر رکھا ہے۔ حالانکہ نہ اُن پر "اللہ کا دین" اس طور پر پیش کیا گیا جس سے یہ صداقت اُن کے دلوں پر روشن ہو جائے ۔۔۔ بلکہ سرے سے پیش ہی نہیں کیا گیا ۔۔۔ اور نہ وہ حالات ہیں جو اس موقع جدوجہد کے قائم مقام بن جائیں تب اس دین سے اُن کی دوری یا مسلمانوں سے مخالفت 'اللہ سے مخالفت' کے ہم معنی کیسے ہو سکتی ہے؟

کچھ افراد آج کی غیر مسلم قوموں میں ایسے ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں سے تعصب میں اسلام کی بھی باقاعدہ مخالفت اور اسے نقصان پہنچانے پر کمربستہ ہو جائیں اور واقعات و قرائن شہادت دے رہے ہوں کہ ایسا کام کرنے کے لیے یہ اسلام کے مآخذ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ بے شک اپنی خرابیٔ فطرت سے حق دشمن اور اللہ کا خوف نہ کرنے والے ہیں اور اعداء اللہ کہلانے کے پورے پورے مستحق۔ اسی

طرح کچھ اور قسمیں بھی ایسے افراد کی نکل سکتی ہیں ___ علیٰ ہذا بعض خاص فکر و فلسفے والی جماعتوں اور تنظیموں کا نام آپ لے سکتے ہیں جنھوں نے الحاد پر اپنے فکر و عمل کی بنیاد رکھ لی ہے اور خدا بیزاری ان کا کھلا نشان ہے۔ یہ مذکورہ بالا افراد سے بھی بڑھ کر "اعداء اللہ" کا مصداق ہیں۔ لیکن خالی غیر مسلم ہونا یا اس کے ساتھ مسلمانوں سے مخالفت اور صف آرائی بھی رکھنا، آج کے حالات میں، اللہ سے مخالفت اور حق سے عداوت کے ہم معنی قرار دیا جائے تو یہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔

اسلام نے انسانوں کے درمیان اخوت کا برادرانہ رشتہ بنایا تھا۔ اس رشتے کے احساس اور پاس کا حق قدرتی طور سے اُن لوگوں کے ذمہ زیادہ عائد ہوتا ہے اور ان ہی سے اس حق کی ادائیگی کی اُمید بھی بہ نسبت دوسروں کے زیادہ کی جا سکتی ہے جو اسلام کو قبول کریں۔ انبیاء علیہم السلام اوّل المسلمین ہوتے تھے تو اسی نسبت سے اُن میں اس حق کا احساس اس درجہ ہوتا تھا جسے حال کہا جائے گا۔ وہ اس طرح اپنی قوم (امت دعوت) کی ہدایت کے لیے گھلتے تھے کہ خدا کو اُن کی حالت پر رحم آتا تھا۔ آنحضرت (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو کئی جگہ قرآن مجید میں ٹوکا گیا ہے کہ کیا تم اُن کے پیچھے اپنی جان دیدو گے؟ سورۂ کہف کی آیت ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى	تم شاید اپنی جان ہی ان کے
آثَارِهِمْ إِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوا	پیچھے غم میں دے دوگے، اگر یہ اس
بِهٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا (ع-۱)	کتاب پر ایمان نہ لائے!

اپنے درجے کے مطابق یہی حال پیغمبر کے ماننے والوں کا بھی ہونا چاہیے خاص کر آنحضرت کی اُمت کی تو یہ اس لیے بھی ذمہ داری ہے کہ اب کوئی پیغمبر نہیں آنا ہے، اسی امت کو پیغمبروں کا کام انجام دینا ہے۔ ان کا "مسلمان" ہونا صرف یہی نہیں ہے کہ شریعت پر چلیں اور خدا سے بے میل عبدیت کا رشتہ استوار رکھیں بلکہ یہ بات بھی اسی "مسلمان ہونے" میں داخل ہے کہ جو مسلم نہیں ہیں اُن کی ہدایت کی فکر کریں۔ اور کوئی دقیقہ اس معاملے میں برادرانہ خلوص، دلسوزی اور جد و جہد کا اٹھا نہ رکھیں۔ یہ حق بس اس وقت جا کے ساقط ہوگا جب اس برادرانہ جد و جہد کی انتہا کر دی جائے اور دوسری طرف سے مایوس کن لے کی حد ہو جائے۔ اب حق ہی نہیں اخوت کا رشتہ بھی باقی نہیں رہتا، اس لیے کہ اس رشتے کی بنیاد کو ٹھکرا دیا گیا۔ اب اس "مسلمان ہونے" ہی کا تقاضہ یہ ہوگا کہ عداوت کی

نظرت ایسے لوگوں کو دیکھا جائے۔

ہم پہلے فرض کی ادائیگی کیے بغیر دوسرے "فرض" کی ادائیگی کو اسلام سمجھے بیٹھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس کی فرضیت تو درکنار جواز بھی اُس پہلے فرض کی ادائیگی کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اسلام نہیں نفس کا دھوکہ اور شیطان کا فریب ہے کہ دوسروں کو اعداء اللہ ٹھہرا کر اپنے کو "حزب اللہ" سمجھ لیا، جس کا رشتہ غیر مسلم قوموں سے صرف یہ ہے کہ اگر موقع پیدا ہو تو جہاد کے دو دو ہاتھ کیے جائیں۔

کہیں کسی غیر مسلم قوم کی طرف سے جنگ تھوپ دی جائے تو بے شک اس سے نبرد آزمائی بھی جہاد ہے۔ مگر محض اُس کے غیر مسلم ہونے کی بنا پر یہ جہاد "اعداء اللہ" سے "حزب اللہ" کا جہاد نہیں ہوگا آپ کا اپنے اعداء سے جہاد ہوگا۔ اور امن قائم ہو جانے کے بعد آپ اپنی دشمنی کو خدا سے دشمنی قرار دیکر ان غیر مسلموں کے اُس حق سے سبکدوش نہیں ہو سکتے جو جنگ سے پہلے آپ پر عائد ہوتا تھا۔ آپ پر بھی استطاعت کے مطابق ذمہ داری ہوگی کہ ان میں دعوتی جدوجہد کے لیے سازگار حالات پیدا کریں اور جو مسلمان ان غیر مسلموں کے درمیان رہتے ہیں اُن کی تو پوری ذمہ داری ہے کہ قومی بنیادوں پر پیدا ہونے والی یا چلی آنے والی منافرت اور غیریت کی دیواروں کو توڑ کر یہ اسلامی فریضہ حالات کی گنجائشوں اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق ادا کریں اور مسلسل کرتے رہیں یہاں تک کہ "قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" کی صبح نمودار ہو اور "لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ" کا ظہور ہو جائے۔

ہم "اعداء اللہ" اور "حزب اللہ" کی فرضی دیواریں (آج کے حالات میں) قائم کرکے یا کہیے کہ بے محل اصطلاحوں کو اوڑھ کے اپنے میں مست ہوگئے ہیں۔ غیر مسلموں کے درمیان حق کی دعوت کو ایک فریضے کے بجائے فضیلت اور احسان مندی سمجھ لیا ہے حالانکہ قرآن و حدیث اور پیغمبروں کے اُسوے کو سامنے رکھ کر تو صاف ہی معلوم ہوتا ہے کہ آج کے حالات میں جو کوئی عام غیر مسلم اس دنیا سے جاتا ہے تو اُس کا اخروی انجام جو کچھ بھی ہو لیکن وہ ہمارا دامن خدا کے دربار میں پکڑنے کا ضرور حقدار ہوگا کہ ہم نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ اُس کی بے خبرانہ جاہلی عصبیت کے مقابلہ میں عصبیت ہی کا مظاہرہ کرکے حق کو سننے اور سمجھنے کے امکانات سے اسے اور دور کر دیا کہ نہ کان کچھ سن سکیں اور نہ آنکھ کچھ دیکھ سکے۔ کیا اچھا ہو کہ اہل علم و نظر اس مسئلے سے اعتنا فرمائیں تاکہ اوپر کے پیش کردہ خیالات میں اگر کوئی غلطی ہو تو اسکی تصحیح ہو جائے ورنہ انکی تائید سے اسوقت کے عام ذہن کی اصلاح آسان ہو۔

نئی مطبوعات

مذہب اور سائنس مولانا عبدالباری ندوی، سابق پروفیسر فلسفہ، عثمانیہ یونیورسٹی دکن۔
ناشر:- مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ
سائز ۲۰×۲۶/۸۔ کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت روشن۔ صفحات ۲۹۴، قیمت مجلد -/۸ روپے

سائنسی انکشافات کو اب تک مذہب کی علمی تردید کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے بلکہ اب بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن مذہب کی تردید کا سامان بہم پہنچانے میں سائنس کامیاب ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، ... حقیقت کائنات کے بارے میں اپنے اب تک کے تصورات کی تردید وہ از خود ضرور کرنے لگی ہے۔ پہلے مادہ اصل کائنات قرار پایا تھا۔ مگر مزید تحقیقات کے لیے مسلسل ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزرتے ہوئے یہ اپنی حقیقت میں محض دھوکہ نکلا۔ اب اس کی جگہ انرجی اصل کائنات قرار پائی لیکن دیر نہیں لگی کہ یہ بھی اپنے پیشرو کے انجام کو پہنچ گئی اور اب تازہ ترین تصور چوٹی کے سائنس دانوں کا یہ ہے کہ ساری کائنات کی حقیقت ایک نہایت بلند پایہ اور حد درجہ طاقتور "ذہن" ہے۔ جس طرح خواب میں ہم محض ذہن کی کارفرمائی سے ہر طرح کے حقائق اور واقعات کی ایک دنیا تخلیق کر لیتے ہیں، بس گویا اس طرح "اس ذہن" کی کارفرمائی یہ سارا عالم ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ قائم نہیں رہتا اور یہ اس ذہن کی اعلیٰ شان کے مطابق ٹھوس حقائق کی طرح قائم ہے ــــ ظاہر ہے کہ اس کے بعد مذہب ــــ جو حقیقت میں ایک ہی ہے یعنی اسلام ــــ کی بتائی ہوئی حقیقت هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ـ کے درمیان اور اس سائنس کی سمجھی ہوئی حقیقت کے درمیان کچھ زیادہ فاصلہ نہیں رہ جاتا، چہ جائیکہ اس سے اس کی تردید کا سوال پیدا ہو۔

زیر نظر کتاب میں سائنس اور مذہب کے درمیان او لتے بدلتے ان ہی رشتوں اور سائنس کی ارتقائی منزلوں کو بہت تفصیل سے دکھاتے ہوئے یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ جس "حقیقت" کی تلاش میں سائنس سرگرداں ہے وہ نہ سائنس کے تحقیقی تجربات سے گرفت میں آنے والی چیز ہے نہ فلاسفہ کی پرواز خیال سے۔ اس سرگردانی سے نجات کی واحد سبیل اس ذریعہ علم دیافت کی طرف رجوع ہونا ہے جسے مذہب کی زبان میں وحی کہتے ہیں۔ بفرض محال سائنس اصل اور پوری حقیقت کو پا بھی لے تب بھی وہ یہ اطمینان کسی کو عطا نہیں کرسکتی کہ حقیقت پالی گئی ہے۔ اس کی بنیاد ہی شک اور مزید جستجو پر ہے۔ اس لیے قرار و اطمینان کی کیفیت اسکی کسی منزل پر نصیب ہو جانے کا سوال ہی نہیں۔

مصنف کا ذہن بڑا نکتہ آفریں اور نظر بڑی دقیقہ رس ہے۔ سائنس کے نقطۂ آغاز سے لیکر اس کے سفر کے ہر ہر قدم اور ہر ہر منزل سے انھوں نے مذہب اور مذہبی طرز فکر کے حق میں دلائل اخذ کیے ہیں۔ سائنس کا مدعا اور محرک سفر اُن حقیقتوں کی یافت ہے جو نظر آنے والی سطح کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں۔ انسان کو یہ شعور کہاں سے حاصل ہوا کہ موجودات عالم کی ظاہری سطحوں کے پیچھے بھی کچھ ہے؟ اور یہ طلب اس کی طبیعت میں کہاں سے آگئی کہ ان پردوں کے پیچھے جھانکے اور جتنے پردے اُٹھیں اس کی یہ طلب و تشنگی بڑھتی جائے؟ یہ سوال اٹھا کر وہ سائنس کے پہلے ہی قدم بلکہ محرک عمل ہی سے حجت اخذ کرتے ہیں کہ کیا یہ کسی ایسے "غیب الغیوب" کی موجودگی کا ثبوت نہیں ہے جسے پالینے کا انتھک اور بے قرار جذبہ انسان کی سرشت میں رکھا ہوا ہے؟ — اور ایک سائنس ہی کا میدان نہیں زندگی کے ہر میدان میں انسان کی سرشت یہی بے اطمینانی، بے قراری، ناآسودگی اور خوب سے خوب تر اکامل سے کامل تر کی تلاش ہے۔ اس کے پیچھے بھی ایک ایسی نادیدہ حقیقت کے فطری شعور اور اُس سے ایک روحانی ربط کے سوا کیا چیز بتائی جاسکتی ہے، جو سراپا کمال اور سراپا کشش ہے؟

اور اب سائنس یہاں پہنچی ہے کہ ایک "کائناتی ذہن" ہے جس کی کرشمہ کاریوں کی نمود یہ سارا عالم بشمول انسان ہے، اس کی بنیاد پر وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جب ہمارے اور اُس کے درمیان رشتے کی یہ نوعیت ہے تو اس کے بارے میں ہمارے کچھ جان لینے کی صورت اس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ وہ خود ہم پر اپنی ذات و صفات کی حقیقت کھولے، جتنی کے قابل ہم ہیں یا جتنی ہمارے لیے مناسب ہے؟ اس طرح نکتوں پر نکتے اٹھاتے، حسب موقع اور حسب ضرورت بحث فرماتے اور سائنسدانوں

کے اذکار و مسلمات ہی سے اُن پر خدا کی حجت تمام کرتے مصنف مدظلہٗ اپنی یہ کتاب یہاں لاکر ختم کرتے ہیں)۔

"..... لہٰذا انسان کی محدود و ظلوم و جہول ذات کو اس کے علمی و عملی ظلمہ و جہل کی تاریکیوں پر تاریکیوں (ظُلُماتٌ بعضُها فوقَ بعض) سے نکال کر صرف یہ خدا حسب ضرورت و حکمت روشنی عطا کر سکتا ہے۔ "من لم یجعل اللّٰہ لہٗ نوراً فمالہ من نور"۔"

اس کے بعد اس روشنی (از علم) کی وضاحت قرآن مجید سے کرنے کے لیے کتاب کا دوسرا حصہ ہوگا جو گویا دہی حاصل کتاب ہوگا۔ مگر فی الحال قاری کی دسترس سے باہر ہے۔ خدا کرے اُسکا انتظار بہت زیادہ نہ کرنا پڑے۔

کتاب کا دوسرا حصہ سامنے آئے بغیر بحث کے آخری نتائج ہی گویا سامنے نہیں آتے لیکن ایک تأثر ہر حال ہوتا ہے کہ جیسے وحی کا دیا ہوا تصور خدا و کائنات گویا وہ ہے جسے وحدۃ الوجود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبکہ قرآنی بیان کے الفاظ اس تصور سے صریح طور پر ٹکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ تأثر ہی کے مرحلے پر بھی خاموش گزر جانا سمجھ میں نہیں آتا ورنہ اصل بات وہی ہے کہ کچھ کہنے کے لیے دوسرے حصہ کا انتظار کرنا چاہیے۔

کتاب اپنے مباحث کے لحاظ سے اتنی ہی بلند پایہ ہے جتنی کی توقع "مذہب و عقلیات" اور "برکلے" کے مصنف سے لوگ کرینگے۔ طبیعاتی سائنس کے ماہر خصوصی ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کا کتاب پر مقدمہ اس پر مستزاد ایک اعلیٰ درجہ کی سند ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی جان لینے کی ہے کہ کتاب مشکل اور دقیق اس سے بھی زیادہ ہے جتنی مشکل ہونے کا کچھ اندازہ پہلے ہی کیا جا سکتا ہے۔ سائنس کے جو جدید نظریات اس میں مذکور ہوئے ہیں وہ ہیں ہی اتنے دقیق کہ ماہران خصوصی بھی دوسروں کو اُن کے سمجھا دینے سے عاجز ہیں۔ مصنف مدظلہٗ کا تو یہ خاص فن بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے شاید ان کے بیان اور تفہیم میں تکرار اتنی اختیار کی گئی ہے کہ کچھ زیادہ ہی معلوم ہونے لگتی ہے اور اسکے بعد بھی قاری کو نتائج بحث سمجھنے کیلیے اپنے فہم کا استعمال بہت کرنا پڑیگا۔ کم از کم تبصرہ نگار کا تأثر یہی ہے۔ ایسی دقیق کتاب میں کتابت و طباعت کی صحت کے جس اہتمام کی ضرورت تھی افسوس ہے کہ ویسا اہتمام نظر نہیں آیا۔ غلطیاں خاصکر الفاظ کا چھوٹ جانا تھوڑا نہیں اچھا خاصہ ہے۔ کتابت کا قلم بھی اس کتاب کے لحاظ سے کچھ موزوں نظر نہیں آتا۔ گو یہ ایک ذوقی بات ہے، مگر کتابت کو دیکھکر ایسا لگتا ہے جیسے کم خواندہ لوگوں کے لیے لکھی گئی کوئی کتاب ہو۔ آئندہ اڈیشن میں غلطیوں کی تصحیح کا اہتمام تو بہرحال ہو ہی جانا چاہیے۔

کتب خانۂ الفرقان کی مطبوعات

قیمتوں میں ناگزیر اضافہ

ہم اپنے خریداروں کو بہت پس و پیش کے بعد یہ اطلاع دینے پر مجبور ہیں کہ تمام دوسری اشیاء کی طرح کتابوں کی لاگت میں بھی مسلسل اضافہ کی بنا پر ہمیں اپنی کتابوں کی قیمتوں میں تھوڑا سا اضافہ کرنا پڑا ہے۔ کتابت اور بلاک کی اجرتوں میں بھی کافی فرق ہو چکا ہے۔ لیکن اپنے خریداروں کی قوت خرید پر نظر کرتے ہوئے جب تک ہو سکا قیمتوں میں اضافہ کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ اب بالکل مجبوری ہے۔ لہٰذا ۱۰ جون سے ہماری مطبوعات کی قیمتیں یہ ہوں گی۔

معارف الحدیث	جلد اوّل غیر مجلد	۶/۲۵
〃	〃 دوم 〃	۷/۲۵
〃	〃 سوم 〃	۹/-
〃	〃 چہارم 〃	۶/۵۰
〃	〃 پنجم 〃	۸/۵۰
〃	کامل سٹ 〃	۳۷/۵۰

مجلد کے لیے فی جلد ۱/۲۵ مزید

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟	۵/۵۰	تذکرۂ مجدد الف ثانیؒ	۶/-
مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ	۵/۵۰	فیصلہ کن مناظرہ	۲/-
دین و شریعت	۴/-	دینی دعوت، غیر مجلد ۲/۵۰، مجلد ۴/-	

منیجر کتب خانۂ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

BOMBAY ANDHRA
TRANSPORT CO.

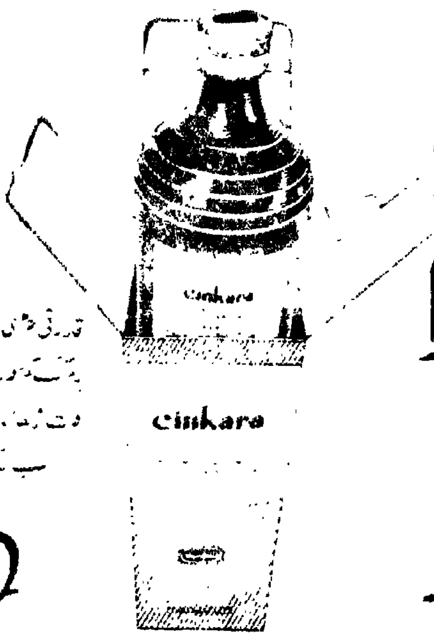
Transport Contractor

11B, Bhandari Street (Chakla)

BOMBAY-3

گھر بھر کے لیے

سنکارا



طاقت و تغذیہ

اور

چستی و توانائی کا سرچشمہ

ہمدرد

Regd. No L-353

Monthly **'ALFURQAN'** [illegible] Road [illegible]

VOL. 40 NO. [illegible] JUNE [illegible] [illegible]

Receipt No. 24/
Date 7/8/72

شفیق الحسن

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چندۂ سالانہ
غیر ممالک سے
۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

الفرقان
ماہنامہ — لکھنؤ

چندۂ سالانہ
ہندوستان سے ......
بنگلا دیش سے ......
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی ...... ۵، پیسے

جلد ۴۰ | بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ مطابق جولائی ۱۹۷۲ء | شمارہ ۵

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۸ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ انکی اطلاع ۲۸ تاریخ تک آجائے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کو مبارک ہو کہ وزیرِ اعظم اندرا گاندھی اور صدر ذوالفقار علی بھٹو کی کانفرنس ایک امید افزا سمجھوتے پر ختم ہوئی۔ ایسے سمجھوتے کے، کم از کم ہندوستان میں، سب سے زیادہ ضرورت مند شاید ہندوستانی مسلمان تھے۔ اس سمجھوتے کے ذریعہ گزشتہ پچیس سال کی تلخیوں کا باب بند کرنے اور اچھے پڑوسیوں کے سے تعلقات استوار کرنے کی جو داغ بیل ڈالی گئی ہے وہ اگر جڑ پکڑنے اور برگ و بار لانے کا موقع پا سکی تو اس سے جہاں دونوں ملکوں کے سب ہی لوگوں کی زندگی کا ایک نیا خوشگوار دور شروع ہوگا وہاں ہندوستانی مسلمان بھی اپنے مخصوص مسائل کے اعتبار سے انشاء اللہ کچھ نہ کچھ سکھ ضرور پائیں گے۔

دونوں ملکوں کے تعلقات کی خرابی سے ہندوستانی مسلمانوں کی مشکلات میں جو مخصوص قسم کا اضافہ ہوتا تھا اُس کی تازہ مثال یہ واقعہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نئے ترمیمی ایکٹ پر جو یومِ احتجاج مسلمانوں نے منایا اور پھر ایک نمائندہ میٹنگ ۲۴ اور ۲۵ جون کو آگے کے اقدامات سوچنے کے لیے دہلی میں رکھی گئی تو اخبارات سے لے کر گورنمنٹ کے ذمہ داروں تک نے یہ الزام لگایا کہ ان باتوں کا مقصد پاکستان کے اس وفد کے ذہن پر خراب اثر ڈالنا ہے جو صدرِ پاکستان کی قیادت میں ہندوستان سے مصالحت کی گفتگو کے لیے جون کی ۲۸ تاریخ کو شملہ آرہا ہے۔۔۔ اس طرح کے خیالات کا کسی دل میں واقعتہً پیدا ہونا یا محض شرارتاً ایسی باتیں کہہ کر مسلمانوں کو خوف زدہ کر دینے اور ملک کی ذہنی فضا اُن کے خلاف بنا دینے کی امید کرنا صرف اسی بنا پر ممکن ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات کی خرابی کی بنا پر پاکستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا ناپسندیدہ رشتہ شرارتاً جوڑنے یا

واقعتہً اس کا شبہ کرنے کا موقع لوگوں کو ملتا ہے جو اچھے تعلقات ہونے کی صورت میں نہیں مل سکتا تھا۔

ہزاروں مسلمان کنبے ایسے ہیں جن کے افراد ہندوستان اور پاکستان میں بٹے ہوئے ہیں، اُن کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ یہ دونوں ملک حریف اور دشمن بن کر نہیں دوست اور حلیف بن کر رہیں۔ خون اور خاندان کے رشتوں سے آگے مذہب اور ثقافت کا رشتہ بھی اسی صورت حال کا خواہاں ہے۔ کیسی اذیت ناک صورت ہے کہ خط و کتابت، ملنا جلنا، تبادلۂ خیال اور ایک دوسرے کے افکار و احوال سے واقفیت کے تمام ذرائع اس درجہ قرب کے باوجود بند ہیں کہ مسٹر بھٹو نے مسز گاندھی کے اعزاز میں شملہ میں ڈنر دیا تو نہایت آسانی سے پاکستان میں کھانے پک کر تازہ بتازہ شملہ پہونچ گئے۔

ہندوستان کے اسلامی رسائل و مجلّات کی وہ برادری جو اپنے معیار اور مقصدیت کی بنا پر ایک محدود حلقۂ اشاعت رکھتی ہے، دونوں ملکوں کے تعلقات کی ابتری میں نیم جاں ہو کر پڑی ہوئی ہے۔ ان رسائل کے خریداروں کی خاصی تعداد پاکستان کے علاقے میں تھی۔ تعلقات خراب نہ ہوتے تو وہاں کے نئے اقتصادی حالات کی بنا پر اس تعداد میں معتد بہ اضافہ ہو سکتا تھا۔ مگر یہ اضافہ تو کیا ہوتا ۱۹۶۵ء میں آکر جنگ کی بنا پر رشتہ ہی منقطع ہو گیا۔ تاشقند پیکٹ نے کچھ راستہ پھر سے کھولا۔ مگر جلد ہی پھر بند ہو گیا۔ اور اب تین چار سال سے ان رسالوں کی مالیات کا انحصار، جن میں سے ایک الفرقان بھی ہے، بس ہندوستانی خریداروں پر رہ جانے سے ان کا جو حال ہے اسے بس وہی جانتے ہیں۔ ایسے میں اس سمجھوتے کی یہ شق کہ رسل و رسائل کا نظام بحال کیا جائے گا اور تجارتی تعلقات بھی جلد سے جلد قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی "سوکھے دھانوں پہ پانی" کا مصداق ہے۔

الغرض ان خاص اسباب سے اور دونوں ملکوں کے وسیع تر مفاد کے لحاظ سے یہ سمجھوتہ بہت ہی مسرت کے قابل ہے اور ہم تہ دل سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

جون کے پورے مہینے میں گرمی کی بے پناہ شدت اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے اُن مقدمات کے سلسلے میں جو "ندائے ملت" سے قطع تعلق کے وقت حصے میں آئے تھے، کچہری کی پریشان کن مصروفیت کے باعث اگر الفرقان کا یہ شمارہ لیٹ نہ ہو گیا ہوتا تو شملہ کی چوٹی کانفرنس کے بجائے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسئلے سے ان صفحات کا آغاز ہوتا۔ مگر یہ قیامت کی گرمی جس میں مہینے بھر تک پورا شمالی ہندوستان

بھنتا رہا اور پھر اس گرمی میں یکم سے لے کر ۲۰ جون تک پے بہ پے دس پیشیاں ایک بیمار سے آدمی کو کہاں اس لائق چھوڑ سکتی تھیں کہ وہ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ صفحات تیسری جولائی کو شروع کیے جا سکے، جبکہ مسلم یونیورسٹی کا ہنگامہ خیز مسئلہ چوٹی کانفرنس کی اوٹ میں جا چکا تھا۔ لیکن یہ مسئلہ بہرحال نظرانداز کردیے جانے کے قابل نہیں ہے، اور نہ یہ چوٹی کانفرنس اسے مردہ ہی کرسکی ہے۔ اس لیے ثانوی ہی درجے میں سہی مگر اس پر کچھ لکھنا لازم ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے اس وقت کے مسئلہ کا، جو نئے ترمیمی ایکٹ سے متعلق ہے، ایک پہلو یہ ہے کہ یو، پی میں اس ایکٹ کے خلاف مسلمانوں کو احتجاج کرنے کی اجازت یہاں کی حکومت نے نہیں دی اس وقت بہت سے لوگ خود مسلمانوں میں سے بھی، یہ کہنے کے لیے کھڑے ہوگئے ہیں کہ یو، پی حکومت کا یہ رویہ درست اور امن وامان کی حفاظت کے لیے ضروری تھا، مگر ان "گواہیوں" کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ یہ انتہائی شرمناک اور غیر جمہوری رویہ تھا، اس سے ہندوستان کی عوامی جمہوریت پر حرف نہیں لگا، داغ آیا۔ اور ملک کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد کا اس کے بارے میں اعتماد بجا طور پر متزلزل ہوا۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کے سیاسی حریف جو ۱۹۷۱ء کے پارلیمانی الکشن کے بعد سے ایمانداراً خدشہ کے طور پر یا محض ایک سیاسی حربہ کے طور پر یہ آواز اٹھا رہے تھے کہ اس اتنی بھاری جیت کے نتیجے میں جو ہندوستانی عوام نے انھیں دلائی ہے، وہ عوام کے حقوق اور جمہوریت ہی کے لیے ایک خطرہ بن گئی ہیں، یو، پی کی کانگریسی حکومت کے زیر بحث رویے نے اس آواز میں حقیقت اور صداقت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ لا اینڈ آرڈر (امن وقانون) کے سلسلے میں کسی ریاستی حکومت کے اقدامات کو باوجود جماعتی رشتے کے مرکزی حکومت کی ذمہ داری قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن ایک عام اصول کی یہ بات ہر وقت اور ہر معاملے میں بچاؤ کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ اس وقت کسی ریاست کی کانگریسی حکومت اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ اپنے اختیارات کے معاملوں میں بھی مرکزی اقتدار کی مرضی جانے بغیر قدم اٹھا سکے۔ خاص کر جب کہ معاملے کا کوئی تعلق مرکز کے کسی اقدام سے بھی ہو، جیسا کہ مسلم یونیورسٹی سے متعلق اس احتجاج کا معاملہ مرکزی حکومت ہی کے پیش کیے اور پاس کرائے ہوئے بل سے پیدا ہوا تھا۔ اور اس سلسلے میں وہ کسی خاص مرضی اور دلچسپی سے خالی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ مرکزی وزارت داخلہ کے وزیر مسٹر کے۔ سی۔ پنت نے بل کی منظوری کے بعد احتجاج کا خدشہ

محسوس کرتے ہوئے یہ جو کہا تھا کہ حکومت اس سے آسانی نپٹ لے گی۔ اس کے پیش نظر تو یہ کہنا بھی کوئی زیادتی نہیں کہ یہ ایسے تمام اقدامات کے لیے مرکز کا "لائن کلیر" تھا جو یو، پی کی حکومت نے اختیار کیے۔ اس بنا پر یو، پی کی حکومت کا جمہوریت کش رویہ صرف اسی کا رویہ نہیں رہ جاتا بلکہ مزید افسوس کی بات ہے کہ اس میں مرکز کی مرضی اور منظوری شامل تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان اگر اس بل کے خلاف احتجاج کر لیتے تو اس سے کیا بگڑ جاتا۔ یہ تو صرف کمیونسٹ آمریت کا طریقہ ہے کہ حکومت کی مرضی کے خلاف کسی کو بولنے کا حق نہ ہو۔ اگر یہ اندیشہ تھا کہ فرقہ وارانہ بلوے نہ ہو جائیں تو کس کی جانب سے یہ اندیشہ تھا۔ مسلمانوں کو تو صرف حکومت سے شکایت تھی، پبلک کے کسی حصے سے وہ کیوں الجھتے؟ رہا یہ اندیشہ کہ کسی دوسرے گروہ کی جانب سے اس احتجاج میں خلل اندازی سے ایسی صورت پیدا ہو جائے جیسا کہ خاص علی گڑھ میں جن سنگھی عناصر نے کوشش کی تھی تو ایک جمہوری حکومت کا کام یہ نہیں تھا کہ ایک جائز احتجاج کو ناجائز خلل اندازی کے خیال سے روکے، بلکہ روکنے کی چیز یہ ناجائز خلل اندازی تھی، جس کے پاس کوئی ایسی طاقت بھی نہیں تھی جسے حکومت روک نہ سکتی ہو۔ جن سنگھ کی طاقت کا اس وقت جو عالم ہے اسے کون نہیں جانتا۔

—— لیکن اس کے برعکس نہ صرف دفعہ ۱۴۴ لگا کر جلسے روکے گئے، بلکہ جو باتیں دفعہ ۱۴۴ کے دائرہ میں نہیں آتیں، جیسے سیاہ پٹیاں بازوؤں پر باندھنا یا سیاہ جھنڈے لگانا حتیٰ کہ مسجدوں میں دعا کے لیے نمازیوں سے کہہ کا کہنا، ان باتوں پر بھی کہیں کہیں دست اندازی کی گئی جس کے نتیجہ میں دو جگہ پولیس اور مسلمانوں کے درمیان تصادم کی صورت پیدا ہوئی اور جس امن و قانون کی حفاظت کے نام پر ایک غیر معمولی رویہ اختیار کیا گیا تھا اسے خود اس کے محافظوں ہی نے اس غیر معمولی حد سے بھی آگے بڑھ کر آگ لگا ڈالی۔

یہ دو مقام —— فیروز آباد اور بنارس —— اس نئے مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے بارے کیے جانے کی بہت ہی افسوس ناک یادگار رہیں گے۔ یہاں پولیس اور پی اے سی نے اپنی ہی لگائی ہوئی آگ کو پھیلانے کے لیے جس سنگدلی اور بے شرمی کا مظاہرہ جن سنگھی عناصر کو ساتھ لے کر کیا اُس کے آثار دیکھ کر ریاستی کانگرس کی صدر مسز راجندر کماری باجپئی بھی، معتبر روایتوں کے مطابق حیران ہو کر رہ گئیں۔ خود اس نام نہاد "نظم و نسق" کے سربراہ یعنی یو، پی کے وزیر اعلیٰ پنڈت کملا پتی ترپاٹھی کے موقعوں پر جانے کے بعد

بیانات میں، سابقہ بیانوں پر سخن سازی کے ساتھ ساتھ شرمساری کی بھی صاف کیفیت نظر آرہی ہے اور وہ لوگ جو ریاستی حکومت اور مرکزی قیادت کا رُخ دیکھ کر ان غلط کاریوں کی تحسین کرنے کھڑے ہو گئے تھے اور ایک کارنامہ بتا رہے تھے کہ مسلم مجلس اور مسلم لیگ وغیرہ کے مفسدانہ منصوبوں کو نہایت فرض شناسی اور مستعدی سے ناکام بنا کر ریاست کا امن و امان بچا لیا گیا وہ بھی اب قبلہ بدل کر مسز اندرا گاندھی جی کی ان کوششوں میں شرکت کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں کہ مسلمانوں کے مجروح جذبات کا مداوا کیا جائے۔

یہ مسلم یونیورسٹی کے اس وقت کے مسئلے کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو خود وہ نیا ایکٹ ہے جس نے یہ مسئلہ پیدا کیا۔

یہ ایکٹ اچھا ہے یا بُرا؟ یونیورسٹی اور مسلمانوں کے لیے مفید ہے یا نقصان دہ؟ اس کا آخری جواب ایکٹ کے مفصل تجزیہ پر منحصر ہے۔ لیکن مسلمانوں کی اس بے اطمینانی اور ناراضگی کو اس بنیاد پر غلط نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ایکٹ کی تفصیلات جانے بغیر ہی ناراضگی ظاہر کرنی شروع کر دی۔ مسلمانوں کی ناراضگی کی سب سے پہلی اور نہایت معقول بنیاد یہ ہے کہ ان کا اہم ترین مطالبہ جس پر وہ اس نئے ایکٹ کے سلسلے میں اس وقت سے برابر زور دیتے آرہے تھے جب سے پچھلا ایکٹ (۱۹۶۵ء میں) منسوخ کیا گیا تھا، یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کا مطالبہ تھا۔ یعنی اسے مسلمانوں کی یونی ورسٹی مانتے ہوئے اس کا نظم و نسق مسلمانوں کے ہاتھ میں رہنے کی قانونی گارنٹی دی جائے۔ یہ اس لیے ہوا تھا کہ ۱۹۶۵ء کے واقعات کے سلسلے میں حکومت کے رویّے اور ہنگامی آرڈی نینس سے مسلمانوں کو اس بارے میں بہت شبہ ہو گیا تھا کہ ۱۹۵۱ء کے ترمیمی ایکٹ کے بعد کی عملی صورت حال بھی آئندہ باقی رہ سکے گی۔ حکومت کی طرف سے اس مطالبے کو کبھی رد نہیں کیا گیا۔ بلکہ فی الجملہ اطمینان دلایا جاتا رہا کہ نئے ایکٹ میں یہ بات ملحوظ رکھی جائے گی۔ مگر نئے ایکٹ کا بل پارلیمنٹ میں لانے میں اتنی ٹال مٹول کی گئی کہ مسلمان مشکوک ہو گئے اور اس مرحلہ پر بعض لوگوں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا کہ وہ حکومت کو نئے ایکٹ کے سلسلے میں اس کا پابند کرے۔ لیکن فیصلہ خلاف ہوا۔ اس فیصلے کے دلائل مسلمانوں کی نظر میں اطمینان بخش نہیں تھے۔ بعض غیر مسلم ماہرینِ قانون نے بھی اس پر نکتہ چینی کی۔ علاوہ ازیں اس سے حکومت پابند نہیں ہوتی تھی کہ نیا ایکٹ اقلیتی کردار کی بنیاد پر نہ بنائے۔ اس لیے مسلمانوں نے حکومت سے اپنا مطالبہ جاری رکھا اور حکومت نے اس دوران میں بھی ایک دن

یہ پوزیشن نہیں لی کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد اس مطالبہ کا حق مسلمانوں کو نہیں ہے۔ حتیٰ کہ نئے ایکٹ کا مسودہ تیار کر کے مسلمان اہل الرائے کے پاس ان کی رائے لینے کے لیے بھیجا گیا۔ اور اس کے ناقابل قبول قرار دیے جانے پر ایک کمیٹی اس ایکٹ کے لیے سفارشات پیش کرنے کو نامزد کی گئی۔ جو بیگ کمیٹی کہلائی اس کمیٹی کی سفارشات متفقہ طور پر اس مطالبے کے اور اسی قبیل کے دیگر مطالبوں کے حق میں تھیں یہ مسلمانوں کے مطالبے کے حق بجانب ہونے کی نہایت وزنی سند تھی اور اس نوعیت کی تھی کہ اسے ایک معنیٰ میں خود حکومت کا تسلیم کرنا وہ سمجھ سکتے تھے۔ مزید براں ۱۹۷۱ء میں پارلیمنٹ کے درمیانی الکشن کے موقع پر حکمراں کانگریس کے انتخابی منشور میں اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کے تحفظ کی دفعہ شامل کر کے بھی یہ تأثر دیا گیا کہ کانگریس اگر اس الکشن کے بعد برسراقتدار آتی ہے تو وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال کرے گی۔ کسی بھی دوسری اقلیت کے تعلیمی اداروں کا کوئی ایسا مسئلہ اس وقت موجود نہیں تھا جس کے لیے اس دفعہ کو اس خاص ڈھنگ سے منشور میں شامل کرنے کی ضرورت ہوتی۔ مسلمانوں کے بعض نمائندے بار بار یہ بات کہہ چکے ہیں اور کوئی تردید نہیں ہوئی ہے کہ یہ دفعہ مسلم یونیورسٹی ہی کے سلسلہ میں اُن کی گفتگوؤں پر یقین دہانی کے طور پر شامل کی گئی تھی۔

اس پس منظر میں نئے ترمیمی ایکٹ کا بل پارلیمنٹ میں پیش ہوتا ہے اور وزیراعظم صاف صاف کہتی ہیں کہ

"مسلم یونیورسٹی یا کسی ایسی دیگر یونیورسٹی کے جسے مرکز سے مالی امداد ملتی ہو اقلیتی کردار کو برقرار رکھنا ممکن نہیں ہے۔" (قومی آواز۔ ۱۰ مئی ۱۹۷۲ء)

اس پر اگر مسلمان ناراض ہوتے ہیں تو کیا غلط ہے؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ انھیں پہلے ایکٹ کا مطالعہ کرنا چاہیے پھر پسند اور ناپسند کی بات کرنی چاہیے!

وزیر اعظم یا وزیر تعلیم نے اگر کہا ہوتا کہ اس نئے ایکٹ سے یونیورسٹی کا اقلیتی کردار مجروح نہیں ہوتا ہے تو ضرور مسلمانوں سے کہا جا سکتا تھا کہ پہلے وہ ایکٹ کو پڑھیں اور پھر کوئی فیصلہ کریں۔ لیکن جب اُن کے سب سے اہم مطالبے کے بارے میں خود ہی پوری صفائی سے کہہ دیا گیا کہ اسے اس ایکٹ میں نہیں مانا گیا ہے تو پھر ان کی ناراضگی کیلئے کسی دوسری چیز کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟

کیسے کیسے لوگ، اقتدار کی پرستش اور مفادات کی ریس یا سیکولرازم کے مرض نے پیدا کر دیے ہیں کہ

وہ واقعات کے اس تمام پس منظر سے مکمل تجاہل کی جرأت دکھاتے ہوئے مسلمانوں کی اس ناراضگی کو ایک حماقت وجہالت یا ان کے ایک طبقہ کی ظلمت پسندی اور رجعت پرستی بتاکر ان سے پوچھتے ہیں کہ آخر کس بات پر یہ شور وغوغا ہے؟

کہنے سننے کی کچھ گنجائش رہ جاتی اگر وزیر اعظم یا وزیر تعلیم نے اس مطالبے کو رد کرنے کے اسباب میں کوئی وزنی بات پیش کی ہوتی۔ لیکن جو دو تین باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی بات کسی حاشیے اور شرح سے بھی وزنی ہو کر سامنے نہیں آئی۔ ایک بات تو اوپر کے نقل کردہ فقرہ ہی میں مذکور ہے کہ جس یونیورسٹی کو مرکز سے امداد ملتی ہو اسے اقلیتی نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن یہ کیا دلیل ہوئی؟ انداز یہ ہے کہ جیسے کوئی دستور و آئین کی بات ہو۔ لیکن دستور کی کونسی دفعہ میں یہ لکھا ہوا ہے؟ کسی کو معلوم نہیں!

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ

"اگر اس مطالبے کو منظور کیا گیا تو حکومت کے لیے دیگر لسانی یا مذہبی اقلیتوں کے اسی قسم کے مطالبات کو روکنا ممکن نہ ہو سکے گا۔" (قومی آواز۔ ایضاً)

اس دلیل کا صاف مطلب یہ ہے کہ کوئی دستوری رکاوٹ مسلمانوں کا مطالبہ مان لیے جانے میں حائل نہیں ہے بلکہ صرف یہ اندیشہ رکاوٹ بن رہا ہے کہ کہیں دوسری اقلیتیں بھی ایسے ہی مطالبات نہ کرنے لگیں۔ لیکن ایک دستوری نظام حکومت میں کسی بات کو ماننے نہ ماننے کے لیے دلیل کا یہ کون سا انداز ہے! کیا یہ کوئی تنخواہوں میں اضافہ کا قصہ ہے کہ ایک محکمہ کے ملازموں کی تنخواہ یہ سوچ کر نہیں بڑھائی جا سکتی کہ دوسرے بھی ایسا ہی مطالبہ کریں گے جس کا بار حکومت کا مالیہ نہیں اٹھا سکتا؟ مسلمان دستور کی دفعہ ۳۰ کے حوالے سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کی یونیورسٹی کو ان کے ہاتھ سے نہ نکالا جائے۔ اس دلیل کو ایک دستوری ریاست میں یہ کہہ کر کیسے رد کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے بھی ایسا ہی مطالبہ کرنے لگیں گے؟ پھر اس سے قطع نظر اس میں خرابی کیا ہے کہ کوئی دوسری اقلیت بھی اپنی یونیورسٹی قائم کرنے لگے؟ ۔۔۔ واضح رہے کہ کسی دوسری اقلیت کی کوئی یونیورسٹی اس وقت موجود تو ہے نہیں، اس لیے قائم کرنے ہی کا سوال ہو سکتا ہے ۔۔۔ نہ وزیر اعظم ہی نے اس خرابی کی کوئی وضاحت فرمائی اور نہ ان کے کسی حامی نے بتایا کہ ان کی اس دلیل کا کیا وزن ہے؟

تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ:-

"اقلیت کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کا اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اس یونیورسٹی میں صرف آٹھ ہزار طلباء ہیں۔ جب تک مسلم عوام کو خاص (؟) تعلیمی دھارے میں نہیں لایا جاتا وہ بقیہ عوام کے ساتھ آگے بڑھنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔" (ایضاً)

بالکل ممکن ہے کہ وزیر اعظم کا خیال صحیح ہو اور اسے قبول کر لینے ہی میں مسلم اقلیت کی بھلائی ہو۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا تو اس اقلیت ہی کا کام ہے کہ اس کی بھلائی کس بات میں ہے! وزیر اعظم مشورہ دے سکتی ہیں، سمجھا سکتی ہیں، لیکن وہ اپنی رائے کو اقلیت پر لاد بیٹھیں تو اس کا نام "ڈکٹیٹرشپ" کے سوا کچھ اور نہیں، اور افسوس ہے کہ ان کی تینوں ہی دلیلوں میں اس کی دھمک سنائی دے رہی ہے! وزیر اعظم کو اگر اپنی رائے کی صحت پر اعتماد تھا تو انھیں موقع دینا چاہیے تھا کہ متعلقہ لوگ اس پر غور کر کے اپنا ردعمل ظاہر کریں لیکن انھوں نے بل کو پیش ہونے کے ساتھ ہی اس عجلت سے پاس کرایا جیسے وہ اس اعتماد سے بالکل خالی ہوں اور مذکورہ بالا الفاظ سے لوگوں کی رائے ہموار کرنے کے بجائے محض ایک فیصلہ انھیں سنا رہی ہوں۔ پارلیمنٹ میں مسلم نمائندے چیختے رہ گئے کہ بل کو رائے عامہ کے لیے مشتہر کیا جائے یا کم از کم اس پر بحث کو اگلے اجلاس تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ لیکن ۳۰ مئی کو ایک پیش کیا جانے والا یہ بل کانگرس کی بھاری اکثریت کے بل پر یکم جون کو پاس کرا کے رکھ دیا گیا۔ جیسے کوئی غیر اختلافی اور عوام کے کسی چھوٹے طبقے کی بھی دلچسپی نہ رکھنے والا بل ہو۔ مسلمان یا ان کا کوئی طبقہ اگر اس طرز عمل پر محسوس کرتا ہے کہ ؎

مرا دل لے کے شیشے کی طرح پتھر پہ دے پٹکا ۔۔۔ نہیں کہتا رہ گیا ظالم مرا دل ہے مرا دل ہو

تو حکومت کی حمایت میں صفحات سیاہ کرنے اور قلم کو تھکانے والے حضرات کو دانش ورانہ باتوں کے ساتھ تھوڑی سی زحمت کر کے یہ بھی بتانا چاہیے کہ اس میں بیجا کیا بات ہے؟

جو لوگ اس نئے ایکٹ کو اچھا اور بہت اچھا سمجھ رہے ہیں انھیں ایسی رائے کا پورا حق ہے۔ لیکن اسے اصلاً ان کی نظر میں برا بنانے کی ذمہ داری ان کے کسی طبقے سے بہت پہلے حکومت کے اس طرز عمل پر جاتی ہو جو انھیں خواہی نخواہی یہ یقین دلانے والا تھا کہ اس میں ضرور بہت برائی ہو جس کی بنا پر اسے جیب سے نکالتے ہی اس جبر و زبردستی کے ساتھ ان کے حلق میں انڈیلا گیا ہو۔ مسلمانوں کے کسی طبقے کی "کم اندیشی" یا "بداندیشی" کا توڑ کیا جا سکتا تھا مگر اس توڑ میں منہمک اصحاب کو یہ افسوس ہونا چاہیے کہ خود حکومت نے اس "آب حیات" پر جو زہر کا لیبل لگا دیا ہو اس کا توڑ کسی کے بس میں نہیں۔

لیکن مسلمانوں کی ناراضگی اور اُن کا احتجاج سو فیصدی حق بجانب سمجھنے کے باوجود اس نعرے کی تائید ہم نہیں کرسکتے کہ انھیں نئے سرے سے احتجاج کے لیے کھڑا ہونا چاہیئے۔ جہاں احتجاج میں دو درجن آدمی مار دیے جانے پر ایسی آسانی سے صبر کرکے بیٹھ جانا پڑا [illegible] جیسے بس کپڑے پھٹ گئے ہوں۔ وہاں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ احتجاج کرنے سے نہ کرنا ہزار بار اچھا تھا۔ ایک نئے احتجاج کا نعرہ دینا نہ عقلمندی ہے نہ غیرت مندی۔

ہمیں ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو ۲۰ اپریل کے [illegible] احتجاج کا نعرہ دیتے ہیں جبکہ صرف اپنے شہر لکھنؤ میں حکام نے [illegible] احتجاج کا بھی پورے شہر میں پتہ نہ چلا۔ بلکہ وہ دو درجن پروانے جو مر مٹے اُن کی خبر لینے تک نہ جا سکے [illegible] نے کوئی مسئلہ بناتے، لیکن مسلمانوں کو پکار رہے ہیں کہ [illegible] دن کا نہیں بلکہ ایک طویل مدت کا احتجاج انھیں منانا ہے!——

گزشتہ مہینے کے انہی صفحات میں [illegible] لکھا تھا کہ مسلمانوں کے معاملے میں بعض حالات یہاں ایسے ہیں جنھیں دور کیے بغیر "انتخابی یا سیاسی [illegible] کے ذریعہ کچھ نہیں حاصل کیا جاسکتا۔" آج اس پر اس اضافہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اگر [illegible] پسند کیا جائے تو [illegible] بات ہے، لڑائی کے نعرے کی آبرو تو رکھنی ہی چاہیئے [illegible] اگر [illegible] بار بار ایسے آبروئی اس نعرے کی کرائی گئی ہے [illegible] دوسری [illegible] اصل رائے کے باوجود اسکی تائید کرڈالیں [illegible] ایک اور [illegible] کا ہے!



زکوٰۃ ـــ اور ـــ ٹیکس

ایک تقابلی مطالعہ

(از استاذ یوسف القرضاوی)

ـــ قسط (۱) ـــ

[زکوٰۃ اسلام کے نظامِ فکر و نظامِ زندگی کا ایک اہم رکن ہے۔ موجودہ دور میں فلاحی ریاست کا تصور بروئے کار لانے کے لیے ٹیکس ہی کا سہارا لیا جاتا ہے تو زکوٰۃ اور ٹیکس کا تقابلی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان دونوں میں اشتراک اور اختلاف کے کیا پہلو ہیں، اور زکوٰۃ کا نظام ٹیکس سے مشابہ ہونے کے باوجود وہ کیا خصوصیات رکھتا ہے جن کا بدل ٹیکس میں نہیں مل سکتا، نیز موجودہ سماجی اور مالی نظریات کی روشنی میں زکوٰۃ کا مقام اور اس کی حیثیت کیا نکلتی ہے۔ زکوٰۃ کے موضوع پر مصنف کے ایک مضمون کا تلخیصی ترجمہ اس سے پہلے الفرقان میں دیا جا چکا ہے، یہ دراصل ان کی ایک ضخیم کتاب کے اجزاء ہیں۔ ـــ ـــ (مترجم)]

فصل اوّل ـــ ٹیکس اور زکوٰۃ کی حقیقت

ٹیکس، ماہرینِ مالیات کی تعریف کے مطابق، ایک قانونی فریضہ ہے، جسے دولت مند اشخاص اپنی استطاعت کے پیمانے سے ریاست کو ادا کرنے کے پابند ہیں، قطع نظر اس کے کہ ریاستی اداروں کی طرف سے انجام دی جانے والی پبلک خدمات کا کتنا فائدہ ان اشخاص کو پہونچتا ہے۔ یہ آمدنی

ایک پہلو سے حکومت کے عام اخراجات پورے کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، اور دوسرے پہلو سے ان اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی مقاصد کی تکمیل اس سے ہوتی ہے جنھیں ریاست اپنی ذمہ داری قرار دے ——

اور زکوٰۃ۔ علمائے شریعت کی تعریف کے مطابق، وہ ایک متعین اور مقرر حق ہے جو اللہ نے مسلمانوں کے اموال میں کچھ نامزد مستحقین (فقراء و مساکین وغیرہ) کے لیے قائم کیا ہے تاکہ یہ ان کی طرف سے نعمت الٰہی کا شکرانہ ہو، ذریعہ قرب و عنایت بنے، اور مال اور صاحب مال کی معنوی اور روحانی طہارت و پاکیزگی کا کام انجام دے۔

زکوٰۃ اور ٹیکس کی مشترکہ خصوصیات

مذکورہ بالا تعریفوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ اور ٹیکس کے درمیان کچھ باتیں مشترک ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو دونوں کو الگ الگ کرتی ہیں۔ پہلے ہم اشتراک اور اتفاق کے پہلو واضح کریں گے

(۱) جس طرح ٹیکس ایک قانونی ذمہ داری ہے اور اگر کوئی ادا نہ کرے تو قانون کی طاقت سے اسے مجبور کیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح زکوٰۃ بھی اگر کوئی مسلمان، جس پر زکوٰۃ واجب ہو، اپنے ایمانی تقاضے سے ادا کرنے میں ناکام رہے تو قانونی جبر سے وصول کی جائے گی، آخری درجہ کا جبر یہ ہے کہ طاقت استعمال کی جائے۔ سو اگر زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کرنے والا کچھ طاقت و جمعیت کا مالک ہے تو اس کے خلاف اسلحہ کی طاقت بھی استعمال کر کے یہ حق، اسلامی حکومت وصول کرے گی۔

(۲) جس طرح ٹیکس حکومت کو ادا کیے جاتے ہیں، خواہ وہ مرکزی حکومت ہو یا علاقائی، اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی میں اصل صورت یہی ہے کہ اس مخصوص عملہ کے واسطے سے، حکومت کو دی جائے، جس کو قرآن نے "العاملین علیہا" (عاملین زکوٰۃ) کے نام سے یاد کیا ہے۔

(۳) ٹیکس کے مقابلہ میں کوئی مخصوص اور متعین نفع نہیں ہوتا۔ بلکہ دینے والا، اپنے معاشرہ سے طرح طرح کے فائدے اٹھانے والے ایک فرد کی حیثیت سے، بلا کسی مخصوص عوض کے یہ رقم دیتا ہے، بالکل یہی حال زکوٰۃ کا بھی ہے، زکاۃ کے عوض مسلمان کے سامنے کوئی مخصوص اور متعین منفعت نہیں ہوتی۔ کچھ فائدے اس رقم کے یقیناً اس کی طرف بھی کسی نہ کسی شکل میں لوٹ کر آتے ہیں لیکن اس کی ادائیگی ان منافع سے قطع نظر محض اس بنیاد پر اس کے ذمہ ہوتی ہے کہ وہ ایک معاشرے میں رہنے کی بنا پر اس کی حمایت، کفالت اور اخوت سے مستفید ہوتا ہے، اس لیے اس کا بھی فرض ہے کہ ابنائے معاشرہ

خدمت میں حصہ لے، مفلسی، معذوری اور حادثات کی صورتوں کیلئے اُنکی دستگیری کرنے والے نظام میں شریک ہو اور عمومی طور سے اُمتِ مسلمہ کی تعمیر و ترقی کے ان کاموں میں، اس کا حصہ ہو جن میں کلمۂ حق کی سربلندی اور دعوتِ حق کی اشاعت کا سامان ہے۔

(۴) جدید نظریات میں ٹیکس کا مقصد صرف حکومت کا مالیہ بڑھانا اور اسے مستحکم کرنا نہیں ہوتا بلکہ کچھ سیاسی، اقتصادی، اور سماجی مقاصد بھی ہوتے ہیں جو ٹیکس کی اسکیموں میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ اور مالی نقطۂ نظر سے زیادہ ان کی اہمیت ہوتی ہے ـــــ بالکل یہی زکوٰۃ کی بھی نوعیت ہے اور اس کے سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کچھ اور بھی زیادہ وسیع، گہرے اور دوررس ہیں، جو انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

زکوٰۃ اور ٹیکس کے اختلافی عناصر

ان مشترک نقاط کے بالمقابل زکاۃ اور ٹیکس کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی بھی کچھ چیزیں ہیں ـــــ اور وہ یہ ہیں۔

(۱) سب سے پہلا فرق تو وہ ہے جو ان دونوں کے ناموں سے ظاہر ہو رہا ہے، لفظ "زکاۃ" کے معنی لغت میں پاکیزگی، طہارت اور برکت و نمو کے ہیں۔ کہا جاتا ہے "زکت نفسہ" یعنی اس کا نفس پاک اور صاف ہو گیا "زکا الزرع" کھیتی بڑھ گئی۔ "زکت البقعۃ" فلاں خطۂ زمین بابرکت ہو گیا۔

شریعتِ اسلامی نے مال کے واجب الادا حصہ کو "زکاۃ" کا نام دے کر ہی جو تصور اس فریضے کے بارے میں پیدا کیا ہے وہ ٹیکس کے لفظ سے پیدا ہونے والے تصور سے بالکل الگ ہے ـــــ ٹیکس کا ترجمہ عربی میں "ضریبہ" ہے، جو "ضرب" بہ معنی عائد کرنے، مسلط کرنے اور مکلف کرنے سے مشتق ہے۔ اسی سے قرآنِ مجید میں یہودیوں کے لیے "وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ" آیا ہے، یعنی اُن پر ذلت اور بیچارگی مسلط کر دی گئی ـــــ یہی وجہ ہے کہ ٹیکس کو ایک بار سمجھا جاتا ہے جو زبردستی لوگوں پر لاد دیا گیا ہے۔

برخلاف اس کے لفظ زکوٰۃ اور اس میں پنہاں، پاکیزگی، طہارت اور خیر و برکت کے معانی یہ تصور دیتے ہیں کہ اگر مال کا ایک متعین حصہ ان مصارف میں خرچ نہ کیا جائے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہیں اور بس خود ہی فائدہ اٹھا لینے پر اکتفا کیا جائے تو وہ مال نجس اور ناپاک ہے۔

اسی کے ساتھ لفظ زکوٰۃ ہی سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ مال جو ظاہر بینوں کو کم ہوتا نظر آتا ہے، درحقیقت بڑھتا اور بابرکت ہوتا ہے جسے اربابِ بصیرت خوب محسوس کرتے ہیں۔ اور صاف طور سے قرآن میں فرمایا بھی گیا ہے: "یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ"[۱] "وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ"[۲] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "وَمَا نَقَصَ مَالٌ مِّنْ صَدَقَةٍ"[۳]

زکوٰۃ کا لفظ یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ طہارت و برکت صرف مال ہی میں نہیں ہوتی، انسان میں بھی رونما ہوتی ہے ـــ دینے والے انسان میں بھی اور لینے والے انسان میں بھی ـــ جسے زکوٰۃ دی جاتی ہے اس کا نفس اپنا حق پا کر بغض و حسد کے رذائل سے پاک ہو جاتا ہے اور معیشت کا معیار بھی بڑھتا ہے، رہا دینے والا تو اس کے نفس کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے بخل اور خود پرستی کی گندگی سے طہارت ملتی ہے، خرچ اور سخاوت کا مادہ پیدا ہوتا ہے ـــــ اور اللہ کی طرف سے برکتیں اس پر اور اس کے اہل و عیال پر نازل ہوتی ہیں۔

(۲) زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے جو بندۂ مسلم پر اللہ کے شکر اور حصولِ رضا و تقرب کے لیے فرض کی گئی ہے، جبکہ ٹیکس محض ایک شہری فریضہ ہے جو عبادت اور قربِ الٰہی کے کوئی معنی اپنے اندر نہیں رکھتا ـــ یہی بنیاد ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں نیتِ عبادت بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ اللہ کے یہاں قبول نہیں (انما الاعمال بالنیات)۔

زکوٰۃ کی اسی حیثیت کی بنا پر قرآنِ مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ کوئی اٹھائیس جگہ آتا ہے۔ اور ان احادیث نبویہ کا تو شمار ہی نہیں جن میں یہ دونوں ساتھ ساتھ مذکور ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ و مسائل کی کتابوں میں بھی زکوٰۃ کا بیان عبادات ہی کے ذیل میں آتا ہے۔ اور زکوٰۃ کی اس عبادتی حیثیت ہی کی بنا پر [illegible] دونوں پر لازم ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا اہم فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار ایک حد ہے جو شارع نے مقرر کر دی۔ اسی نے قابلِ زکوٰۃ مال کا نصاب بھی مقرر کیا ہے، اور اس سے کم مقدار کو مستثنیٰ ٹھہرا دیا۔ پس اب کسی کو حق نہیں ہے کہ

---

[۱] اللہ مٹاتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے زکوٰۃ و صدقات کو (البقرہ آیت ۲۷۶) [۲] جو کچھ بھی تم راہ خدا میں نکالتے ہو اللہ اس کا بدل دیتا ہے (سبا آیت ۳۹) [۳] کوئی مال صدقے سے کم نہیں ہوتا۔ (ترمذی)

ان میں کوئی ردوبدل یا کمی بیشی کرے، اسی لیے ہم نے (متعلقہ بحث میں) ان انتہا پسندوں کے مطالبہ کو رد کر دیا ہے جو عصرِ حاضر کے بدلے ہوئے حالات کی دلیل سے زکوٰۃ کی مقررہ مقداروں میں اضافہ کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں ـــــ بخلاف ٹیکس کے، کہ وہ کس مال پر لیا جائے گا؟ کتنی مقدار پر لیا جائے گا؟ اور کس شرح سے لیا جائے گا؟ یہ سب حکومتِ وقت کی صوابدید پر موقوف ہے۔ بلکہ سرے سے اس کا عائد کیا جانا اور ختم کر دیا جانا بھی حکومت پر منحصر ہے۔

(۴) اب ایک چوتھا فرق اسی سے فرق سے اور نکلتا ہے کہ زکوٰۃ ایک دائمی اور مستقل فریضہ ہے۔ جب تک دنیا میں اسلام اور اس کے نام لیوا موجود ہیں یہ فریضہ اپنی جگہ قائم ہے۔ حکومت عادل ہے یا جابر، اس سے کوئی فرق اس کی فرضیت پر نہیں پڑتا، جس طرح نماز دین کا ستون ہے، زکوٰۃ اس کی سربلندی ہے، برخلاف اس کے ٹیکس میں اس ثبات و دوام کا وجود نہیں۔ نہ اس کے اقسام میں نہ اس کے نصاب میں، نہ اس کی شرح اور مقدار میں ـــ حکومت کو ہر وقت [illegible] اپنی رائے اور ضرورت کے مطابق کمی بیشی کرنے کا اختیار ہے۔ بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا اس کا نفسِ وجود ہی ضروری نہیں ضرورت نہ سمجھی جائے تو سرے سے ختم ہی کیا جا سکتا ہے۔

(۵) زکوٰۃ کے کچھ خاص مصرف ہیں، جن کو قرآن مجید اور سنتِ نبویؐ نے بہت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ یہ ایسے واضح اور متعین ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو ہر مسلمان ان میں۔ یا کم از کم ان میں سے زیادہ تر میں، اپنی زکاۃ کو خود صرف کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس ٹیکس کے مصارف متعین نہیں ہیں، وہ ریاست کی عام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے اور ہر حکومت اپنی صوابدید کے مطابق اس کی خرچ کی مدیں متعین کرتی ہے ـــ اسی بنا پر زکاۃ کا بجٹ ریاست کے عام بجٹ سے الگ ایک مستقل بجٹ ہوتا ہے اور اس کی مدیں وہی ہوتی ہیں جو اللہ نے متعین کر دی ہیں۔

(۶) یہاں ایک فرق اور سامنے آگیا کہ ٹیکس کا [illegible] حکومت اور ٹیکس دہندہ کے درمیان محدود ہے۔ حکومت ہی اس کا قانون بنانے والی ہے، حکومت ہی اس کی مقدار متعین کرتی ہے، حکومت ہی اسے وصول کرتی ہے۔ اور حکومت ہی کو یہ اختیار ہے کہ کسی خاص وجہ سے، خواہ ایک مدت کے لیے یا مستقل طور پر، اس میں کچھ کمی کر دے یا [illegible] کسی چیز کو ساقط کر دے،

یا بالکل ختم ہی کر دے پس اگر حکومت لاپروائی کرے، یا وصولیابی میں تاخیر کرے تو متعلقہ شخص پر عدم ادائیگی کا کوئی الزام نہیں آتا ـــــ اس کے برعکس زکوٰۃ کی ادائیگی کا رشتہ سب سے پہلے انسان اور خدا کے درمیان براہ راست ہے۔ خدا ہی نے اسے دولت دی، اسی نے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا اور اس کا نصاب، مقدار، مصارف وغیرہ متعین کیے۔ پس اگر مسلم حکومت نہ ہو جو کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرے، تو [illegible] ذمہ لازم ہے کہ خود مستحقین تک زکوٰۃ پہونچائے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ زکوٰۃ معاف ہو جائے۔ اس سلسلہ میں زکوٰۃ اور نماز کا حکم بالکل یکساں ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ایسی جگہ ہو جہاں نہ مسجد ہو اور نہ کوئی امام تو اسے چاہیے کہ جہاں ممکن ہو خود ہی نماز پڑھ لے۔ یہ نہیں کہ نماز اس سے معاف ہو جائے۔

زکوٰۃ کے مسئلہ میں بندہ اور مالک کے درمیان اس براہ راست تعلق کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ خوشی خوشی ادا کی جائے، قبولیت کی امید اور آرزو کے ساتھ کی جائے اور بہتر ہے کہ اس طرح کی کوئی دعا ادائیگی کے وقت کی جائے۔ جیسے اللّٰھم اجعلھا مغنماً ولا تجعلھا مغرماً۔[۱]

اور اسی نوعیت کی [illegible] ایک سچا مسلمان زکوٰۃ دینے سے بھاگتا نہیں، بلکہ دینے کے لیے لپکتا ہے۔ بہت سے مسلمان [illegible] مقدار سے بڑھ کر دینا چاہتے ہیں جبکہ ٹیکس میں معاملہ الٹا ہے آدمی دیتا بھی ہے تو کراہاً اور مجبوراً دیتا ہے۔

(۷) ساتواں فرق مقاصد اور نقطۂ نظر کا ہے۔ زکوٰۃ کے کچھ روحانی اور اخلاقی مقاصد بھی ہیں بلکہ اصل وہی ہیں، اور [illegible] ٹیکس [illegible] کا تصور بھی نہیں کر سکتا، لفظ زکوٰۃ پر کلام کے ضمن میں [illegible] اور زیادہ تفصیل کے ساتھ اس پر کلام "زکوٰۃ کے مقاصد و [illegible]" [illegible] زکوٰۃ کے مقاصد اور اس باب میں نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے تنہا یہ فرمان [illegible] جس میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ۔[۲]

---

[۱] اے اللہ اس [illegible] باعث اجر و ثواب بنا، اور [illegible] تاوان نہ بنا۔

[۲] الفرقان [illegible] [illegible] نکل چکا ہے۔

[۳] آپ ان کے مال [illegible] صدقہ [illegible] پاک اور صاف کریں اور ان کے لیے دعا کیجیے کہ آپ کی دعا ان کے لیے موجب تسکین ہے۔

ٹیکس کو ظاہر ہے کہ ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں۔ مدتیں ایسی گزریں کہ علمائے مالیات اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے کہ ٹیکس کا کوئی مقصد ریاستی خزانے کے لیے مال فراہم کرنے کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ پھر جب خیالات میں ترقی ہوئی، اجتماعی اور سیاسی حالات کا رنگ بدلا تو یہ مسلک پسپا ہوا اور اُن لوگوں کا نقطۂ نظر غالب آیا جو اس کے قائل تھے کہ ٹیکس اسکیموں کے کچھ متعین اجتماعی اور اقتصادی مقاصد ہونے چاہئیں۔ جیسے کہیں خرچ کا حوصلہ پیدا کرنا، کہیں بس اندازی کی طرف راغب کرنا، کہیں زیبائش و آسائش پر خرچ کے رجحان کو گھٹانا، اور کہیں امیری و غریبی کے فرق کو کم کرنا لیکن اس ترقی میں یہ علماء مالیات یا ماہرین ٹیکس مقاصد کی مادّی سطح سے اٹھ کر اخلاقیات و روحانیات کی سطح پر نہیں جا سکے اور زکوٰۃ کا امتیاز اپنی جگہ پر قائم رہا۔

(۸) سب سے زیادہ نمایاں فرق دونوں کی قانونی یا نظری اساس اور بنیاد ہے۔ ٹیکس کی بابت اس بارے میں مختلف نقطۂ نظر ہیں جنھیں ہم آگے بیان کریں گے۔ زکوٰۃ کی قانونی اساس واضح ہے کیونکہ اس کی فرضیت اللہ کی طرف سے ہے (جو انسان اور اس کی تمام مالیات کا مالک ہے) اس اساس کو بھی ہم چار نظریوں کی شکل میں پیش کریں گے، جو درحقیقت ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی تائید بہم پہونچاتے ہیں ——— اس کے لیے بھی ہم نے ایک مستقل فصل ہی مناسب سمجھی ہے تاکہ کچھ حق ادا کیا جا سکے اور کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ زکوٰۃ بیک وقت عبادت بھی ہے اور ٹیکس بھی۔ ٹیکس اس پہلو سے ہے کہ وہ ایک مقررہ مالی حق کا نام ہے جس کی نگرانی حکومت کرتی ہے اور رضامندی سے نہ ملے تو جبراً وصول کرنا اس کا فرض ہے اور پھر اسے حسب مصارف خرچ کرنا بھی ——— لیکن اس کے ساتھ، بلکہ اس سے پہلے، وہ عبادت اور ایک اسلامی شعار ہے، اس کی ادائیگی کے ذریعہ بندۂ مسلم کو قرب خداوندی نصیب ہوتا ہے اور ادائیگی کے وقت اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے ایک رکن کی بجا آوری کر رہا ہے۔

یہاں مجھے یہ بات بھی کہنی چاہیے کہ یہ حقیقت ہمارے فقہاء کے سامنے بھی رہی ہے کہ اسلام کا یہ رکن عبادت اور ٹیکس دونوں کا جامع ہے۔ ٹیکس کا لفظ اگرچہ ان کے یہاں نہیں ملتا ہے لیکن

یہ بعد کی اصطلاح ہے۔ لیکن وہ اس مفہوم کو "حق" کے لفظ سے ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "انہا حق واجب للفقراء والمساکین فی اموال الاغنیاء"[1] یا یوں کہتے ہیں "ھی صلة للرحم وفیہا شائبة عبادة"[2]

ہمارے اس دعوے کی بہت زیادہ واضح دلیل بعض فقہاء و محققین کا یہ کلام ہے جو "الروض النضیر" کے مصنف نے زکوٰۃ کی حکمت اور حقیقت کے بیان میں نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اپنے مالدار بندوں کی دولت میں جو زکوٰۃ فرض فرمائی ہے، اُس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی برادری کے حاجت مند لوگوں کی خبرگیری ہو، اسلامی اخوت کا حق ادا ہو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک دوسرے کی اعانت اور دستگیری کا جو حکم ہے اُس کی تعمیل کی جائے۔ علاوہ ازیں جیسے عباداتِ بدنی کا حکم کر کے بدنی آزمائش کی گئی ہے اسی طرح اس مالی عبادت کی فرضیت سے نفس کی آزمائش ہے۔ پس یہ ایک طرح سے صلہ رحمی ہے اور ایک طرح سے عبادت کا بھی اس میں رنگ ہے۔ عبادتی رنگ کی وجہ سے اس میں نیت شرط ہے اور شانِ صلہ رحمی کی وجہ سے اس میں "نیابت" جائز ہے۔ یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کسی دوسرے ذریعہ سے کرا دی جائے۔ اس پر مجبور کرنا بھی صحیح ہے۔ اور جب جبر سے لی جائے تو صاحبِ زکاۃ کی طرف سے امام (حاکمِ وقت) کا نیت کر لینا بھی کافی ہے۔ اور میت کے مال میں سے بھی وصول کی جائے گی۔ اگرچہ اس نے وصیت بھی نہ کی ہو۔ صاحبِ زکوٰۃ کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کرتے ہوئے مستحقین کے زیادہ فائدہ کی رعایت رکھی جائے گی۔ نابالغ کے مال میں بھی واجب ہوگی[3]......"

---

[1] یہ فقراء و مساکین کا واجبی حق ہے مالداروں کے مال میں۔ [2] یہ ایک طرح کی صلہ رحمی ہے اور اس میں عبادت کا پہلو بھی ہے۔ [3] الروض النضیر ج ۲ ص ۳۰۹

BOMBAY ANDHRA TRANSPORT. CO.
(TRANSPORT CONTRACTOR)
113 BHANDARI STREET (CHAKLA)
BOMBAY - 3.

"بذل المجہود فی حل ابی داؤد"
اور اس کی خصوصیات

(مولانا تقی الدین ندوی مظاہری مقیم حال مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور)

"سنن ابی داؤد" حدیث کی ان کتابوں میں سے ہے، جن کو امت نے قبول عام کی سند دی ہے۔ اور ائمہ فن اور فقہاء و محدثین کا ہر دور میں ان پر اعتماد رہا ہے۔ بعض محققین کے قول کے مطابق یہ صحاح ستہ کا چوتھا اور جمہور کے نزدیک تیسرا رکن عظیم ہے۔

سنن کی خصوصیات و اوصاف کے بارے میں خود مؤلف کا بیان جس قدر قابل اعتماد و لائق وثوق ہو سکتا ہے، دوسرے کسی کا نہیں۔ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ مؤلفؒ اس سلسلہ میں اپنے اس خط میں جو اہل مکہ کے نام ارسال کیا تھا، تحریر فرماتے ہیں۔

"اور یہ ایسی کتاب ہے کہ تمہارے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر وہ سنت جو قابل اعتماد سند سے ثابت ہو وہ اس کے اندر موجود ہے، الا یہ کہ وہ کوئی ایسی بات ہو جو کسی حدیث سے مستنبط کی گئی ہو (صریح الفاظ میں نہ ہو)، میں نہیں جانتا کہ قرآن کریم کے بعد لوگوں کے لیے اس کتاب سے بڑھ کر اور کسی کتاب کا سیکھنا ضروری ہو اور کسی آدمی کے لیے اس میں نقصان نہیں ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کے بعد اور کسی چیز کو نہ لکھے۔ جب کوئی اس میں تفکر و تدبر سے کام لے گا اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرے گا، اس وقت اس کی قدر و منزلت کا اندازہ ہو سکے گا۔"[1]

---

[1] رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکۃ ص ۳۰۔

یہ واضح رہے کہ دیگر مؤلفین صحاح کی بہ نسبت امام ابوداؤد پر فقہی ذوق غالب ہے چنانچہ تمام ارباب صحاح میں صرف یہی ایک بزرگ ہیں جن کو علامہ ابو اسحٰق شیرازی نے طبقات الفقہاء میں جگہ دی ہے۔
امام موصوف کے اسی فقہی ذوق کا یہ نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کو صرف احادیث احکام کے لیے مختص فرمایا، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں آپ کو دیگر کتب صحاح کی طرح زہد اور فضائل اعمال وغیرہ کی حدیثیں نہیں ملیں گی، گو اس بنا پر احادیث کے بہت سے ابواب سے یہ کتاب خالی ہے لیکن فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے۔ صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں آپ کو نہیں ملے گا، چنانچہ حافظ ابوجعفر غرناطی (متوفی ۷۰۸ھ) صحاح ستہ کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے ابوداؤد کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

ولابی داؤد فی حصر احادیث	اور احادیث فقہیہ کے احاطہ و استیعاب میں
الاحکام واستیعابہا مالیس	ابوداؤد کو جو مقام حاصل ہے وہ دوسرے
لغیرہ[1]	مصنفین صحاح ستہ کو نہیں،

سنن ابی داؤد کی افادیت کے پیش نظر امام غزالی نے تصریح کی ہے کہ علم حدیث میں صرف یہی ایک کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے[2] محدث زکریا ساجی کے الفاظ ہیں:

کتاب اللہ عزوجل اصل الاسلام	اللہ کی کتاب اصل اسلام اور سنن ابی
وکتاب ابی داؤد عہد الاسلام[3]	داؤد فرمان اسلام ہے۔

امام ابوداؤد نے کتاب السنن کی تکمیل اپنے عہد شباب میں کر لی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ان کے شیخ امام احمد بن حنبل حیات تھے۔ امام ابوداؤد نے جب یہ کتاب امام موصوف کی خدمت میں پیش کی، تو امام موصوف نے اس کو پسند فرمایا، اور تحسین کی[4] حافظ ابوسعید المعروف بابن الاعرابی م ۳۴۰ھ فرماتے ہیں کہ: اگر کسی آدمی کے پاس اس مصحف کے سوا جس میں کتاب اللہ ہے اور اس کتاب کے سوا، اور کچھ نہ ہو تو ان دونوں کی موجودگی میں قطعاً کسی اور کتاب کی احتیاج نہیں[5]

[1] تدریب الراوی ص۵۶ [2] فتح المغیث ص۲۸ [3] شروط الائمۃ الستۃ ص۱۹ [4] مقدمہ تلخیص منذری ص۸ [5] معالم السنن ص۶

امام حمد بن محمد ابو سلیمان خطابی م ۳۸۸ھ اپنی مشہور شرح "معالم السنن" میں فرماتے ہیں۔

امام ابوداؤد کی کتاب السنن بلاشبہ ایسی عمدہ کتاب ہے کہ علم دین میں ایسی کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی، اور اس نے سب لوگوں کی طرف سے سندِ قبولیت حاصل کی۔ چنانچہ یہ کتاب علماء کے تمام فرقوں اور فقہاء کے سب طبقوں میں باوجود اختلاف مذاہب کے حَکَم مانی جاتی ہے۔ سب لوگ اسی کے گھاٹ پر آتے اور یہیں سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس پر اہل عراق، اہل مصر، بلاد مغرب اور روئے زمین کے بہت سے شہروں کے رہنے والوں کو اعتماد ہے البتہ اہل خراسان میں بیشتر لوگ محمد بن اسماعیل، مسلم بن الحجاج اور ان لوگوں کی کتابوں کے دلدادہ ہیں کہ جو صحیح احادیث جمع کرنے میں ان دونوں حضرات کے قدم بقدم چلے اور جنھوں نے جانچ پڑتال میں انہی کے شرائط کو ملحوظ رکھا لیکن ابوداؤد کی کتاب ترتیب کے اعتبار سے بہت اچھی اور فقہ کے لحاظ سے بہت بڑھی ہوئی ہے۔[1]

شارح مسلم امام نووی فرماتے ہیں۔

"فقہ وغیرہ سے اشتغال رکھنے والے کے لیے مناسب ہے کہ وہ سنن ابی داؤد کا اعتبار کرے اور اس سے پوری واقفیت رکھے کیونکہ اکثر احادیثِ احکام جن سے استدلال کیا گیا ہے مصنف نے اس کتاب میں تلخیص و تہذیب کے ساتھ ایک خاص انداز میں ان کا حصول آسان بنا دیا ہے۔[2]

بلندپایہ فقیہ علامہ ابن القیم فرماتے ہیں:

"چونکہ امام ابوداؤد کی کتاب السنن کو اسلام میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس لیے یہ کتاب اہل اسلام کے درمیان حَکَم بن گئی ہے۔ اور اختلافی مسائل میں فیصلہ کن ہے۔ اسی کی طرف انصاف پسند اپنے معاملات میں رجوع کرتے ہیں، محققین اسکے فیصلہ پر رضامند ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ کتاب احادیث احکام کی جامع ہے۔ اور مؤلف نے بہترین انداز میں اس کو مرتب کیا ہے۔ اس کی ترتیب و انتخاب میں نہایت سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے۔ مجروح اور ضعیف راویوں کی روایات کو نظر انداز کر دیا ہے۔[3]

ان ائمہ حدیث اور علماء و محققین کے بیانات سنن ابی داؤد کی قدر و منزلت جاننے کے لیے

---

[1] معالم السنن ص ۶ [2] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۲۳۱ [3] تہذیب السنن ص ۶

کافی ہیں۔ سنن کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر علماء و محدثین نے اس کے ساتھ غیر معمولی اعتناء کیا۔ اس کی متعدد شروح اور حواشی اور مستخرجات لکھے گئے۔ اس ناچیز نے اپنے مقالہ "الامام ابو داؤد و مکانۃ کتابہ السنن" میں بائیس شروح و متعلقات کا تعارف کرایا ہے ان میں سے اکثر کا "محدثین عظام" میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اس وقت جس شرح کا تفصیلی تعارف مقصود ہے وہ شیخ علامہ محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری م ۱۳۴۶ھ کی عظیم الشان شرح بذل المجہود فی حل ابی داؤد ہے۔

حضرت سہارنپوری اپنے علم و فضل، تفقہ فی الحدیث، وسعت مطالعہ، دقت نظر اور اصلاح و تربیت میں نادرۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جس کے وہ سرپرست و صدر مدرس تھے اس کو ابتدائی حالت سے بام عروج تک حق تعالیٰ نے ان ہی کے مبارک ہاتھوں سے پہونچایا۔ یہ مدرسہ اپنی بہت سی خصوصیات بالخصوص علم حدیث کی خدمت میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ مدرسہ مظاہر علوم کے دورۂ حدیث میں سنن ابی داؤد کا خصوصی اہتمام رہا ہے۔

حضرت سہارنپوری کے دور میں سنن ابی داؤد کی تدریس کی خدمت حضرت بذات خود انجام دیتے یا حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کاندھلوی کے سپرد ہوتی تھی، ان دونوں کے علاوہ اور کسی مدرس کے یہاں اس کا سبق حضرت سہارنپوری کے دور میں شاید ہی ہوا ہو۔ اسی لیے ابتدا ہی سے حضرت سہارنپوری کی آرزو تھی کہ حق تعالیٰ اس کتاب کی شرح لکھنے کی سعادت عطا فرمائے، چنانچہ اس کام عظیم کو شروع بھی فرمادیا تھا، اور اس کا نام "حل المعقود الملقب بالتعلیق المحمود علی سنن ابی داؤد" تجویز بھی فرمایا تھا، مگر مشاغل ہجوم کی وجہ سے یہ سلسلہ رک گیا، تین مرتبہ اس کو شروع فرمایا تیسری مرتبہ ۱۳۱۱ھ میں شروع کیا تھا، مگر درس و تدریس، مسائل افتاء اور دیگر موانع کی وجہ سے اس کام کو بند کرنا پڑا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تقدیر الٰہی میں ابھی اس کی تکمیل کا وقت نہیں آیا تھا۔ "قضاء و قدر میں ہر کام کا وقت مقرر ہے۔ اور وہ اشخاص بھی متعین ہوتے ہیں، جن کے ہاتھوں کسی کام کی تکمیل مقدر ہوتی ہے۔ پھر کوشش کے بعد بھی نہ کوئی کام اپنے وقت سے پہلے ہو سکتا ہے نہ اپنے وقت سے ٹل سکتا ہے" چنانچہ ۱۳۳۵ھ میں جب حضرت سہارنپوری کی عمر کا قافلہ ۶۴ سال کی منزلیں طے کر چکا تھا، اور اس کتاب کی تالیف و تکمیل کا وقت آ گیا، تو ایک دن حضرت سبق پڑھا کر درسگاہ سے تشریف لاتے تھے

کہ راستے میں کھڑے ہو گئے، اور اپنے سعید شاگرد (حضرت شیخ الحدیث) مولانا محمد زکریا مدظلہٗ اور آپ کے رفیق درس مولانا حسن احمد صاحب مرحوم کی طرف متوجہ ہو کر یوں ارشاد فرمایا کہ ساری عمر سے یہ تمنا رہی کہ ابوداؤد شریف پر کچھ لکھوں اور کئی دفعہ شروع بھی کیا مگر پورا نہ ہو سکا، حضرت گنگوہی کی حیات میں ہمیشہ تقاضا رہا کہ لکھوں اور جو اشکال ہو گا حضرت سے پوچھتا رہوں گا، حضرت کے وصال کے بعد طبیعت سرد ہو گئی لیکن پھر خیال ہوا کہ ہمارے مولانا یحییٰ صاحب تو حیات ہیں، جہاں اشکال ہو گا، ان سے اب پوچھتے رہیں گے۔ مگر ان کے انتقال پر تو خیال بالکل ہی نکل گیا تھا۔ مگر اب پھر خیال ہے کہ اگر تم دونوں میری مدد کرو تو شاید لکھ سکوں۔

حضرت شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا ضرور! اور یہ میری دعا کا ثمرہ ہے! حضرت نے فرمایا، اس کا کیا مطلب؟ میں نے عرض کیا کہ جب والد صاحب نے مشکوٰۃ کی ابتداء کرائی تھی، تو طویل دعا مانگی تھی! اور میری ایک ہی دعا تھی کہ یا اللہ! حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا ہے۔ اس کو مرنے تک اب میرے ساتھ وابستہ رکھیے۔ اب تک اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آرہی تھی، اب سمجھ میں آگئی کہ آٹھ دس برس تو حضرت کی اس شرح میں لگ ہی جائیں گے۔ اس وقت تک ان شاء اللہ حضرت کی برکت سے یہ ناکارہ حدیث پڑھانے کی منزل تک پہونچ جائے گا۔ حضرت شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ اس پر حضرت کا چہرہ مسرت سے کھل گیا۔ حضرت قدس سرہ نے اگلے دن مجھے بلا کر کتب خانہ سے نکالنے کے لیے کتابوں کی

لہ حق تعالیٰ نے حضرت قدس سرہٗ کو حب رسولؐ، علم حدیث کی تدریس، شرح و تشریح اور بحث و فکر کے جن کیفیات و کمالات سے نوازا تھا، یہ سب سے بڑا اس شرح کی تکمیل کا محرک تھا، اور دوسرا اہم سبب یہ بھی تھا کہ سنن ابی داؤد کی کوئی شرح کسی ایسے حنفی عالم کے قلم سے نہیں نکلی تھی جو فقہ و حدیث میں جامع ہو، حالانکہ کسی مسلک کے اثبات و ابطال میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں، کیونکہ مؤلف کے پیش نظر احکام کی روایات ہیں جن میں فقہی اختلافات، تحقیق اور قوت استدلال کے جوہر دکھلائے گئے ہیں۔ اس لیے اس کی شرح کی فکر و خیال حضرت نور اللہ مرقدہ کے دل و دماغ پر مستولی تھا۔

ایک فہرست لکھوائی، چنانچہ ۲ ربیع الاول کو مدرسہ کے کتب خانہ سے کتابیں لی گئیں اور دارالطلبہ کے "خزانے والے کمرہ" میں بذل المجہود کی تالیف ۳ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ میں شروع ہوئی۔

طریقہ تالیف یہ تھا کہ کتبخانہ میں موجود کتابوں کے متعلقہ مقامات کی طرف حضرت اشارہ فرماتے، اور شاگردوں کا کام متقدمین و متاخرین شراح و مؤلفین کی کتابوں سے مواد فراہم ... کرنا ہوتا تھا پھر انکو حضرت قدس سرہ کے سامنے پڑھتے، حضرت ان میں سے انتخاب و الفاظ فرماتے اور املاء کراتے تھے حضرت کے شب و روز کا محبوب مشغلہ اب بذل کی تالیف تھی، جس کو بہت بڑی عبادت سمجھتے تھے، اور شاگرد کا کام درس کے چند گھنٹوں کے سوا مواد فراہم کرنا، کتابوں کا مطالعہ کرنا، اور انھیں حضرت قدس سرہ کے سامنے پیش کرنا تھا۔

اس طرح نو مہینے گزرے اور بذل کی جلد اول محرم ذیقعدہ ۱۳۳۵ھ میں مکمل ہو گئی۔ شیخ کے احساسات و خیالات بلکہ قلب و جگر میں اس تالیف کی محبت سرایت کر گئی تھی، بلکہ یہ ان کا ذوق و حال بن گیا، خواب و بیداری ہر حالت میں بس یہی ایک خیال تھا جو ہمہ وقت مستولی رہتا جیسا کہ کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔ ع

آخر شیٔ انت فی کل هجعة اول شیٔ انت عند هبوبی

اس حقیقت کو وہی سمجھے جس کو کسی بلند مقصد کے ساتھ عشق کی نعمت سے حق تعالیٰ نے نوازا ہو۔ یہ چیز اس سے قرب و اختصاص کا ذریعہ بن جاتی ہے، اور جو شخص جس قدر اس کے کام و مقصد میں معین بنے گا، وہ اسی قدر اسکے نزدیک مقبول و محبوب بنے گا، اور یہی اس شخص کے قرب و اختصاص کا ذریعہ بن سکے گی، اس موقع پر قاضی ابن شداد کا بیان جو انھوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے حالات میں لکھا ہے، نقل کرنا بالکل حسب حال ہے۔

"سلطان کو جہاد سے غیر معمولی عشق اور محبت تھی۔ اور یہ محبت ان کے قلب و دماغ اور اعضاء پر مستولی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک اس جہاد کی بات کے سوا اور کوئی گفتگو نہیں۔ انکی نظر ہر وقت آلات جہاد و مجاہدین کی تیاری میں مشغول رہتی تھی سلطان کا میلان صرف انھیں لوگوں کی طرف تھا، جو جہاد کا ذکر کریں اور اس پر ترغیب دیں، ... یہی سلطان سے تقرب کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔"[1]

---

[1] النوادر السلطانیہ ص ۱۶

اگر کوئی شخص تراجم و طبقات کی کتابوں کا مطالعہ کرے گا تو اس غیر معمولی شغف و استغراق کی حیرت انگیز مثالیں علماء و مؤلفین، قائدین و مصلحین کے حالات میں ان کے اپنے اپنے ذوق و مسلک کے مطابق ملے گا۔

جب مقصد سے عشق و شغف کسی انسان پر مستولی ہو جاتا ہے تو اس سے حیرت انگیز واقعات کا صدور ہوتا ہے جو عام حالات و واقعات کے بالکل خلاف ہوتے ہیں، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ کے ساتھ بھی بعض حیرت انگیز واقعات پیش آئے۔ چنانچہ خواب میں ایک مرتبہ آپ نے دیکھا کہ کوئی تنبیہ کر رہا ہے کہ شرح میں فلاں مقام پر غلطی ہے۔ جب خواب سے بیدار ہوئے تو اپنے تلمیذ رشید حضرت مولانا محمد زکریا صاحب (مدظلہ) کو بلا کر وہ خواب سنایا، پھر اس مقام کی مراجعت کی، تو واقعی عبارت غلط تھی، چنانچہ اس کی اصلاح فرمائی۔

یہ مبارک کام اسی غیر معمولی انہماک و اہتمام سے جاری تھا شیخ اپنے قلب و قالب کے ساتھ اور شاگرد اپنی قوتوں و صلاحیتوں کے ساتھ ہمہ تن مشغول تھے کہ اچانک اس مقدس سرزمین کا سفر پیش آگیا جو مہبط وحی اور حدیث پاک کا مدرسہ اولیٰ ہے۔ اس موقع پر سعید شاگرد نے حضرت قدس سرہ کی کبر سنی اور ضعف کے باوجود اس شرح کی تکمیل کی آرزو کو محسوس کرتے ہوئے اس مبارک سفر میں رفاقت کی درخواست کی۔ حضرت قدس سرہ نے اس پر انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا۔ اور اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔ بفضلہ تعالیٰ شوال ۱۳۴۴ھ میں حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ عبادت و فرائض دینیہ اور امور طبعیہ کے سوا ہر کام سے اپنے آپ کو یکسو کر لیا۔ حضرت نے تین دعائیں مانگی تھیں، جو ان کی محبوب آرزوئیں تھیں۔ ایک یہ کہ حجاز مقدس میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آجائے، جس کے زیر سایہ امن و سلامتی قائم ہو۔ اور معاملات میں استحکام ہو۔ دوسری آرزو بذل کی تکمیل کی تھی۔ تیسری یہ کہ موت آئے تو مدینۃ الرسولؐ میں آئے اور جنت البقیع میں مدفن بنے۔ ع

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے　　قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

حق تعالیٰ شانہ نے حضرت قدس سرہ کی تینوں دعائیں جنھیں انھوں نے ملتزم پر مانگا تھا، قبول فرمائیں اور ان کی آرزوؤں کو پورا کر کے دکھا دیا۔

۲۱ شعبان المعظم ۱۳۴۵ھ کو ان کی سب سے بڑی آرزو جس کی انھوں نے خونِ جگر سے آبیاری کی تھی، وہ پوری ہوئی یعنی اس شرح کی تکمیل ہو گئی۔ اس کام میں دس سال اور قریباً پانچ ماہ کی مدت صرف

ہوئی [illegible] حضرت قدس سرہٗ
[illegible] مسرت انگیز اور شادمانی کا کوئی
دن نہیں آیا چنانچہ [illegible] مسرت وخوشی کے
[illegible] طرز پر کافی تعداد میں
[illegible] مبارک تاریخ کی اطلاع
[illegible]

[illegible] مرتبہ عربی ٹائپ میں حضرت
[illegible] انتہا اس تالیف
[illegible] ابی داؤد کا
[illegible] اجمال کی تفصیل یا توضیح
[illegible] درج کر دیا گیا ہے تاکہ علماء و
[illegible] مصادر [illegible]

"بذل المجہود کی [illegible] خصوصیات"

[illegible] نے خصوصی توجہ فرمائی ہے، [illegible] حضرت [illegible] کر سکتے ہیں جنھیں طویل مدت تک [illegible] سے واقف ہوں، لیکن ایک گونہ اندازہ [illegible] بیان [illegible] سکتا ہے

[illegible] لکھی گئیں یا مذہب حنفی کے اثبات یا کسی [illegible] اسلوب اور منطقی رنگ غالب

لہ [illegible] جن کے لیے حضرت مؤلف کی سوانح [illegible] کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

ہے ، ان کتابوں کے لطائف علمیہ و کلامیہ اور [illegible] کا حسن نیت اور [illegible]
ایک بڑا نقص یہ رہا ہے کہ محدثین اور متقدمین شراح حدیث [illegible]
ان میں رواۃ حدیث پر کلام [illegible] اور تعقبات [illegible] اس طرح کرفتی مباحث
جو علم حدیث سے تعلق رکھتے ہیں [illegible] کی کمی ہے [illegible] کی کتابوں میں سے
صرف تین کتابیں مستثنیٰ ہیں۔ ایک علامہ ظہیر [illegible] نیموی م ۱۳۲۹ھ [illegible] آثار
السنن والتعلیق الحسن علی آثار السنن" ہے مگر افسوس کہ اس کتاب [illegible] ابواب الطہارۃ سے
کتاب الصلوٰۃ تک کے مباحث [illegible] کتاب مکمل ہو جاتی [illegible]
دوسری حضرت حکیم الامت مولانا [illegible] کی کتاب "[illegible]
ہے ، یہ متقدمین شراح [illegible] ہے [illegible] محدثین کے طرز [illegible]
شروح کو امت میں قبولیت [illegible]
اسماء الرجال و اصول حدیث کی بڑی قیمتی [illegible] کتاب [illegible]
کے ساتھ روایت حدیث پر فنی حیثیت سے [illegible] کیا ہے۔

۲۔ مؤلف نے سنن کے [illegible]

۳۔ امام ابو داؤد کے [illegible]
خصوصی توجہ فرمائی ہے۔

۴۔ سنن کی تعلیقات [illegible]
تحقیق کرنے کے بعد [illegible] کا اظہار
فرمادیا ہے۔

۵۔ روایات [illegible] مؤلف نے اس موقع
پر جس وقت نظر اور [illegible]

۶۔ اسی طرح جہاں [illegible] اور ایسی توضیح
وتشریح فرمائی جس سے [illegible]

۷۔ جن جگہوں پر شراح حدیث [illegible] یا ان کا [illegible] اپنی ذاتی

تحقیق سے اس کو اس طرح دو دو فرمایا ہے کہ پڑھ کر قلب کو اطمینان نصیب ہو جاتا ہے۔ اور گتھی سلجھ جاتی ہے۔

۸۔ حضرت مؤلف نے استنباط و استخراج کے ایسے دقیق و لطیف نکات اپنی شرح میں بکھیر رکھے ہیں جو ان کی سلامت فکر اور کتب حدیث پر عمیق و وسیع نظر کے شاہد عدل ہیں۔

۹۔ بذل المجہود کے محاسن میں سے فتن و ملاحم کی روایات کی شرح بھی ہے جس سے حضرت مؤلف کی غیر معمولی محنت اور دقت نظر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مؤلف نے ان فتن کی تعیین فرمائی ہے جن کی طرف ان احادیث میں اشارے کیے گئے ہیں۔ اور بعض مقامات پر کسی ایک کو ترجیح دی ہے۔ اور ان تحقیقات کو پورے جزم و وثوق کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ قاری کو اعتماد حاصل ہو۔

۱۰۔ حضرت مؤلف نے اس شرح میں امام ربانی محدث کبیر مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کی تحقیقات سے جابجا استفادہ کیا ہے۔ حضرت کے یہ افادات ان کے نامور شاگرد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی نے قلمبند فرمائے تھے۔

بذل المجہود کے بارے میں اکابر علماء و محدثین کی آراء

اس شرح کو دیکھ کر علماء عرب و عجم نے جن تاثرات کا اظہار فرمایا ہے۔ ان کی فہرست طویل ہے۔ البتہ بذل جلد اول کے ٹائیٹل پر جن اکابر علماء کی تقریظات طبع ہوئی ہیں، ان میں سے چند کو اختصاراً نقل کرتا ہوں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شرح کو ملاحظہ فرمانے کے بعد تحریر فرمایا "میں نے اس تعلیق کو فن اسناد و روایت میں کافی، اور اصول اجتہاد و درایت میں شافی، اور عقلی و نقلی مباحث میں کافی پایا کیونکر نہ ہو جبکہ کوئی زمانہ اور المعی دوراں نے اس کو تحریر فرمایا ہے۔"

محدث عصر حضرت علامہ مولانا انور شاہ کشمیری تحریر فرماتے ہیں: "سنن ابی داؤد کی اب تک کوئی تعلیق ایسی نہیں لکھی گئی، جو حل کتاب میں کافی ہو، اور جس میں اس کا حق ادا کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ نے ہمارے آقا عارف فقیہ شیخنا و شیخ الفقہ والحدیث مسند الوقت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کو جو ہمارے شیخ اور ہمارے مشائخ کے شیخ حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ

کے خلیفہ ہیں، ان کو اس خدمت کی طرف متوجہ فرمایا۔ اور حضرت نے اس کا پورا حق ادا کر دیا۔ کافی و شافی بحث فرمائی، متن حدیث کی شرح کی اور اقوال ابوداؤد جن کے مطالب مخفی تھے، ان کو واضح فرمایا۔ اور دشوار مقامات کو سہل و نرم بنا دیا۔ جس طرح امام ابوداؤد کے لیے حدیث کو نرم بنایا گیا تھا۔ تراجم کو ضبط فرمایا۔ المفترق والمختلف کے درمیان امتیاز قائم فرمایا۔ اور المؤتلف والمختلف کی وضاحت فرمائی، فقہی مسائل کا استخراج کیا۔ اور علماء احناف کی توجیہات کو بیان فرمایا۔ اور یہ شرح ایسی ہو گئی کہ جس سے دلوں کو ٹھنڈک اور آنکھوں کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت مؤلف کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس اس کو ذخیرہ بنا دیا، اور امت اسلامیہ اور علماء پر ان کا احسان عظیم قائم فرمایا۔ حق تعالیٰ تمام مسلمانوں کی طرف سے انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

—— شیخ العرب والعجم حضرت اقدس مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ حضرت اقدس قدس سرہٗ کے لیے طویل القاب لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: "حق تعالیٰ نے اس امت اسلامیہ پر احسان عظیم فرمایا کہ حضرت قدس سرہٗ جیسی نادرۂ روزگار شخصیت کو اس شرح کی طرف متوجہ فرمایا اور حضرت اقدس نے اس شرح میں ان روایات کی بھی تشریح فرمائی، جن میں بہت سے لوگوں سے لغزش واقع ہوئی ہے۔ اور سنن کے دشوار مقامات کو بھی حل فرما دیا، جن کے حل سے بڑے بڑے اہل علم اور صاحب کمالات عاجز و درماندہ تھے۔ یہ ایسی عجیب شرح لکھی کہ علماء متقدمین کے لیے باعث افتخار اور اماثل و علماء کے لیے روشنی کا منارہ بن گئی۔"

مدینہ منورہ کے مشہور عالم علامہ شیخ محمد بن احمد جری مالکی نے اس شرح کی شان میں قصیدہ بھی لکھا ہے۔ وہ اس شرح کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "میں نے اس شرح میں وہ حیرت انگیز تحقیقات دیکھیں جو اور کہیں میری نگاہ سے نہیں گزری تھیں اور نہ میں نے ان کو سنا تھا، میں نے اس شرح میں ایسے دقیق و لطیف حقائق کا مطالعہ کیا، جن کو بیان کرنے سے بڑے بڑے اہل کمال عاجز تھے، اس شرح میں روایت و درایت کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح پورا کیا گیا ہے۔ اور ہر ایک کا پورا حق ادا کیا گیا ہے جو باتیں صحاح کی شروح اور کتب رجال اور کتب مذاہب میں منتشر تھیں ان کو نہایت سلیقہ مندی سے جمع کر دیا گیا ہے، اور اہل زیغ و ملحدین کے شبہات کا پوری طرح ازالہ کیا گیا ہے۔"

(باقی صفحہ ۳۸ پر ملاحظہ ہو)

ملا عبد القادر بدایونی

[illegible]

[illegible] ملا عبد القادر بدایونی کے بارے میں [illegible] چند [illegible]
[illegible]
[illegible] علوم [illegible]
بھی الفرقان [illegible]

[illegible] دربار ہی نہ تھے بلکہ
ملا عبد القادر بدایونی [illegible]
[illegible] شیخ مبارک شاہ تھا حضرت
[illegible] سے ملا عبد القادر
[illegible] پیدا
ہوئے [illegible] ابتدائی کتابیں صرف
نحو کی [illegible] ہجری میں تکمیل
علوم کی غرض سے [illegible] آئے [illegible] شیخ مبارک ناگوری سے
علوم [illegible] مولوی [illegible] پڑھے
تھے [illegible] فرماتے تھے۔ سنبھل سے چل کر علم
کے شوق میں بدایوں آئے [illegible] ملا سعید اللہ [illegible] کی خدمت میں رہ کر تکملۂ علوم
ظاہری کیا تھا۔ بعد تحصیل علوم بدایوں سے آگرہ واپس چلے گئے تھے۔ وہیں آپ کے والد کا انتقال
ہوا تھا مگر لاش قصبہ بساور لے جا کر دفن کی گئی تھی۔ طالب علمی کے زمانہ سے حضرت شیخ داؤد کرمانی

سے عقیدت رکھتے تھے۔ علوم صوری و معنوی سے بہرہ مند ہو کر سلسلہ قادریہ میں حضرت شیخ داؤد قادری کرمانی [illegible] والے کے مرید ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں حضرت شیخ جلال تھانیسری، حضرت شیخ سلیم چشتی، حضرت شیخ برہان الله [illegible] حضرت شیخ نظام الدین نارنولی، حضرت شیخ ابوالفتح گجراتی اور حضرت شیخ [illegible] خوش حال طریقت عالم [illegible] کا رنگ ادبی ذوق بہت بلند تھا۔ صرف و نحو [illegible] اور [illegible] تھا۔ علم تاریخ سے آپ کو خاص شغف تھا۔ منتخب التواریخ اور [illegible] آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ فن تاریخ گوئی میں کمال [illegible] تو آپ کا جواب نہ تھا [illegible] دستیاب [illegible] آپ کی بلند ادبی [illegible] سال پر کچھ [illegible] کی گئی جو بہت مقبول ہوئی۔ آپ کی تصانیف [illegible] کتابوں کے فارسی تراجم بھی شامل ہیں [illegible] ۱۰۰۴ھ [illegible] شیخ حبیب [illegible] بدایونی کے خلوص و محبت پر [illegible] بدایوں میں سکونت اختیار کی تھی [illegible] حضرت خواجہ سید محمد نظام الدین اولیاء [illegible] کا ن تعمیر کرایا تھا۔ [illegible]

[illegible] امام غزالی [illegible] کرامت سن سن کر… پر دیکھے میرے دل میں ان کا اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔ [illegible] کا ارادہ بھی کیا لیکن [illegible] واپس لے آئے اور کبھی اپنے [illegible] انہیں پہونچ [illegible] خلیفہ تھے [illegible] قصبہ [illegible] جا کر دفن کی گئی۔ [illegible]

بھی وہیں دفن کیا گیا تھا۔ ان دونوں مزاروں سے بڑا فیض جاری ہے۔ میں نے اپنے باپ کا قطعۂ تاریخ وفات بھی لکھا ہے۔ اس کے بعد ۹۷۱ھ ہجری میں شیخ جمال خاں منگن بن شیخ جیب منگن بدایونی کے اظہار خلوص و محبت پر بدایوں آکر رہنے لگا تھا اور اپنا گھر پتنگی ٹیلہ پر سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی نور اللہ مرقدہٗ کی ڈیوڑھی کے قریب تعمیر کرا لیا تھا اور حسین خاں حاکم بدایوں کی کچہری میں ملازمت کر لی تھی۔ بدایوں آئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ شیخ داؤد کرمانی کے خادم مسمی کالو مجھے ملے اور بولے بڑے افسوس کی بات ہے میاں داؤد کرمانی عالم میں موجود ہیں اور تم ایک مرتبہ بھی ان سے ملنے نہیں گئے۔ یہ سُن کر میں بہت پریشان ہوا۔ میری پریشانی دیکھ کر خداوند کریم نے سبب پیدا کر دیا۔ حسین خاں حاکم بدایوں ابراہیم حسین کے تعاقب میں بدایوں سے پنجاب کی طرف روانہ ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا اور لاہور پہونچ گیا۔ پھر لاہور سے قسیر گڑھ جا کر حضرت شیخ داؤد قادری کے دیدار پر انوار سے مشرف ہوا۔ ایسا حسین انسان میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مسکراہٹ اور تکلم میں ہونٹوں سے نور چمکتا تھا۔ جس کی جھلک نے میرے دل کو منور کر دیا۔ مجھے دیکھ کر میرا حال پوچھا اور بڑی شفقت سے اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھے مرید کر لیا اور خانقاہ میں رہنے کا حکم دیا۔ میں خانقاہ میں رہنے لگا اور ہر وقت شیخ کی صحبت میں رہ کر صفائی قلب حاصل کرتا رہا اور ذکر و شغل میں مصروف رہا۔ تین دن گزرنے کے بعد چوتھے روز جب دست بوس ہوا تو مجھے اپنے پاس بٹھا کر اپنی کلاہ مرحمت کی اور ارشاد فرمایا: "اب تم میری طرح اپنے اہل میں جا کر رہو۔ ہمارا یہی طریقہ ہے۔" پھر ایک چادر اور ایک رومال زنانخانہ سے منگوا کر میرے متعلقین کے لیے عطا کیا۔ یہ شفقت دیکھ کر میں نے عرض کی اگر پیرہن مرحمت ہوتا تو بہتر تھا۔ اس پر سوچ کر فرمایا: "وقت آنے پر وہ بھی مل جائے گا۔" پھر کچھ اسرار نہانی اور مقاصد و مطالب فقر بتا کر مجھے رخصت کر دیا۔

ان چار دن میں جو باتیں میں نے دیکھیں اور سنیں ان کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا اب میں سب کاروبار ترک کر کے اسی خانقاہ کی جاروب کشی کروں گا مگر اس کی بھی منظوری نہیں ہوئی۔ چنانچہ میں بحالت محزون چل دیا۔ بدحواسی میں میری چیخ نکل گئی جس کو سن کر شیخ نے مجھے اپنے پاس بلا کر بڑی تسلی دے کر فرمایا: "میری خانقاہ میں تین دن سے زیادہ کوئی فقیر نہیں ٹھہرتا۔ تجکو میں چوتھے دن رخصت کر رہا ہوں۔ یہ شرف تیرے لیے کیا کم ہے۔"

باقیات الصالحات میں مولوی عبدالوالی بدایونی لکھتے ہیں کہ شیر گڑھ سے واپس ہونے پر ملا عبدالقادر اکثر مشائخ عصر کی صحبت سے مستفید ہو کر نعمت باطنی پاتے رہے تھے۔ دو مرتبہ شیخ جلال تھانیسری خلیفہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض حاصل کیا تھا اور بذریعہ شیخ اعظم فاروقی بدایونی حضرت شیخ سلیم چشتی فتحپوری کی صحبت سے فیض یاب ہوئے تھے اور شیخ برہان الدین کالپی والے اور شیخ نظام الدین نارنولی کی زیارت سے فیض یاب ہو کر شیخ ابوالفتح گجراتی کی خدمت میں جا کر ان سے بھی تلقین ذکر پائی تھی۔ ان کی صحبت میں رہ کر ملّا نے عجیب فیض پایا تھا اور غریب مشاہدہ کیا تھا اور ان پر مطالب قرآنی منکشف ہو گئے تھے اور ایسی کیفیت ہو گئی تھی کہ آواز اور شمع کے گداز سے ان کو سوز و گداز ہونے لگتا تھا۔ ۹۷۶ھ ہجری میں سید علی اصغر بدایونی اور قاضی احمد کے ہمراہ شیخ نظام الدین امیٹھی والے کی خدمت میں پہنچ کر ان سے استفادہ حاصل کیا تھا۔ شیخ موصوف نے بھی اپنے سر کی کلاہ مرحمت کی تھی اور ملّا کو ایک حجرہ میں لے جا کر دو رکعت نماز ادا کرائی تھی۔

منتخب التواریخ میں ملّا نے لکھا ہے کہ میں نے وہ نماز عجیب حالت میں ادا کی تھی، اس وقت وہ فقیر باہر بیٹھے ہوئے ہندی پر اپنی آواز حزیں اور دل خراش صدا سے گا رہے تھے۔ اس کو سنتے ہی میری حالت متغیر ہو گئی تھی۔ اس وقت شیخ ممدوح نے مجھے اجازت اس دعا کے پڑھنے کی دی تھی اور فرمایا تھا کہ اس کو ہمیشہ پڑھتے رہنا۔ اللّٰھم انی اعوذبک من الصمم والبکم والجنون والجذام والبرص والعمیٰ۔ پھر شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے بے حد دوستی ہو گئی تھی اور بڑے خلوص کے ساتھ خط و کتابت ہونے لگی تھی۔ چنانچہ میں جس وقت بدایوں سے روانہ ہو کر دہلی ہوتا ہوا لاہور پہونچا ہوں تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مجھے ایک خط بھی لکھا تھا۔

تذکرۃ الفضلاء میں علامہ خافی خاں نے لکھا ہے کہ ۹۸۱ھ ہجری میں بوجہ تقرب بارگاہ حسین خاں حاکم بدایوں، جلال خاں قورچی اور حکیم عین الملک کے توسّل سے ملّا کی رسائی شہنشاہ اکبر کے دربار میں ہو گئی تھی اور حسن کارکردگی کے صلہ میں ایک ہزار بیگھے آراضی معافی دوامی در موضع عطاء پور پرگنہ بدایوں کے جاگیردار ہو گئے تھے۔ بعد ازاں قاضی علی بغدادی کی کوشش سے منصب ہزاری پر پہونچ کر بادشاہ کے حضور میں نذر گزارنے لگے تھے اور ہم کلامی کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔ شاہ کے مصاحب بن کر گروہ نورتن میں داخل ہو گئے تھے۔ بادشاہ نے ملّا کا رجحان تالیف و تصنیف کی طرف پا کر

کا تذکرہ ہے۔

توران میں اپنے علمی تبحر کی وجہ سے ملّا ہاتھوں ہاتھ لیے گئے شاہ توران نے ان کی ستم رسیدگی پر اظہار افسوس کیا اور اکبر کی ملحدانہ حرکات سن کر سخت برہم ہوا۔ اس طرح اکبر کی بے دینی کی خبر تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔ شریف مکّہ نے اس کا بھیجا ہوا سالانہ نذرانہ تک واپس کر دیا تب بادشاہ کی آنکھیں کھلیں۔ ملّا سے اختلاف پیدا کرنے کا نتیجہ معلوم ہوا۔ اپنے اوپر سے کفر کا الزام مٹانے کی غرض سے ایک بے نقطہ تفسیر قرآن مجید کی فیضی سے لکھوا کر جس کا نام سواطع الالہام ہے شاہ توران کے پاس اس عریضہ کے ساتھ بھیجی کہ ملّا سے مجھے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ وہ مجھے بلا وجہ بدنام کرتے ہیں میں ان کو علماء ملت سے جانتا ہوں۔ جس صحیفہ کا تذکرہ کر کے انھوں نے میری طرف سے آپ کو بدگمان کیا۔ یہ وہ بغرض ملاحظہ ارسال ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا کہ اگر ملّا آنا چاہیں تو ہندوستان واپس آسکتے ہیں۔ ان کی مراعات سابقہ بحال کی جائیں گی۔ ایک رباعی عربی زبان میں لکھوا کر شریف مکہ کے پاس بھجوائی جس کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

"بعض لوگ اللہ کو صاحب اولاد کہتے ہیں، بعض رسول کو جادوگر کہتے ہیں۔ جب اللہ و رسول ہی زبانِ خلق سے نہ بچ سکے تو میں کیا چیز ہوں۔"

اس رباعی کو پڑھ کر شریف مکہ نے اکبر کو سچا مسلمان سمجھ کر اس کا نذرانہ قبول کر لیا تھا۔ شاہ توران نے سمجھا بجھا کر اپنی ذمہ داری پر ملّا کو ہندوستان بھیج دیا تھا۔ ہندوستان واپس آکر ملّا تارک الدنیا ہو گئے تھے اور بدایوں میں رہ کر بقیہ عمر تصنیف و تالیف میں گزاری تھی۔ اکبر نے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ملّا کا آخیر زمانہ بڑی عسرت اور تنگ حالی میں گزرا۔ ان کے رفقاء نے ساتھ چھوڑ دیا تھا کوئی پاس تک نہیں آتا تھا۔ بعض بخوف سلطانی اور بعض اس خیال سے کہ انھوں نے محضر پر دستخط کیے تھے۔ ملّا نے ان حالات کی طرف ایک خط میں اشارہ کیا ہے جو انھوں نے اپنے دوست سید حیات علی بیہ پوری کو لکھا تھا۔ جو وظیفہ ان کو ملتا تھا وہ گزر بسر کے لیے ناکافی تھا اس لیے وہ اکثر شاہ ولایت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے لنگر خانہ سے مسکینوں کی طرح کھانا لا کر پیٹ کی آگ بجھایا کرتے تھے۔

یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ گیا ہے کہ ملّا عبدالقادر بدایونی نے دو شادیاں کی تھیں پہلی

بیوی سے ایک صاحبزادے پیدا ہوئے تھے۔ ان ماں بیٹوں کے انتقال کے بعد انھوں نے دوسری شادی بدایوں میں کی تھی اور خود ہی قطعۂ تاریخ لکھا تھا:

چوں مرا از عنایت ازلی　　اتصال باہ مہرے شد
عقل تاریخ کتخدائی ما　　گفت ماہ قرین مہرے شد

دوسری بیوی کے بطن سے ایک فرزند اور ایک دختر تولد ہوئے تھے۔ فرزند کا انتقال ملّا کی حیات ہی میں ہو گیا تھا۔ البتہ صاحبزادی سن بلوغ کو پہنچ کر خیرآباد بیاہی گئی تھیں۔

طبقات الاولیاء میں شیخ سعد الدین بصیر ثانی بدایونی لکھتے ہیں کہ آپ کی وفات کے بعد منتخب التواریخ منظر عام پر آئی تھی تو ایک تہلکہ مچ گیا تھا۔ ہر شخص کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

"حق اور صداقت کی روشنی میں ملّا نے ایک ایسی تاریخ مرتب کی ہے جس کا کوئی جواب نہیں"

جہانگیر بادشاہ کا زمانہ تھا۔ اڑتے اڑتے یہ خبر اس کے کان تک پہنچی تھی، بے حد ناراض ہوا تھا اور آپ کی اہلیہ مختر مہ اور خورد سال صاحبزادی کو دربار میں طلب کر لیا تھا۔ جب وہ بچی اس دربار میں حاضر ہوئی تو اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ (غالباً وہ اپنی سلامتی کے لیے آیات دعا کر رہی تھی)

مراۃ عالم میں بختاور خاں مورخ عالمگیری لکھتے ہیں کہ بادشاہ نے از راہ برہمی سے اس بچی سے پوچھا تھا کہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ اس نے بے ساختہ جواب دیا تھا۔ "اپنا سبق یاد کر رہی ہوں۔" ؎

گنہ بود مرد ستم گارہ را　　چہ تاواں زن و طفل بے چارہ را

(شیخ سعدی)

بادشاہ یہ سن کر ہنس پڑا تھا اور دونوں کو رہا کر دیا تھا۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ ملّا جب توران چلے گئے تھے تب ان کی اہلیہ اور صاحبزادی کو ندامت میں کے اکبر بادشاہ نے اپنے روبرو طلب کیا تھا اور اس وقت بچی نے یہ شعر پڑھا تھا۔

تذکرۃ الواصلین میں خان بہادر مولوی رضی الدین بسملؔ بدایونی لکھتے ہیں کہ مولانا عبد القادر صاحب طبقۂ علماء و مشائخ و شعراء و امراء عہد اکبری میں سے تھے۔ مولانا کی طرح سچ لکھنے والا ہم نے کسی مورخ کو سلف سے زمانہ حال تک نہیں دیکھا۔

کا تذکرہ ہے۔

توران میں اپنے علمی تبحر کی وجہ سے ملّا ہاتھوں ہاتھ لیے گئے شاہ توران نے ان کی ستم رسیدگی پر اظہار افسوس کیا اور اکبر کی ملحدانہ حرکات سُن کر سخت برہم ہوا۔ اس طرح اکبر کی بے دینی کی خبر تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔ شریف مکّہ نے اس کا بھیجا ہوا سالانہ نذرانہ تک واپس کر دیا تب بادشاہ کی آنکھیں کھلیں۔ ملّا سے اختلاف پیدا کرنے کا نتیجہ معلوم ہوا۔ اپنے اوپر سے کفر کا الزام مٹانے کی غرض سے ایک بے نقط تفسیر قرآن مجید کی فیضی سے لکھوا کر جس کا نام سواطع الالہام ہے شاہ توران کے پاس اس عریضہ کے ساتھ بھیجی کہ ملّا سے مجھے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ وہ مجھے بلا وجہ بدنام کرتے ہیں میں ان کو علماء ملّت سے جانتا ہوں۔ جس صحیفہ کا تذکرہ کر کے انھوں نے میری طرف سے آپ کو بدگمان کیا ہے وہ بغرض ملاحظہ ارسال ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا کہ اگر ملّا آنا چاہیں تو ہندوستان واپس آسکتے ہیں۔ ان کی مراعات سابقہ بحال کی جائیں گی۔ ایک رباعی عربی زبان میں لکھوا کر شریف مکہ کے پاس بھجوائی جس کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

"بعض لوگ اللہ کو صاحب اولاد کہتے ہیں، بعض رسول کو جادوگر کہتے ہیں۔ جب اللہ اور رسول ہی زبانِ خلق سے نہ بچ سکے تو میں کیا چیز ہوں۔"

اس رباعی کو پڑھ کر شریف مکہ نے اکبر کو سچا مسلمان سمجھ کر اس کا نذرانہ قبول کر لیا تھا۔ شاہ توران نے سمجھا بجھا کر اپنی ذمہ داری پر ملّا کو ہندوستان بھیج دیا تھا۔ ہندوستان واپس آکر ملّا تارک الدنیا ہو گئے تھے اور بدایوں میں رہ کر بقیہ عمر تصنیف و تالیف میں گزاری تھی۔ اکبر نے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ملّا کا آخیر زمانہ بڑی عسرت اور تنگ حالی میں گزرا۔ ان کے رفقاء نے ساتھ چھوڑ دیا تھا، کوئی پاس تک نہیں آتا تھا۔ بعض بخوف سلطانی اور بعض اس خیال سے کہ انھوں نے محضر پر دستخط کیے تھے۔ ملّا نے ان حالات کی طرف ایک خط میں اشارہ کیا ہے جو انھوں نے اپنے دوست سیّد حیات علی بیدپوری کو لکھا تھا۔ جو وظیفہ ان کو ملتا تھا وہ گزر بسر کے لیے ناکافی تھا اس لیے وہ اکثر شاہ ولایت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے لنگر خانہ سے مسکینوں کی طرح کھانا لاکر پیٹ کی آگ بجھایا کرتے تھے۔

یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ گیا ہے کہ ملّا عبد القادر بدایونی نے دو شادیاں کی تھیں پہلی

بیوی سے ایک صاحبزادے پیدا ہوئے تھے. ان ماں بیٹوں کے انتقال کے بعد انھوں نے دوسری شادی بدایوں میں کی تھی اور خود ہی قطعۂ تاریخ لکھا تھا:

چوں مرا از عنایت ازلی　　اتصال باہ مہرے شد
عقل تاریخ کتخدائی ما　　گفت ماہے قرین مہرے شد

دوسری بیوی کے بطن سے ایک فرزند اور ایک دختر تولد ہوئے تھے. فرزند کا انتقال ملا کی حیات ہی میں ہو گیا تھا. البتہ صاحبزادی سن بلوغ کو پہنچکر خیر آباد بیاہی گئی تھیں.

طبقات الادبا میں شیخ سعد الدین بصیر قنانی بدایونی لکھتے ہیں کہ آپ کی وفات کے بعد منتخب التواریخ منظر عام پر آئی تھی تو ایک تہلکہ مچ گیا تھا. ہر شخص کی زبان پر یہ الفاظ تھے.

"حق اور صداقت کی روشنی میں ملا نے ایک ایسی تاریخ مرتب کی ہے جس کا کوئی جواب نہیں"

جہانگیر بادشاہ کا زمانہ تھا. اڑتے اڑتے یہ خبر اس کے کان تک پہونچی تھی. بے حد ناراض ہوا تھا اور آپ کی اہلیہ محترمہ اور چھ سالہ صاحبزادی کو دربار میں طلب کر لیا تھا. جب وہ بچی اس دربار میں حاضر ہوئی تو اس کے ہونٹ ہل رہے تھے. (غالباً وہ اپنی سلامتی کے لئے خداسے دعا کر رہی تھی)

مرآۃ عالم میں بختاور خاں مورخ عالمگیری کہتے ہیں کہ بادشاہ نے نہایت برہمی سے اس بچی سے پوچھا تھا کہ تو کیا کہہ رہی ہے. اس نے بے ساختہ جواب دیا تھا. "اپنا سبق یاد کر رہی ہوں." ؎

گنہ بود مرد ستمگارہ را　　چہ تاوان زن و طفل بیچارہ را
(شیخ سعدی)

بادشاہ یہ سن کر ہنس پڑا تھا اور دونوں کو رہا کر دیا تھا. بعض مورخین کہتے ہیں کہ ملا جب توران چلے گئے تھے تب ان کی اہلیہ اور صاحبزادی کو حراست میں لے کر اکبر بادشاہ نے اپنے روبرو طلب کیا تھا اور اس وقت بچی نے یہ شعر پڑھا تھا.

تذکرۃ الواصلین میں خان بہادر مولوی رضی الدین بسمل بدایونی لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالقادر صاحب طبقۂ علماء و مشائخ و شعراء و امراء عہد اکبری میں سے تھے. مولانا کی طرح سچ لکھنے والا ہم نے کسی مورخ کو سلف سے زمانہ حال تک نہیں دیکھا.

وفات آپ کی ۲۹ ذیقعدہ ۱۰۰۴ھ ہجری کو بدایوں میں ان کے مکان واقع پتنگی ٹیلہ میں ہوئی تھی، نماز جنازہ جامع مسجد شمسی میں قاضی شہر قاضی غلام محمد نے پڑھائی تھی۔ انھوں نے ہی محضر پر دستخط کیے تھے۔ دفن کے وقت بے حد اژدھام آدمیوں کا تھا۔ حکام وقت تک موجود تھے۔ قبر کا کڑا بکا لگایا جا رہا تھا کہ ملا کے ایک شاگرد نے کہا "نجات الرشید" میں مخدوم صاحب نے لکھا ہے کہ کڑا کچی اینٹوں کا ہونا چاہیے۔" اتنا کہنا تھا کہ کڑا فوراً نیچے دھنس گیا تھا۔ پھر اسی طرح پکی اینٹوں کا کڑا دوبارہ لگایا گیا تھا مگر وہ بھی بیٹھ گیا تھا۔ تب بمشورہ قاضی شہر کچی اینٹوں کا کڑا لگایا گیا تھا وہ برقرار رہا تھا اور آج تک ہے۔ آپ کے مزار سے اکثر لوگوں کو فیض ہو چکا ہے۔

مزار شریف آپ کا بدایوں سے داتا گنج جانے والی سڑک کی جانب شمال شہر سے دو میل کے فاصلہ پر تیج رائے ولد لچھمن کا شتکار کے کھیت واقع موضع عطاءپور پرگنہ بدایوں میں ایک چبوترہ پختہ واقع ہے مگر حالت بوسیدہ ہے۔ سرہانے چراغدان بنا ہے۔ جانب شرق آپ کے بھائی شیخ محمد فاروقی کی قبر ہے۔ بائیں آپ کی پہلی بیوی اور دونوں لڑکوں کی قبریں ہیں ۱۳۵۱ھ ہجری میں مولوی اکرام عالم صاحب وکیل نے اس مزار کی درستی کرا دی تھی۔ اس سے بیشتر بہت خراب حالت میں تھا لیکن اس وقت بھی تمام قبروں کے نمود باقی تھیں۔ میری ناچیز رائے ہے کہ اس مزار کی جب بھی درستی کرائی جائے تو آپ کا یہ شعر لوح مزار پر ضرور کندہ کرا دیا جائے۔

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

"بذل المجہود فی حل ابی داؤد" ——— بقیہ صفحہ ۲۹

بحمد اللہ اب یہ عظیم شرح تیسری مرتبہ حضرت الاستاد مولانا محمد زکریا صاحب مدفیوضہم کے حواشی کے ساتھ حضرت ہی کے حکم سے دار العلوم ندوۃ العلماء کے پریس میں حضرت مولانا علی میاں ندوی مدظلہ کے زیر اہتمام عربی ٹائپ میں طبع ہو رہی ہے۔ اس کی جلد اول طبع ہو چکی ہے۔ جلد ثانی عنقریب طبع ہو کر آنے والی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مکہ مکرمہ سے مولانا نعمانی کا مکتوب مولانا نسیم احمد فریدی کے نام

[مولانا نعمانی شروع اپریل میں جنوبی افریقہ کے سفر پر روانہ ہوئے تھے، وہاں سے مشرقی افریقہ کے متعدد ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے ۵ جون کو حجاز مقدس پہونچے، اور مکۂ معظمہ سے مولانا فریدی کے نام ایک خط لکھا جس میں پورے سفر کی اجمالی روداد آگئی ہے۔ ذیل میں وہی مکتوب نذر ناظرین کیا جا رہا ہے۔]

باسمہٖ سبحانہٗ و تعالیٰ

از مکۂ مکرمہ ۸ جون ۷۲ء یوم پنجشنبہ

برادر مکرم و محترم جناب مولانا نسیم احمد فریدی صاحب! احسن اللہ تعالیٰ الیکم والینا

سلام و رحمت!

میں اس وقت اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و توفیق سے بلد اللہ الامین مکۂ مکرمہ میں ہوں۔ آج یہاں حاضری کا تیسرا دن ہے۔ گزشتہ رات آپ کو خواب میں دیکھا کہ آپ عمرہ کرنے سر منڈائے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں اور آپ کی شکل و صورت وہ ہے جو اب سے ۲۵-۲۰ سال پہلے تھی جب آپ جوان تھے۔ مجھے اس خواب سے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کے لیے بھی یقیناً بہت مبارک ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق کی رہنمائی میں میں نے سمجھا کہ یہ آپ کا "مثالی وجود" تھا جس کو

اللہ تعالیٰ کے اس دربارِ عالی میں حاضری اور عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی ــــ فہنیئاً لکم وطوبیٰ لکم۔

اس خواب ہی سے دل میں یہ تقاضا پیدا ہوا کہ اپنے اس سفر کے بارے میں آپ کو خط لکھوں اور اس طرح کسی قدر تفصیلی ملاقات خط ہی کے ذریعہ کروں۔

میرے اس طویل سفر پر روانہ ہو جانے کے بعد مولوی عتیق الرحمٰن کے خط سے آپ کو اس کا علم ہوا ہوگا۔ یہ سفر بالکل اچانک اس طرح ہوا جس طرح بہت سے واقعات قضا و قدر کے فیصلے بعض اوقات اچانک ہو جاتے ہیں ــــ میں ۹؍ مارچ کو سورت میں تھا، عشاء کے بعد ایک تبلیغی اجتماع میں تقریر کر رہا تھا، جب فارغ ہوا تو سورت ہی کے ایک صاحب نے بتایا کہ ابھی ابھی جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) سے میرے جاننے والے ایک صاحب نے ٹیلی فون پر مجھ سے بات کی ہے، انھوں نے کہا ہے کہ :-

"ہم لوگ بمبئی میں حاجی یعقوب صاحب سے بات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن وہاں سے ٹیلی فون کا رابطہ قائم نہیں ہو سکا، سورت سے مل گیا ہے۔ اس لیے یہ کام آپ کے سپرد کرتے ہیں کہ آپ حاجی یعقوب صاحب کو بمبئی میں ٹیلی فون پر اسی وقت ہمارا یہ پیغام پہونچا دیں کہ ہم لوگوں نے مولانا منظور نعمانی کا ویزا بڑی کوششوں کے بعد اپنی حکومت سے حاصل کر لیا ہے، اب حاجی یعقوب صاحب مولانا نعمانی کو ہمارا یہ پیغام بھی لکھنؤ پہونچا دیں اور اس کی کوشش کریں کہ وہ پہلے ہوائی جہاز سے جوہانسبرگ کے لیے روانہ ہو جائیں ــــ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم براہِ راست مولانا کو بھی لکھنؤ تار دے رہے ہیں۔"[1]

جن صاحب نے ٹیلی فون کی یہ بات مجھ سے آکر بتائی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ میں نے اُن کو جواب دے دیا ہے کہ "اتفاق سے مولانا نعمانی آج ہمارے شہر سورت ہی میں آئے ہوئے ہیں، ان کو بھی یہ پیغام پہونچا دوں گا اور بمبئی حاجی یعقوب صاحب کو بھی ٹیلی فون کر دوں گا۔"

واقعہ یہ ہے کہ اس سے کچھ دن پہلے جنوبی افریقہ کے بعض مخلص احباب نے جو وہاں کے مسلمانوں

---

[1] اس عجلت اور اہتمام کی خاص وجہ یہ تھی کہ شروع اپریل میں وہاں تبلیغی اجتماع ہونے والا تھا، وہ لوگ چاہتے تھے کہ میں کسی طرح اجتماع میں شریک ہو جاؤں۔

کے دینی اجتماعی مسائل سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں مجھے وہاں کے سفر کی دعوت دی تھی اور لکھا تھا کہ وہ ویزا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہاں کی حکومت سے ویزا حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے، ملتا بھی ہے تو مہینوں کی کوششوں کے بعد ملتا ہے۔ اِدھر میرے سامنے کچھ ضروری کام تھے جن کی وجہ سے میں جلدی کسی طویل سفر کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا میں نے یہ بات اپنے اُن مخلصین کو لکھ بھی دی تھی ——— اور اس سب کے علاوہ میرے پاسپورٹ میں جنوبی افریقہ کا اندراج تک نہیں تھا، اور چونکہ وہاں کی حکومت اور ہماری حکومت کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، سفارتی رابطہ تک نہیں ہے اس لیے جنوبی افریقہ کا پاسپورٹ بہت ہی مشکل سے خاص ہی حالات میں کسی کو ملتا ہے۔ الغرض ان تمام وجوہ سے بظاہر میرے اس سفر کا جلدی امکان نہیں تھا۔

میں اپنے پروگرام کے مطابق ۳۰ مارچ کو علی الصبح سورت سے روانہ ہو کر دس بجے کے قریب بمبئی پہونچا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ حاجی یعقوب صاحب کو جنوبی افریقہ سے رات ہی تار ملا ہے کہ "منظور نعمانی کا ویزا حاصل کر لیا گیا ہے، ان کو فوراً روانہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کیجئے" میں نے بمبئی کے اپنے احباب سے عرض کر دیا کہ بظاہر اس وقت میرے سفر کا کوئی امکان نہیں ہے، علاوہ دوسری مجبوریوں کے میرے پاسپورٹ میں جنوبی افریقہ کا اندراج نہیں ہے اور یہ کام جلدی ہو بھی نہیں سکے گا اور میرا پاسپورٹ بھی اتفاق سے اس وقت دہلی میں ہے میں نے اسی مقصد سے بھیجا تھا۔ بمبئی کے دوستوں نے کہا کہ ہم پاسپورٹ دہلی سے منگوا لیں گے اور یہاں اندراج کی کوشش کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ہم یہ کام جلد ہی کر لیں گے۔

میں ۳۱ مارچ کو بمبئی سے روانہ ہو کر یکم اپریل کو لکھنؤ آگیا، مطمئن تھا کہ اگر یہ سفر ہوا بھی تو ہفتے دو ہفتے کے بعد ہی ہو سکے گا۔ لیکن دوسرے یا تیسرے ہی دن بمبئی سے ٹیلی فون آیا کہ "پاسپورٹ دہلی سے ہم نے منگوا لیا اور اس میں جنوبی افریقہ کا اندراج بھی کرا لیا گیا، آپ فوراً بمبئی پہونچ جائیے" ——— مجھے سخت حیرت ہوئی اور اپنے کچھ ضروری کاموں کے پیش نظر فیصلہ کرنا سخت مشکل ہو گیا میں نے بمبئی کے دوستوں سے کہا کہ میں ذرا سوچ سمجھ کر ایک دو دن میں رائے قائم کر سکوں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ میں دو ہی دن پہلے تین ہفتے کے ایک طویل سفر کے بعد واپس آیا تھا بعض بہت ضروری اور اہم مسائل میرے سامنے تھے جن کی وجہ سے کسی طویل سفر کے لیے تیار ہو جانا میرے لیے

بہت مشکل تھا لیکن ویزا اور پاسپورٹ کے مشکل ترین قانونی مرحلے جس رفتار سے طے ہوئے تھے، میں نے اس سے سمجھا کہ یہ منجانب اللہ ہے۔ نیز یہ بھی لالچ دل میں پیدا ہوا کہ واپسی میں انشاء اللہ حرمین شریفین کی حاضری اور عمرہ و زیارت کی سعادت بھی نصیب ہو جائے گی —— الغرض سوچ کر میں نے اپنے اعذار اور کاموں کو نظر انداز کر کے اپنے کو سفر کے لیے آمادہ کر لیا، بمبئی کے دوستوں کو اطلاع دے دی، انھوں نے فوراً ہی ہوائی جہاز میں رزرویشن کرا لیا اور میں ۵ر اپریل کی شب میں ساڑھے نو بجے لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۶ر اپریل کی صبح ۶ بجے وہاں پہونچ گیا۔

بمبئی میں صرف ۳۔۴ گھنٹے قیام رہا۔ گیارہ بجے سے پہلے ہی ہوائی اڈے کو روانگی ہو گئی، ساڑھے بارہ بجے ایر انڈیا کے اس طیارہ کی پرواز کا وقت تھا جس سے سفر کرنا تھا۔ وہ ٹھیک اپنے وقت پر روانہ ہو گیا اور تقریباً پانچ گھنٹے میں تین ہزار میل کے قریب مسافت طے کر کے مشرقی افریقہ کے مشہور شہر نیروبی کے ہوائی اڈہ پر اُترا، وہاں ابھی ظہر کا آخری وقت تھا، پہلے سے اس کا اندازہ بھی تھا۔ وہیں اتر کے ظہر کی نماز ادا کی، مجھے جوہانسبرگ جانا تھا اور وہاں کے لیے نیروبی سے اگلے دن ۸ر اپریل کو طیارہ لینے والا تھا اس لیے ۲۴ گھنٹے قیام نیروبی ہی میں رہا۔ عشاء کے بعد ایک مسجد میں تقریر بھی ہوئی۔ یہ "بنگالی مسجد" کے نام سے معروف ہے۔ اس کے قرب و جوار میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو اُردو سمجھتے اور بولتے ہیں۔ اس کے امام خاص دیوبند کے رہنے والے مولوی اظہار احمد صاحب ہیں جو دیوبند کے فاضل بھی ہیں۔

یہ نیروبی مشرقی افریقہ کے ملک کینیا کا دارالحکومت ہے۔ اب سے چند برس پہلے تک کینیا، بلکہ مشرقی افریقہ کے اکثر دوسرے ممالک بھی برطانیہ کے زیر اقتدار تھے، نیروبی کو انگریزوں نے بالکل لندن کے نقشہ پر بنایا تھا۔ بہت ہی خوبصورت شہر ہے، بڑی اچھی اور معتدل آب و ہوا ہے، اور بڑی زرخیز زمین ہے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد جس طرح بہت سے دوسرے مقبوضات سے انگریزوں نے دست بردار ہو جانے کا فیصلہ کیا اسی طرح کینیا اور اُس کے پڑوسی ملکوں کو بھی انھوں نے آزادی دیدی۔ اب وہاں کے عوام کی اپنی حکومت ہے۔ یہ سیاہ فام نسل ہے۔ اللہ کی شان ہے! سفید فاموں کی ساری اونچی کرسیوں پر اب سیاہ فام بیٹھے ہیں، لیکن حکومت کی صلاحیت اور اہلیت آنے کے لیے بظاہر ابھی کافی وقت چاہیے۔

ہم اپنی ناواقفی سے اب تک یہ سمجھتے تھے کہ جن ملکوں میں گرمی بہت زیادہ پڑتی ہے وہاں کے

لوگوں کا رنگ کالا ہوتا ہے لیکن کینیا اور پھر جنوبی افریقہ میں یہ دیکھ کر کہ وہاں کے اصل باشندے بالکل سیاہ فام اور کالے رنگ کے ہیں، اس غلط خیال کی تصحیح ہو گئی۔ یہ ممالک بالکل گرم نہیں ہیں لیکن ان میں رہنے والے جو یہاں کے اصل باشندے ہیں، بالکل سیاہ فام ہیں۔ معلوم ہوا کہ رنگ کا تعلق گرم و سرد علاقہ سے نہیں بلکہ نسل سے ہے۔

رات کو نیروبی قیام کرنے کے بعد اگلے دن ۱۸ راپریل قریباً ۹ بجے صبح بی۔ او۔ اے۔ سی کے طیارہ سے جوہانسبرگ کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ بہت بڑے قسم کا طیارہ تھا، اس سے پہلے اتنا بڑا طیارہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس میں ۔۔۔ کے قریب مسافروں کی نشستیں تھیں۔ یہ لندن سے آیا تھا اور جوہانسبرگ جا رہا تھا۔ اس میں بچوں کے کھیل کود کی جگہ بھی تھی اور اس کے سامان بھی تھے ـــــ خدا ہی جانتا ہے کہ دنیا کے تمتعات اور تعیشات کی یہ ترقیاں کہاں تک جائیں گی؟! ـــــ حیرت ہے کہ جن لوگوں کی عقل معاش کی پرواز اتنی بلند اور تیز رفتار ہے ان کی عقل معاد کیسی مردہ ہو گئی ہے کہ مرنے کے بعد کے مسئلہ کی مطلق فکر نہیں؟! حق ہے من يضلل الله فلا هادى له ـــ قریباً چار گھنٹے میں اس برق رفتار طیارہ نے جوہانسبرگ کے ہوائی اڈے پر اتار دیا۔ احباب و مخلصین آئے ہوئے تھے سفر کے قانونی مراحل سے فارغ ہو کر شہر جوہانسبرگ سے گزرتے ہوئے لوڈی پورٹ پہنچے جہاں اس دن قیام طے تھا۔ یہ بستی شہر جوہانسبرگ سے قریباً بارہ میل پر ہے گویا اس کے ملحقات میں سے ہے۔ ہمارے خاص میزبان موسیٰ بھائی بڑھانیا کا رہائشی مکان وہیں ہے ـــــ رات کو عشاء کے بعد لوڈی پورٹ کی مسجد میں تقریر ہوئی۔ جنوبی افریقہ پہنچکر یہ پہلی تقریر تھی شہر جوہانسبرگ سے آکر بھی لوگ بہت کافی تعداد میں شریک ہوئے۔

میرے اس سفر کے اصل محرک اور داعی ڈربن کے مولانا عبدالحق عمر جی تھے، یہ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے عصری تقاضوں کا فہم بھی دیا ہے اور ان کی فکر بھی، اور مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے گہرا تعلق بھی ـــــ ڈربن جنوبی افریقہ کے صوبہ نیٹال کا سب سے بڑا اور پورے ملک کا دوسرے نمبر کا شہر ہے۔ جوہانسبرگ سے قریباً چار پانچ سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ مولانا موصوف کو ٹیلیفون سے میرے پہنچنے کی اطلاع دیدی گئی۔ وہ ہوائی جہاز کے ذریعے اسی دن (بعد عشاء) ۔۔۔ جوہانسبرگ تشریف لے آئے۔ موصوف سے خط و کتابت کا سلسلہ تو مدتوں سے تھا لیکن ملاقات اسی دن ہوئی۔ انھوں نے بتلایا کہ کل اتوار ہے اور اس دن کاروبار، تعلیم گاہیں اور دفاتر سب بند رہتے ہیں، لوگوں

کو عام فرصت ہوتی ہے اس لیے کل بعد ظہر کے لیے ڈربن کی جامع مسجد میں تقریر کا اعلان کر دیا گیا۔
اس لیے علی الصبح ہوائی جہاز سے ڈربن چلنے کا پروگرام ہے۔ چنانچہ ۹ اپریل کی صبح ہوائی جہاز
ڈربن روانہ ہوگئے اور تقریباً ایک گھنٹہ میں وہاں پہونچ گئے۔ بعد ظہر ڈربن کی جامع مسجد میں پہلی تقریر
اس مسجد کے امام مولانا ابو بکر صاحب ہیں۔ اصلی باشندے "دمن" کے ہیں۔ تعلیم فرنگی محل لکھنؤ
مدرسۂ نظامیہ کی ہے۔ طرز فکر اور طرز عمل اپنے اساتذہ حضرات علمائے فرنگی محل والا ہے۔ ان سے
جی بہت خوش ہوا۔ بہت متواضع اور متوازن صاحب علم ہیں۔

اس جامع مسجد سے تھوڑے سے فاصلہ پر ایک اور بڑی مسجد ہے۔ یہ غالباً جامع م
کے بعد ڈربن کی سب سے بڑی اور آباد مسجد ہے۔ ڈربن میں میرا قیام اسی دوسری مسجد کے قریب
جناب حاجی محمد احمد عمر صاحب کے مکان پر تھا، اس لیے اکثر اوقات نماز اسی مسجد میں ہوتی تھی۔
کے زمانۂ قیام میں کئی بار اس مسجد میں تقریر بھی ہوئی۔ اس مسجد کے امام اور خطیب دارالعلوم دیوبند
میرے ایک رفیق درس جناب مولانا عبد الرحمٰن انصاری صاحب ہیں، بہت فہیم اور متوازن
وطن رامپور ضلع سہارنپور ہے لیکن طویل مدت سے جنوبی افریقہ میں مقیم ہیں۔ غالباً وہاں کی شہریت
حاصل ہوگئی ہے۔ متعدد تعلیمی اداروں اور اسکولوں کے شعبۂ دینیات کے ذمہ دار اور نگراں
اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اچھا اثر و رسوخ حاصل ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی طالب علمانہ رفاقت
بعد جس کو قریباً آدھی صدی ہوگئی، بس ایک دو دفعہ چند چند منٹ کی ملاقات بھی ہوئی تھی
۱۹۶۸ء کے سفر حج میں کچھ اطمینان سے دو چار ملاقاتیں مسجد حرام میں ہوئی تھیں، اس کے بعد
اس سفر میں اطمینان سے قریب رہنا ہوا۔ مولانا نے بہت محبت اور تعلق کا اظہار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ جزائے
خیر عطا فرمائے۔ ایسے حضرات جہاں بھی ہوں ان پر خاص اس علاقہ کی دین کی فکر و خدمت اور رسول اللہ
علیہ وسلم کی نیابت کی خاص ذمہ داری ہے۔ اور اگر اس کی ادائیگی کی توفیق ملے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ
بڑے درجات ہیں (اللہ تعالیٰ اپنے اُن سب بندوں کو جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے
ہوئے علم کا وارث و امین بنایا ہے، توفیق دے کہ وہ اس وراثت کا حق ادا کریں اور اپنے مقام
عالی کو سمجھیں)

مولانا عبد الحق عمر جی اور دوسرے مخلصین کی خواہش تھی کہ میں جنوبی افریقہ میں تین

کروں، میرے لیے ویزا بھی تین مہینے کا حاصل کر لیا گیا تھا، اس ملک میں قریباً ۸۰۔ ۵۰ شہر اور بستیاں ایسی ہیں جہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی ہے۔ وہ حضرات چاہتے تھے کہ میں ان میں سے ہر جگہ پہنچوں، ایک دو دن قیام کروں، وہاں کے مسلمان مجھ سے ملیں اور میری باتیں سنیں۔ عمومی اجتماعات کے علاوہ خصوصی مجالس بھی ہوں۔ لیکن میں جن حالات میں یہاں سے گیا تھا، میرے لیے تین مہینے قیام کا کوئی امکان نہیں تھا تاہم میں نے ۶ ہفتے قیام کا فیصلہ کیا اور ان دوستوں سے کہا کہ آپ میرے راحت آرام لحاظ کیے بغیر ایسا پروگرام بنا لیجیے کہ میں تمام ایسے مقامات پر پہونچ سکوں جہاں آپ ضروری سمجھیں اور حسب ضرورت و موقع ایک دو دن قیام کر سکوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جنوبی افریقہ چار صوبوں میں منقسم ہے۔ ان میں سے تین ہی میں مسلمان ہیں۔ سب سے زیادہ صوبہ نیٹال میں ہیں جس کا مرکزی شہر ڈربن ہے۔ اس سے کچھ کم صوبہ ٹرانسوال میں ہیں، جس کا مرکزی شہر جوہانسبرگ ہے اور اس سے کم کیپ میں ہیں جس کا مرکزی شہر "کیپ ٹاؤن" ہے، جو پورے ملک کا دار الحکومت بھی ہے، یہ سمندر کے کنارے ہے۔ بڑے خوش منظر پہاڑ ہیں۔ آب و ہوا اور موسم کے لحاظ سے گویا یورپ کا ایک خطہ ہے۔ مسلم آبادی کے اس تناسب کے لحاظ سے میرے ۶ ہفتے کے وقت کو اس طرح تقسیم کیا گیا کہ سب سے زیادہ وقت یعنی تین ہفتے سے بھی کچھ زیادہ صوبہ نیٹال کے لیے رکھے گئے، کیپ کے لیے صرف ۵ دن رکھے گئے اور باقی ۱۵۔۱۶ دن ٹرانسوال کے لیے رکھے گئے ــــ سڑکیں دور دراز پہاڑی علاقوں میں بھی دہری ایسی بہترین اور شیشہ کی طرح ہموار ہیں کہ ہمارے یہاں دار الحکومت نئی دہلی میں بھی نہیں ہیں۔ موٹریں بھی عام طور سے نہایت اعلیٰ قسم کی استعمال ہوتی ہیں۔ اس لیے سیکڑوں میل کا سفر بھی ذرا محسوس نہیں ہوتا۔

جنوبی افریقہ میں پورا ڈیڑھ مہینہ گویا مسلسل سفر میں گزرا۔ بعض دنوں میں تو تین تین چار چار سو میل کا سفر ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل یہ رہا کہ اس پوری مدت میں صحت ایک دن بھی خراب نہیں ہوئی۔ اکثر دنوں میں تو دو دو اور بعض دنوں میں تین تین اور چار چار تقریریں بھی کیں۔ صحت کی اس بحالی میں عالم اسباب میں کسی درجہ دخل اس بات کو بھی رہا کہ وہاں کے دسترخوانوں کی یہ نوعیت دیکھ کر کہ ان پر نوع بہ نوع کے قیمتی اور مرغن کھانے ہوتے ہیں، میں نے اپنے پر یہ پابندی عائد کر لی کہ دسترخوان کی چیزوں میں جو سب سے ہلکی اور سریع الہضم ہو گی بس وہی کھاؤں گا اور اتنا اور اس ... سے کھاؤں گا کہ

۲۴ گھنٹوں میں ایک پاؤ سے زیادہ غذا اندر نہ جائے ـــ دورہ میں ۲-۳ دفعہ روزانہ یہ آزمائش ہوتی تھی کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھنا پڑتا تھا، انواع و اقسام کے بہت اعلیٰ اور مرغن قسم کے کھانے سامنے ہوتے تھے لیکن میں اپنے لیے صرف ایک، دو چیزیں ہلکی قسم کی منتخب کر لیتا تھا اور دوسری چیزوں سے حتی الوسع پرہیز کرتا تھا۔ اس امتحان میں بڑے عزم سے کام لینا پڑتا تھا لیکن الحمد للہ کامیاب رہا اور بظاہر اسباب اس کا نتیجہ تھا کہ اتنی طویل مدت میں ایک دن کے لیے بھی طبیعت خراب نہیں ہوئی اور کسی علاج معالجہ کی ضرورت پیش نہیں آئی حالانکہ برسوں سے گھر پر بھی صحت کی خرابی کا کچھ نہ کچھ سلسلہ چلتا ہی رہتا تھا۔

یہ دسترخوان اور کھانے کی بات تو جملہ معترضہ کے طور پر آگئی۔ میں جنوبی افریقہ کے تینوں صوبوں کے دورہ کا ذکر کر رہا تھا۔ اس دورہ میں سارے سفر موٹر سے ہوئے، صرف ڈربن سے پورٹ الزبتھ یا وہاں سے کیپ ٹاؤن اور وہاں سے جوہانسبرگ اور پھر وہاں سے ڈربن تک کے سفر ہوائی جہاز سے کئے۔ ٹرین سے سفر کی نوبت بالکل نہیں آئی حالانکہ ملک میں بہت اعلیٰ اور آرام دہ قسم کی ٹرینیں چلتی ہیں لیکن معلوم ہوا کہ اس سے سفر کرنے کا رواج بہت ہی کم ہے۔ لوگ عام طور سے لمبا سفر ہوائی جہازوں سے کرتے ہیں یا پھر اپنی کاروں سے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کے پاس اپنی کاریں نہ ہوں۔ یہ لوگ بسوں سے سفر کرتے ہیں جو بہت سستا بھی پڑتا ہے اور وقت بھی کم لگتا ہے۔

سفر کا پروگرام یہ ہوتا تھا کہ نماز فجر کے بعد مختصر اصلاحی بیان، اس کے بعد چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر سفر شروع ہو جاتا، اگر سفر طویل تین چار سو میل کا ہوتا تو راستہ میں کسی مقام پر ظہر سے پہلے پہنچ کر قیام کرنا طے کر لیا جاتا اور پہلے سے وہاں اطلاع دے دی جاتی۔ ظہر کی نماز میں وہاں کے لوگ جمع ہو جاتے اور ان سے کچھ دینی اصلاحی باتیں ہو جاتیں۔ پھر کھانے سے فارغ ہو کر کچھ آرام کر کے آگے چلے جاتے۔ اصل اجتماع اور بیان رات کو بعد عشاء ہوتا۔ ہر مقام پر سو دو سو میل تک کے لوگ اپنی کاروں سے ضرور پہنچ جاتے۔ معلوم ہوا کہ یہ یہاں کا عام رواج ہے۔ گویا جس طرح ہمارے یہاں کے لوگ کسی دینی اجتماع یا تقریب کے لیے ۲-۴ میل کی مسافت سے پیدل یا رکشوں سے آجاتے ہیں، اسی طرح یہاں سو، دو سو میل تک سے اپنی کاروں سے آکر شرکت کرتے ہیں۔ اور اجتماع کے ختم پر اپنے گھر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس لیے ایسے مقامات پر بھی جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ نہ ہوتی اجتماع میں حاضری اکثر

بہت کافی ہو جاتی۔

عام طور سے تقریر اردو ہی میں ہوتی جس کو اکثر حاضرین سمجھتے ہیں اس کی پوری کوشش کرتا کہ اپنے امکان کی حد تک آسان سے آسان زبان استعمال کروں اور ایک ایک بات کو اگر ضرورت سمجھوں تو دو دو تین تین بار دہراؤں بصرف صوبہ کیپ کی تقریروں میں انگریزی ترجمہ کی ضرورت ہوئی کیونکہ وہاں مسلمانوں میں بھی شاذ و نادر ہی ایسے لوگ ہیں جو اردو سمجھ سکیں میرے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل مولانا محمد یونس پٹیل تھے۔ بڑے اچھے ذی استعداد عالم ہیں۔ انگریزی میں میری تقریر کا ترجمہ بہت اچھا کرتے ہیں جو آیت پڑھتا وہ آیت پڑھتے اور جس حدیث کا متن پڑھتا وہ لفظاً بہ لفظ اسی کو پڑھتے صوبہ کیپ میں جتنی تقریریں ہوئیں ان سب کا ترجمہ مولانا موصوف ہی نے انگریزی میں کیا۔

ہر تقریر کے موقع پر محسوس ہوتا تھا کہ لوگ بات توجہ سے سنتے اور فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دینی ذوق و طلب کی یہ کیفیت کچھ ہی دنوں سے اس ملک کے مسلمانوں میں پیدا ہوئی ہے۔ اور اسمیں تبلیغی جماعت کے کام کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ اس کام کا سلسلہ اس ملک میں ۷۔ ۸ سال سے چل رہا ہے جو لوگ کام میں زیادہ لگے ہوئے ہیں ان کو بڑا ہی مخلص پایا۔ معلوم ہوا کہ پہلے کئی سال تک لوگوں نے بالکل توجہ نہیں کی۔ لیکن یہ مخلص بندے اجر آخرت کی امید پر اسی لگن، اخلاص اور استقامت سے محنت کرتے رہے ——— پھر، جیسا کہ سنت اللہ ہے، حق تعالیٰ نے قلوب کو متوجہ کیا، اب لوگوں کے دلوں میں اس کام کی بڑی عظمت ہے۔ اس کام کے ذریعہ بعض لوگوں کی اتنی دینی ترقی ہوئی ہے کہ ان کا حال جان کر بڑا ہی رشک آیا۔ اور دل میں اس کام کی عظمت اور زیادہ بڑھ گئی۔

جنوبی افریقہ مختلف پہلوؤں سے عجیب و غریب اور نرالا ملک ہے۔ یہاں ایسے مناظر اور نعمتوں کی ایسی فراوانی ہے کہ جنت کا سمجھنا کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں کے سیاسی حالات بھی بہت ہی عجیب و غریب ہیں۔ مختلف پہلوؤں سے یہاں کے مسلمانوں کے حالات بھی ایسے ہیں کہ ان پر تفصیل سے لکھا جائے۔ دین کے سلسلہ میں جو کوششیں اور جو کام اور جس طرح ہو رہے ہیں وہ بھی قابل تذکرہ ہیں لیکن اس خط میں ان میں سے کسی چیز کے ذکر کی گنجائش نہیں۔ اس وقت تو میں اپنے اس سفر کی منزلوں کا سرسری تذکرہ کر کے حرمین شریفین کی حاضری کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

جنوبی افریقہ کے اس دورہ میں میری آخری منزل ڈربن تھی۔ آخری تقریر ۲۲ مئی کو ڈربن کی

اسی جامع مسجد میں ہوئی جس میں ۹ر اپریل کو سب سے پہلی تقریر ہوئی تھی۔ یہ ڈربن میں گویا میری الوداعی تقریر تھی۔

۲۲ مئی کو میں ڈربن سے ماریشس کے لیے روانہ ہوا۔ ماریشس مشرقی افریقہ میں چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اب سے ۵ سال پہلے ۶۷ء میں بھی یہاں جانا ہوا تھا۔ اس وقت یہ برطانیہ کے زیر اقتدار تھا۔ لیکن اس کی آزادی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اور اقتدار منتقل ہونے کے انتظامات ہو رہے تھے۔ اب یہ آزاد ملک ہے اس ملک کی کل آبادی ۸ لاکھ کے قریب ہے۔ گویا ہمارے آپ کے ضلع مراد آباد کی آبادی کے قریباً ایک تہائی۔ اس کا طول و عرض اتنا ہے کہ ملک کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ تک چلے جانے کے بعد بھی سفر کی مسافت پوری نہیں ہوتی اور نماز میں قصر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ زمین بہت زرخیز ہے۔ اس دفعہ یہاں صرف چار دن قیام رہ سکا۔ وقت میں زیادہ کی گنجائش نہیں تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل مولانا اسماعیل صاحب اور ان کے ایک مخلص رفیق حاجی غلام محمد صاحب اس عاجز سے بڑا گہرا مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے ۳۔۴ دن کی گنجائش کسی طرح نکالی تھی۔ قیام ان دونوں کے یہاں منقسم رہا۔ حاجی غلام محمد صاحب اردو بالکل نہیں جانتے۔ گجراتی بھی غالباً بہت کم جانتے ہیں صرف انگریزی اور فرانسیسی جانتے ہیں، لیکن ان کی بوڑھی والدہ صاحبہ کچھ اردو بول بھی لیتی ہیں اور پڑھ بھی لیتی ہیں۔

۲۶ مئی کو بعد نماز جمعہ ماریشس سے ری یونین کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ بھی مشرقی افریقہ کا ایک جزیرہ ہے۔ ماریشس کی طرح یہ بھی چھوٹا سا ملک ہے لیکن یہ فرانس کے زیر اقتدار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آب و ہوا کے لحاظ سے یہ گویا یورپ کا ایک بہترین خطہ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ بھی بتائی گئی کہ اس کی زمین میں سانپ بچھو جیسے زہریلے جانور بالکل نہیں ہیں، نہایت سرسبز اور حسین ملک ہے۔ پورا ملک ایک گلزار معلوم ہوتا ہے۔ مرکزی شہر سینٹ ڈینس ہے۔ زیادہ تر قیام یہیں رہا۔ اس کے علاوہ دو تین شہروں میں اور بھی جانا ہوا سفر ہوٹے سے اس طرح ہوا کہ ساتھ والوں نے بتلایا کہ پورے ملک کا دورہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ہر شخص خوشحال ہے۔ معمولی مزدور کی آمدنی ہندوستانی سکہ کے حساب سے ۵۰ روپے یومیہ ہے۔ اسکولوں کے ٹیچروں کی تنخواہ کم از کم دو تین ہزار ہوتی ہے۔ ایک دوست نے بتایا کہ میرا لڑکا بنک میں کلرک ہے، ہندوستانی سکہ کے حساب سے اس کی تنخواہ پانچ ہزار سے اوپر ہے۔ پورے ملک میں

تجارت قریباً سو فیصدی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اس لیے مسلمان عموماً بہت خوشحال ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہے اور ملک کے دوسرے طبقوں کا پورا اعتماد ان کو حاصل ہے۔ میں یہاں کے صرف چند حضرات ہی سے واقف ہوں، اللہ نے دولت دنیا کے ساتھ آخرت کی فکر اور دین کی نعمت بھی بظاہر بھرپور عطا فرمائی ہے۔ بلاشبہ ایسے لوگ بڑے خوش نصیب ہیں جن کو "حسنۂ دنیا" اور "حسنۂ آخرت" دونوں حاصل ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو شکر کی اور ان نعمتوں کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہاں کے دولتمندوں میں آخرت کی فکر بہت ہی کم دیکھی جاتی ہے۔

ری یونین میں میرا قیام ۶ دن رہا۔ ۲ جون کو وہاں سے نیروبی کے لیے روانہ ہوا۔ ایک دن نیروبی اور دو دن "ممباسہ" میں قیام رہا، یہ ممباسہ کینیا کا دوسرے نمبر کا شہر ہے۔ اور بہت حسین اور صاف ستھرا شہر ہے۔ اب سے چند سال پہلے تک اس کے علاقے کے علاقے انگریزوں کے لیے گویا مخصوص تھے۔ لیکن اب وہ سب انگریزوں سے خالی ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ ان کے بنگلوں میں دوسرے لوگ آباد ہیں۔ كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝

ممباسہ میں تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والوں کی الحمدللہ ایک اچھی تعداد ہے۔ بڑے مخلص اور صالح بندے ہیں۔ ممباسہ ہی کینیا اور مشرقی افریقہ کے کئی دوسرے ملکوں کے لیے بحری اسٹیشن ہے۔ اس لیے یہاں تبلیغی جماعتوں کی آمد و رفت زیادہ رہتی ہے۔

یہاں کی ایک شخصیت حاجی ابراہیم صاحب قابل ذکر ہیں تبلیغی کام کے سلسلے سے ہندوستان آتے رہتے ہیں، بار بار ملاقات ہوئی ہے۔ کافی عرصے سے تعارف ہے لیکن ان کی خصوصیات بالکل معلوم نہیں تھیں۔ اب معلوم ہوا کہ دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے بہت ممتاز ہیں۔ کاروبار بھی بہت بڑا ہے اور بین الاقوامی قسم کا ہے۔ لوگوں نے ذکر کیا کہ ایک زمانہ میں ان کا حال یہ تھا کہ ان کے کپڑے پیرس میں دھلتے تھے۔ اللہ کی شان ہے کہ تبلیغی کام سے تعلق کے بعد ان کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ حجازی قسم کا لمبا کرتا اور اس کے اوپر عبا اور سر پر عمامہ مستقل لباس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صورت بھی مشائخ کی عطا فرمائی ہے۔ دین میں اتنی پختگی اور استقامت ہے کہ گھر میں، دفتر میں کسی قسم کی تصویر کا گزر نہیں۔ چونکہ کاروبار بہت بڑا ہے اس لیے حکومت کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ کم از کم دفتر میں ملک کے صدر کی تصویر آویزاں کی جائے جیسا کہ

ملک میں عام دستور ہے۔ انھوں نے معذرت کی کہ میرا مذہب مجھ کو اس کی اجازت نہیں دیتا اس لیے میں ایسا نہیں کر سکتا۔ صاف لکھ دیا کہ اگر اس کے بغیر میں ملک میں نہیں رہ سکتا تو میں اس بارے میں سوچونگا آخر حکومت نے اپنا اصرار واپس لے لیا۔ اور صرف اس پر قناعت کر لی کہ دفتر میں ملک کے جھنڈے کا کاغذی نقشہ آویزاں رہے جس میں کوئی تصویر نہیں ہے۔ حاجی صاحب کے ساتھ ان کے دفتر میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ اور میں نے دیکھا کہ ملک کے جھنڈے کا نقشہ ہی آویزاں ہے۔ معلوم ہوا کہ حاجی صاحب اپنا کوئی مکان کسی کو کرایہ پر دیتے ہیں تو اس سے شرط کر لیتے ہیں کہ وہ مکان میں تصویر نہیں لگائے گا اور کتا نہیں رکھے گا۔ حاجی صاحب موصوف کی یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ مناسب مواقع پر ارباب حکومت اور اصحاب اقتدار کو بھی دعوتی خطوط لکھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے خود ذکر فرمایا کہ ۲۸ جون کو ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور پاکستان کے موجودہ صدر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی ملاقات ہونے والی ہے۔ میں نے ان دونوں کو بھی ایک ہی مضمون کے خطوط لکھے ہیں۔ خط کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ "قومی اور بین الاقوامی ہر قسم کے شر و فساد کا علاج یہ ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کے بنیادی اصول کو دل سے مانا جائے اور عملی زندگی کی بنیاد بنایا جائے اور اس کی پوری تشریح اللہ کے سچے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور آپ کی تعلیم سے حاصل کی جائے۔" انھوں نے اپنے اس انگریزی خط کی ایک کاپی مجھے بھی عنایت فرمائی۔ الحمد للہ وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ اس دنیا کی امن اور اس کے بعد عالم آخرت کی نجات کا راستہ صرف یہی ہے۔ معلوم ہوا کہ اپنے ملنے والے غیر مسلموں کے سامنے بھی وہ بڑی بے تکلفی اور اخلاص و دلسوزی کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کرتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی اسی کی دعوت دیتے ہیں۔ تبلیغی کام سے حاجی صاحب موصوف کا گہرا تعلق ہے۔ جولائی میں انگلستان میں جو تبلیغی اجتماع ہونے والا ہے وہ اس میں شرکت کا ارادہ کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کئی ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے وہاں پہنچیں۔ اور اسی طرح مختلف ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے واپس آئیں۔ اس سلسلے میں ہندوستان آنے کا بھی ذکر فرما رہے تھے۔ میرا قیام ممباسہ میں حاجی صاحب کے بنگلہ ہی پر تھا ـــــ حاجی صاحب کی یہ بات بھی قابل ذکر و تقلید ہے کہ ان کی دولتمندی اور دنیوی وجاہت کے لحاظ سے ان کا دسترخوان بہت سادہ نظر آیا، غالباً یہ بھی تبلیغی کام کے برکات میں سے ہے، اس سے جی بہت خوش ہوا ـــــ اُردو کے علاوہ انگریزی

اور سواحلی زبانوں میں بھی بہت اچھی تقریر کرتے ہیں۔ دنیا کے نئے حالات کے بارہ میں پوری واقفیت رکھتے ہیں۔

۵ جون کی صبح ممباسہ سے بذریعہ ہوائی جہاز نیروبی واپسی ہوئی۔ اور اسی دن شام کو پانچ بجے نیروبی سے جدہ کے لیے روانگی ہوئی۔ تقریباً ڈھائی گھنٹہ کی پرواز کے بعد طیارہ نے جدہ اتار دیا۔ میں نے نیروبی سے رابطہ کو تار دیدیا تھا کہ جدہ کے ہوائی اڈہ پر میرے لیے ویزا حاصل ہونے کا انتظام کردیا جائے (حاضری کی اطلاع کا ایک تار مدرسہ صولتیہ کو بھی دیدیا تھا) میں ہوائی جہاز سے اترا تو رابطہ کی طرف سے ایک صاحب میرا ویزا لیے ہوئے موجود تھے۔ لیکن میرے ساتھ بمبئی کے دو دوست اور بھی تھے۔ ان کے ویزا حاصل ہونے میں کافی دیر لگ گئی۔ اس لیے رات کو جدہ ہی میں قیام کا فیصلہ کرنا پڑا۔ جدہ میں "بیت نوردلی" ہم لوگوں کے لیے اپنے گھر کی طرح ہوگیا ہے۔ ان حضرات کو اطلاع بھی ہوگئی تھی۔ بھائی محمد نور صاحب اور بھائی محمد ولی عبداللہ صاحب موٹر لے کر ہوائی اڈہ پر آگئے تھے۔ ویزا اور کسٹم کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ان کے ساتھ گھر پر آگئے۔ نماز عشاء سے فارغ ہو کر کھانا کھایا اور اطمینان سے سو گئے۔ صبح بعد نماز فجر غسل کرکے عمرہ کا احرام باندھا اور سویرے ہی مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ پہلے اپنی قیام گاہ یا پناہ گاہ مدرسہ صولتیہ پہنچے۔ وہاں سامان رکھا، بہت مختصر ملاقات کی اور عمرہ کے لیے حرم شریف چلے گئے۔ طواف کیا، دوگانہ طواف مقام ابراہیم پر ادا کیا پھر ملتزم پر دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے دعا نصیب فرمائی، اس کے بعد صفا و مروہ کی سعی کی ــــ عمرہ سے فارغ ہو کر مدرسہ آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ میں، مدرسہ صولتیہ کی شکل میں ہم لوگوں کے لیے ایک مستقر اور مرکز بنا دیا ہے۔ یہ مدرسہ بھی ہے، خانقاہ بھی ہے، ساتھ ہی مسجد بھی ہے اور ہمارے اکابر کی یادگار بھی ہے۔

ــــ ہاں! آپ تو مدرسہ صولتیہ سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں ــــ اسی مدرسہ صولتیہ کے ایک حصہ میں ہمارے ایک مخلص دوست قاری محمد سلیمان صاحب بھی رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہم جیسے لوگوں کو مہمان بنا کر میزبانی کرنے کا خاص ذوق شوق دیا ہے۔ انھوں نے اپنے مکان کے ساتھ ایک خراب خستہ چھوٹے زمین دوز کمرہ کو ذمہ دار حضرات کی اجازت سے مہمانوں کے لیے اچھا خاصا آرام دہ تہہ خانہ بنا لیا ہے۔ خاص کر ان دنوں میں جبکہ مکہ معظمہ میں سخت لُو چل رہی ہو۔ وہ نہایت آرام دہ درویشانہ اور شاہانہ مہمان خانہ ہے۔ قاری صاحب نے حضرت مولانا محمد سلیم صاحب (مدیر مدرسہ صولتیہ) اور ان کے صاحبزادے بھائی محمد شمیم صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ اجازت

دیں تو ان کا دیعنی میرا) قیام میرے اس "خلوہ" میں رہے اور کھانا بھی میرے یہاں ہو۔ آخر میں بات یہ طے ہوئی کہ روزانہ دن کو میں مدرسہ میں مولانا ممدوح کے ساتھ ان کے دسترخوان پر کھاؤں، اور کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو قاری صاحب بھی اسمیں شریک ہوں، اور رات کا کھانا قاری صاحب کے یہاں ہوا کرے ۔۔۔ ناشتہ کے بارے میں میں نے عرض کر دیا کہ میں صرف چائے پیوں گا اور اسمیں سہولت رہے گی کہ صبح حرم شریف سے واپس آکر قاری صاحب کے یہاں پی لیا کروں۔ چنانچہ اسی فارمولے پر عمل رہا۔ ہاں رات کے سونے کا انتظام مدرسہ صولتیہ کے دفتر کی چھت پر رہا، جو اس موسم کے لیے بہترین جگہ ہو سکتی تھی اور طبیعت اس جگہ سے بہت مانوس بھی ہے۔ کیونکہ ۱۳۵۳ھ کے سفر حج میں اہلیہ مرحومہ کے ساتھ وہیں قیام رہا تھا۔ اور اسی چھت پر سونا ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق سے اس سے پہلے حج کے بھی کئی سفر نصیب ہوئے اور رابطہ کی رکنیت کے طفیل اس کے جلسوں کے سلسلہ میں بھی کئی بار حجاز مقدس کی حاضری نصیب ہوئی، لیکن اس دفعہ مسجد حرام میں خاصکر طواف میں اللہ تعالیٰ کا کچھ خاص فضل و کرم محسوس ہوتا تھا اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بہت سے اُن حضرات کی طرف سے بھی جن سے قرابت، احسان یا محبت کے تعلقات ہیں اور ان کے حقوق ہیں، طواف کرنا نصیب ہوا۔ آپ کی خوشی کے لیے عرض کرتا ہوں کہ آپ کی طرف سے بھی طواف کیا۔

مولانا سعید احمد خاں صاحب کو تو آپ خوب جانتے ہوں گے اور اچھی طرح یاد ہوں گے۔ حجاز پاک میں وہ تبلیغی کام کے ذمہ دار ہیں، ہمیشہ سے میرے قلب میں ان کی بڑی عظمت ہے۔ ان کا قیام مدینہ طیبہ رہتا ہے۔ معلوم یہ ہوا تھا کہ وہ عنقریب مدینہ طیبہ سے کسی سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ اس لیے مجھے فکر تھی کہ مولانا کے سفر سے پہلے مدینہ طیبہ پہنچ جاؤں، لیکن اللہ کی شان کہ وہ خود مکہ معظمہ تشریف لے آئے۔ ان کی زیارت و ملاقات سے بڑی خوشی ہوئی۔ بھائی فضل عظیم مرادآبادی جو اب خدا کے فضل سے مکی ہو گئے ہیں، ان کی ملاقات بھی بڑی خوشی کا باعث ہوئی۔ ان دوستوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص فضل ہے۔ ان سے تعلق و محبت ان شاء اللہ آخرت میں کام آئے گا۔

مولانا غلام رسول صاحب مالیگانوی سے بھی آپ واقف رہے ہوں گے۔ میرے اندازہ میں بہت متوازن اور فہیم ہیں۔ مکہ معظمہ میں اپنے کسی بھی کام کے لیے جب کسی کو زحمت دینا ناگزیر ہو تو میں بے تکلف

ان ہی کو تکلیف دیتا ہوں۔ بہت مخلصانہ محبت رکھتے ہیں۔ ان کی ایک سعادت اور خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب لاہوری سے ان کا خاص رابطہ ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے مولانا تک پہنچنے کا گویا یہی دروازہ ہیں۔ آپ حضرت مولانا ممدوح سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ شاید دارالعلوم دیوبند میں ساتھ بھی رہا ہو۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری قدس سرہ کے صاحبزادے ہیں۔ عمر مجھ سے خاصی کم ہے لیکن خاص درویشانہ طرز زندگی نے اتنا متاثر کیا ہے کہ مجھ سے بہت زیادہ ضعیف اور بوڑھے معلوم ہوتے ہیں۔ اختلاج کی بھی کافی عرصے سے شکایت ہے۔ لوگوں سے بہت ہی کم ملنا چاہتے ہیں۔ میرے ساتھ اور مجھ سے زیادہ مولانا علی میاں کے ساتھ عنایت و محبت کا خصوصی تعلق ہے۔ مکہ معظمہ کے اس قیام میں ۲-۳ بار مولانا کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ بلاشبہ مولانا اُن بندگانِ خدا میں سے ہیں جن کا حال حدیث نبوی میں یہ بیان فرمایا گیا ہے "یذکرکم اللہ رؤیتہ ویذکرکم الآخرۃ عملہ وینفعکم منطقہ"۔[1]

خلوت پسندی مولانا کا حال ہے اور اس وقت وہ اس بارے میں بالکل معذور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی تبدیلی فرمائے کہ لوگوں کے لیے اُن سے ملنا اور اُن کی صحبت سے استفادہ آسان ہو جائے۔ مولانا یقیناً اُن بندگانِ خدا میں سے ہیں جن کی صحبت اکسیر ہے۔

مکہ معظمہ میں ۶ دن گزارنے کے بعد مدینہ طیبہ حاضری کا ارادہ کیا۔ میں نے افریقہ ہی سے اپنے نہایت عزیز دوست صوفی محمد اقبال صاحب (مقیم مدینہ طیبہ) کو لکھ دیا تھا کہ ان شاء اللہ مکہ معظمہ اور پھر وہاں سے مدینہ طیبہ حاضری ہوگی۔ اور آپ کا مہمان رہوں گا۔ لیکن ہمارے میزبان قاری محمد سلیمان صاحب نے (مع اپنی اہلیہ مکرمہ کے جن کو اللہ تعالیٰ نے قاری صاحب کے جذبۂ مہمان نوازی کا بھی پورا شریک بنا دیا ہے) میرے ساتھ مدینہ طیبہ چلنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ ان کی میزبانی کا سلسلہ وہاں بھی اسی طرح جاری رہے اور پوری ایک موٹر کار مدینہ طیبہ کے لیے کر لی۔ ۱۱ جون کی شام کو مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور رات کو عربی ٹائم کے حساب سے

---

[1] یعنی انھیں دیکھ کر تمھیں اللہ یاد آئے اور اُن کا طرز عمل اور ان کی زندگی آخرت کو یاد دلائے اور ان کی باتوں سے تمھیں نفع ہو اور دل زندہ ہو۔

۴ بجے کے بعد (یعنی ہمارے حساب سے گیارہ بجے کے بعد) مدینہ طیبہ پہونچ گئے۔

قاری صاحب پر اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک بہت عالیشان اور نہایت آرام دہ مکان اپنے پورے سازوسامان کے ساتھ گویا ان کی نگرانی اور انتظام میں ہے۔ جس میں وہ خود بھی قیام فرماتے ہیں اور ان کے مہمان بھی اس میں مقیم ہوتے ہیں۔ اسی مکان پر جاکر اتر گئے۔ یہ مسجد نبوی سے بہت قریب ہے، صرف ۳۔۴ منٹ کا راستہ ہے۔ عشاء کی نماز اور کھانے سے فارغ ہوکر کچھ آرام کیا، اور اذان فجر سے پہلے مسجد شریف میں حاضر ہوگئے "روضۃ الجنۃ" میں دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرنے کے بعد سرورِ کائنات آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں سلام عرض کرنے کے لیے مواجہہ شریف میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ اور جن حضرات، اکابر و احباب یا عزیزوں کی طرف سے سلام پہونچانا تھا ان کا سلام پہونچایا۔ قرآن پاک کی یہ آیت بار بار زبان پر آئی۔

اذا جاءك الذين يؤمنون بآياتنا فقل سلام عليكم كتب ربكم على نفسه الرحمة أنه من عمل منكم سوء بجهالة ثم تاب من بعده وأصلح فإنه غفور رحيم

مدینہ طیبہ میں ۶ دن قیام رہا، الحمد للہ وقت بہت ہی اچھا گزرا۔ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم سے تعلق رکھنے والوں کا وہاں ایک پورا حلقہ ہے، گویا اپنا ایک خاندان بسا ہوا ہے صوفی محمد اقبال صاحب اور ڈاکٹر اسماعیل صاحب سے پورا عزیزانہ تعلق ہے۔ بظاہر ان حضرات پر اللہ تعالیٰ کا بہت فضل ہے۔ اتفاق سے ان دنوں مولانا عبدالرحیم صاحب بھی مدینہ طیبہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کو حضرت شیخ سے استفادہ کی بڑی توفیق ملی ہے۔ حضرت کی بھی ان پر خاص نظر عنایت رہی ہے ان کو دیکھ کر بڑا ہی رشک آتا تھا اور اپنے پر بڑا ہی افسوس اور محرومی کا بڑا احساس ہوتا ہے۔ یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اللہ کے اچھے بندوں کی محبت نصیب ہے۔ اللہ تعالیٰ شکر نصیب فرمائے۔

احب الصالحين ولست منهم لعل الله يرزقني صلاحا

مدینہ طیبہ ۶ دن قیام رہا۔ ایک دن شہداء احد رضی اللہ عنہم کے مزارات پر اور جنت البقیع میں بھی حاضری اور "مسنون طریقہ پر" عرض سلام اور دعا و ایصال ثواب کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔

۱۶ جون کو جمعہ تھا۔ اسی کی شام کو مکہ معظمہ کے لیے روانگی کا پروگرام تھا۔ نماز جمعہ مسجد شریف

میں روضۃ الجنۃ میں ادا کی، امام صاحب کا خطبہ بڑا مؤثر اور خاصا طویل تھا جب مسلمانوں کے دل زندہ تھے تو اس سے بہت مختصر خطبوں سے دلوں کی دنیا اور پھر اس کے نتیجہ میں باہر کی دنیا بدل جاتی تھی، اب بس زبان بول دیتی ہے اور کان سن لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ پھر امت کے دلوں کو زندہ فرمائے۔ انہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

قرآن مجید میں بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔ "ثم قست قلوبکم من بعد ذالک فھی کالحجارۃ او أشد قسوۃ، وإن من الحجارۃ لما یتفجر منہ الانہار وان منہا لما یشقق فیخرج منہ الماء، وإن منہا لما یہبط من خشیۃ اللہ وما اللہ بغافل عما تعملون۔

سوچنے کی بات ہے کہ آج ہماری حالت کیا اس سے کچھ زیادہ مختلف ہے۔؟!

عصر کی نماز بھی مسجد شریف میں ادا کی، غروب آفتاب سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے بارگاہ عالی، مواجہ شریف میں آخری حاضری ہوئی، الوداعی سلام عرض کیا، اور غروب سے قریباً ۱۵ منٹ پہلے مکہ معظمہ کے لیے روانگی ہو گئی۔ اس دفعہ بھی قاری صاحب نے صرف ہم تین آدمیوں کے لیے پوری گاڑی کر لی تھی۔۔۔ "ابیار علی" پہونچکر مغرب کی نماز ادا کی۔ اسی کے قریب میں وہ جگہ ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کا احرام باندھا تھا۔ ہم لوگوں نے بھی وہیں سے عمرہ کا احرام باندھا اور لبیک لبیک پکارتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ مکہ معظمہ ایسے وقت پہنچنا ہوا کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، فجر کی اذان میں بس ڈھائی گھنٹے باقی تھے، تھوڑی دیر سو لیے پھر نماز فجر کے لیے اٹھ گئے، نماز ادا کی اشراق کے بعد عمرہ کا طواف اور سعی کر کے حلق کرایا۔۔۔ الحمد للہ اس سفر میں یہ دوسرا عمرہ مدینہ طیبہ سے نصیب ہو گیا۔

اللھم لک الحمد لا احصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علی نفسک

اس پورے سفر میں اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایات نصیب رہیں، بیان تک کہ اپنے حال اور اعمال پر نظر کر کے بار بار یہ ڈر پیدا ہوا کہ کہیں یہ استدراج کا معاملہ نہ ہو لیکن سفر کا خاتمہ جس طرح حرمین شریفین کی حاضری پر فرمایا گیا اس سے امید ہوتی ہے کہ یہ سب رب کریم کا فضل و کرم اور انعام و احسان ہی ہوگا جس کے لیے استحقاق بالکل شرط نہیں ہے۔

شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو　　عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

ایک اہم بات ذکر سے رہ گئی۔ انشاء اللہ اس کا تذکرہ آپ کے لیے بہت خوش کن ہوگا۔ اس دفعہ حرمین شریفین میں بلکہ جدہ میں بھی دینی لحاظ سے فضا بہت بہتر محسوس ہوئی ۔۔۔ معلوم ہوا کہ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے دو سخت حکم جاری ہوئے ہیں، ایک یہ کہ اذان ہونے پر لوگ فوراً مسجد کو چل دیں۔ اگر جماعت کے وقت کوئی شخص (معذوروں کے سوا) گھر پر یا دکان پر یا کہیں دیکھا گیا تو وہ قابل سزا ہوگا اور یہ سزا بہت سخت بھی ہوسکتی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ عورتیں پردے کے حکم کی پابندی کریں اگر کسی عورت کو دیکھا گیا کہ وہ بے پردہ ہو کر اپنی آرائش و زیبائش کی نمائش کرتی ہے تو اگر وہ سعودی ہے تو اس کو اور گھر والوں کو سزا دی جائے گی اور غیر ملکی ہے تو ملک چھوڑنے کا حکم دیا جائے گا۔

معلوم ہوا کہ ان دونوں حکموں نے غیر معمولی اثر ڈالا ہے اور بڑی اصلاح ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کے سب طبقوں کو اپنی ذمہ داریاں سمجھنے اور ان کو ادا کرنے کی توفیق دے۔ خدا کرے آپ کا مزاج بعافیت ہو۔

اس خط کے جواب میں بس دعا کا طالب و سائل ہوں نہایت محتاج ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

یہ خط آج سے ۸۔۹ دن پہلے ۸ جون کو لکھنا شروع کیا تھا جبکہ مکہ معظمہ میں میری حاضری کا تیسرا دن تھا اور آپ کو خواب میں دیکھا تھا۔ لیکن شروع کرنے کے بعد کئی دن تک بالکل نہیں لکھا یہاں تک کہ مدینہ طیبہ کا سفر ہوگیا اور اب وہاں سے واپسی بھی ہوگئی اور ہندوستان واپسی کا وقت بھی قریب آگیا ۔۔۔ اب تو ہندوستان پہونچ کر ہی یہ آپ کو بھیجا جاسکے گا کیونکہ یہاں سے بھیجنے میں اور زیادہ دیر ہوجائے گی لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کا ڈاک کا انتظام بہت افسوسناک ہے۔

والسلام آخراً

۱۸ جون ۷۲ء

BOMBAY ANDHRA
TRANSPORT CO.

Transport Contractors

[illegible] (Chakla)

BOMBAY-3



Regd No L-55[illegible]

Monthly 'ALFURQAN' [illegible]

[illegible] No 3 MAY [illegible]

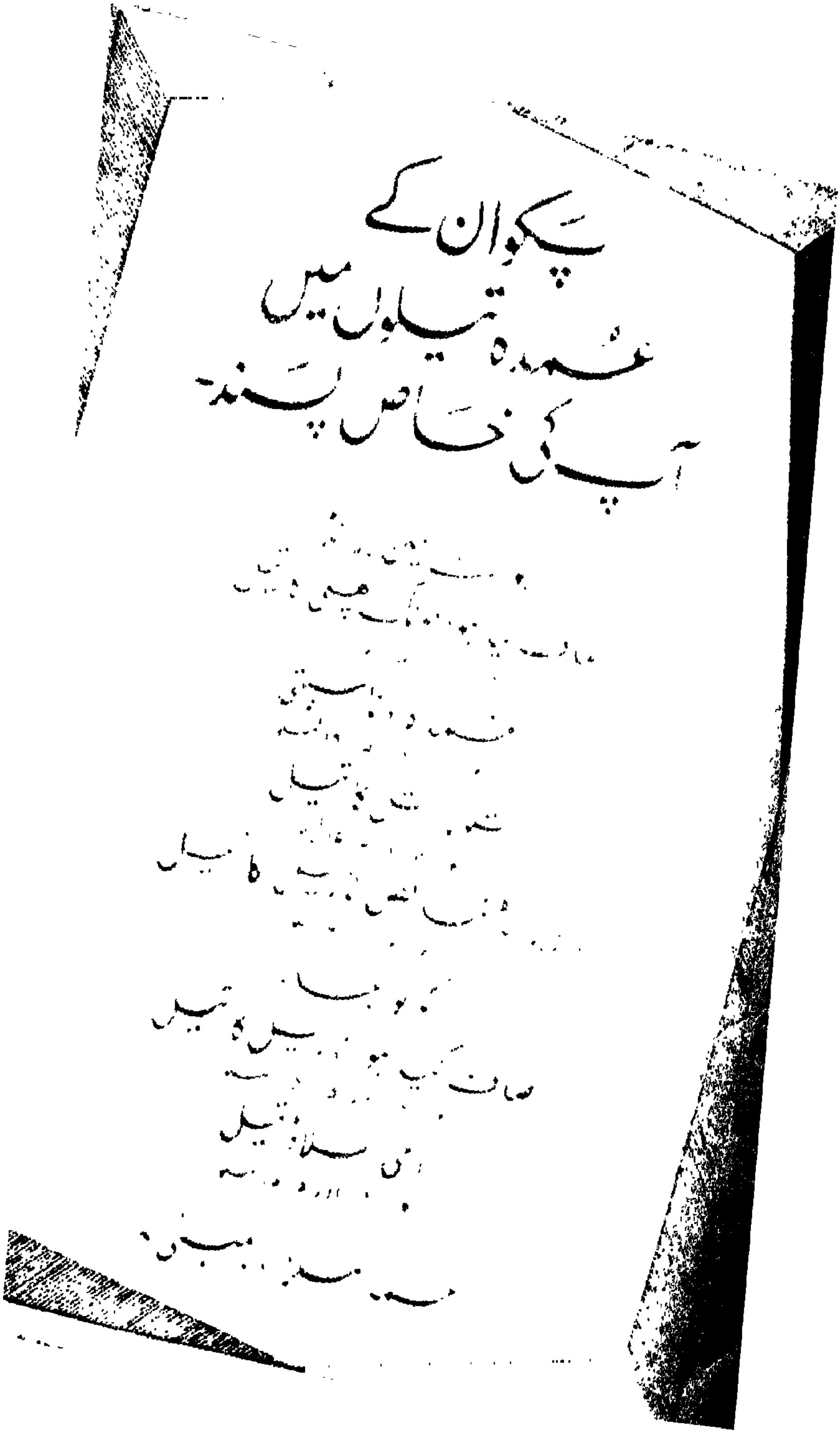
[illegible]

26/9/72

الفرقان
لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی


پکوان کے
عمدہ تیلوں میں
آپ کی خاص پسند

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۸/-
بنگلادیش سے ۸/-
ضخامت ۷۶ صفحات
قیمت
فی کاپی ...... ۷۵ پیسے

الفرقان
لکھنؤ
ماہنامہ

اس شمارہ کی قیمت ۱/۲۵

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۴۰ | بابت ماہ جمادی الاخری و رجب ۱۳۹۲ھ مطابق اگست و ستمبر ۱۹۷۲ء | شمارہ ۵-۶

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہے تو

مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۵ راکتوبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع کردیں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجائے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اعتذار

(از مرتب)

کس طرح اپنے ناظرین سے معافی چاہی جائے کہ پچھلے شمارے کی اشاعت میں جتنی تاخیر ہوئی تھی اُس سے کہیں زیادہ انتظار کی زحمت دے کر یہ شمارہ اُن کے ہاتھ میں آرہا ہو۔ افسوس کہ ندائے ملت کے مقدمات اپنے آخری دنوں میں ذاتی پریشانی سے آگے بڑھ کر الفرقان کے نظامِ اشاعت پر بھی اثر انداز ہو گئے۔ پچھلی اشاعت میں تاخیر کا باعث بھی یہی تھا اور اس بار بھی یہی ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ دونوں مقدمے جن کا ذکر گزشتہ اشاعت میں معذرت کے طور پر لانا پڑا تھا ۲۹ر اور ۳۰ر اگست کو یکے بعد دیگرے راقم کے حق میں فیصل ہو کر ختم ہو گئے۔ مگر صحت کو اس درجہ پر پہونچا دیا کہ مسلسل دو بار فیصلے کی تاریخ کو بھی اپنی طرف سے اس لیے آگے بڑھوانا پڑا کہ حاضری کی سکت نہ تھی۔ خونیہ پر بلڈ پریشر اتنا گرا ہوا رہا کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل۔ ستمبر کے دوسرے ہفتے میں آکر کیفیت کچھ بدلی ہے۔ والد ماجد مدظلہم کوشاں تھے کہ ارادہ کے مطابق اگست اور ستمبر کا مشترک شمارہ اوائل ستمبر میں نکل جائے مگر اگست میں اُن کے کوئی دو ہفتے بعض ضروری سفروں کی نذر ہوئے۔ اگست کے آخر میں بمبئی کے سفر سے واپسی ہوئی تو گھر کا ایک ایک فرد فلو کا شکار ہوا پڑا تھا۔ اور جب یہ سب اس کی گرفت سے نکلے تو آنمحترم خود اس کا شکار ہو گئے۔ ایسے میں بڑا غنیمت معلوم ہو رہا ہے کہ دیر ہی سے سہی ستمبر میں بہر حال رسالے کی اشاعت ہو رہی ہے، گو کہ ناظرین کرام کو انتظار کی بڑی زحمت سے گزرنا پڑا ____ خدا کرے کہ آئندہ یہ صورت پیش نہ آئے اور جیسا کہ ارادہ ہے اکتوبر کا شمارہ ۱۰ر اکتوبر سے پہلے شائع ہو جائے۔

متعدد ناشرین اور مصنفین اپنی کتابوں پر تبصرہ کے منتظر ہیں، بعض سے وعدہ کی بنا پر شرمندگی بھی ہے، اُمید ہے کہ مذکورہ بالا حالات کی بنا پر وہ بھی معاف فرمائیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

الفرقان کے اس سے پہلے ہی شمارہ میں (جو آخر جولائی میں شائع ہو سکا تھا) ناظرین کرام نے وہ خط پڑھا ہوگا جو راقم سطور نے مکہ مکرمہ سے مولانا نسیم احمد فریدی کو لکھا تھا، اس میں حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب لاہوری مہاجر کا ذکر کرتے ہوئے اس ناچیز نے مولانا فریدی کو لکھا تھا کہ

"آپ حضرت مولانا ممدوح سے اچھی طرح واقف ہوں گے، شاید دار العلوم دیوبند میں ساتھ بھی رہا ہو، حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہٗ کے صاحبزادہ ہیں، عمر مجھ سے غالباً کم ہے لیکن خاص درویشانہ طرز زندگی نے اتنا متاثر کیا ہے کہ مجھ سے بہت زیادہ ضعیف اور بوڑھے معلوم ہوتے ہیں، اختلاج کی بھی کافی عرصہ سے شکایت ہے، لوگوں سے بہت ہی کم ملنا چاہتے ہیں، میرے ساتھ اور مجھ سے زیادہ مولانا علی میاں کے ساتھ عنایت و محبت کا خصوصی تعلق ہے۔ مکہ معظمہ کے اس قیام میں ۱-۲ بار مولانا کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، بلاشبہ مولانا اُن بندگانِ خدا میں سے ہیں جن کی نشانی حدیث نبویؐ میں یہ بیان فرمائی گئی ہے۔

"یذکرکم اللہ رؤیتہ، ویذکرکم الآخرۃ عملہ، وینفعکم منطقہ"۔[۱] خلوت پسندی مولانا کا حال ہے اور اس وقت وہ اس بارے میں بالکل معذور ہیں، اللہ تعالیٰ ایسی تبدیلی فرمائے کہ لوگوں کے لیے اُن سے ملنا اور اُن سے استفادہ آسان ہو جائے۔ مولانا یقیناً اُن بندگانِ خدا میں سے ہیں جن کی صحبت اکسیر ہے۔"

یہ سطریں مکہ مکرمہ کے قیام کے بالکل آخری دنوں میں لکھی گئی تھیں۔ ۲۰ رجون کو راقم سطور حجاز مقدس سے روانہ ہو کر اُسی دن شام کو بمبئی اور پھر ۲۲ رجون کو لکھنؤ پہونچ گیا تھا۔

صرف ۵ ہفتے کے بعد، ۲۷ رجولائی کو مکہ مکرمہ سے جناب عبدالرحمٰن نوردلی صاحب کا خط مولانا علی میاں کو ملا جس میں یہ مختصر اطلاع تھی کہ "کل جمعرات (۲۹ رجمادی الثانیہ) کو حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب واصل بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

اس کے دو دن بعد ۲۹ رجولائی کو جناب حکیم سید معراج الحسن صاحب مقیم مکہ مکرمہ کا کسی قدر مفصل مکتوب مولانا

---

[۱] یعنی اللہ کے بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کے تمہیں اللہ یاد آئے اور اُن کے طرز عمل اور اُن کی زندگی آخرت کو یاد دلائے اور اُن کی باتوں سے تمہیں نفع ہو، اور دل زندہ ہو۔

علی میاں کے پاس آیا، مناسب معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مرحوم کے حادثۂ وفات سے متعلق اس کی سطریں الفرقان میں محفوظ کر دی جائیں۔ حکیم صاحب نے لکھا ہے :-

"مولانا حبیب اللہ صاحب کی طبیعت قریباً ایک ماہ سے خراب چل رہی تھی .... اپنی خدمات کی استدعا کی لیکن منع فرمایا اور فرمایا بس دعا کرو یہی کافی ہے۔ پھر اسحاق صاحب کے ذریعہ (جو مولانا کے یہاں کچھ رسائی رکھتے تھے) کوشش کی کہ معالجہ قبول فرمالیں، لیکن ان سے بھی فرمادیا کہ بھائی میں نے باری تعالیٰ سے رجوع کیا، علاج بے سود ہے بس دعا کرو...... اس کے بعد پھر عیادت کے لیے گیا غالباً دوشنبہ کا دن تھا، بے چینی برابر بڑھ رہی تھی، فرمایا جمعہ تک انتظار کرو ان شاء اللہ جمعہ تک بالکل تندرست ہو جاؤں گا .... بس دعا کرتے ہوئے رخصت ہو کر چلا آیا، مصروفیت کی وجہ سے دو دن نہ جا سکا لیکن احوال دریافت کرتا رہا۔ جمعرات کے دن صبح ہی سے بے چینی تھی کہ مولانا کی عیادت کو جاؤں، مگر عصر کی نماز پڑھ کر جا سکا۔ اسحاق صاحب کو ان کی دوکان سے ساتھ لیا ہم لوگ سیڑھیاں جا کر جب مولانا کی قیام گاہ پہونچے تو دیکھا کہ مولانا دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے ہیں، اور ایک صاحب جو ۲-۱ روز سے مولانا کی خدمت اور دیکھ بھال کر رہے تھے وہ ان کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میری پہلی نظر آنکھوں پر پڑی اور نبض دیکھی۔ مولانا رخصت ہو چکے تھے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہم لوگوں نے لٹا دیا اور چادر ڈال دی۔ سقوط نبض اور آنکھوں کی رنگت کے سوا کوئی چیز نہ تھی جس سے موت کا اندازہ کیا جا سکتا۔ خادم سے پوچھا بھئی کیا ہوا اور کیا وصیت فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ جب میں نماز سے واپس آیا تو مولانا دیوار سے سہارا لیے ہوئے تھے، میں گھبرایا کہ خلاف عادت مولانا نے اس طرح دیوار سے سہارا کیوں لیا۔ میں درست کرنے لگا۔ بس اتنا فرمایا۔ الحمدللہ اللہ نے میرا کام بنادیا۔ اور کلمہ شریف پڑھا پھر آپ حضرات آگئے۔

تجہیز و تکفین کا انتظام فوراً ہو گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد نماز جنازہ ہوئی اور جنت المعلیٰ میں حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی قبر مبارک سے ۳ فٹ کے فاصلہ پر مولانا عبدالحق شیخ الدلائل کی جگہ پر مدفون ہوئے۔

صرف کتابوں کے لیے وصیت فرما گئے کہ دارالعلوم دیوبند بھجوا دی جائیں۔ قریباً ایک ماہ سے کتابوں پر اپنے نام کی مُہریں لگوا رہے تھے۔"

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ بڑی ہی قابل رشک تھی مولانا مرحوم کی درویشانہ زندگی، اور اس سے زیادہ قابل رشک ہوئی ان کی وفات ـــــــ وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون۔

ناظرین کرام بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندہ کے ساتھ رحمت و مغفرت کا خاص الخاص معاملہ فرمائے اور ہماری امیدوں سے بالاتر اپنی شانِ عالی کے مطابق برکات سے نوازے اور ہمیں بھی اپنی رضا طلبی اور اپنے مقبول بندوں کی محبت نصیب فرمائے۔

جرح اور تعدیل

مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی
استاد دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فن جرح و تعدیل، یعنی احادیث نبویؐ کے راویوں کی معتبر ہونے کے پہلو سے جانچ اور درجہ بندی اگرچہ ایک خالص دینی ضرورت کا تقاضا تھا جسے مسلمانوں نے پورا کیا، لیکن ان کے اس علمی کارنامے نے پوری دنیائے علم کا سر ان کے آگے خم کر دیا ہے اور آج تک مسلمانوں کی اس عظیم خدمت کو شرق و غرب کے علمی حلقے سراہ رہے ہیں، خود مسلمانوں کے بعض حلقے آج کل، اس فن کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں، کچھ تو اس کی وجہ اس فن سے کما حقہ واقفیت کی کمی ہے اور کچھ اس کا یہ پہلو کہ راویوں کے بالکل نجی حالات اور اُن کی سیرت کے ناپسندیدہ گوشوں کی پردہ دری، اس سے ہوتی ہے۔ اس لیے بعض ضرورت سے زیادہ سنجیدہ طبائع پر یہ چیز بار ہو جاتی ہے۔

اردو زبان میں احادیثِ نبویؐ کا بنیادی ذخیرہ کم و بیش منتقل ہو چکا ہے، لیکن فنِ جرح و تعدیل پر (راویانِ حدیث کی جرح اور صفائی پر) اردو زبان نے اب تک توجہ نہیں کی، عربی داں، مکتبی حلقے تک اس اہم فن کے نازک پہلوؤں سے پوری واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے اس کا اس طرح استعمال کر جاتے رہے کہ بات بننے کے بجائے بگڑ جاتی رہی۔

مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحئی فرنگی محلی (وفات سنہ ۱۳۰۴ھ) نے جرح و تعدیل کے موضوع پر جب عربی میں ایک کتاب تصنیف کی تو اس وقت مقدمے میں انھوں نے لکھا تھا کہ:-

"اس کتاب "الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل" لکھنے کا باعث یہ ہے کہ

ہیں نے بیشتر معاصر علماء کو پایا کہ جرح و تعدیل کی بحثوں میں فنی مسائل سے ناواقفیت کی بنا پر اندھی سواری کی پشت کے سوار ہیں..... کتنے علماء ہیں جنھوں نے مستند سندوں کو مجروح قرار دے ڈالا اور کتنے فضلاء ہیں جنھوں نے کمزور سندوں کو معتبر اور صحیح کہہ دیا...... یہ حضرات جرح و تعدیل کے ماہر مصنفین کی کتابوں سے اقوال جرح و تعدیل کو بس نقل کر دینا بہت کافی سمجھتے ہیں، حالانکہ جرح و تعدیل کے اماان فن کی اصطلاحوں کی حقیقت سے یہ ناقلین بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کو جرح مبہم اور جرح غیر مبہم کا فرق تک نہیں معلوم۔ اور کیا مقبول اور کیا نامقبول ہے اس کا بھی علم نہیں رکھتے......؛

اُس وقت جب براہِ راست عربی تصانیف سے استفادہ آسان امر تھا، اس نازک فن میں عربی داں حلقے ٹھوکریں کھاتے رہتے تھے تو آج جبکہ عربی دانی کا دو نمبر واپسیں کے درجہ میں ہے فن جرح و تعدیل کے نازک مسائل کا عدم ادراک ہی نہیں بلکہ پورے فن سے کورے تک ذرا بھی حیرت خیز نہیں ہو سکتی۔

اکثر یہ خیال آ آ کر رہ گیا کہ کیوں نہ مولانا عبدالحیٰ فرنگی محلی کی اسی کتاب "الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل" کے مضامین و مطالب کو آسان اردو میں منتقل کر دیا جائے، میرے ساتھی ڈاکٹر (مولانا) فضل الرحمٰن گنوری (استاد شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے مولانا کی اس کتاب کے جدید ایڈیشن کا مطالعہ کرنے کے بعد میرے قدیم خیال کو پھر مہمیز کیا۔

"الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل" کا جدید ایڈیشن، ترتیب اور تہذیب کے ساتھ عرب محقق مفتی عبدالفتاح ابو غُدّہ (مفتی حلب)، نے کوئی دس برس ہوئے حلب (شام) سے شائع کیا تھا اس سے کچھ ہی مہینے قبل اُنھوں نے مولانا عبدالحیٰ فرنگی محلی کی تصانیف کی تلاش اور اُن کے مزار زیارت کے قصد سے ہند و پاکستان کا سفر بھی کیا تھا، فرنگی محل بھی تشریف لائے تھے۔ مولانا کی بعض نایاب مطبوعہ تصانیف جو بازار میں موجود نہیں تھیں، میں نے اُن کی نذر کی تھیں۔ اُنھوں نے اس کو رکھا اور مولانا عبدالحیٰ فرنگی محلی کی تمام تصانیف کو ترتیب و تہذیب کے ساتھ شائع کرنے کا پروگرام اُنھوں نے بنایا تھا اُس کے تحت یہی پہلی کتاب، یعنی "الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل" سنہ ۱۹۶۲ء میں جب شائع کی تو یہ قابلِ قدر تحفہ مجھے بھی ارسال کیا۔

اس جدید اڈیشن کی خوبیوں کا کیا ذکر کیا جائے، ظاہری خوبیاں تو رہیں الگ، معنوی خوبیوں نے مولانا کی اس اہم تصنیف کو اہم تر اور مفید تر بنا دیا ہے، مولانا کی حیات میں ہی کتاب چھپی تھی تو بڑے سائز کے صرف تیس صفحات پر تھی، مفتی ابو غدہ نے جو اڈیشن اپنے حواشی، مقدمہ، اشاریہ وغیرہ کے ساتھ خوبصورت ٹائپ میں چکنے کاغذ پر شائع کیا ہے اس کے صفحات کی تعداد مجموعی طور پر (۲۷۲) ہے۔

عربی سے لفظی ترجمہ تو کچھ زیادہ سود مند نہ ہوگا، کتاب میں بعض مطالب ایسے بھی آگئے ہیں جو اردو حلقوں کے لیے کچھ ایسے ضروری نہیں ہیں، مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصل کتاب اور مفتی ابو غدہ کے حواشی کے ضروری مضامین اپنی زبان میں بیان کر دیے جائیں اور یہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے کہ اصل و حواشی مخلوط نہ ہونے پائیں، مصنف (مولانا عبدالحیؒ) کے دیباچہ اور محشی کے پیش لفظ بھی سردست قطع نظر کر لینا مناسب ہے، آغاز بنیادی مسائل ہی سے ہونا چاہیے، مفتی ابو غدہ کے حواشی فٹ نوٹ میں دیکھیے۔ ۳۰ ز ...

۱- جرح و تعدیل کی شرعی حیثیت اور اس سے کام لینے کی ضروری شرطیں

شیخ الاسلام امام محی الدین نووی شارح صحیح مسلم (وفات ۶۷۶ھ) نے اپنی تصنیف "ریاض الصالحین" میں شیخ الاسلام امام غزالی (وفات ۵۰۵ھ) نے اپنی کتاب "احیاء علوم الدین" میں اور دوسرے مصنفین نے اپنی اپنی تصانیف میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ کسی شخص کی غیبت نہ اس کی زندگی میں نہ اس کے مرنے کے بعد جائز نہیں ہے۔ البتہ کوئی شرعی ضرورت اس کی متقاضی ہو تو اور بات ہے۔ شرعی ضرورت کی حسب ذیل صورتیں ہیں۔

(۱) ظلم و زیادتی کے خلاف فریاد۔ یعنی مظلوم کے لیے جائز ہے کہ وہ بادشاہ یا قاضی وغیرہ سے جو دادرسی کی قدرت رکھتے ہیں یہ کہے کہ "فلاں شخص نے میرے اوپر یہ ظلم کیا ہے"۔

(۲) کسی برائی کے مٹانے میں دوسرے کی مدد لینے کے لیے، اس شخص سے جو برائی کی روک تھام کر سکتا ہے یہ کہنا جائز اور درست ہے کہ "دیکھیے فلاں ایسی حرکتیں کر رہا ہے اُسے منع کیجیے"۔

(۳) استفتا کے طور پر مفتی لوگوں سے یہ کہنا جائز ہے کہ مثلاً "میرے والد نے میرے ساتھ یہ زیادتی کی ہے اس سے نجات کی کیا صورت ہوگی"۔

(۴) مسلمان بھائیوں کو برائی سے آگاہ کرنے اور خیر خواہی کے لیے بھی غیبت جائز ہے، مثال کے طور پر شادی بیاہ کی بات چیت کے سلسلے میں یا کسی کاروباری معاملے میں شرکت کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں یا اسی قسم کے اور معاملات کے سلسلے میں اگر کوئی کسی سے مشورہ کرے تو مشورہ دینے والے کے لیے بہ نیت خیر خواہی و آگاہی غیبت سے کام لینا جائز ہے، اسی ضمن میں قاضی یا حاکم عدالت کے سامنے گواہوں پر جرح کرنے کا بھی معاملہ آتا ہے۔ (یعنی گواہ سے بطور جرح ایسی باتیں پوچھی جا سکتی ہیں جو بدگوئی کی حیثیت رکھتی ہیں) اور اسی دائرے میں حدیث کے راویوں کی جرح (بدگوئی) بھی آتی ہے جو سب کے نزدیک نہ صرف جائز ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر واجب و لازم ہے، اسی سلسلے میں یہ صورت بھی ہے کہ مثلاً فقہ کا ایک طالب علم کسی ایسے سے پڑھ رہا ہے جو بد عقیدہ یا بد عمل ہے اور بد حال یا کھلے بندوں گناہ میں مبتلا ہے، اور یہ اندیشہ ہے کہ فقہ اور علم دین کا طالب علم بھی کہیں اس سے متاثر نہ ہو جائے اس وقت طالب علم سے بطور خیر خواہی اگر کوئی اُس کے استاد کے صحیح صحیح حالات بیان کر دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہ لازمی شرط ہے کہ مقصد محض خیر خواہی ہو، اُستاد سے حسد یا عداوت کی بنیاد پر یہ بدگوئی ہرگز نہ ہو۔

(۵) ایک شخص برملا گناہ اور بدعت میں مبتلا ہے اور اپنی اس حالت کا بے باکی سے اظہار بھی کر رہا ہے تو ایسے شخص کی بدگوئی جائز ہے مگر صرف اُس گناہ کی حد تک جس میں وہ بے باکی کا ثبوت دے رہا ہے' اسی کے ساتھ ساتھ اس کے دوسرے عیوب کا بیان جائز نہیں ہے۔

(۶) کوئی ایسے ہی لقب یا عرف سے مشہور ہو جس میں بدگوئی کا پہلو نکلتا ہو، تو اس معیوب عرف یا لقب سے اُسے یاد کرنا غیبت یا بدگوئی نہیں ہوگا جیسے اعمش (چندھا) اعرج (لنگڑا) اصم (بہرا) احول (بھینگا) وغیرہ (عربی میں ایسے "عرف" بہت ہیں۔ اُردو میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں جیسے ٹُنڈا)

یہ چھ صورتیں ہیں اور ان ہی کے تحت آنے والی کچھ دوسری فروعی شکلیں بھی، جن میں غیبت اور بدگوئی جائز ہے، مگر بجائے خود ہے یہ بڑا مشکل معاملہ، اس سے حق اللہ کا بھی واسطہ ہے اور حقوق انسان کا بھی، بلا وجہ بدگوئی کا جو ضرر قیامت کے دن ہوگا وہ الگ، دُنیا میں بھی اس کے نقصانات اور مضرتیں کھلی ہوئی ہیں۔ اس سے منافرت اور عداوت باہم پیدا ہو جاتی ہے، بدگوئی کی اجازت محض شرعی ضرورت کے تحت دی گئی ہے علمائے دین کا صاف صاف کہنا ہے کہ' جس حد تک ضرورت ہے

اُس سے زیادہ بدگوئی کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اگر ایک شخص کی ماہرینِ جرح و تعدیل میں سے بعض نے برائی کی ہے اور بعض نے صفائی کی ہے تو صرف برائی (جرح) کو نقل کر دیا جائے اور صفائی (تعدیل) کا ذکر ٹال دیا جائے، یہ بھی جائز نہیں ہے کہ کسی کی برائی بیان کر دی جائے حالانکہ برائی کے بیان کی شرعاً کوئی حاجت ہی نہ ہو، اسی لیے اُن اہلِ علم کی بدگوئی سے علماء نے منع کیا ہو جن کا روایتِ حدیث میں کوئی دخل ہی نہیں ہے۔

حافظ شمس الدین سخاوی (وفات ۹۰۲ھ) نے اپنی کتاب "فتح المغیث" میں لکھا ہے "اگر ایک ہی عیب کے بیان کر دینے سے (شرعی) ضرورت پوری ہو رہی ہے تو دو عیب بیان کرنا جائز نہیں ہے۔"

شیخ الاسلام علامہ ذہبی (وفات ۷۴۸ھ) نے اپنی تصنیف "میزان الاعتدال" میں لکھا ہو کہ "متأخرین کے بارے میں جو بعض برائیاں بیان کی گئی ہیں، میں اپنی کتاب میں ان کو نہیں لاؤں گا ہاں، جس کی کمزوری بالکل واضح اور نمایاں ہو چکی ہے اُس کا ذکر بے شک کروں گا، متأخرین کی کمزوریاں نہ بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں روایتِ حدیث پر دار و مدار نہیں رہا ہے (کہ متأخر راویوں کی کمزوریوں کو بیان کر کے روایتِ حدیث کی صحت اور اس کا ضعف جانچا جائے) بلکہ ان محدثین اور مصنفینِ کتبِ حدیث پر دار و مدار ہو گیا ہے جن کی سچائی، دیانت اور حفظ معروف و مشہور ہیں، (تو متأخر راویوں کی برائی بھلائی جانچنے کی ضرورت ہی نہیں رہی) اور یہ طے شدہ بات ہے کہ (جہاں تک ممکن ہو) راوی کی ناموس کی حفاظت اور اس کی پردہ پوشی لازم و واجب ہے۔ "متقدم" کون ہے اور "متأخر" کون ہے؟ اس کی حدِ فاصل تین سو سال ہے۔" (تین سو سال کے بعد والے راویانِ حدیث "متأخرین" ہیں)

علامہ سیوطی (وفات ۹۱۱ھ) نے اپنے معاصر علامہ سخاوی کی مرتبہ تاریخ پر سخت تبصرہ کرتے ہوئے اپنی تصنیف "الکاوی فی تاریخ السخاوی" میں لکھا ہے۔ "اس تصنیف سے میری غرض یہ ہو کہ سخاوی نے اپنی تاریخ میں لوگوں کی جو عیب جوئی کی ہے اور محض اپنے قیاس کی بنیاد پر جو غلط گوئی سے کام لیا ہے اُس کی تردید کر دوں، اس لیے کہ از روئے قرآن و حدیث مسلمانوں کی تحقیر حرام قرار دیا چکی ہے۔ سچی اور واقعاتی عیب جوئی اور بدگوئی تک کے سلسلے میں بڑی سخت احتیاط کا حکم دیا

گیا ہے، چہ جائیکہ ایسی بدگوئی جس میں بدگوئی کرنے والا جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لے رہا ہو! یہ کہنا کہ حدیث کے راویوں اور ناقلوں کی علانیہ بدکاری کرنے والوں کی اور عیبی لوگوں کی بدگوئی تو ایک ناگزیر امر ہے تو اس کا کھلا جواب یہ ہے کہ اولاً تو سخاوی نے بڑی تعداد میں ایسے لوگوں کی بدگوئی اپنی تاریخ میں کی ہے جن کا کوئی تعلق حدیث کی روایت اور نقل سے ہے ہی نہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں تو شرعاً لازم اور واجب ہے کہ ان کی عیب جوئی سے سکوت اختیار کیا جائے اور جیسے وہ ہیں انھیں رہنے دیا جائے، دوسرے یہ کہ جرح اور بدگوئی شروع زمانہ اسلام میں، یعنی اس زمانے میں جائز قرار دی گئی تھی جب کتابوں کے صفحات کے بجائے راویوں کے سینوں سے حدیث حاصل کی جاتی تھی، اُس وقت احادیث کی جانچ اور مقبول و مردود حدیث کی پہچان کے لیے راویوں کی جرح کی ضرورت تسلیم کی گئی تھی، ہمارے زمانے میں تو تصنیف شدہ حدیث کی کتابوں پر دار و مدار ہو گیا ہے، موجودہ زمانے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط یہی ہے کہ یہ ٹھونک بجا لیا جائے کہ سلسلۂ اسناد میں مذکورہ اشخاص میں وہ دو شرطیں پائی جاتی ہیں یا نہیں جو علما نے ان کے لیے ضروری قرار دی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ محتاط اور محفوظ ہو دوسرے یہ کہ اپنے محدث سے جس پر بھروسہ کیا جاتا ہے، اس کی تحریر کی ہوئی حدیثوں کی سماعت کا راوی کے بارے میں ثبوت موجود ہو! اس زمانے میں اگر کسی راوی کے بارے میں نقد کیا جا سکتا ہے تو صرف یہی کہ وہ غیر محتاط ہے یا مستور الحال ہے یعنی معتمد علیہ سے اس کی سماعت کا ثبوت نہیں ملتا، یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی سماعت حدیث میں لاپروائی (تہور) اور آمیزش کی کچھ جھلک پائی جاتی ہے، جب یہ صورت ہے تو بتلیئے، قایاتی، قلقشندی اور سنادی کے ایسے امامانِ فن اور مشائخ اسلام کے بارے میں سخاوی کو بدگوئی کرنے کی کیا وجہ تھی؟ اور اُن علما اور مشائخ کی بعض شعرا نے جو ہجویں کہی ہیں اُن کے ذکر کا اپنی تاریخ میں کیا محل تھا؟"

حافظ سخاوی نے اپنی کتاب "فتح المغیث" میں لکھا ہے" ابن دقیق العید نے ابن سمعانی پر اسی بنا پر کہ اس نے بعض شعرا کا ذکر کیا ہے اور ان کی عیب جوئی کی ہے یہ کہتے ہوئے اعتراض کیا ہے کہ اگر روایتِ حدیث کے لیے بدگوئی کرنے کی مجبوری نہ ہو تو پھر بدگوئی جائز نہیں ہے اور اسی طرح کی بات ابن المرابط نے بھی کہی ہے کہ احادیث تو اب کتابوں میں محفوظ ہو چکی ہیں، اب جرح

(بدگوئی) کی ضرورت باقی نہیں رہی، بلکہ چوتھی ہجری کے آغاز ہی میں جرح کا محل ختم ہوچکا ہے۔"

علامہ ذہبی (وفات ۷۴۸ھ) نے اپنی کتاب "میزان الاعتدال" میں ابان بن یزید العطار (راوی) کے احوال میں لکھا ہے کہ "علامہ ابن جوزی (وفات ۵۹۷ھ) نے ابان بن یزید کو ضعیف راویوں میں شمار کیا ہے، انھوں نے ان علماء کے اقوال بیان نہیں کیے جنھوں نے ابان بن یزید کو معتبر (ثقہ) قرار دیا ہے، علامہ ابن جوزی کی کتاب کا یہی نقص ہے کہ جرح کا ذکر تو کر دیتے ہیں اور اگر اس راوی کی توثیق بھی بعض علماء نے کی ہے تو اُس کے ذکر کو ٹال جاتے ہیں۔"

مستند علماء کے اقتباسات جو ابھی نقل ہوئے، غالباً ہمارے زمانے کے بعض علماء و فضلاء کے کانوں تک ان کی بھنک نہیں پہونچی ہے، ان کا یہ وتیرہ ہے کہ جب وہ کسی روایت کا ضعف بیان کرنا چاہتے ہیں تو جرح و تعدیل کی کتابوں سے بعض جرح والے اقوال نقل کر دیتے ہیں اور تعدیل کے اقوال کو چھوڑ جاتے ہیں۔ اس طرح عوام الناس کو اس مغالطے میں ڈال دیتے ہیں کہ فلاں راوی کی توثیق کسی بڑے عالم نے کی ہی نہیں ہے، حالانکہ ان کا فرض ہے کہ اگر جرح نقل کی ہے تو تعدیل بھی نقل کریں، پھر ان دونوں پہلوؤں میں سے جو ان کے خیال میں قابل ترجیح ہو اُس کو ترجیح دیں، یہ حرکت جو ہمارے زمانے کے بعض افاضل کرتے ہیں، سچ یہ ہے کہ حرام اور بڑی بُری خصلت ہے!۔

بعض معاصر علماء کی بُری عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کبھی وہ فضلا و علما کے احوال میں کوئی تصنیف کرتے ہیں تو اس کو ایسی باتوں سے بھر دیتے ہیں جن سے سمجھ دار لوگوں کو بیزاری ہوتی ہے، جو لوگ ان مصنفین کی نظر میں بُرے اور بد ہیں اُن کے عیوب و نقائص ہی بس ذکر کرتے ہیں خواہ وہ خوبیوں اور اچھائیوں کے جامع ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ بہت سنگین عیب ہے! اس کے نتیجے میں عوام بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بڑی بڑی شخصیتوں کے بارے میں بُرے بُرے خیالات پھیلنے لگتے ہیں۔

بعض علمائے عہد حاضر کی ایک عادت بد یہ بھی ہے کہ اگر کسی مسئلے کے بارے میں اپنے کسی معاصر عالم سے مباحثہ کریں گے تو اس کے نجی حالات کی بنیاد پر اس کی بدگوئی (جرح) کرنے لگیں گے، اور ایک سچ میں ہزار جھوٹ ملا کر بیان کریں گے اس طرح زبان طعن اس کے بارے میں کھول دیں گے کہ ہر پرہیزگار آدمی حیران دیکھتا رہ جائے گا، ان کا مقصد بس یہی ہوتا ہے کہ بُرا بھلا کہہ کر حریف کو چپ کر دیں اور زور زیادتی کے ذریعہ اپنے مقابل کے اعتراضوں سے بچ جائیں۔ مناظرہ کو گالم گلوچ اور مباحثہ کو مخاصمہ

بنا دیتے ہیں۔ ان قبیح عادتوں کے خلاف واضح دلائل کے ساتھ اپنی کتاب "تذکرۃ الراشد برد تبصرۃ الناقد" میں، میں آگاہی دے چکا ہوں۔

جرح کا حق کس کو ہے اور کس کو نہیں

جرح ہو یا تعدیل، یعنی راوی کا عیب بیان کیا جائے یا خوبیاں، شرط یہ ہو کہ بیان کرنے والا بھی وہ ہو جو زیورِ علم و تقویٰ و دیانت وصدق سے آراستہ اور ہٹ دھرمی (تعصب) سے پاک ہو، نیز جرح و تعدیل کے وجوہ واسباب کا پورا پورا علم رکھتا ہو جس میں یہ باتیں نہیں ہیں اُس کی نہ جرح مقبول ہے نہ تعدیل و تزکیہ (صفائی)

علامہ تاج الدین سبکی (وفات ۷۷۱ھ) کا قول ہے کہ "جو شخص جرح و تعدیل کے اسباب و وجوہ کا جاننے والا نہیں ہے اُس کی نہ جرح مقبول ہو گی نہ تعدیل، خواہ وہ مطلق ہو یا مقید۔

علامہ بدر بن جماعہ (وفات ۷۳۳ھ) نے بھی ان ہی الفاظ میں یہ بات کہی ہے۔

علامہ حافظ ابن حجر شارح صحیح بخاری (وفات ۸۵۲ھ) نے اپنی کتاب "نخبۃ الفکر" میں ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ "اگر ایسے شخص نے جرح کی ہے جو اسباب جرح کا واقف کار نہیں ہے تو ایسی جرح کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔" نیز یہ بھی لکھا ہے "صفائی (تزکیہ اور تعدیل) اُس کی معتبر ہے جو اسباب تزکیہ کا عالم ہو نہ کہ ہر کس و ناکس کی، اور جرح بھی صرف اُسی کی قبول کرنا چاہیئے جو منصف اور بیدار مغز ہو۔"

علامہ ذہبی (وفات ۷۴۸ھ) نے اپنی کتاب "تذکرۃ الحفاظ" میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے تذکرے میں لکھا ہے: "حدیث بیان کرنے والے کا فرض ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اُس میں دیانت داری کو ملحوظ رکھے، اور اس سلسلے میں باخبر اور متدین حضرات سے پوچھتا بھی رہے تاکہ وہ اس کی روایت کی ہوئی حدیثوں کے معنی اور مطلب کی وضاحت میں معین و مددگار ہوں، راویوں کی پرکھ اور اُن کے قبول و رد کے علم رکھنے والے کے لیے اس فن میں مہارت اور بصیرت حاصل کرنے کی اس کے علاوہ کوئی شکل نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں منہمک رہے اور کھوج میں لگا رہے، تبادلۂ خیال برابر کرتا رہے، انہماک اس حد تک ہو کہ خواب و خور حرام ہو جائیں۔ پھر تقویٰ، مستحکم دین داری، اور انصاف پسندی کے ساتھ سمجھ بھی رکھتا ہو، نیز علماء اور فن میں رسوخ رکھنے والوں سے ملتا جلتا رہے۔ اگر یہ سب نہیں ہو سکتا تو پھر اس کی طرف رُخ ہی نہ کرے۔

فدع عنك الكتابة لست منها　　　ولو سوّدت وجهك بالمداد

(ورنہ لکھائی کا خیال چھوڑ دو، سمجھ لو کہ تم اس کے اہل نہیں۔ اگرچہ اپنا پورا چہرہ بھی تم روشنائی سے سیاہ کرلو) تو اگر تمھیں یہ اندازہ ہوجائے کہ سمجھ، سچائی، دین داری اور پرہیزگاری کے عناصر تم میں پائے جاتے ہیں تو اس فن کی طرف توجہ کرو ورنہ نہیں، اگر خواہشِ نفسانی، اور کسی رائے یا کسی مسلک کے سلسلے میں ہٹ دھرمی (تعصب) کا غلبہ اپنے اندر محسوس کرو تو خدا کے واسطے اس زحمت میں نہ پڑو، اور اگر محسوس کرتے ہو کہ گڑبڑ اور بے ربطی تمھارے مزاج میں ہے اور اللہ تعالیٰ کے قائم کیے ہوئے حدود کی پروا کا جذبہ تم میں نہیں ہے تو پھر ہمیں بخشو۔"

ملا بحر العلوم (ابو العیاش محمد عبد العلی فرنگی محلی (وفات ۱۲۲۵ھ) نے اپنی تصنیف "فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت" میں لکھا ہے۔ "مزکّی (راویوں کی صفائی دینے والے) کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ منصف مزاج اور اسبابِ جرح و تعدیل کا بخوبی جاننے والا ہو اور حق پسند و خیر خواہ ہو، ہٹ دھرم اور خود بیں نہ ہو، اس لیے کہ ہٹ دھرم کی بات اس قابل ہی نہیں ہوتی کہ اس کی طرف ذرا بھی دھیان دیا جائے، جیسے امام ابوحنیفہ کے بارے میں دارقطنی (محدث) کا یہی کہنا کہ "روایتِ حدیث میں وہ ضعیف ہیں"۔ اس سے زیادہ کیا اور کوئی اہانت امام صاحب کی ہوسکتی ہے؟ وہ متقدی، پاکباز، پاکیزہ متقی اور اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ ان کی کرامتیں تک مشہور رہیں پھر کدھر سے ضعف ان کے اندر سما گیا؟"

"امام ابوحنیفہ کو حدیث میں ضعیف ٹھہراتے والے کبھی یہ کہتے ہیں کہ" وہ تو فقہ ہی میں مشغول رہا کیے، ذرا انصاف کرو! اس میں کون سی برائی کی بات ہے؟ بلکہ فقیہ سے حدیث کی روایت کرنا تو اولیٰ تر ہونا چاہیے!"

یہی لوگ کبھی یہ کہتے ہیں کہ" امامانِ حدیث سے امام ابوحنیفہ نے ملاقات نہیں کی، جو کچھ انھوں نے حاصل کیا وہ حماد سے حاصل کیا بس"۔ یہ جھوٹ ہے امام ابوحنیفہ نے بہت سے ائمۂ حدیث جیسے امام محمد الباقر اور اعمش وغیرہ سے حدیثیں روایت کی ہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ خود حماد علم کا مخزن تھے، ان سے تحصیلِ علم نے امام ابوحنیفہ کو دوسروں سے استفادہ کرنے سے مستغنی کردیا تھا، یہی بات کہ انھوں نے صرف ایک ہی استاد سے تحصیلِ علم کی، بجائے خود امام ابوحنیفہ کی علمیت پرہیزگاری اور

کمالِ تقویٰ کی دلیل ہے۔ اُنھوں نے زیادہ اس لیے نہیں بتائے کہ ان سب کے حقوق بھی ان پر لازم ہوجاتے۔ اور اندیشہ تھا کہ ان سب کے حقوق کو وہ پورا نہیں کر پائیں گے" اور عدم ایفائے حقوق کے سلسلے میں ماخوذ ہوں گے)

"یہی لوگ کبھی یہ الزام لگاتے ہیں کہ" امام ابوحنیفہ اصحاب رائے و قیاس میں سے تھے۔ حدیث کے عامل نہیں تھے' یہاں تک کہ ابوبکر بن ابی شیبہ نے اپنی کتاب (مصنّف ابن ابی شیبہ) میں امام صاحب کی ردمیں ایک الگ باب جس کا عنوان "باب الرد علی ابی حنیفہ" ہے قائم کیا ہے" یہ الزام بھی تعصب اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہے، بھلا کیسے درست ہوسکتا ہے یہ الزام؟ متصل حدیث تو رہی ایک طرف، امام ابوحنیفہ تو مراسیل تک کے ماننے والے ہیں" (یعنی وہ حدیثیں تک امام ابوحنیفہ کے نزدیک قیاس اور رائے پر مقدم ہیں جن کے راویوں کا سلسلہ کسی تابعی پر جاکر ختم ہوجاتا ہے، نہ کہ کسی صحابی پر، حالانکہ ارشادات نبوی کے اصل راوی تو صحابہ ہی ہوتے ہیں)

"امام ابوحنیفہ کا تو کہنا یہ ہے کہ" جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ تو سر آنکھوں پر ہے ہی، صحابہ نے بھی جو کچھ فرمایا ہے اُسے بھی میں ترک نہیں کرتا" امام ابوحنیفہ، کسی خبرِ واحد کے عمومی حکم تک کو اپنے قیاس کے ذریعہ محدود نہیں کرتے، چہ جائیکہ قرآن پاک کے عام احکام کو وہ قیاس کے بل پر محدود و مخصوص کرتے ہوں، امام صاحب تو "اخالہ" اور "مصالح مرسلہ" تک پر عمل نہیں کرتے تھے (حالانکہ امام شافعی "اخالہ" اور "مصالح مرسلہ" کے قائل ہیں، یہ دونوں اصطلاحیں اصولِ فقہ کی ہیں اور بڑی تفصیلی وضاحت چاہتی ہیں، اجمالاً یہ ہے کہ کسی واضح شرعی حکم کی وجہ اور علت جو مجتہد نے سمجھی ہے وہی وجہ اور علت کسی ایسے معاملے میں اگر پائی جائے جس کے بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے تو اس مشترک علت کی بناپر مجتہد وہی حکم اس معاملے کا بھی قرار دیتا ہے جس کے لیے کوئی حکم نہیں ہے، یہ قیاس ہے، جس پر امام ابوحنیفہ کا بھی عمل ہے اور امام شافعی کا بھی' اب امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر کسی اور معاملے میں بھی اسی علت سے ملتی جلتی یعنی مناسبت رکھنے والی کوئی علت پائی جاتی ہے تو اس نئے معاملے میں بھی اُسی حکم پر عمل کرنا صحیح ہوگا مگر واجب نہ ہوگا، امام شافعی کے نزدیک واجب ہوگا اگر دل میں یہ خیال غالب ہوجائے کہ یہی وجہ اس حکم کی علت ہے؛ تو اس تخیل قلبی کو "اخالہ" کہتے ہیں جو امام شافعی کے نزدیک حجت ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک "اخالہ" حجت نہیں ہے اور نہ "مصالح مرسلہ" (یعنی

اوصاف جن کی وجہ سے مجتہد کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ وصف جامع علتِ حکم ہے)

"تعجب ہے کہ یہ معترضین امام ابو حنیفہ پر تو طعنہ زن ہوتے ہیں (حالانکہ امام صاحب صحابہ کے ال کو سر آنکھوں پر مانتے ہیں، مراسیل تک قبول کرتے ہیں اور "اِخالہ" اور "مصالح مرسلہ" کو نہیں مانتے) بن امام شافعی کو مقبول قرار دیتے ہیں حالانکہ امام شافعی کا اقوالِ صحابہ کے بارے میں یہ مقولہ ہے کہ یں ان حضرات کے اقوال کو کیسے دلیل بنا سکتا ہوں جن کے زمانے میں اگر میں ہوتا تو اُن سے ن کے اقوال پر ردّ و قدح کرتا"۔ نیز امامِ شافعی "مراسیل" کو بھی قبول نہیں کرتے۔ قرآن کے کسی عام لم کو قیاس کے ذریعہ مخصوص اور محدود کر دینا بھی ان کا مسلک ہے اور "اخالہ" پر بھی ان کا عمل درآمد ہے؟"

"ان طعنہ زنوں کا امام ابو حنیفہ کے بارے میں وہ سب کہنا (جو اوپر گزر چکا) کیا سوائے اتہام زی کے اور کچھ کہا جائے گا؟" "حقیقت یہی ہے کہ امام ابو حنیفہ کے ایسے بلند مقام امام کے بارے میں عترضین کے یہ جتنے اقوال ہیں، سب ہٹ دھرمی (تعصب) کی پیداوار ہیں، ان کو قابلِ التفات ہی یں سمجھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کا نور لوگوں کی پھونکوں سے بجھنے والا نہیں ہے۔ تو اس ساری بحث کو یاد کھنا چاہیے اور ہوشیاری سے صورتِ حال کا مطالعہ کرنا چاہیے"۔ (بحر العلوم فرنگی محلی کا اقتباس ختم)

امام ابو حنیفہ پر اکیلے دار قطنی کے ایسے حضرات ہی نے ازراہِ تعصب طعنہ زنی نہیں کی ہے اور لوگ بھی اس میں شریک ہیں جیسا کہ یوسف بن عبد الہادی حنبلی (وفات ۹۰۹ھ) نے اپنی کتاب "تنویر الصحیفہ بمناقب الامام ابی حنیفہ" میں لکھا ہے:۔

"امام ابو حنیفہ کے بارے میں خطیب بغدادی کی طعنہ زنیوں سے تم کو دھوکا نہ ہو جائے، وہ تو علما کی ایک بڑی جماعت کے خلاف جن میں امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل اور اُن کے متبعین تک شامل ہیں بہت زیادہ تعصب رکھتے ہیں اور ہر پہلو سے ان پر حملہ آور ہوتے ہیں، اس کے نتیجے میں بعض مصنفین نے جوابی کتابیں لکھیں، جیسے یہی کتاب جس کا نام "السہم المصیب فی کبد الخطیب" ہے (خطیب کے جگر کو نشانہ بنا کر سر کیا جانے والا اور ٹھیک نشانے پر بیٹھ جانے والا تیر) رہا ابن جوزی کا معاملہ تو وہ خطیب بغدادی کے قدم بہ قدم ہیں، ابن جوزی کے نواسے نکسنے (جن کا نام جمال الدین سبط ابن جوزی ہے اور جن کی وفات ۶۵۴ھ میں ہوئی) ابن جوزی کے اس رویہ پر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے اپنی

کتاب "مرآۃ الجنان" میں لکھا ہے کہ "حیرت خطیب بغدادی پر نہیں ہوتی انھوں نے اکیلے امام ابوحنیفہ نہیں بلکہ) بہت سے علما پر چوٹیں کی ہیں، مجھے اصل حیرت اپنے نانا (علامہ ابن جوزی) پر ہے، وہ کیسے ان کے نقش قدم پر چلنے لگے انھوں نے جو کچھ (علما کے خلاف قلم بند) کیا وہ تو خطیب بغدادی سے بھی بڑا (المیہ) ہے"

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ قرائن سے خواہ وہ تحریری ہوں یا احوالی جب بھی یہ اندازہ ہو جائے کہ جرح (جرح) کرنے والے نے جس شخص کے خلاف طعنہ زنی کی ہے اس سے اس کو تعصب تھا تو ایسی جرح مقبول نہ ہوگی اور اگر یہ اندازہ ہو جائے کہ اکیلے ایک شخص سے نہیں بلکہ اکابرین کے کسی خاص گروہ سے اس کے دل میں تعصب ہے تو پھر ایسے جرح کرنے والے کی جرح بے پناہ (ناقابل توجہ) ہے اور ایسا جارح جارح نہیں ایذارساں لوگوں میں شمار کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں مزید تفصیل آگے آئے گی۔

(الف) مولانا بحرالعلوم فرنگی محلی کے اس خیال کی تائید میں کہ "ایک فقیہ سے روایت حدیث کرنا اولیٰ تر ہونا چاہیے" حاشیہ نگار مفتی عبدالفتاح ابوغدہ نے اپنے استاد امام محمد زاہد الکوثری مرحوم کا ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے' اُن لوگوں کے لیے جو قیاس" اور "رائے" کے مفہوم و مطلب میں غلط راہ پر پڑ سکتے ہیں۔ اس اقتباس کو یہاں نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مفتی ابوغدہ کہتے ہیں: ہمارے استاد امام محمد زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا: "رائے" اور "قیاس" کے بارے میں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن میں ان کی مذمت کی گئی ہے اور ایسی روایتیں بھی ہیں جن میں قیاس اور رائے کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے! وہ رائے زنی جو مذموم ہے وہ ہے جو خواہش نفسانی کے تحت کی جاتی ہے۔ اور پسندیدہ رائے زنی وہ ہے کہ کسی نئے وقوع پذیر مسئلے کے بارے میں کسی صریحی عبارت (نص) سے حکم کا استنباط کرنا جس طرح فقیہ صحابہ اور فقیہ تابعین اور اُن کے پیرو کیا کرتے تھے یعنی قرآن اور حدیث میں موجود کسی نظیر سے نئی نظیر کو مربوط کرنا۔ خود خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "الفقیہ المتفقہ" میں اس طرح کی بہت سی مثالیں درج کی ہیں، اسی طرح ابن عبدالبر نے اپنی کتاب "جامع بیان العلم" میں ایسی مثالوں کے بہت سے محل اور موقعوں کا بیان کیا ہے' اس سلسلے میں حتمی بات یہ ہے کہ فقیہ صحابہ' تابعین اور اُن کے اتباع کرنے والوں نے "رائے" کے راستہ کو اختیار کیا تھا، یہاں "رائے" کا مطلب یہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی کسی نئے معاملے میں کسی نص سے حکم نکالنا، اور یہ راستہ اور طریقہ کار اس درجہ اجماعی اور متفق علیہ ہے کہ اس سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا ..... تو اس معنی و مفہوم میں "رائے" (قیاس سے کام لینا) ایک خوبی ہے جس سے ہر فقیہ کو متصف ہونا چاہئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقیہ کتنا نکتہ رس باریک بین اور کس حد تک گہرائی میں جانے والا شخص ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "المعارف" میں فقہا کا تذکرہ "اصحاب الرائے" کے عنوان کے تحت کیا ہے اور اس عنوان کے تحت اوزاعی، سفیان ثوری اور امام مالک وغیرہ کے ایسے حضرات کا ذکر کیا ہے، اسی طرح ہم دیکھتے

—:(بقیہ فٹ نوٹ):—

ہیں کہ حافظ محمد بن الحارث الخشنی اپنی کتاب "قضاۃ قرطبہ" میں امام مالک کے متبعین کو "اصحاب الرائے" سے موسوم کر کے ذکر کرتے ہیں، اور بالکل یہی انداز حافظ ابو الولید الفرضی نے اپنی کتاب "تاریخ علمائے اندلس" میں اختیار کیا ہے اور حافظ ابو الولید الباجی نے بھی مؤطا کی شرح میں، اور حافظ ابن عبد البر نے بھی یہی انداز رکھا کہ انھوں نے اپنی شرحِ مؤطا کا نام رکھا ہے "الاستذکار لمذاہب علماء الامصار فیما تضمنہ المؤطا من معانی الرائے والآثار"۔

ان تفصیلوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ "خواہش نفسانی کے تحت رائے اور قیاس" سے کام لینے کی مذمت میں وارد ہونے والی روایتوں کا فقہا کی فقہ پر اور نئے نئے پیش آنے والے واقعات کو — جن کی انتہا جب ہی ہو سکتی ہے جب انسانی تاریخ کی انتہا ہو — قرآن و سنت کی نصوص کی طرف لوٹانے پر اطلاق کرنا قبیح ہوس پرستی ہے، دلائل شرعیہ اس سے یکسر بری ہیں۔

اب رہی امام ابو حنیفہ کی یہ خصوصیت کہ وہ "صاحب رائے" تھے تو اس تخصیص کا سوائے اس کے اور کوئی مطلب لینا صحیح نہ ہوگا کہ نئے مسائل کے لیے نصوص شرعیہ سے احکام نکالنے میں ید طولیٰ اور انتہائی ذہانت رکھتے تھے اس لیے کہ جہاں تک فقہ کا سوال ہے وہ کہیں بھی ہو، مدینہ میں، عراق میں یا اور کہیں، رائے اور قیاس اس کے ساتھ ضرور رہوں گے فقہا کے مختلف گروہ اپنے اپنے دلائل کی بنیاد پر شرائط قیاس و اجتہاد میں ضرور اختلاف رکھتے ہیں لیکن اس پر سب ایک رائے ہیں کہ دلائل شرعیہ کے ماخذ چار ہیں، قرآن، سنت، اجماع اور قیاس، فقہاء میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان چاروں ماخذ میں سے کسی ایک پر انحصار کیے ہوئے ہو ..... سلیمان بن عبد القوی الطوفی الحنبلی اپنی کتاب "مختصر الروضہ" میں جو حنابلہ کے اصول کے موضوع پر ہے لکھتے ہیں: "اصحاب رائے" عملاً وہ سب لوگ ہیں جو احکام شرعیہ میں رائے سے کام لیتے ہیں، تو 'اصحاب رائے' ہونے کی بات تمام علمائے اسلام کو شامل ہے، اس لیے کہ مجتہدین میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے اجتہاد میں غور اور رائے سے کام لینے سے بے نیازی برت سکے خواہ وہ غور و فکر "اخالہ" (جسے تخریج المناط بھی کہتے ہیں) کی قسم کا ہو، اس غور و فکر کی صحت کے بارے میں کوئی نزاع نہیں ہے ہاں فتنۂ خلقِ قرآن کے مسئلے کے بعد متقدمین اہل حدیث نے عرفاً اہل عراق کا نام 'اصحاب الرائے' رکھ دیا اور وہ اہل کوفہ ہیں یعنی امام ابو حنیفہ اور ان کے متبعین وغیرہ ..

... بعضوں نے اس سلسلے میں امام صاحب کی مذمت کی ہے ..... میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان "بعضوں" نے جو کچھ امام صاحب کے بارے میں کہا ہے اس سے میں ان کو بری اور اتہامات سے منزہ پاتا ہوں۔ ان کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کسی حدیث کی از راہِ عناد ہرگز مخالفت نہیں کی ہے، اگر اختلاف کیا ہے تو

اور جو اجتہاد کیا ہے اور جو تشریع اور ... ہے ... کی بنیاد بنایا ہے، ان کے دلائل آج بھی لوگوں کے سامنے موجود ہیں، اُن کے مخالفوں نے ان کے دلائل ... ہیں ... جو کمزوری ... کی ہے، بالفرض امام صاحب سے اجتہاد میں غلطی ہوئی ہے تو ایک اجر تو ضرور ان کو ملے گا، اور اگر وہ صحیح نتیجے پر پہنچے ہیں تو ان کو دو اجر ملیں گے، امام صاحب پر طعن کرنے والے یا تو حاسد ہیں یا مواقع اجتہاد سے نابلد، ہمارے امام احمد بن حنبل سے معتبر اور صحیح آخری روایت یہی ہے کہ انھوں نے امام ابو حنیفہ کی تعریف کی ہے اور ان کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے جیسا کہ ہمارے اصحاب حنابلہ میں ابو الورد نے اپنی کتاب "اصول الدین" میں امام احمد بن حنبل کے یہ اقوال نقل کیے ہیں۔

(د) ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب "مصنف" میں جو باب "باب الرد علی ابی حنیفہ" کے عنوان سے قائم کیا ہے جس کا ذکر علامہ بحر العلوم فرنگی محلی کے اقتباس میں ہو چکا ہے، حاشیہ نگار مفتی ابو غدہ ان کے بارے میں رقم طراز ہیں: "امام ابو حنیفہ کے مسلک سے بغض رکھنے والے بعض حضرات نے یہ کوشش فرمائی کہ "مصنف ابن ابی شیبہ" کے خاص اس باب "باب الرد علی ابی حنیفہ" کی خوب تشہیر ہو، ہندوستان میں اس کی اشاعت بھی کی گئی، مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے علمائے احناف ... اور ہندوستان میں جمہور مسلمین کا مسلک حنفی ہے۔ ——— مشغول ہوں، اس وقت ہمارے استاذ علامہ محقق امام محمد زاہد الکوثری (خلافت عثمانیہ کے عہد میں جو شیخ الاسلام کے وکیل کے عہدے پر ممتاز تھے، اللہ کو پیارے ہو گئے) اور ابن ابی شیبہ نے جن مسائل کا ذکر کر کے امام ابو حنیفہ کی رد کی تھی ان کی ایک بہت مفصل شرح انھوں نے تصنیف کی، ایسے مسائل (۱۲۵) تھے جو امام صاحب کے اجتہادی مسائل میں خاص اہمیت کے مالک تھے جن کے بارے میں ابن ابی شیبہ کا دعویٰ تھا کہ امام ابو حنیفہ نے ان مسائل میں احادیث صحیحہ کی مخالفت کی ہے، ہمارے استاذ نے ان مسائل کے سلسلے میں امام ابو حنیفہ کے دلائل کی پوری پوری وضاحت کی اور یہ بھی صراحت کرتے گئے کہ ان مسائل میں امام صاحب سے اور کون کون بڑے بڑے ائمہ مجتہدین موافقت رکھتے ہیں، ہمارے استاذ کی کتاب کا نام "النکت الطریفۃ فی التحدث عن ردود ابن ابی شیبۃ علی ابی حنیفۃ" ہے جو قریب قریب تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور مصر میں ۱۳۶۵ھ میں طبع ہو چکی ہے، ہمارے استاذ کی ایک دوسری کتاب "تانیب الخطیب علی ما ساقہ فی ترجمۃ ابی حنیفۃ من الاکاذیب" بھی ہے، ہمارے استاذ کی ان دونوں کتابوں کی خوبیاں اتنی ہیں کہ ہمارے ایک دوسرے استاذ شیخ مصطفیٰ صبری نے جو خلافت عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام تھے اپنی کتاب "موقف العقل والعلم والعالم من رب العالمین وعبادہ المرسلین" میں لکھا ہے کہ یہ دونوں کتابیں ایسی ہیں کہ ان کا ... دار الخلافہ اور مصر کے ادارے ... برابر ... ہو سکتے ہیں اس لئے کہ ان دونوں کتابوں کے مصنف آستانہ (دولت عثمانیہ) کے ... اور ... ہیں ... جب مصطفیٰ کمال نے خلافت ختم کر دی تو ...

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم

حضرت شاہ ولی اللہ اور اکابر جماعت دیوبند کی نظر میں

محمد منظور نعمانی

"شرح عقائد نسفی" درس نظامی کی ایک معروف کتاب ہے، ابھی حال میں اس کی ایک شرح "الجواہر البہیّة" کے نام سے شائع ہوئی ہے، بلکہ ابھی اس کی صرف پہلی جلد شائع ہوئی ہے مصنف کے بیان کے مطابق اس کی دو جلدیں اور ہیں، جو ابھی چھپنے سے باقی ہیں۔ اس کے مصنف کوئی صاحب مولانا شمس الدین افغانی ہیں، جو ضلع سورت (گجرات) کے ایک مدرسہ میں مدرس ہیں۔ اس کا ایک نسخہ اظہار رائے کے لیے اس عاجز راقم سطور کے پاس بھی بھیجا گیا ـــ میں نے کتاب کی طباعت وغیرہ دیکھنے کے لیے اس کو یونہی کھولا تو اتفاق سے کتاب کا صفحہ ۲۲ سامنے آگیا، میں اس کو پڑھنے لگا تو دیکھا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کو "الخبیث اللعین" لکھا ہے، صبر کر کے آگے کی چند سطریں اور پڑھیں تو دیکھا کہ اسی طرح ان کے ساتھ شیخ ابن القیم اور صاحب تفسیر حافظ ابن کثیر کی بھی خبر لی گئی ہے ـــ پھر اسی نشست میں پوری کتاب کی ورق گردانی کر کے سرسری نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ کم از کم ۲۵-۳۰ جگہ ان حضرات کی اسی طرح خبر لی گئی ہے اور ان کے لیے "الخبیث اللعین" اور "الملحد الزندیق" جیسے الفاظ استعمال کر کے ان کی قطعی تکفیر کی گئی ہے۔

شرح میں مصنف نے "ترجمة المؤلف" کے زیر عنوان اپنے علمی اور تعلیمی سلسلہ کا بھی ذکر

کیا ہے اور لکھا ہے کہ پہلے اپنے وطن میں اور پھر بعض دوسرے مقامات پر درسیات سے فراغت کے بعد انھوں نے دار العلوم دیوبند میں کئی سال رہ کر مزید تکمیل کی۔

اس سے ناواقف لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے، بلکہ بعض تجربوں کی بنا پر گمان غالب ہے کہ بہت سے لوگ یہی سمجھیں گے کہ مصنف نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ابن القیمؒ کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے یہی جماعتِ دیوبند اور اُن کے اکابر کی رائے ہے ـــــ اور یہ بات علاوہ اسکے کہ واقعہ کے خلاف ہے۔ دار العلوم دیوبند اور جماعتِ دیوبند پر اس کے بہت بُرے اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان حضرات شیخین کے بارے میں اکابر جماعتِ دیوبند کی رائے اور اُن کا مسلک جو اُن کی کتابوں میں بھی محفوظ ہے واضح کر دیا جائے۔ یہی احساس ان سطور کے لکھنے کا اصل محرک ہے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔

اکابر جماعتِ دیوبند اور جماعتِ دیوبند کے بارے میں جس کو کچھ بھی واقفیت ہے وہ اتنا ضرور جانتا ہے کہ اس جماعت کے علمی و فکری، امام و سرخیل حضرت شاہ ولی اللہؒ ہیں اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس باب میں اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دور میں ہندوستان کے پہلے عالم اور مصنف ہیں جنھوں نے مدینہ طیبہ کے زمانۂ قیام میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابیں براہ راست دیکھیں کیونکہ ان کے استاد شیخ ابو طاہر کردیؒ شیخ الاسلام کی کتابوں سے خاص شغف رکھتے تھے اور اُن کی علمی و دینی جلالت کے معترفین میں سے تھے، ہاں اسی کے ساتھ وہ شیخ محی الدین اکبر ابن عربی سے بھی خاص عقیدت رکھتے تھے، (خود شاہ صاحبؒ نے اُن کی اس جامعیت کا تذکرہ اپنے بعض رسائل میں کیا ہے) پھر یہی جامعیت اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی عطا فرمائی، پھر یہی ہمارے اکابر علماء دیوبند کو وراثت میں ملی۔

راقم سطور کو اچھی طرح یاد ہے کہ اب سے ۴۰ سال پہلے دار العلوم دیوبند کی تعلیم کے آخری سال بلکہ آخری دنوں میں ایک دن حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے ہم طلبہ کے سامنے ایک نہایت اہم تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے ہمارے اکابر کو یہ جامعیت عطا فرمائی کہ وہ بیک وقت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور شیخ اکبر ابن عربیؒ کے معتقد و معترف ہیں"۔

(ممکن ہے کہ لفظوں میں کچھ فرق ہو لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مفہوم اور مطلب یہی تھا) اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ ہمارے اکابر حنفیت کے ساتھ ساتھ امام بخاری اور ان دیگر ائمہ حدیث کی پوری عظمت و عقیدت اپنے قلب میں رکھتے ہیں جنھوں نے امام اعظم ابوحنیفہؒ پر سخت سے سخت جرحیں کی ہیں ــــــ میں نے حضرت شیخ الہندؒ کا یہ ملفوظ بھی حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ صاحب سے بار بار سنا ہے کہ

"جب اللہ تعالیٰ کسی کو نور علم عطا فرماتا ہے تو ائمہ امت کے اختلافات اس کی نظر میں مضمحل ہو جاتے ہیں"

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے وارثین اپنے اکابر کے مسلک جامعیت کے بارہ میں یہ تو جملۂ معترضہ تھا، جو ذرا طویل ہو گیا ورنہ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ ہماری جماعت کے علمی و دینی امام و سرخیل ہیں۔ انھوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ فرمایا ہے، ان کے اس براہ راست مطالعہ کی ایک کھلی شہادت یہ بھی ہے کہ "حجۃ اللہ البالغہ" اور ان کی بعض دوسری تصانیف میں بھی کئی مقامات ایسے ملتے ہیں جہاں شاہ صاحبؒ نے حافظ ابن تیمیہؒ کی کسی کتاب سے پورا مضمون لفظاً بہ لفظ نقل فرمایا ہے (جس کو مقابلہ کر کے آج بھی دیکھا جا سکتا ہے[1]) اور نام کا اظہار غالباً اس لیے نہیں فرمایا کہ اس زمانہ میں حافظ ابن تیمیہؒ کے خلاف پروپیگنڈے کے ذریعہ فضا اس درجہ مسموم کر دی گئی تھی کہ بہت سے نیک دل عالم اور مفتی بھی ان کی کتابیں دیکھے بغیر ان کے ملحد اور بددین ہونے کا یقین رکھتے تھے اور فتوے دیتے تھے، جس کی ایک عبرت ناک مثال ابن حجر ہیثمی شافعی مکی کا وہ فتویٰ ہے جو ان کے مجموعہ فتاویٰ "فتاوی حدیثیہ" میں شامل ہے[2]۔

---

[1] الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر کے ایک مضمون میں شاہ صاحبؒ کی کتابوں کے صفحات کے حوالوں کے ساتھ ایسے چند مقامات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ [2] ابن حجر ہیثمی مکی کے "فتاویٰ حدیثیہ" میں ایک بہت طویل فتویٰ ہے جس میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طرف بہت سے ملحدانہ اور کافرانہ عقائد منسوب کر کے سخت سے سخت حکم لگایا گیا ہے اور آخری درجہ کے نامناسب الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ـــ اور آخر میں انتہائی بزرگانہ سادگی کے ساتھ یہ بھی ظاہر فرمایا گیا ہے کہ انھوں نے یہ چیزیں خود ان کی کتابوں میں نہیں دیکھی ہیں، اور یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگ بتلاتے ہیں کہ ان میں سے بہت سی باتوں کی

(باقی اگلے صفحہ پر)

الغرض شاہ صاحبؒ اُن لوگوں میں نہیں ہیں جنھوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بارے میں صرف سُنا ہو یا اُن کے عقائد و خیالات صرف اُن کے مخالفین کی کتابوں میں پڑھے ہوں، بلکہ انھوں نے براہِ راست اُن کی کتابوں کا مطالعہ فرمایا ہو۔

ٹھٹہ (سندھ) کے اُن کے ایک معاصر عالم شیخ معین الدین نے ابن تیمیہ کے خلاف کچھ مشہور الزامات لکھ کر اُن کے بارے میں شاہ صاحبؒ سے دریافت کیا تھا کہ آپ کی رائے اُن کے بارے میں کیا ہو اور آپ اُنکو کیسا سمجھتے ہیں؟ شاہ صاحبؒ نے اُنکے خط کے جواب میں ایک مفصل مکتوب لکھا ہو جو ایک چھوٹا سا رسالہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نسبت اُن کی طرف (یعنی ابن تیمیہ کی طرف) صحیح نہیں ہے۔ اور آخر میں اس طویل فتوائے تکفیر کو اس جملہ پر ختم کیا ہے۔

فان صح عنہ ما یقولہ مبدع	اگر اُس سے (ابن تیمیہ سے) کوئی بات موجب کفر یا
یعاملہ اللہ بعدلہ والا یغفر	موجب بدعت ثابت ہو تو اللہ اسکے ساتھ عدل کا
لنا ولہ۔ صفحہ ۸۵	معاملہ کرے (یعنی سزا دے) اور اگر ایسی کوئی بات
	ثابت نہیں ہو تو ہماری اور اُنکی مغفرت فرمائے اور ان کی بھی۔

حیرت ہو جب ابن تیمیہ سے ان باتوں کا ثبوت معلوم و متعین نہیں تو پھر شک پر تو اس فتویٰ تکفیر کا کیا جواز تھا۔ دراصل بات یہی ہو کہ اُس دور میں ابن تیمیہ کے متعلق پروپیگنڈے سے فضا ایسی بنا دی گئی تھی کہ ان کے خلاف سخت سے سخت فتویٰ دینے کے لیے بھی لوگ خود ان کی کتابیں دیکھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ عام شہرت کو کافی سمجھتے تھے۔ اللہ ابن حجر ہیثمی اور ان جیسے دوسرے لوگوں کی اس سنگین غلطی کو معاف فرمائے اور بعد والوں کو اس سے سبق لینے کی توفیق دے۔

یہاں ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہو کہ مشہور حنفی عالم اور مصنف ملا علی قاریؒ، ابن حجر ہیثمی کے شاگرد ہیں لیکن انھوں نے ابن تیمیہ اور ابن القیم کی کتابیں خود دیکھی ہیں اور وہ استاد سے زیادہ وسیع النظر اور محقق ہیں اسلیے ان کی رائے اس بارے میں اپنے استاد کی رائے سے بالکل مختلف ہو۔ شمائل ترمذی کی شرح "جمع الوسائل فی شرح الشمائل" میں ایک جگہ ابن تیمیہ اور ابن القیم کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

ومن طالع شرح منازل السائرین تبین لہ انہما	جو شخص ابن القیم کی شرح منازل السائرین کا مطالعہ کرے گا
کانا من اکابر اھل السنۃ والجماعۃ ومن اولیاء	اسے واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ دونوں (ابن تیمیہ و ابن القیم)
ھذہ الامۃ صفحہ ۲۰۸ ج ۱	اکابر اہلسنت و جماعت اور اس امت کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔

بورحیب ۱۳۹۲ھ

لیا ہے، اس میں شاہ صاحب نے اُن مشہور الزامات کا کسی قدر مفصل جواب بھی دیا
ن تیمیہ پر اُن کے مخالفین کی طرف سے لگائے جاتے ہیں ـــــ یہ مکتوب اُس مجموعۂ مکا
ہے جس کو شاہ صاحب کے شاگرد رشید خواجہ محمد امین کشمیریؒ[1] نے مرتب کیا تھا، اس کو اب سے قریباً
مدی پون صدی پہلے شاہ رفیع الدین صاحب کے نواسے مولانا سید احمد صاحب نے چھپوا کر
ائع کیا تھا، اب یہ مدتوں سے نایاب ہے، اسی لیے ہمارے زمانے کے اکثر اہلِ علم بھی اس سے
قف نہیں ہیں۔ راقم سطور کو اس کا ایک بہت خستہ سا نسخہ ایک جگہ سے مل گیا تھا، ابھی حال میں
اش و تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں بھی اُس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔
رے نسخہ میں بعض اوراق کے شکستہ ہو جانے کی وجہ سے کچھ سطریں پڑھی نہیں جا سکتی تھیں ہم نے
ارالعلوم کے نسخہ سے ان سطروں کو نقل کرا کے اپنے نسخہ کی اس کمی کو پورا کیا ہے۔

اس مجموعۂ مکاتیب کے اکثر مکتوبات فارسی زبان میں ہیں، چند مکتوب عربی میں بھی ہیں، شیخ الاسلام
ن تیمیہ سے متعلق یہ مکتوب بھی عربی ہی میں ہے، اس مجموعہ کی نایابی اور اکثر علماء عصر کی عدم واقفیت
، وجہ سے مناسب معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کے اس پورے مکتوب کو اس مضمون کا جزو بنا دیا جائے
کہ یہ الفرقان کے صفحات میں محفوظ بھی ہو جائے اور خاصکر ہمارے ولی اللّٰہی سلسلے کے علماء کرام
کے سامنے آجائے اور وہ اس سے بے خبر اور ناواقف نہ رہیں۔

یہ مکتوب اس قدیم مطبوعہ نسخہ کے صفحہ ۲۶ سے شروع ہوتا ہے۔ (۲) مجموعۂ مکاتیب کے
جامع اور مرتب خواجہ محمد امین کشمیری نے اس کا تمہیدی تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

"جوابِ مکتوب جامع الفضائل مخدوم معین الدین تھتائی متضمن کشف شبہات و رفع ایراد
ایشاں در کلام شیخ تقی الدین ابن تیمیہ حنبلی و بیانِ فضائل و تنویہ شان او در زمرۂ اہل سنت
و ردِّ جمعے کہ زبان طعن در حق وے دراز کنند، و اظہارِ حُسنِ عقیدۂ خویش نسبت او رضی اللّٰہ
عنہ و عن سائر علمائے دین تحریر یافت۔"

---

[1] خواجہ محمد امین کشمیریؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، شاہ صاحب ان کو اپنے مکتوبات میں ولی مکرمی
در معدن اسراری" لکھتے ہیں جو ان کے مقام کی عظمت و رفعت کی بڑی شہادت ہے ۱۲

ذیل میں مکتوب کا اصل متن ترجمہ کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے ـــــ ترجمہ میں ناظرین کی سہولتِ فہم کی خاطر کہیں کہیں حاصلِ مطلب لکھ دیا گیا ہے۔

بسم الله الرحمٰن الرحیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
الحمد لله مفيض النعم وملهم الحكم وصلى الله على سيدنا محمد سيد العرب والعجم وعلىٰ اٰله وصحبه اصحاب عوالي الهمم ـــ اما بعد ـ	ساری حمد و ستائش اُس اللہ کے لیے ہے جو بندوں کو نعمتوں سے نوازنے والا اور علومِ صحیحہ کا الہام فرمانے والا ہے، اور اُس کی رحمتیں ہوں سیدنا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جو سید العرب والعجم ہیں اور اُن کے آل و اصحاب پر جو بلند ہمتوں والے تھے ـــ اما بعد ـــ
فيقول الفقير ولي الله بن عبد الرحيم عاملهما الله تعالىٰ بفضله الجسيم وردت رقيمة كريمة من مخدوم مكرم لازال معيناً للحق والدين في الفحص عن حال الشيخ تقي الدين احمد ابن تيمية عامله الله تعالىٰ بفضله واي شيئ ينبغي ان يعتقد فيه فوجب الائتمار بامره وان كنت بمعزل عن مثل ذالك ـ	فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم عاملہما اللہ تعالیٰ بفضلہ الجسیم عرض کرتا ہے کہ مخدوم مکرم (شیخ معین الدین ٹھٹوی) کا گرامی نامہ موصول ہوا، جس میں شیخ تقی الدین احمد بن تیمیہ عاملہ اللہ تعالیٰ بفضلہ کا حال دریافت کیا گیا ہے اور پوچھا گیا ہے کہ اُن کے بارے میں کیا خیال اور عقیدہ رکھنا چاہیئے ـ؟ آپ کی اس فرمائش کی تعمیل میرے لیے ضروری ہے، اگرچہ میرا یہ مقام نہیں ہے (بہرحال عرض کرتا ہوں)
الذی اعتقد انا واُحبّ ان يعتقده جميع المسلمين في علماء الاسلام حماة الكتاب	وہ تمام علماءِ اسلام جو کتاب و سنت اور فقہ کے حاملین ہیں اور اہل السنۃ کے عقائد کی طرف سے دفاع اور اس کی حمایت و حفاظت کرنے ہیں اُن سب کے بارے میں خود میرا عقیدہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تمام اہلِ اسلام ان کے بارے میں یہی عقیدہ رکھیں کہ وہ سب عدول (یعنی صالح العقیدہ والعمل ہیں) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تعدیل فرمائی ہو

والسنة والفقه الذابين عن
عقيدة اهل السنة والحديث
انهم عدول بتعديل النبي
صلى الله عليه وسلم حيث
قال يحمل هذا الدين من كل
طبق عدوله، وان قال بعضهم
بما لا يرتضيه هذا المعتقد
اذا كان قوله ذالك غير
مردود بنص الكتاب والسنة
والاجماع وكان قوله ذالك
محتملاً وكان مجال ومساغ
للخوض فيه، سواء كان قوله
ذالك في اصول الدين او في
المباحث الفقهية او في الحقائق
الوجدانية — وعلى هذا الاصل
اعتقدنا في الشيخ الاجل محي الدين
ابن علي ابن العربي وفي الشيخ
المجدد احمد بن عبد الاحد
السهرندي انهما من صفوة
عباد الله ولم نلتفت الى ما
قيل فيهما فكذالك ابن تيمية
فانا تحققنا من حاله انه عالم
بكتاب الله ومعانيه اللغوية

جیسا کہ ارشاد فرمایا کہ "ہر دور کے عادل (یعنی صالح
العقیدہ والعمل) لوگ اس دین کے حامل ہوں گے"۔
اگرچہ ان میں سے بعض ایسی چیزوں کے قائل ہوں جن
سے اتفاق نہ ہو بشرطیکہ اُن کا یہ قول نصوص کتاب و سنت
اور اجماعِ اُمت کے خلاف نہ ہو۔ اور اس کی کسی درجہ
میں، احتمال ہی کے درجہ میں گنجائش ہو۔ پھر خواہ یہ
قول اُصول و عقائد کے باب میں ہو، خواہ فقہی مباحث
میں اور خواہ وجدانی حقائق کے سلسلے میں، — اور
اسی اُصول و بنیاد پر شیخ اجل محی الدین ابن علی بن العربی
اور شیخ مجدد احمد بن عبد الاحد سرہندی کے بارے میں
ہم اس کے قائل ہیں کہ وہ اللہ کے مقبول بندوں میں
سے ہیں اور ہم ان باتوں کی طرف مطلق التفات نہیں
کرتے جو ان دونوں بزرگوں کے خلاف کہی جاتی ہیں۔
— یہی معاملہ ابن تیمیہ کا ہے۔ ہمیں ان کا یہ حال
خوب تحقیق سے معلوم ہے کہ وہ عالم کتاب اللہ تھے،
اس کے لغوی اور شرعی معانی پر ان کو عبور حاصل تھا،
احادیثِ نبوی اور آثارِ سلف کے وہ حافظ تھے اور
اُن کے لغوی و شرعی معانی و مقاصد کی معرفت ان کو
حاصل تھی، وہ فن نحو اور لغت میں استاد تھے، مذہب
حنابلہ اور اس کے اُصول و فروع کے وہ محرر تھے،
ذہانت و ذکاوت میں بہت فائق تھے، بڑی طلاقتِ
بلاغت کے ساتھ عقیدۂ اہل السنہ کی طرف سے دفاع
کرتے تھے، فسق و بدعت کے قبیل کی کوئی بات بھی اُن

والشرعية وحافظ لسنة رسول
الله صلى الله عليه وسلم وآثار
السلف عارف بمعانيها اللغوية
والشرعية، استاذ في النحو
واللغة محرر لمذهب الحنابلة
فروعه واصوله فائق في الذكاء
ذو لسن وبلاغة في الذب عن
عقيدة اهل السنة لم يؤثر عنه
فسق ولا بدعة اللهم الا هذه
الامور التي ضيق عليه لاجلها
وليس شيء منها الا ومعه
دليله من الكتاب والسنة
وآثار السلف فمثل هذا الشيخ
عزيز الوجود في العالم ومن
يطيق ان يلحق شأوه في تحريره
وتقريره، والذين ضيقوا
عليه ما بلغوا معشار ما آتاه
الله تعالى، ان كانوا اصابهم
فأشياء منها اجران ومنها اجر
العلماء في مثل ذالك ما هي
الا كالمشاجرة الصحابية فيما
بينهم والواجب في ذالك
كف اللسان الا بخير — —

سے منتقل نہیں سوائے ان چند باتوں کے جن کی وجہ سے
ان کو (بعض معاصرین کی طرف سے) تنگ کیا گیا اور تکلیفیں
پہونچائی گئیں، اور ان میں کوئی ایک بات یا ایک مسئلہ بھی
ایسا نہیں ہے جس کے لیے ان کے پاس کتاب وسنت
اور آثار سلف میں سے کوئی دلیل نہ ہو۔ پس شیخ ابن تیمیہ
جیسا کوئی آدمی پورے عالم میں ملنا مشکل ہے اور کس میں
اس کی طاقت ہے کہ تحریر وتقریر کے میدان میں اُن سے
قدم ملا کے چل سکے۔ اور جن لوگوں نے ان کو تنگ کیا (اور
قید تک کرایا) اُن کو اس علمی کمال کا دسواں حصہ بھی
حاصل نہیں تھا جو اللہ نے ان کو عطا فرمایا تھا، اگرچہ
اُن کا یہ تنگ کرنا اور تکلیفیں پہونچانا اجتہادی ہی سے تھا
اور ان جیسی چیزوں میں علماء کے اختلافات بس ایسے ہی
ہیں جیسے کہ صحابۂ کرام کے باہمی اختلافات و مشاجرات،
اور اس معاملہ میں ضروری ہے کہ کف لسان کیا جائے،
اگر کسی کے حق میں کچھ کہا جائے تو بس کلمۂ خیر ہی کہا جائے۔
اور اُن کے یعنی ابن تیمیہ کے بارے میں ایک بات (اعتراض
کے طور پر) یہ ذکر کی جاتی ہے کہ وہ اس کے قائل ہیں کہ
اللہ تعالیٰ "فوق العرش" ہے اور تحقیقی بات یہ ہے کہ اس
مسئلہ میں تین مقام (یعنی غور وفکر کے تین نقطے ہیں)
ایک یہ کہ از روئے شریعت کس چیز کا اللہ تعالیٰ کے لیے
ثابت کرنا صحیح ہے اور کس چیز کا صحیح نہیں ہے؟
اور اس بارے میں حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (قرآن
مجید میں) اپنے لیے جہت فوق کو ثابت کیا ہے اور جہت

وقد ذكرناه. قال ان الله تعالیٰ فوق العرش والتحقيق ان في هذه المسألة ثلث مقامات احدها البحث عما يصح اثباته للحق توقيفاً وعما لا يصح اثباته توقيفاً والحق ان الله تعالیٰ اثبت لنفسه جهة الفوق وان الاحاديث متظاهرة على ذالك وقد نقل الترمذي ذالك عن الامام مالك ونظائره — و

ثانيهما ان العقل هل يجوز كون مثل هذا الكلام حقيقة او يوجب حمله على المجاز والحق في هذا المقام ان العقل يوجب انه ليس على ظاهره في نفس الامر — وثالثها انه هل يجب تاويله او يجوز وقفه على ظاهره من غير تعيين المراد، والحق في هذا المقام ان العقل يوجب انه لم يثبت في حديث صحيح او ضعيف انه يجب تاويله ولا انه لا يجوز استعمال مثل تلك العبارات في الامة۔

سی حدیثیں بھی اس کی موید ہیں، اور امام ترمذی نے امام مالک اور اُن جیسے دوسرے ائمہ سے یہ مسلک نقل کیا ہے۔

اور دوسرا قابل غور نقطہ یہ ہے کہ کیا عقلاً اس کی گنجائش ہے کہ ایسے کلام کے جو حقیقی ظاہری معنی ہیں وہی لیے جائیں۔ یا ازروئے عقل یہ ضروری اور واجب ہے کہ اس کو مجاز پر محمول کیا جائے۔۔؟ — اور اس بارے میں حق یہ ہے کہ بیشک عقل اس کو ضروری اور واجب قرار دیتی ہے کہ ایسا کلام نفس الامر میں اپنے ظاہری معنی پر محمول نہ ہو۔

اور تیسرا قابل غور نقطہ اس بحث میں یہ ہے کہ کیا اسکی تاویل کرنا (اور مجاز پر محمول کرنا) واجب ہے یا اس کی بھی گنجائش ہے کہ کلام کو ظاہری معنی ہی پر رکھیں اور مراد متعین نہ کریں؟ اور اس بارے میں حق یہ ہے کہ کسی صحیح یا ضعیف حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ اسطرح کی تاویل کرنا واجب ہو اور یہ بھی ثابت نہیں ہے کہ اسطرح کی تعبیرات کا استعمال اُمت کے لیے جائز نہیں ہے۔

— ہمارے شیخ ابو طاہر کردی مدنیؒ نے اپنے والد ماجد شیخ ابراہیم کردیؒ کے حوالے سے مجھ سے نقل کیا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے کسی صحیح طریقے سے صراحت کے ساتھ یہ بات نقل نہیں کی گئی ہے کہ ان متشابہات کی تاویل واجب ہے اور نہ یہ کہ ان کا ذکر کرنا ممنوع اور ناجائز ہے — اور یہ بات قطعاً محال اور ناممکن ہے

اخبرني ابو طاهر عن ابيه انه
قال قال الحافظ ابن حجر
العسقلاني لم ينقل عن النبي
صلى الله عليه وسلم ولا عن
الصحابة من طريق صحيح التصريح
بوجوب تاويل شيئ من ذالك
يعني المتشابهات ولا المنع من
ذكره ومن المحال ان يامر الله نبيه
بتبليغ ما انزل اليه من ربه و
ينزل عليه "اليوم اكملت لكم
دينكم" ثم ترك هذا الباب فلا
يميز ما يجوز نسبته اليه تعالى
مما لا يجوز مع حثه على تبليغ
الشاهد الغائب حتى نقلوا اقواله
واحواله وما فعل بحضرته فدل
على انهم اتفقوا على الايمان
به على الوجه الذي اراد الله
تعالى منها. واوجب تنزيهه
عن مشابهة المخلوقات بقوله
ليس كمثله شيئ. فمن اوجب
خلاف ذالك بعدهم فقد خالف
سبيلهم انتهى۔
وهذا الذي حققناه هو

کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہو کر
جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے اُس کو لوگوں تک پوری طرح پہونچا
دیں اور آیت "الیوم اکملت لکم دینکم" بھی
نازل ہو چکی ہو، پھر آپ نے اس کے بعد بھی اس پورے
باب کو بیان سے چھوڑ دیا ہو اور لوگوں کو وضاحت سے
نہ بتایا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف کس بات کی نسبت کرنا
جائز ہے اور کس کی جائز نہیں ہے حالانکہ خود آپ نے
لوگوں کو اس کا حکم دیا کہ جو حاضر ہیں (اور جنھوں نے
میری باتیں سُنیں اور میرا عمل دیکھا ہو) وہ غائبین کو پہونچائیں
اور اسی کے نتیجہ میں آپ کے صحابہ نے آپ کے ارشادات
اور آپ کے حالات بعد والوں کو تبلائے، اور آپ کے
سامنے جو کچھ ہوا وہ سب بھی نقل کیا ــ یہ بات اس
کی صریح دلیل ہے کہ صحابۂ کرام کا اس پر اتفاق ہے
کہ ان متشابہات پر ایمان لایا جائے اس معنی کے لحاظ
سے جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہو ــ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے
ارشاد "لیس کمثلہ شیئ" سے اس کو بھی واجب
کیا ہے کہ مخلوقات کی مشابہت سے اس کو منزّہ مانا
جائے، پس جو شخص صحابہ کرام کے بعد اس کے خلاف
کو واجب اور ضروری قرار دیتا ہے تو وہ ان کے طریقہ
اور مسلک کے خلاف ہے۔ انتہیٰ۔

اور تحقیقی بات یہ ہے کہ یہی مسلک جس کو ہم نے
حق قرار دیا ہے امام ابوالحسن اشعریؒ کا مذہب و
موقف ہے ــ ہمارے شیخ ابوطاہر کردی مدنی نے

مذهب ابی الحسن الاشعری عند التحقیق ـــ اقرأنی ابوطاهر المدنی رضی الله عنه بخط ابیه ان الشیخ ابا الحسن قال فی کتابه انی علی مذهب احمد فی مسئلة الصفات وان الله فوق العرش وکلام ابن تیمیه محمول علی المقام الاوّل والثالث ـــ واذا رجعنا الی الوجدان فلا شك ان الله تعالیٰ خصوصیة مع العرش لیست مع غیره من مخلوقاته ، ولا نجد عبارة فی ذالك افصح واقرب من الاستواء علی العرش کما انا لا نجد عبارة فی انکشاف المسموعات والمبصرات افصح من السمع والبصر والله اعلم بحقائق الامور

وقد ذکر عنه انه منع السفر لزیارة النبی صلی الله علیه وسلم ولا یرد کلامه ذالك بدلیل صریح صحیح فانه لم یمنع الزیارة مطلقاً بل منع السفر للزیارة بحدیث "لا

اپنے والد ماجد شیخ ابراہیم کردی کے قلم کی لکھی ہوئی یہ تحریر مجھے پڑھوائی کہ امام ابوالحسن اشعری نے اپنی کتاب میں صاف فرمادیا ہے کہ میں صفات کے مسئلہ میں امام احمد کے مسلک پر ہوں اور بے شک اللہ تعالیٰ فوق العرش ہے"۔ اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ اس موضوع پر ابن تیمیہ کا کلام مقام اوّل اور مقام ثالث پر محمول ہے، (یعنی اس کا حاصل یہ ہے کہ کتاب وسنت کے نصوص نے اللہ تعالیٰ کے لیے جہت فوق کو ثابت کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ ان کی تاویل واجب ہے ہاں مخلوقات کی مشابہت سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیشک واجب ہے۔ اس لیے صحیح موقف یہ ہے کہ ان نصوص کو اپنے ظاہر ہی پر رکھتے ہوئے اور مخلوق کی مشابہت سے اس کو منزہ مانتے ہوئے تعیین مراد کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا جائے)

اور جب ہم اپنے وجدان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہم کسی شک وشبہ کے بغیر محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو عرش کے ساتھ ایک خاص نسبت ہے جو دوسری مخلوقات کے ساتھ نہیں ہے، اور اس کے لیے کوئی تعبیر استواء علی العرش سے زیادہ فصیح اور اقرب نہیں مل سکتی جس طرح کہ مسموعات اور مبصرات کے انکشاف اور معرفت کے لیے کوئی تعبیر سمع اور بصر سے زیادہ فصیح نہیں مل سکتی۔ واللہ اعلم بحقائق الامور۔

تشد الرحال" وبحديث" لا تتخذوا قبري عيداً" فاذا كان لقوله مساغ اجتهاد لاينبغي ان يشدد عليه ذالك التشدد وقد ذكر عنه انه انكر وجود القطب والغوث والخضر والذى يدعيه الشيعة انه المهدي، وحق له ذالك النفي مادام على شرط من اعتقاد ما ثبت بالكتاب والسنة والاجماع والسكوت عما لايثبت بها، يجوز له ان لايعتقد ذالك ومن اثبت من الصوفية فانه لم يثبت عن كتاب وسنة اللهم الا الكشف و ليس من ادلة الشرع .. والذى افهم من كلامه ان هذا قول مبتدع باطل اعتقاده من حيث الشرع لقوله صلى الله عليه وسلم" من احدث في امرنا هذا ماليس منه فهو رد" ولو كان قطع بالانكار لم يستحق التكفير ولا التفسيق ايضاً

اور ابن تیمیہ کے متعلق ایک بات اعتراض کے طور پر یہ بھی ذکر کی جاتی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے سفر کرنے کو ناجائز کہا ہے ــــ اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی اس بات کو کسی صحیح اور صریح دلیل سے رد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انھوں نے روضۂ مقدسہ کی زیارت کو ناجائز نہیں کہا ہے بلکہ مشہور حدیث" لاتشد الرحال" اور دوسری حدیث" لاتتخذوا قبري عيداً" کی بنا پر زیارت کے لیے مستقل سفر کر کے جانے کو منع کیا ہے اور یہ اُن مسائل میں سے ہے جن میں اجتہاد اور اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ لہٰذا کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ اس مسئلہ کی وجہ سے اُن کے خلاف تشدد کا یہ رویہ اختیار کیا جائے (یعنی اُن کی تکفیر یا تفسیق کی جائے)

اور ان کے متعلق بطور اعتراض کے ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ ان کو قطب، اور غوث اور خضر کے وجود سے انکار ہے اور شیعہ حضرات جس کو مہدی قرار دیتے ہیں وہ اس کے بھی منکر ہیں ــــ میں کہتا ہوں ــــ کہ ان کو اس انکار و نفی کا پورا حق ہے، بشرطیکہ جو کچھ کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہو اس کا اعتقاد رکھیں اور جو ثابت نہیں ہے اس کے قائل نہ ہوں، اس بنا پر اُن کے لیے جائز ہے کہ وہ غوث، قطب وغیرہ کا عقیدہ نہ رکھیں ــــ اور حضرات صوفیہ میں سے جنھوں نے ان کو تسلیم اور ثابت کیا ہے انھوں نے

وهٰهنا دقيقة وهي انه كم
من مسئلة لم يدل عليها الشرع
لا نفياً ولا اثباتاً ودل عليه
العقل كعون يحصل من ضرب
العشرة في العشرة المائة
او الكشف والوجدان كقولنا
المحبة الذاتية ثابتة للكل
من عباد الله وهي ميل الوجود
الخاص الى اصله المطلق من
القيود كمثل ميل كل عنصر الى
مقره، وهذه المسائل حقة
في الحقيقة ولو اعتقد انسان
انها من الشرع كان اعتقاده
ذالك خطاءً، ولو احلها محل
الثابت بالشرع فانكر على من
لم يقل بها او حاول اثباتها
على منكريها كاثبات الشرعيات
كان خطاءً ايضاً۔

وقد ذكر عنه انه انكر
اعتقاد الشيعة في الامام
المحجوب على زعمهم وحق له
ان ينكر ذالك بل الاشاعرة
كلهم على هذا الانكار والا علم

کتاب وسنت کی بنیاد پر ثابت نہیں کیا ہے بلکہ ان کی بنیاد بس
اُن کا کشف ہے اور کشف کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔ اور
اس بارہ میں ابن تیمیہ کا جو کلام ہے، میں نے اس کا مطلب
یہ سمجھا ہے کہ غوث و قطب اور خضر وغیرہ کے وجود کو شرعی
عقیدہ کے طور پر ماننا حدیث نبوی "من احدث فی
امرنا هذا ما ليس منه فهو رد" کی رو سے باطل اور
بدعت ہے اور اگر انھوں نے ان چیزوں کا قطعی انکار بھی
کیا ہو تب بھی اس کی وجہ سے ہرگز ان کی تکفیر و تفسیق نہیں
کی جا سکتی۔

اور یہاں ایک باریک نکتہ ہے جس کو اس قسم کے
مسائل و مباحث میں پیش نظر رکھنا چاہیے، اور وہ یہ ہے
کہ بہت سے ایسے مسئلے ہیں جن کے بارہ میں شریعت نے نفی
یا اثبات میں کچھ نہیں بتلایا اور عقل اُن کو بتلاتی ہے مثلاً
یہ کہ اگر دس کو دس میں ضرب دینے سے حاصل ضرب ۱۰۰ ہو جاتے ہیں یا اسی طرح
بعض چیزیں ہیں جن کا کشف و وجدان سے علم ہوتا ہے
مثلاً ہمارا یہ کہنا کہ محبت ذاتیہ کا جوہر اللہ کے ہر بندے
میں ہوتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وجود خاص
کا اپنی اصل وجود مطلق کی طرف میلان ہوتا ہے جیسے کہ
ہر عنصر کا اپنے مستقر کی طرف میلان ہوتا ہے اور اس
قسم کے مسائل جو شریعت نے تو نہیں بتلائے لیکن
عقل یا کشف و وجدان کے ذریعہ علم میں آئے ہمارے
نزدیک تو واقع اور نفس الامر کے لحاظ سے صحیح ہیں
لیکن اگر کوئی شخص یہ اعتقاد رکھے کہ وہ شریعت کے

احداً قال به.

وقد ذكر عنه انه اساء الادب مع سيدنا على رضى الله تعالىٰ عنه وحاشاه من ذالك وقد طالعت كلامه فوجدت بعضه مسوقاً فى مناقضة الشيعة فى طعنهم على الخلفاء الثلٰثة بامور تخيلوها نقصاً كما هو مذكور فى اٰخر التجريد فقام هذا الشيخ يعد عليهم اموراً اعترفوا بها فى سيدنا على هى مثلها كانه يقول ليست هذه الامور نقصاً كما تخيلتم فان مثلها ماثور عن سيدنا على وهو رضى الله تعالىٰ عنه مرضى عندنا وعندكم فما هو جوابكم فى سيدنا على هو جوابنا فى الخلفاء الثلٰثة، وهذا من كمال علمه وقوة مناظرته ومن الاعتراف بفضل سيدنا

ہوئے اور تہذیب شریعت ہیں تو ان کا یہ اعتقاد غلط ہوگا اور پھر اگر وہ آدمی ان مسائل کو شرعی مسائل کا درجہ دیتا ہے اور اس بناء پر اُن کے نہ ماننے والوں پر نکیر و اعتراض کرتا ہے یا شرعی مسائل کی طرح ان کو ثابت کرکے منوانا چاہتا ہے تو یہ طرزِ عمل بھی غلط ہوگا۔

اور ابن تیمیہ کے بارہ میں ایک بات اعتراض کے طور پر یہ بھی ذکر کی جاتی ہے کہ شیعہ حضرات کا اپنے امام غائب کے بارے میں جو اعتقاد ہے وہ اُس کے منکر ہیں میں کہتا ہوں کہ ان کا یہ انکار بالکل برحق ہے بلکہ اشاعرہ سب کے سب اس کے منکر ہیں اور اشاعرہ میں مجھے ایک فرد بھی ایسا معلوم نہیں جو اس بارہ میں شیعہ حضرات کا ہم خیال ہو۔

اور ایک بات اُن کے بارے میں بطور اعتراض کے یہ بھی ذکر کی جاتی ہے کہ انھوں نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شان میں بے ادبی کی ہے، اور یہ بات بالکل غلط ہے اُن کا دامن اس سے بالکل پاک ہے اس موضوع پر میں نے اُن کے کلام کا خود مطالعہ کیا ہے اس سے یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ انھوں نے اس سلسلہ کے اپنے کلام کے بعض حصوں میں تو شیعوں کے اُن اعتراضات اور حملوں کا جواب دینا چاہا ہے جو وہ حضرات خلفاء ثلٰثہ پر بعض اُن چیزوں کی بنا پر کرتے ہیں جن کو وہ اپنے خیال میں موجب نقص اور قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں جیسا کہ تجرید کے آخری حصہ

عمل — وعلیٰ ھذا الاصل،
یخرج قولہ معلوم ان الرای
اذا لم یکن مذموماً الخ
وقولہ فان الحسین رضی اللہ
عنہ لم یعظم انکار الامۃ
لقتلہ کما عظم انکارھم
لقتل عثمان، وقولہ فان فضل
ابی بکر الخ معناہ الرد علی
الشیعۃ فی طعنہم علی الصدیق
بمنع فدک وانہ ایذاء لفاطمۃ
رضی اللہ عنہا وقد قال
النبی صلی اللہ علیہ وسلم
یوذینی ما اذاھا وحاصلہ
ان مثل ھذہ الامور مستثنی
من مطلق الایذاء لانہ ما
لیشرع للشرع وکذالک قولہ
واما فعل توذینی الخ حاشاہ
ان یشنع علی علیؓ وفاطمۃ
رضی اللہ عنہما بل ھو علی سبیل
المناقضۃ کانہ قال تشنیعکم
علی ابی بکر ھو مثل ما یفرض
من تشنیع احد علی علیؓ و
فاطمۃ وجوابکم ھو جوابنا

میں مذکور ہے پس شیخ ابن تیمیہ اُن اعتراضات کے جواب کے
لیے میدان میں آئے اور انھوں نے اسی طرح کی بہت سی ایسی
چیزیں گنائیں جو ان شیعہ حضرات کے اقرار کے مطابق
حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں بھی موجود تھیں اور وہ
اسی قسم کی ہیں جن کی بناء پر انھوں نے حضرات خلفاء
ثلاثہ پر اعتراضات اور گلے کیے تھے — تو ابن تیمیہ
ان شیعوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جن امور کی بنا پر تم حضرات
خلفاء ثلاثہ پر اعتراض کرتے ہو وہ قابل اعتراض نہیں ہیں
کیونکہ ایسے ہی امور سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے
بھی منقول اور ثابت ہیں جن کی شخصیت اور مقبولیت
ہمارے تمہارے درمیان مسلم ہے پس جو جواب تم ان
کی طرف سے دوگے وہی ہمارا جواب حضرات خلفاء
ثلاثہ کی طرف سے ہے — اور یہ ابن تیمیہ کا علمی کمال
اور فن مناظرہ میں اُن کی مہارت کا کرشمہ ہے اور اس
سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ
کی فضیلت و عظمت کے پوری طرح قائل ہیں۔ اور
اسی بنیاد پر ابن تیمیہ کے اس قول کی حقیقت معلوم
ہو جاتی ہے کہ "معلوم ان الرای اذا لم
یکن مذموماً الخ" اور اُن کے اس قول کی بھی
کہ "فان الحسین رضی اللہ عنہ لم
یعظم انکار الامۃ لقتلہ کما
عظم انکارھم لقتل عثمان —
— اور ابن تیمیہ کا یہ قول کہ "فان فضل ابی بکر الخ"

بعينه وبعضه في مناقضة
الشيعة في اثباتهم
افضلية سيدنا علي
على الخلفاء الثلثة كما
هو مذكور في آخر التجريد
ايضاً۔
فقام هذا الشيخ يثبت
للخلفاء الثلثة مثل
ما اثبتوا لسيدنا علي و
افضل منه وليس في
التفضيل اساءة ادب
فان التفضيل مذهب
اهل السنة اجمع وحاشاهم
ان يسوء الادب معه
رضي الله تعالى عنه
واما تفسير آية الطهارة
بالارادة التشريعية دون
الارادة التكوينية
فصحيح ومثاله قوله
تعالى يريد الله بكم
اليسر ولا يريد بكم
العسر ويريد الله ان
يتوب عليكم الى غير

ان کا مقصد بھی شیعہ حضرات کے اُس اعتراض کا جواب دینا
ہے جو وہ باغ فدک سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نہ دینے
کی بنا پر حضرت صدیق اکبر پر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ
انھوں نے فدک حضرت فاطمہ کو نہ دے کر ان کو ایذا
پہونچائی درانحالیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد
ہے کہ جس بات سے میری بیٹی فاطمہ کو ایذا پہونچے اُس
سے مجھے ایذا پہونچتی ہے ۔ تو شیخ ابن تیمیہ کے جواب
کا حاصل یہ ہے کہ حضور کے اس ارشاد کا تعلق ہرگز
قضیہ فدک جیسے معاملات سے نہیں ہو سکتا جن میں
صدیق اکبر نے خود حضورؐ کے حکم کی تعمیل کی ۔ اسی
طرح ابن تیمیہ کا قول " اما فعل تو ذینی الخ"
اس میں حضرت علی مرتضیٰ اور سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ
عنہا کی محترم ذوات پر ہرگز کوئی اعتراض نہیں کیا گیا
ہے بلکہ اس میں شیعوں کے جواب میں مناظرانہ انداز میں
کہا گیا کہ صدیق اکبر پر تمہارا یہ الزام و اعتراض ایسا
ہی ہے جیسے کہ کوئی حضرت علی مرتضیٰ اور فاطمہ زہرا
رضی اللہ عنہا کے بارہ میں ایسی بات کہے پس اس کو جو
جواب تم دوگے وہی ہمارا جواب ہے
اور اس سلسلہ کے اپنے کلام کے بعض حصوں
میں ابن تیمیہؒ نے شیعوں کے اُن دلائل پر نقض وارد
کیا ہے جن سے وہ حضرات خلفاء ثلثہ رضی اللہ عنہم کے مقابلہ
میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت ثابت کرتے ہیں جیسا کہ
یہ بھی تجرید کے آخر میں مذکور ہے پس شیخ ابن تیمیہ

ذالك من الآيات۔

وبعد فانى اذكر الله عزو جل كل مسلم فى هذه المسئلة وامثالها۔ الله الله ان يسب احد من المسلمين عالماً مجتهداً فى امثال هذه۔

هذا ما تيسر لى فى الحال من الجواب وما حملنى عليه الا النصح والله اعلم بحقيقة الامور۔

ص ۲۹

حضرات خلفاء ثلاثہ کے لیے ویسے ہی کمالات ثابت کرکے دکھاتے ہیں جیسے کہ شیعہ حضرات نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت کیے ہیں یا اُن سے بھی بالاتر کمالات۔۔

اور خلفاء ثلاثہ کو افضل ماننے میں ہرگز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بے ادبی نہیں ہے بلکہ یہ تو تمام اہل سنت کا مذہب و مسلک ہے پس اس کو بے ادبی سمجھنا انتہائی غلط بات ہے اور آیت تطہیر میں "یرید اللہ" کے لفظ کی تفسیر ارادہ تکوینیہ سے نہیں بلکہ ارادہ تشریعیہ سے کرنا (جیسا کہ شیخ ابن تیمیہ نے کیا ہے) بالکل صحیح ہے اور اس طرح کی دوسری بہت سی آیات مثلاً "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" اور "یرید اللہ ان یتوب علیکم" میں بھی ارادہ تشریعیہ مراد لینا ہی صحیح ہے۔ اور اس سب کے بعد میں اس خاص مسئلہ میں (یعنی ابن تیمیہ کی تکفیر و تفسیق اور بدگوئی کے بارہ میں) اور اس جیسے دوسرے تمام مسئلوں میں بھی اللہ جل جلالہ کے نام پاک پر ہر مسلمان کو نصیحت کرتا ہوں، انھیں اللہ سے ڈر کر اس بات میں محتاط رہنا چاہیے کہ وہ ان جیسے اختلافی مسائل کی وجہ سے کسی عالم دین اور کسی مجتہد کی بدگوئی اور اس کی شان میں زباندرازی کریں۔

میں اس بات میں جو کچھ اس وقت لکھ

سکتا تھا وہ اس مکتوب میں حوالۂ قلم کر دیا ہے — اور جو
کچھ میں نے لکھا ہے وہ صرف نصح دینی کے جذبہ نے مجھ
سے لکھوایا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الامور صفحہ ۲۹

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا پورا مکتوب ناظرین کے سامنے ہے، اس کی ایک ایک سطر سے ظاہر ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کرنے کے بعد اور اُن کے مخالفین نے اُن پر جو اعتراضات کیے اور الزامات لگائے ہیں اُن سب سے واقف ہونے کے بعد بھی شاہ صاحب کے دل میں اُن کی کتنی عظمت اور کیا احترام ہے اور جن لوگوں نے ان کی تکفیر یا تفسیق کی شاہ صاحب کے نزدیک اُن کا موقف کتنا غلط ہے —— اس مکتوب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ٹھٹھہ (سندھ) کے مخدوم معین الدین کے جس خط یا رسالہ کے جواب میں حضرت شاہ صاحب نے یہ مکتوب لکھا ہے اُس میں غالباً ان سب اعتراضات اور الزامات کا ذکر تھا جن کا شاہ صاحب نے اس مکتوب میں جواب دیا ہے۔

جیسا کہ یہ عاجز شروع میں عرض کر چکا ہے اور ہر باخبر کو معلوم ہے حضرت شاہ ولی اللہ[۳۱] جماعت دیوبند کے فکری اور دینی امام اور رہنما ہیں، اُن کا صرف یہ مکتوب ہی یہ معلوم کرنے کے لیے کافی ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بارے میں اکابر جماعت دیوبند کا مسلک و موقف کیا رہا ہے —— تاہم اس موقع پر بعد کے چند اکابر کی تصریحات بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(باقی)

BOMBAY ANDHRA TRANSPORT CO.

TRANSPORT CONTRACTORS

113. BHANDARI STREET (Chakla)
BOMBAY - 3.

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم

کا

سفرِ حج

(تلخیص ـــــ از جناب شمس تبریز خاں صاحب)

(نواب صاحب مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کی ایسی جامعیت اور علم و فضل کی وہ عظمت نصیب فرمائی تھی کہ علامہ انور شاہؒ سے لیکر مولانا ابوالکلام آزادؒ تک اُن کے تمام معاصرین یکساں طور پر اُن کے معترف نظر آتے ہیں۔ اگست ۱۹۵۰ء میں انتقال فرمایا۔ ذیل میں موصوف کے سفرنامہ حج کی تلخیص درج کی جا رہی ہے جو اُن کی سوانح حیات (از شمس تبریز خاں) سے ماخوذ ہے۔ ان شاء اللہ عازمین حج کے لیے یہ ایک اچھا تحفہ ثابت ہوگی ـــــ مرتب)

......۲۷ شوال المکرم ۱۳۴۴ھ شنبہ کو بعد نماز عصر حصن حصین کی ادعیہ ماثورہ پڑھکر حبیب گنج سے روانہ ہوا۔

بارہ روز بمبئی میں قیام رہا، موسم خوشگوار، آموں کی بہار، رحمت کا ظہور، نعمت کا وفور، بلدۃ طیبۃ و ربٌّ غفور، حیدرآباد کا قافلۂ حجاج ہمراہ عم محترم[1] آیا ہوا تھا، اختر یار جنگ بھی تھے، وقت بہت اچھا

---

[1] مولانا اس زمانہ میں ریاست حیدرآباد کے صدر الصدور تھے (ادارہ الفرقان)

گزرا، شیخ الفضل نے مہربانی سے دعوت بھی کی
بالآخر سمندر کا سفر شروع ہوا۔ ع

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرساہا

"۴ ذیقعدہ روز دوشنبہ کو سہ پہر کے وقت نازی کمپنی کے جہاز "گرجستان" نامی پر مع الخیر سوار ہوئے۔ شیراز کا ٹج میں قیام رہا، گرجستان میں سفر ہوا، جمال اور جلال دونوں کے مظاہر گویا جمع تھے۔ جہاز میں بہترین سیلون اور کمرے قیام کے لیے ملے انتظام اور صفائی بہت اچھی تھی، کپتان خلیق اور معقول تھا، حجاج کی آسائش و راحت کا پورا خیال رکھتا، ساتھ ہی ضبط و آئین کا بھی۔"

"جہاز پر سوار ہوتے ہی تین شوق بالکل فنا ہو گئے، اخبار بینی، شعر گوئی اور پان خوری۔ چند روز قبل سے اردو شعر کہنے کا شوق از خود پیدا ہو گیا تھا، بے اختیار شعر موزوں ہوتے۔ کبھی کبھی بہ یک وقت دو دو غزلیں موزوں ہوتی رہتیں، جو طرح پسند آجاتی، غزل پوری ہو جاتی، سمندر میں پہونچ کر گویا یہ سوتا خشک ہو گیا، اخبار و اپسی بمبئی تک دیکھا ہی نہیں، اور نہ دل چاہا، حالانکہ برسوں سے التزام و اہتمام تھا، جو مسافر جہاز کے فرسٹ کلاس میں تھے انمیں "موتمر" اور سیاسیات پر بحث کا بہت ہنگامہ تھا، جو اکثر اوقات برپا رہتا، میری طبیعت بحمدہ بالکل اس سے بیگانہ رہی، ایک بار سے زیادہ مجھ سے شرکت "موتمر" کی بابت سوال ہوا اور ہر دفعہ میں نے انکار کیا۔

چونکہ اس راستہ میں عدن نہیں آتا، اس لیے سب سے پہلے مبارک سرزمین عرب کا حصہ بیرم جزیرہ دیکھا۔ کپتان نے پہلے سے اس کے آنے کی خبر دیدی تھی، اس لیے انتظار تھا، جس وقت وہ پاک سرزمین آئی نگاہ محبت و عقیدت سے دیکھی۔ قلب میں رقت پیدا ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے، گنہگاری یاد آئی۔ دیر تک دعا و استغفار کا سلسلہ عجز و نیاز کے ساتھ جاری رہا، سرزمین مقدس عرب کی یہ پُر تزکیہ تاثیر ہر ہر مقام پر دیکھی۔"

"دوشنبہ ۱۸ ذیقعدہ کو ۹ بجے صبح جہاز بندرگاہ جدہ میں داخل ہوا۔

شکر کہ جہاز بہ منزل رسید
زورقِ امید بہ ساحل رسید

جدہ کے حمالوں کی دراز دستی اور جمرک کی دقتوں کا اندیشہ بہت کچھ دلایا گیا تھا، اس لیے خیال تھا، اس کی بندہ نوازی، جہاز کے پہونچنے کے بعد ہی شیخ علی رضا زینل قائم مقام جدہ، رئیس البلدیہ جدہ (میونسپلٹی) اور مدیر اخبار ام القریٰ اور ایک صاحب میرے سیلون میں تشریف لائے۔ ملک الحجاز ابن سعود کی جانب سے خیر مقدم کیا، اور موٹر کشتی میں ہم سب کو سوار کرکے جدہ پر آرام پہونچا دیا، قیام کے لیے قصر شریف علی تجویز ہو چکا تھا۔ یہ شاندار عمارت سمندر کے کنارہ پر ہے جو شریفیہ عہد میں دارالامارۃ تھی، تھوڑی دیر میں بقیہ ہمراہی اور سامان بھی وہاں پہنچ گیا، جس دقت کا اندیشہ تھا وہ بفضلہ تعالیٰ خواب میں بھی نظر نہ آئی، اس دن اور شب کو جدہ میں قیام رہا۔ ضیافت ابن سعود کی جانب سے تھی، سہ پہر کے وقت قائم مقام جدہ کے مشورہ کے بموجب ملک الحجاز کو اپنے جدہ پہنچنے کی اطلاع تار کے ذریعہ سے کی اور اخلاقاً حاضری کی اجازت طلب کی، جواب میں پر عنایت خیر مقدم کا پیام آیا، شام کو انگریزی کونسل سے ملاقات کی۔"

"ایک بار سے زیادہ اس دوران میں رقت آمیز دعاء و استغفار کی نوبت آئی۔ خصوصاً حرم میں داخل ہونے کے وقت بمقام جدہ پورا جوش نیاز و عجز تھا، پیہم دعاء و استغفار تھے، اشک رواں تھے۔ مکہ مکرمہ زادہا اللہ تعالیٰ تشریفاً کے قریب پہونچکر سات کبوتر نظر آئے۔ الحمد للہ حرم شریف میں سات جمع ادا ہوئے۔ لاری کے قائد نے اشارہ کرکے کہا۔ "ھذا حمام الحرم" عاجز دل نے محسوس کیا کہ مسافر نوازی فرمائی گئی۔ اس تصور سے دیر تک ایک کیف رہا۔ دعاؤں کے ورد کے ساتھ عصر کے وقت لاریاں مکہ مکرمہ پہونچیں۔ اور ایک عمر کی تمنا بلکہ حاصل زندگی تمنا فضل ربانی سے بر آئی۔ زیارت بیت اللہ المکرم و حاضری مسجد الحرام کا شرف حاصل ہوا۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ ظہر (قضا) اور عصر کی نماز مسجد الحرام میں ادا کی، طواف، عمرہ، سعی صفا و مروہ سے مشرف ہو کر احرام اتارا، پیاس تھی برف کی بالائی و تازہ عربانی ذائقہ نواز و سرمایۂ تسکین ہوئی۔ الحمد للہ تعالیٰ، قیام ضیافت کا اہتمام منجانب حکومت حجاز تھا، حرم شریف سے بالکل متصل "جیت نو فیر" میں قیام ہوا، یہ مکان باب الدریبۃ کے قریب اور کتاب خانہ سلطان عبدالمجید خاں مرحوم کے آمنے سامنے ہے۔ عالیشان کئی منزل کی عمارت ہے۔"

۲۲ ذیقعدہ کی شب کو بعد عشا ابن سعود سے سقافیہ میں ملاقات ہوئی، حافظ وہبہ مصری آکر حکومت کی موٹر میں لے گئے، سلطان اُس وقت حدیث شریف سُن رہے تھے، مجھ کو بہ اصرار اپنے قریب بے تکلف بٹھایا، حدیث شریف کے سماع سے فارغ ہوکر گفتگو کی، ملاقات تو تقریباً ۴۵ منٹ تک رہی مگر باتیں کم ہوئیں، زیادہ حصہ سکوت میں گزرا، دو مرتبہ میں نے اجازت بھی چاہی مزید نشست پر اصرار کیا، خیر مقدم کے بعد راستے کی خیریت دریافت کی۔ آسائش قیام کا حال پوچھا، مدینہ طیبہ کے راستے میں موٹر چلنے پر خیالات ظاہر کیے۔ کہا ابھی محطات نہیں بنے، سامان ضروری دستیاب ہوا، اس لیے تاخیر ہے، عنقریب چلنے لگیں گی۔ حیدر آباد کی آبادی اور پیداوار پر گفتگو کی، ایک موقع پر میرے استفسار پر حافظ وہبہ نے بتایا کہ سلطان نے ملاقات کے بعد تمہاری نسبت کہا کہ "ھو رجل اصیل"۔

۸ ذی حجہ سے قبل منیٰ میں جاکر مکان پر قیام کیا۔ اثنائے راہ میں جبل النور مطوف صاحب نے دکھایا۔ ایک سیدھی بلند چٹان دیدہ افروز تھی، جس کا رنگ ادامہٹ لیے محسوس ہوا، اس مبارک چٹان سے گویا نگاہ لپٹ گئی۔ جب تک سامنا رہا دیکھتا رہا۔ نظر جم جانے کے بعد براہ راست ایک اثر اس پہاڑ کے آسمانی بلکہ عرشی تعلق کا قلب محسوس کرتا رہا، جس قدر احساس قوی ہوتا گیا، قلب پر ایک کیفیت بیخودی و وجد بڑھتی گئی۔ یہ اس امر کی شہادت ہوگی کہ ہنوز نزول وحی کے برکات و آثار اس بقعۂ مبارک پر فیض بار ہیں۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست

نماز عصر خیمے میں ادا کی، اس کے بعد جبل رحمت کی حاضری سے مشرف ہوا، میرے ہم نام مولوی لدھیانوی عـــہ ساتھ لے گئے، مقام ناقۂ نبوی قصواء نامی کے قریب حاضر ہوکر دعا شروع کی، ہاتھ اٹھنے کے بعد دعا کے الفاظ زبان پر آئے تھے کہ قلب میں ایک جوش خضوع پیدا ہوا، آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، ترىٰ اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ۔ بدن جھک گیا، معاصی کی یاد اور ندامت دل و جسم کو گھلائے دیتی تھیں۔ گھلاوٹ آنسو بن کر آنکھ

عـــہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی مرحوم۔ (الفرقان)

سے رواں تھی، اسی عالم میں دیر تک استغفار و دعا کا سلسلہ جاری رہا۔ الحمد للہ خضوع و خشوع کا وہ عالم طاری ہوا جو مدۃ العمر کبھی نہ دیکھا تھا۔ آنسوؤں سے نہ صرف چہرہ اور داڑھی تر ہوئی بلکہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی تر ہو گئیں۔ قال اللہ تعالیٰ

تَرٰی اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ

یہ یقین دلیل جوش رحمت کی تھی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً طیباً کثیراً مبارکاً فیہ۔ ختم دعا کے بعد قلب نے راحت سکون محسوس کی، جو بعض تعالیٰ دلیل قبول دعا ہوگی۔ مغرب کا وقت ابھی ختم ہو جانے پر عرفات سے مراجعت ہوئی، روانگی کے وقت چادر شب نے اس وسیع اور متبرک و مقدس میدان کو چھپا لیا تھا، ہزاروں انسان اور اونٹ اس اندھیرے میں رواں تھے، اس وقت مجھ کو ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوا، قلب نے محسوس کیا کہ جس قدر میدان انسانوں سے خالی ہوتا جاتا ہے، آسمان سے نازل ہونے والے ملائک سے بھرتا جاتا ہے۔ احساس دم بدم قوت پکڑتا گیا، آنکھیں تو نہ دیکھتی تھیں، باقی تمام کیفیت ... گروہ کے نزول و اجتماع کی قلب محسوس کرتا تھا، یعنی قلب کو احساس قرب عظمت و تقدس کا تھا دیر تک یہ کیفیت طاری رہی، مزدلفہ پہنچ کر نماز مغرب و عشاء ملا کر پڑھی، رمی جمار کے لئے کنکریاں چنیں۔ اونٹوں کے حلقے میں زمین پر بستر بچھائے گئے، تمام کی رات کا سماں دیکھا، اس شب کی خنکی و راحت اور خواب پر راحت ساری عمر یاد رہے گی۔ ؎

سقی اللہ لیلا لنا ... ... شب ... زلفین ... ب

ظاہراً ایک عالم تھا، یہ عالم سفلی کی کیفیات سے بالاتر تھا سونے میں سوتا تھا، چاند نے سر در کو پر نور کر دیا تھا، یا رب کہ میرہ وہ پر نور سر و پھر نصیب ... فرما آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ اجمعین۔

منیٰ واپس آکر قربانی کی، رمی جمار سے بہ اطمینان فراغت حاصل ہوئی، شب دوازدہم کو منیٰ میں صبح سے کچھ پہلے ... خواب میں دیکھا کوئی کہتا ہے "یہ رتبہ حرم کا ہے" میں نے

---

[1] ... الملائکۃ ... الابرار ... المعصیات ...

پوچھا "کیا مطلب" کہا "ان کا جو بے تعلق ہے" مولانا عبد الکریم صاحب مراد آبادی کا مقولہ عہ یاد کرو۔ اللہ پاک اپنے حبیب کریم علیہ افضل التحیۃ والتسلیم کے صدقے میں اس زمرے میں مجھ عاجز گنہگار بندے کو بھی داخل فرمادے۔ نیز میرے ساتھیوں اور دوسرے مسلمانوں کو۔"

"۱۲ ذی الحجہ کے بعد پیچش کی زیادتی ہو گئی۔ نیچے اترنا بالکل موقوف ہو گیا۔ حکیم تفضل حسین خان صاحب رامپوری نے نہایت عنایت و ہمدردی سے علاج فرمایا۔

علالت کے زمانے میں مولانا الحاج شفیع الدین صاحب (خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ) نے متعدد بار کرم فرما کر مزاج پرسی کی، ایک بار اس وقت تشریف لائے جب مسہل تجویز ہو چکا تھا، فرمایا آب زمزم شریف بہ نیت اسہال پیو۔ پیا، مسہل کامیاب ہوا، سدے خارج ہو گئے۔ اب حابسات کا استعمال شروع ہوا، ان دنوں میں تشریف لائے تو فرمایا، اب حبس کی نیت سے زمزم شریف پیو، پیا، نفع عاجل حاصل ہوا۔"

"ضعف مرض کے بعد ارادہ ہوا کہ چندے طائف میں تبدیل آب و ہوا کی جائے، قوت آنے پر مدینہ طیبہ کا سفر مبارک ہو، اس ارادہ کی اطلاع ابن سعود کو ہوئی تو براہ عنایت وہاں قیام کا انتظام کر کے مجھ سے کہلا بھیجا کہ تبدیل آب و ہوا مناسب ہے۔ فلاں مکان تجویز کر دیا گیا ہے۔ پانی فلاں کنواں کا استعمال کیا جائے، جب یہ سب کچھ ہو گیا تو قلب کو اس تصور سے وحشت ہوئی کہ مدینہ طیبہ کی حاضری میں مزید تاخیر ہو گی اور ایک دوسرا سفر حائل قصد ہوتا ہے۔ اس خیال کے آنے پر طائف جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا۔"

"۴ محرم الحرام ۱۳۴۵ھ پنجشنبہ روانگی مدینہ طیبہ کے واسطے مقرر ہوئی۔ شب پنجشنبہ کو شیبی صاحب نے داخلی کا انتظام کر دیا، داخلی کا وقت بعد نماز عشاء قرار پایا۔ قافلوں کے چلے جانے کی وجہ سے پورا سکون و سکوت اس موقع پر تھا، شدت علالت کے بعد پہلی بار کرسی پر بیٹھ کر اس موقع پر پہنچ گیا، جوں جوں وقت حاضری قریب آتا جاتا تھا، دل پر ہیبت بڑھتی جاتی تھی، عمامہ باندھنے کے وقت اپنی بد اعمالی و گنہگاری یاد کر کے بار بار اندیشہ ہوا کہ کہیں داخلے کے وقت صورت

عہ مولانا عبد الکریم صاحب گمتھلوی مراد آبادی نے نواب صاحب سے فرمایا تھا کہ "میاں بے تعلق ہو کر جاؤ تو لطف ہے۔" (الفرقان)

سنح نہ ہو جائے، فضل و کرم کے سہارے نے دل تھاما خلاصہ یہ شرف داخلی و باریابی سے مشرف ہوا۔ فللّٰہ الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ شبلی صاحب کے بڑے صاحبزادے دروازہ کے قریب اندر بیٹھے تھے۔ ایک سہ شانہ اندر روشن تھا، داخلی کے وقت سخت گرمی محسوس ہوئی، نگاہ نیچی کیے ہوئے ادب سے عاجزانہ سیدھا آگے بڑھا، داخلی کی دعا زبان پر برابر جاری تھی، سامنے کی دیوار کے قریب پہونچکر دو رکعت نماز پڑھی، یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی تھی فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ بعد نماز دیر تک اہتمام خضوع کے ساتھ دعا و استغفار میں زیادہ حصہ گزارا اور دعائیں بھی کیں جن میں حضور نظام کے جاہ و اقبال کی بھی تھی، نسیم لطف کا ایک جھونکا آیا جس نے قلب میں ایک زبردست انبساط اور وجد کی کیفیت پیدا کردی اس کیفیت نے گویا کایا پلٹ دی اب اور ہی عالم تھا، دعا میں اور ہی ذوق تھا، اسی عالم کیف میں ایک دعا کے مرتب الفاظ قلب پر گویا القا ہوئے[1]۔ القا یوں کہتا ہوں کہ نہ ان الفاظ کی طرف میرا خیال تھا اور نہ کبھی ان الفاظ یا ان کے مشابہ الفاظ میں مدۃ العمر دعا کی، نیز یہ کہ ان الفاظ کے ذہن میں آتے ہی انبساط و وجد سابق میں ایک جوش موآجی پیدا ہو گیا، ہاتھ بے اختیار اپنی پوری وسعت کی حد تک پھیل گئے جو مبارک و باعظمت دیوار سے دو دو بالشت ہوں گے۔ خلاصہ خضوع و ذوق کا پورا نقشہ کھنچ گیا۔ مبارک دعا یہ تھی "یا کریم ان ہاتھوں کو مرادوں سے بھر دے" کون سی عبارت یا زبان اس عالم کیف و وجد کا ایک شمہ بھی بیان کر سکتی ہے۔ جو اس دعا کے وقت قلب و روح پر طاری تھا، یہ عاجز بندہ گویا مجسم ذوق عبودیت ہو کر یہ الفاظ ادا کر رہا تھا اور گویا ظاہر و باطن دونوں مل کر زبان دعا بن گئے، سوائے محویت دعا کے نہ کوئی تصور تھا نہ کوئی احساس، شروع میں کبھی لفظ مبارک "یا کریم" زبان پہ آتا اور کبھی "یا مولا" جوشِ دعا تھا اور ان قدسی اثر الفاظ کی تکرار پہ تکرار تھی اور جوش کیف، مزید کرم فرما گیا، جوش کیف لذت حضور حاصل کی اور ادراک ہونے لگا کہ مولائے کریم قریب ہی سن رہا ہے۔ اور نہ صرف

---

[1] قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من فتح لہ من الدعاء منکم فتحت لہ ابواب الاجابۃ

(المصنف لابی بکر بن ابی شیبۃ، کتاب الدعاء ۔ باب فضل الدعاء)

[illegible] بغیر اندازہ ہوتا ہے خوشی ہوتی ہے اس ادراک سے کیفیت ہوتی ہے [illegible] تیز کیا اثر پاک
بہتر بنا ہے کہ کتنی دیر یہ عالم رہا ایک عاجز بندہ اس کو [illegible] تصور کر سکتا ہے۔ فالحمد للہ
تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ ——— فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً
طیباً مبارکاً فیہ۔ [illegible] کیفیت سکون و راحت سے سبک ہوا اور جو عاجز گنہگار بندہ
[illegible] اندیشہ کے حاضر ہوا تھا وہ لطف و کرم سے نوازا گیا دل [illegible] ہوا سے

اے خدا قربان احسانت شوم
این چہ احسان است قربانت شوم

الحمد للہ ان نقوش کی تحریر کے وقت بھی قلب نے اس نعمت کا احساس کیا آنکھوں
سے اشک بہائے۔ [illegible] اللہ تعالیٰ شکر

[illegible] در فشاں [illegible]

[illegible] سے مدینہ شریف کو [illegible] سفر مبارک تھا [illegible] کی بعض [illegible] کی وجہ
سے روانگی نہ ہو سکی [illegible] ہوئی [illegible] محترم تھا [illegible] یہاں
[illegible] جمعہ کی شام ہوئی
[illegible] ادا ہوئے۔ فالحمد للہ
تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ [illegible] (منیٰ اور عرفات ملاکر)
پینتالیس دن [illegible] پانچ دن منیٰ اور عرفات میں [illegible] چالیس دن مکہ مکرمہ جوار بیت اللہ
تعالیٰ میں [illegible] ہو گیا ایک دن کے مزید قیام سے یہ
برکت بھی حاصل ہو گئی۔ [illegible] اللہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

کبھی کبھی تہجد حرم میں ادا [illegible] اور بعد میں طواف کا شرف بھی ملا۔ ایک مرتبہ تہجد کے
وقت [illegible] پاس [illegible] کھڑے تھے مجھ سے
پانی طلب فرمایا [illegible] کی نیت کی ہے۔"

دوران طواف [illegible] کی دعا [illegible] جب الفاظ [illegible] یا غفور زبان پر آئے
قلب نے قریباً ہمیشہ ایک [illegible] کیفیت محسوس کیا [illegible] عجیب [illegible] ذوق محسوس ہوا۔ فالحمد للہ

حسناً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ ۔ روایت میں ہے کہ مقام موصوف پر ایک فرشتے دعائے حجاج پر آمین کہنے پر مامور ہیں۔

ایک بار مطاف کی جاروب کشی کی عزت بھی نصیب ہوئی۔ آغاؤں سے بہ التجا جاروب لی۔ ایک اشرفی اس سرفرازی کی نذر دی۔

مدینہ طیبہ کا مبارک سفر

۳ محرم الحرام کو صبح کے وقت بعد نماز فجر بے تکلف یہ مصرعہ موزوں ہو گیا ع

خوشا نصیب کہ حسرت چلا مدینے کو

تھوڑے سے خیال میں دوسرا مصرعہ بھی موزوں ہو کر شعر پورا ہو گیا ع

تو پھر آج تو ہو تہنیت ہو سینے کو

گیارہ دن منزل بہ منزل [illegible] میں حاضری کا شرف حاصل ہونے والا تھا [illegible] منزل میں [illegible] صاحب عمادی نادری نے مدینہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] محمد عظیم آبادی

پہلی مرتبہ یہ دولت پر آب حیات نصیب حبیب ہوا۔ دل نے کہا کہ غریب پروری دعا نوازی کے لئے ایک منزل پہلے ہی اذن فرمائی۔ فال خوب ہے۔ جس شب کی صبح کو حاضری مدینہ طیبہ ہونے والی تھی سامنے قافلے میں جوش مسرت تھا۔ غسل کیا۔ نئے کپڑے بدلے۔ عطر لگایا۔ بندوں نے بھی لباس بدلا [illegible] تاہم ایسے ہی خوش تھے جیسے دوسرے نئے حاضر ہونے والے۔ پچھلی شب سے قافلے والے بیدار ہو کر لباس بدلے ہوئے پاپیادہ چل رہے تھے۔ میں بھی پاپیادہ ہو لیا۔ ہمشیرہ صاحبہ نے ازراہ شفقت فرمایا "تھک جاؤ گے"

سوار ہو کر ... نے کہا میں بھی جاتا ہوں مگر اب سوار ہو کر سفر نہیں کر سکتا۔ اترنے کے بعد اوّل نماز تہجد ادا کی جو الحمدللہ پرکیف تھی۔ اس کے بعد پیادہ چلا اور بقیہ مسافت پیادہ پا طے کی۔

صبح صادق کی روشنی میں مبارک مسجد نبوی (علی اصاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے نورانی مناظر دیدہ افروز، دلنواز اور جان پرور ہوئے۔ فالحمدللہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ ؎

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے
آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
(حافظ)

بعد نماز حاضر مسجد شریف ہوا۔ داخلی کی دعا پڑھ کر اوّل تحیۃ مسجد محراب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ادا کی پھر روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر درود و سلام عرض کرنے کا شرف حاصل کیا۔ زہے سعادت زہے نصیب، فالحمدللہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ جس نور و سرور کی نوید و تہنیت آغاز سفر سے پہلے موزوں شعر میں ملی تھی اس کا یہ مبارک آغاز تھا۔ شرف حضوری کے بعد فرودگاہ پر آیا۔ یہ مکان حرم شریف سے چند ہاتھ کے فاصلے پر باب رحمت کے متصل تھا۔ ذخیرے حاضری کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ اس مکان کا نام بیت پشاوری تھا۔ افغانی نیاز بھی قائم رہا۔ یہ پنجشنبہ کا بابرکت دن تھا۔"

اس کے بعد حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مرقد مبارک پر حاضر ہوا۔ حاضر ہونے پر امومیت کی نسبت اس قوت سے قلب پر طاری ہوئی کہ بیان میں نہیں آسکتی۔ جوشِ رقت میں امی امی کی صدا دل و زبان کے ساتھ گویا جسم کا ریشہ ریشہ دے رہا تھا اور روح محو ذوق تھی، بے شائبہ تکلف محسوس ہوتا تھا کہ بچے نے مدت دراز کی مفارقت کے بعد شفیق ماں کو دفعتہً پا لیا ہے اور جوش محبت و احساس شفقت سے بیتاب ہو کر امی امی پکار رہا ہے۔ الفاظ کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ بغرض ایک عالم تھا، جو اسی آستانۂ محترم کا شانہ کے ساتھ مخصوص تھا رضی اللہ تعالیٰ عنہا و ارضاہا عنّا۔ یہ دونوں کیفیتیں اپنی نوعیت میں عجیب و غریب تھیں، فالحمدللہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ

"دوشنبہ ۲ صفر المظفر، آج صبح روضۂ مبارک کے خدام میرے ادا ...

عالم کے مخدوم اغوات نے میری قیام گاہ پر قدم رنجہ فرما کر ضیافتِ چائے قبول فرمائی۔ مجھ کو مشرف بکرم فرمایا، عجیب باادب اور سلیقہ شعار بزرگ ہیں، کیسے ادب اور قاعدے سے خدمتِ روضۂ مبارک ادا فرماتے ہیں، جس کو دیکھ کر دل عش عش کرتا ہے۔ ایک موقع پر جب حاجی احمد مرحوم بمبئی کے باخیر سیٹھ نے اپنے مکان پر دعوت میں مجھ کو بھی بلایا تھا، تو آغا سرور شیخ الاغوات صدر نشین تھے، میں پہلو میں قریب حاضر تھا۔ اثنائے کلام میں میں نے پوچھا کہ کس قدر زمانہ سے روضۂ مبارک پر حاضر ہیں، فرمایا ۶۵ برس سے سعادتِ خدمت حاصل ہے۔ سات برس کی عمر میں حاضر ہو گیا تھا، یہ سُن کر ممدوح کی طہارت کا اس قدر تصور بندھا کہ مجھ کو اپنا وجود نجس محسوس ہونے لگا، اور میں شیخ کے قریب سے علیحدہ ہو گیا، جس طرح طاہر جسم کو نجاست سے بچاتے ہیں۔"

"جمعہ ۱۰ صفر المظفر دورانِ حاضری مدینہ طیبہ میں عرضِ درود و سلام کا یہ طریقہ رہا کہ شروع میں تو مزوّر زائرین کے ہمراہ چند بار روضۂ مبارک کے قریب ہو کر یہ شرف حاصل کیا، لیکن اس کے بعد قریب حاضر ہونے کا قصد ہی نہ ہوتا تھا نہ جرأت ہوتی تھی، دور سے باادب ایستادہ ہو کر عرض کر لیتا، برابر یہی طریقۂ ادب ملحوظ رہا، اسی اثنا میں ایک موقع پر جناب مدیر حرم شریف نے روضۂ منورہ میں داخلی کی مجھ سے تحریک فرمائی تو میں ہیبت زدہ سا ہو گیا، اور اپنی نااہلی ظاہر کر کے معذرت کی، نماز جماعت میں بھی روضۂ مبارک کی جالی کے قریب کھڑے ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔"

"قصور کرو میری اس عزت و شان کا جب میں اس مبارک ہیئت سے منتظرِ خدمت و حاضری درگاہ ملائک پناہ موقفِ خدمت میں حاضر تھا، دل میں سکون و عجز کی کیفیت تھی۔ بالآخر خدام کرام حسبِ قاعدۂ مقررہ غایت ادب کے ساتھ روضۂ اقدس کے بابِ معلّٰی پر حاضر ہو کر صف بستہ ایستادہ ہوئے۔ زہے شرف کہ یہ عاجز بندہ بھی اس باشرف صف میں تھا۔ کلید برادر خادم سب سے آگے ایستادہ تھے، ان کے گلے میں بھاری چاندی کی زنجیریں آویزاں تھیں، جن میں بڑی بڑی کنجیاں تھیں، سب نے اول درود و سلام عرض کیا، پھر بعد استیذان در سعادت کھولا۔ سب خاموش نیچی نظر کے ساتھ آہستہ آہستہ بدن کو سمیٹتے ہوئے داخل ہوئے۔"

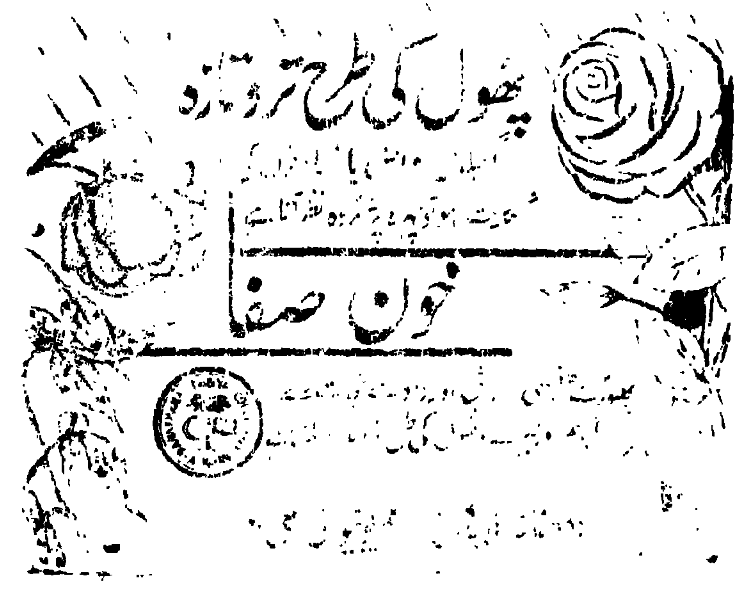
"اس کے بعد حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مرقد مبارک کے قریب حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی، یونہی آہستہ آہستہ درود و سلام پڑھتے خدمت کرتے باہر آ گئے،

ادب نے نگاہ کو اتنا قابو میں رکھا کہ بام آستانہ پر بھی یہ معلوم ہوا کہ کیا دیکھا، فرطِ ادب سے نگاہ فرش مقدس پر بھی نہ تھی، لہٰذا اس کی ہیئت بھی ذہن میں نہ تھی۔ ہر آستانہ پر قلب میں پورا سکون تھا، مفارقت و جدائی کا کبھی تصور بھی نہ رہا، قلب کو طمانیت حاصل ہو گئی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، اللّٰھم صل علیٰ سیدنا محمد وعترتہ بعدد کل معلوم لک۔

"عصر کی نماز کے بعد روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر الوداعی درود و سلام عرض کیا گیا، اہل قافلہ صدمۂ مفارقت سے بے چین مصروفِ آہ و بکا تھے، میرا قلب الحمد للہ تعالیٰ سکینۂ حضور محسوس کر کے مطمئن تھا۔ تصور مفارقت ہی نہ رہا، اور آج تک بھی نہیں ہے۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ بعد نماز عصر قافلہ مع الخیر جدہ کو روانہ ہوا۔"

حبیب گنج سے روانگی ۱۰ شوال المکرم روز شنبہ کو ہوئی تھی۔ واپسی ۱۷ ربیع الاول روز شنبہ ہوئی۔ جملہ ایام سفر مبارک پانچ مہینے۔ ؎

شاد کر تازہ بمنزل رسید
زورقِ امید بساحل رسید"



حضرت مولانا نعمانی کی ایک تقریر

دینی مدارس کے طلبہ سے خطاب

آپ کون ہیں، کیا ہیں اور آپ کی منزل کیا ہے؟

گزشتہ مارچ کے آخری ہفتہ میں حضرت مولانا نعمانی نے گجرات کے قریباً سب ہی بڑے دینی مدارس کا دورہ فرمایا تھا، ہر جگہ صرف طلبہ سے خطاب فرمایا، یا حضرات اساتذہ سے مجالس میں گفتگو فرمائی (یہی اس دورہ کا مقصد و موضوع تھا)۔ — راندیر (ضلع سورت) اس دورہ کی آخری منزل تھی، وہاں خدا کے فضل سے دو بڑے مدرسے ہیں اور الحمدللہ — اچھے حال میں ہیں — ایک "جامعہ حسینیہ" اور دوسرا دارالعلوم اشرفیہ دونوں مدرسوں کے طلبہ اور حضرات اساتذہ کا اجتماع راندیر کی مشہور اور مرکزی مسجد ... میں ہوا۔ اس اجتماع میں جو تقریر فرمائی گئی وہ ریکارڈ کر لی گئی تھی، وہی حضرت مولانا کی نظر سے گزرنے کے بعد شائع کی جا رہی ہے۔ حضرت مولانا نے بتلایا ہے کہ کہیں کہیں اختصار یا قارئین کے فائدہ کے لیے اس میں ترمیم بھی کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى!

میرے عزیز بھائیو! جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا میں اس وقت اسی لیے اور اسی نیت سے آیا ہوں کہ آپ عزیز بھائیوں سے جو یہاں کے ہمارے مدرسوں میں پڑھتے ہیں کچھ باتیں کر دوں — میرے اصل مخاطب اس وقت آپ ہی حضرات ہیں، یعنی ہمارے عزیز طلبہ۔

میں آپ کی برادری کا ایک آدمی ہوں، میں طالب علم تھا، طالب علم ہوں، اور ان شاء اللہ طالب علمی کی حالت ہی میں مروں گا۔

ادھر کچھ عرصہ سے میرے دل میں اس کا بڑا داعیہ ہے کہ اپنے دینی مدارس کے عزیز طلبہ کے پاس پہنچ کر ان سے اپنے دل کی کچھ باتیں کہوں ـــــ میرے بھائیو! علماء دل، اُمت کا قلب ہیں، حدیث پاک میں جس طرح فرمایا گیا ہے قلب کا حال یہ ہے کہ "اذا صلح صلح الجسد کلہ و اذا فسد فسد الجسد کلہ" (یعنی اگر قلب ٹھیک ہے تو سارا جسم ٹھیک ہوگا اور اگر قلب ٹھیک نہیں تو جسم کی بھی خیریت نہیں) تو علماء اس امت کا قلب ہیں تو اگر ہم لوگ جو علماء کہے جاتے ہیں اگر ہم میں فساد ہے تو امت میں اس سے ہزار گنا فساد ہوگا اور اگر ہم میں صلاح ہے تو پھر ان شاء اللہ امت میں بھی صلاح ہوگا اور وہ فساد سے محفوظ رہے گی۔

میرے بھائیو! اللہ تعالیٰ آپ سب کی عمروں میں برکت دے۔ ان شاء اللہ آپ آنے والے زمانے کے علماء ہوں گے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ میں آپ ہی کی برادری کا اور آپ ہی کی دنیا کا ایک آدمی ہوں یعنی طالب علم ہوں، لیکن میری عمر زیادہ ہے، ستر کے قریب پہونچ چکی ہے اور میں بہت سے اُن تجربوں سے گزرا ہوں جن سے آپ کو گزرنا ہوگا، اس لیے میری باتیں ان شاء اللہ آپ کے لیے کار آمد ہوں گی۔

میں اس وقت اپنے مدارس تک دورے کے لیے نکلا ہوا ہوں، اس دورہ کے لیے مجھے کسی نے دعوت نہیں دی تھی بلکہ میں اپنے دل کے داعیہ اور تقاضے سے یہ دورہ کر رہا ہوں، جو باتیں اس وقت آپ سے کہنا چاہتا ہوں یوں سمجھیے کہ میں وہ باتیں کہنے ہی کے لیے دور دراز کا سفر کرکے آپ کے پاس یہاں آیا ہوں ـــــ اس لیے میرا حق ہے کہ آپ میری باتوں کو توجہ سے سنیں!

میری سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپ اپنے کو پہچانیں! اس پر غور کریں کہ آپ کیا ہیں؟ آپ کا منصب اور مقام کیا ہے؟ آپ کی منزلِ مقصود کیا ہے جس کی طرف آپ جا رہے ہیں؟

میرا خیال ہے کہ آپ میں سے بہت کم بھائی ایسے ہوں گے جنھوں نے اس مسئلہ پر کبھی اس طرح غور کیا ہوگا جس طرح غور کرنا چاہیے ـــــ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی عظمت سے باخبر نہیں ہیں اور اپنے مقام اور اپنی ذمہ داریوں کا اُن کو احساس نہیں ہے ـــــ مجھے یاد ہے کہ خود میرا

بھی کبھی یہی حال تھا اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ عام طور سے ہمارے بھائیوں کا یہی حال ہوتا ہے اور یہ بڑے خسارے کی بات ہے۔

الحمد للہ آپ حضرات اگرچہ مختلف درجوں کے طالب علم ہیں لیکن سب ہی ذی علم اور صاحب فہم ہیں۔ آپ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے اس طرح غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری کائنات جو پیدا فرمائی ہے جو ہمارے سامنے ہے زمین، آسمان اور ساری مخلوقات۔ ان سب میں غور کرنے سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان تمام مخلوقات میں اصل مقصود بالتخلیق انسان ہے اس کے علاوہ جو کچھ نظر آتا ہے سب اسی کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۔۔۔ آپ اس کو یوں اور زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے کہ یہ مسجد ہے جس میں اس وقت ہم آپ بیٹھے ہیں، اس میں بہت سی چیزیں ہیں، یہ منبر ہے جس پر بیٹھ کے میں آپ سے باتیں کر رہا ہوں، یہ جا نمازیں بچھی ہوئی ہیں جن پر آپ حضرات بیٹھے ہیں، دوران پر نماز پڑھی جاتی ہے، اس میں یہ گھڑی لگی ہوئی ہے جو وقت بتاتی ہے، ساتھ میں وضو اور استنجے کے سارے انتظامات ہیں۔ اب آپ غور کریں کہ یہ ساری چیزیں کس لیے اور کس کے لیے ہیں تو یہی سمجھ میں آئے گا کہ سب نمازیوں کے لیے ہے اور خود نمازی ان میں سے کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہیں ۔۔۔ اسی طرح زمین و آسمان کی ساری چیزوں پر نظر ڈال کے دیکھ لیجیے صاف نظر آئے گا کہ جو کچھ ہے سب انسانوں کے لیے ہے اور انسان ان میں سے کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے۔ قرآن میں بھی فرمایا گیا ہے "خلق لکم ما فی الارض جمیعا" (زمین میں جو کچھ ہے، پیدا کرنے والے نے تم انسانوں ہی کے لیے پیدا کیا ہے) ۔۔۔ تو اس کائنات میں غور کرنے سے یہ بات پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس سارے عالم اور ساری کائنات میں اصل انسان ہے اور اس کے علاوہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۔۔۔ پھر انسان کاہے کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ خدا نے اس کو عبث اور بے مقصد صرف اس کا تماشا دیکھنے کے لیے پیدا کیا ہو ۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک علواً کبیراً۔ تھوڑا سا غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ انسان اس لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کو عقل و شعور اور ارادہ و اختیار کی نعمتیں اس لیے دی گئی ہیں کہ وہ اپنے خالق کو جانے پہچانے، اس کی مرضی اور اس کی ہدایات کی فرمانبرداری کے ساتھ زندگی گزار کے اس کے اعلیٰ سے اعلیٰ انعامات کا مستحق بنے اور پھر اس کی عنایت و رحمت

ورافت اور احسان وکرم کا بھرپور ظہور ہو۔ اور جو کوئی بغاوت اور نافرمانی والی مجرمانہ زندگی اختیار کرے اس کے لیے اُس خداوند قہار کی صفت عزت و جلال اور قدرت قاہرہ کا پورا پورا ظہور ہو اور اس کے لیے ضروری ہوا کہ انسانوں کو یہ معلوم ہو کہ ان کے لیے اُن کے خالق و مالک نے کیا احکام ہیں اور کیا ہدایات ہیں۔ پھر اسی مقصد اور اسی کام کے لیے نبوت اور پیغمبری کا سلسلہ جاری فرمایا گیا، جو شروع دنیا سے خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہا۔ انبیاء علیہ السلام کے دو کام ہوتے تھے۔ ایک وحی کے ذریعہ اللہ تعالٰے سے ہدایت لینا اور دوسرا اُس ہدایت کو بندوں کو پہونچانا اور اُن کو اُس پر چلانے کی کوشش کرنا۔

پھر اب سے کوئی چودہ سو سال پہلے جب سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو انسانی دنیا کے حالات اور نقشہ میں کچھ ایسی تبدیلیاں آچکی تھیں یا کہنا چاہیے کہ اتنی ترقی ہو چکی تھی کہ حکمت الٰہی کا یہ تقاضا ہوا کہ اسی نبوت کو آخری نبوت قرار دے، اور آپ کے ذریعہ ایسی جامع اور کامل مکمل ہدایت دیدی جائے جو ہمیشہ کے لیے کافی ہو اور اس کا بھی انتظام کر دیا جائے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ بالکل محفوظ رہے، اور پھر کسی نئی وحی اور ہدایت کی ضرورت ہی نہ رہے۔ چنانچہ ہمارا اور آپ کا اور سب مسلمانوں کا عقیدہ اور یقین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ایسی ہدایت آگئی اور وہ بالکل محفوظ ہے اور محفوظ رہے گی اس لیے نبیوں کا پہلا والا کام ختم ہو گیا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی کسی نبی پر ہدایت کی وحی آئے، بس دوسرا کام باقی رہ گیا یعنی خداوندی ہدایت کو بندوں تک پہنچانا اور ان کو اس پر چلانے کے لیے کوشش اور محنت کرنا، یہ کام قیامت تک کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ذمہ کر دیا گیا۔

اب یہ امت محمدیہ جس کے ہم اور آپ بھی فرد ہیں اس کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ دوسرے پیغمبروں کی امتوں کی طرح یہ بھی اللہ کے آخری پیغمبر سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے اور اس کا فرض ہے کہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت پر چلے اور اس کی پیروی کرے ــــ اور اس کی دوسری حیثیت جو اس کا خاص امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد یہ نبیوں والے اس کام کی ذمہ دار بھی ہے کہ دنیا بھر کے لوگوں کو وہ ہدایت پہونچائے اور اس پر چلانے کے لیے نبیوں والی کوشش اور محنت کرے اور اس طرح یہ امت کار نبوت میں

نبیوں کی نائب بھی ہے۔ پھر اس ذمہ داری اور نیابت کا ایک عمومی درجہ ہے جس کے لیے کسی خاص درجہ کے علم اور خاص معیار کی صلاحیت کی ضرورت نہیں، اس میں ہر ایمان لانے والے کا حصہ ہے۔ یہ عام مسلمانوں کا مقام ہے اور یہ بھی بڑا شرف ہے۔ اور ایک اس کا خصوصی درجہ ہے اور وہ یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ کی طرف سے جو علم وحی کے ذریعہ ملا تھا اور جو ہدایت اور شریعت ملی تھی، اپنی صلاحیت واستطاعت کے مطابق اس کو حاصل کیا جائے اور آپ کی خصوصی نیابت کا حق ادا کیا جائے ـــ یہ بہت بڑا درجہ ہے۔ یہ امت کے خواص کا مقام ہے۔ در اصل یہی لوگ وارثین انبیاء اور نائبین انبیاء ہیں۔

ہمارے یہ مدرسے در اصل وہ کارخانے تھے جن میں قرآن وحدیث اور دوسرے دینی علوم کی تعلیم دیکر ایسے لوگ تیار کیے جاتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خصوصی نیابت و وراثت کی ذمہ داری سنبھالتے اور اس کو اپنا مقصد زندگی بنا لیتے اور اسی کے لیے وقف ہو جاتے۔ میرے بھائیو! آپ کا اصل مقام اور منصب یہی ہے اور ہمارے ان مدرسوں کی اصل غرض وغایت یہی تھی۔

قرآن مجید میں کئی جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ مریم صدیقہ کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ آل عمران میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جب ان کی والدہ (اِمْرَأَةُ عِمْرَانَ) نے بچہ پیدا ہونے کی "امید" محسوس کی (اور انھیں غالباً کچھ آثار اور قرائن سے یہ گمان تھا کہ لڑکا پیدا ہوگا) تو انھوں نے نذر مانی اور کہا کہ یا اللہ میں نے پیدا ہونے والے بچے کو تیرے لیے وقف کر دیا۔ قرآن پاک میں ان کی اس نذر کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

"رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○"

بنی اسرائیل میں یہ دستور اور رواج تھا کہ اللہ کے نیک بندے اور نیک بندیاں اپنے نومولود بچوں کو اللہ کے لیے وقف کر دیتے تھے، اُن کو محرر کہا جاتا تھا (یعنی اللہ کے لیے آزاد چھوڑا ہوا) مطلب یہ ہوتا تھا کہ ہم نے اپنے بچے کو خدا کی نذر کر دیا، اب یہ کوئی کاروبار اور دھندا نہیں کرے گا، تو دنیا کا بھی کوئی کام نہیں کرے گا، اور گھر بھی نہیں بسائے گا، بیوی بچوں کی ذمہ داری سے بھی آزاد رہے گا، بس خدا کی عبادت اور اس کے گھر کی خدمت کرے گا۔

——— امام ابوبکر جصاص رازی نے اپنی تفسیر "احکام القرآن" میں اسی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اولاد کو خدا کی نذر کرنے اور وقف کرنے کا یہ طریقہ شریعت محمدی میں بھی ہے لیکن اس کی شکل شریعت محمدی کے مزاج کے مطابق بدل دی گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جن بندوں کو توفیق ہو وہ اپنے بچہ کے متعلق نیت کرلیں کہ ہم اس کو خدا کے لیے اور اُس کے دین کی خدمت کے لیے وقف کرتے ہیں۔ یہ علم دین حاصل کرنے کے لیے اور دین کی خدمت کے لیے وقف ہوگا ——— پھر وہ بس خدا کا ہو جائے گا اور دین کی خدمت اور اللہ کی رضا جوئی اور عبادت اس کی زندگی کا مقصد ہوگا لیکن ہماری شریعت میں وہ نکاح بھی کر سکے گا، کوئی معاشی شغل بھی اختیار کر سکے گا لیکن اس کا مقصد زندگی اور اس کا اصلی کام بس دین کی خدمت ہوگا اسی کے لیے جینا مرنا ہوگا ——— تو میرے بھائیو! ہم آپ جو ان دینی مدرسوں میں پڑھنے آتے ہیں اُن کو دراصل اسی طرح کا "محرّر" ہونا چاہیے۔

میرا اندازہ ہے کہ آپ بھائیوں میں ایسے بہت کم ہوں گے جن کو اُن کے والدین یا سرپرستوں نے اس طرح سوچ سمجھ کے اللہ کی نذر اور وقف کیا ہو اور اسی نیت سے دین کی تعلیم میں لگایا ہو ———
لیکن اب آپ کو یہ موقع حاصل ہے کہ آپ خود اپنے لیے یہ نیت اور یہ فیصلہ کرلیں اور اپنے ... کو خدا کی نذر اور اُس کے دین کے لیے وقف کردیں ——— جس طرح آپ نماز کی نیت کرتے ہیں اور وہ نماز اللہ کے لیے ہو جاتی ہے، اسی طرح آپ پوری زندگی کے بارے میں نیت کرلیں کہ وہ ہم نے اللہ کے لیے اور دین کے لیے وقف کی، اب ہم اللہ کے لیے اور دین کی خدمت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا علم سیکھیں گے اور دین کی خدمت کریں گے، ہماری زندگی کا مقصد بس یہی ہوگا، اسی کے لیے ہمارا جینا مرنا ہوگا ——— (مَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) تو آپ کی پوری زندگی اللہ کے لیے ہو جائے گی، پھر آپ کا کھانا پینا اور سونا بھی اللہ کے راستہ میں ہوگا اور عبادت میں شمار ہوگا ——— پھر آپ کی حیثیت یہ ہوگی کہ آپ "حزب اللہ" میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر میں بھرتی ہو گئے۔

میرے بھائیو! خدا کے لیے سوچو دنیا میں اس سے بلند کوئی مقام اور مرتبہ نہیں ہے۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ میں سے کچھ بھائیوں نے اگر ابھی تک اس بات کو نہیں سمجھا تھا تو اب وہ

ذہن کی پوری صفائی کے ساتھ یہ نیت اور یہ فیصلہ کرلیں اور اب سے اپنے کو خود اللہ کے لیے اور دین کے لیے وقف کردیں۔ اور اگر آپ کی نیت میں خلوص اور سچائی ہے تو یقین کرلیں کہ اللہ نے آپ کو قبول کرلیا ہے۔

اس نیت اور فیصلہ کے ساتھ انشاء اللہ آپ کے اندر ایک بہت بڑی تبدیلی ہوگی، آپ کبھی اُس احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں گے جس میں ہمارے مدرسوں کے بہت سے طلبہ بلکہ بد قسمتی سے بعض علماء تک گرفتار ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں بڑے خسارے اور گھاٹے میں ہیں۔ عالم، مولوی ہونے کے بعد ہمیں کوئی بڑی نوکری نہیں مل سکتی ہم دنیا کے عیش و آرام سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔ ہمیشہ غریبی اور مفلسی کی تکلیفیں اور ٹھوکریں ہمارا مقدر رہیں گی ۔۔۔ اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ ہم خدا کے ہوگئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی خدمت کو ہم نے اپنا مقصدِ زندگی اور مشن بنالیا ہے اور ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ خدا نے ہم کو اس کی توفیق دے کے قبول فرمالیا ہے تو پھر انشاء اللہ کبھی آپ کو یہ احساس کمتری نہیں ستائے گا بلکہ آپ کا احساس یہ ہوگا کہ جو منصب آپ کا ہے اور جہاں آپ پہونچنا چاہتے ہیں وہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ پھر آپ کو وہ قلبی اطمینان اور روحانی سکون حاصل ہوگا جو خاص اللہ والوں کا حصہ ہے۔ اور پھر آپ اپنی اس زندگی کو اور اس راستہ کی غربت اور افلاس کی تکلیفوں کو اللہ کے لیے قربانی اور جہاد اور مجاہدہ سمجھیں گے۔ اس سودے کو بڑے نفع کا اور کامیابی کا سودا سمجھ کر خوش ہوں گے۔ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ"

اس سے ہرگز میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ میں خدانخواستہ غرور اور تکبر آجائے اور آپ اپنے کو خدا کا لاڈلا اور صاحب ولایت سمجھنے لگیں یہ تو اللہ کی نگاہ میں مردود ہوجانے والی بات ہو۔ میرا مطلب یہ ہو کہ آپ علم دین کی تحصیل اور خدمتِ دین کے کام اور اس منصب اور ڈیوٹی کو اتنا بلند سمجھیں اور اس کے لیے اپنے کو وقف کردیں اور اللہ سے دعا کرتے رہیں کہ وہ آپ کو قبول فرمالے اور اس طبقہ میں شامل فرمالے، اسی کے ساتھ اپنی ذات کو قصور وار سمجھ کر ہمیشہ اللہ سے معافی مانگتے رہیں اور اس کے سامنے روتے رہیں اور اس کے فضل و کرم سے امید بھی رکھیں ۔۔۔ تو اپنے

بھائیوں سے میری سب سے پہلی گزارش یا نصیحت یہی ہے کہ اگر آپ نے اب تک اپنے اس مقام ومنصب کو نہیں سمجھا تھا اور اس طرح کا کوئی فیصلہ اپنے بارے میں نہیں کیا تھا تو خدا کے لیے اب کرلیں اور اس وقت اسی مسجد میں بیٹھے بیٹھے کرلیں۔ جس طرح ایک سکنڈ میں ایجاب و قبول کے بعد دو اجنبیوں میں بیوی اور شوہر کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے اسی طرح آپ ایک سکنڈ میں اپنے دل سے یہ فیصلہ کرکے اللہ کے ہوجاتے ہیں اور اللہ آپ کا ہوجاتا ہے۔ پھر آپ دیکھیں کہ اس کے بعد آپ کے نظر و فکر میں کیسی تبدیلی اور حوصلوں میں کیسی بلندی آتی ہے اور آپ کہاں سے کہاں پہونچ جاتے ہیں ـــــ آج آپ اپنے کو نہ پہچاننے کی وجہ سے اور اپنے مقام و منصب کو نہ جاننے کی وجہ سے اپنے کو بلکہ اپنے پورے طبقہ کو بالکل بے قیمت اور اس دنیا کے بازار میں نہ چلنے والا سکہ سمجھ کر افسردہ اور غمزدہ ہیں۔ لیکن اگر آپ اپنے مقام و منصب کو سمجھ کر اپنے بارے میں وہ فیصلہ کرلیں جو میں آپ سے کہہ رہا ہوں اور اپنے کو اللہ کی نذر اور اس کے لیے وقف کردیں جس طرح حضرت مریم صدیقہ کی والدہ نے کیا تھا تو پھر ان شاء اللہ آپ کا احساس یہ ہوگا کہ ہماری قیمت خدا کے سوا کوئی ادا ہی نہیں کرسکتا۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اسی کے ساتھ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں، ایسا یقین جس کی بنا پر مجھے قسم کھانا جائز ہے کہ آپ میں سے جو عزیز بھائی سچے دل سے یہ فیصلہ کرلیں گے اور استقامت کے ساتھ اس کی شرطیں پوری کریں گے وہ دیکھیں گے کہ ان پر ان شاء اللہ اسی دنیا میں بھی اللہ کا فضل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انھیں ان راستوں سے عطا فرمائیں گے جن کا انھیں وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ جو اللہ کا ہوجاتا ہے تو اللہ بھی اس کا ہوجاتا ہے، مَن کانَ لِلّٰہِ کانَ اللّٰہُ لَہٗ۔

میں اس موقع پر خود اپنی مثال آپ کے سامنے رکھنے میں مضائقہ اور حرج نہیں سمجھتا۔ میرا اصل وطن یوپی میں سنبھل (ضلع مرادآباد) ہے۔ یہ سنبھل اصطلاحی اور قانونی حیثیت سے تو قصبہ اور سب ڈویژن ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے بڑا شہر ہے ایک لاکھ سے اوپر آبادی ہے۔ اب سے ۶۰-۷۰ سال پہلے میرے والد ماجد اس قصبہ کے رئیسوں اور دولتمندوں میں شمار ہوتے تھے ان کے لیے اس کی پوری گنجائش تھی کہ اپنی اولاد کو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دلاتے، لیکن انھوں نے نیت کرلی تھی کہ [illegible] بچوں کو دینی تعلیم دلائیں گے تاکہ آخرت میں ان کے

کام آئے ۔۔۔ اتفاق کی بات ہے میری عمر جب ۱۲-۱۳ سال کی ہوگی تو ہمارے ضلع میں ایک انگریز کلکٹر آگیا، معلوم نہیں کیوں والد صاحب سے وہ بہت تعلق رکھتا تھا، اسے جب معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے کسی بچہ کو انگریزی تعلیم نہیں دلائی تو اس نے والد صاحب کو خود ترغیب دی اور میری عمر وغیرہ معلوم کرکے خاص طور سے میرے بارے میں کہا کہ اس کو کل ہائی اسکول بھیجو دو، یہ پانچ سال میں انٹرنس کرلے گا اور میں اس کو نائب تحصیلداری دیدوں گا ۔۔۔ اس زمانہ میں نائب تحصیلداری بہت بڑی چیز تھی، اس سے ترقی کرکے آدمی تحصیلدار ہوجاتا تھا اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہوجاتا تھا اور یہی ہندوستانیوں کی معراج تھی کلکٹر تو عام طور سے اس دور میں انگریز ہی ہوتے تھے ۔۔۔ لیکن والد صاحب کی روح پر خدا کی بے شمار رحمتیں ہوں، وہ کلکٹر کے اس کہنے کے بعد بھی مجھے انگریزی پڑھانے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے جب ان کے بعض مخلص احباب کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے بہت اصرار سے ان سے کہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور اس کو ضرور اسکول میں داخل کردینا چاہیے! ۔۔۔ والد صاحب نے آخر میں ان سے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ مجھے اطمینان اور یقین ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں، مجھے اپنی اولاد کی کمائی کی کوئی ضرورت نہ ہوگی ۔ انشاءاللہ میں خود ان کو کھلاتا رہوں گا۔ ہاں مرنے کے بعد قبر میں مجھے ضرورت ہوگی کہ ان کی کمائی مجھے ملے اس لیے میں تو ان کو دین پڑھاؤں گا، جو قبر میں میرے کام آئے ۔۔۔ تو انھوں نے مجھے اس نیت سے علم دین کی تعلیم دلائی تھی کہ میں بس دین کی خدمت کروں اور وہ آخرت میں ان کے کام آئے۔ وہ میری طالب علمی کے زمانہ کے بعد بھی مدت تک میری ضروریات کے لیے باقاعدہ تنخواہ دیتے رہے، بلکہ زندگی بھر مجھ پر خرچ کرتے رہے ۔۔۔ میرے نزدیک ان کی نیت اور ان کے اخلاص ہی کا یہ صدقہ ہے کہ اس دنیا میں بھی مجھ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔ حالانکہ خود دولتمند نہیں ہوں، زکوٰۃ بھی کبھی واجب ہوتی ہے اور کبھی نہیں لیکن بہت سے دولتمندوں کو بھی وہ راحتیں اور نعمتیں نصیب نہ ہونگی جو میرے مالک نے مجھے نصیب فرمائی ہیں، ہوائی جہازوں میں اڑتا ہوں کاروں میں سفر کرتا ہوں حالانکہ خود میرے پاس تو سائیکل بھی نہیں ہے۔ الحمدللہ زندگی کی سب ضرورتیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے پوری ہوتی ہیں اور بہت اچھے طریقے سے پوری ہوتی ہیں، اگر میں ڈپٹی کلکٹر بلکہ کلکٹر بھی ہوجاتا تو ایسی زندگی مجھے نصیب نہ ہوتی یہ سب میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نیت اور

اخلاص کا صدقہ ہے۔ اور یہ دولتمند نہ ہونا بھی اُن ہی کی دعا کا صدقہ ہے۔ وہ حج کو تشریف لے گئے، واپسی پر مجھ سے تنہائی میں فرمایا کہ میں تیرے لیے کچھ نہیں لایا ہوں، ہاں ایک دعا میں نے تیرے لیے کی ہے اور انشاء اللہ وہ قبول ہوگی اور وہ یہ کہ تیرے پاس کبھی دولت نہ ہو اور تجھے کبھی تکلیف نہ ہو۔ یہ بات اب سے قریباً چالیس سال پہلے کی ہے، اب تک اللہ تعالیٰ کا معاملہ میرے ساتھ بالکل یہی ہے کہ دولت میرے پاس کبھی نہیں ہوئی اور الحمدللہ ہمیشہ راحت نصیب رہی، کبھی وہ تکلیف نہیں ہوئی جو غربت و افلاس کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور میں اس پر دل سے راضی ہوں۔

تو میرے عزیز ہو! یہ واقعہ میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اب تک آپ نے اپنے کو اللہ کی نذر کر دینے اور دین کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کی نیت نہیں کی ہے تو اب اللہ سے یہ معاملہ کر لیجئے اور پھر اپنے آپ کو اس کے مطابق بنا لیجئے۔ میں قسم کھا کے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پھر اللہ تعالیٰ کا بھی آپ کے ساتھ خاص معاملہ ہوگا جس کا اصل ظہور تو آخرت میں ہوگا جو دارالجزا ہے لیکن اس دنیا میں بھی آپ پر کھلا فضل ہوگا۔ خاص کر ہمارے ضعف اور ہماری بے بسی و بے کسی اور ہمارے ماحول کی ناموافقت اور خرابی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا یہ خاص معاملہ ہم اس دور میں تجربہ اور مشاہدہ میں آ رہا ہے کہ جو اپنے کو اس کا بنا دے، اللہ تعالیٰ اس کی کفالت فرماتا ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کو بھی اس کی طرف متوجہ فرما دیتا ہے کوئی اس کا بن کے تو دیکھے! — تو میری پہلی گزارش اور پہلی نصیحت ان دینی مدرسوں میں پڑھنے والے اپنے بھائیوں کو یہی ہے کہ آپ اپنے مقام و منصب اور علم دین کے مقصد اور اس کی قدر و قیمت کو سمجھیں، اور اگر اس راستہ پر چلنا چاہتے ہیں تو ذہنوں کی پوری صفائی کے ساتھ سوچ سمجھ کر اور نیت کر کے اس راستہ کو اپنائیں اور اپنے آپ کو خدا کی نذر کر دیں اور طے کر لیں کہ آپ کو اپنی پوری زندگی اور پوری صلاحیتیں اور توانائیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم والا علم حاصل کرنے پر اور اس کے ذریعہ دین کی خدمت پر لگا دینی ہیں اسی کے لیے آپ کا جینا اور مرنا ہے — پھر آپ اس نیت اور اس فیصلہ کی تجدید بھی کرتے رہیں، میں تو عرض کروں گا کہ روزانہ ایک وظیفہ کے طور پر اس کا مراقبہ کیا کریں کہ میں نے اپنے کو اللہ کی نذر کر دیا ہے، اور علم دین اور خدمت دین کے لیے وقف کر دیا ہے اور دعا کیا کریں کہ اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے اور ہمیں قبول فرمائے۔

اس کے بعد میری دوسری نصیحت یا دوسرا مشورہ آپ بھائیوں کو یہ ہے کہ یہ علم اور خدمت دین کی توفیق اسی کو حاصل ہوتی ہے جو قدر کے ساتھ اس کے لیے وہ محنت کرے جو اس کا حق ہے یہ مدرسوں کے قاعدوں ضابطوں کے مطابق بس اسباق پڑھ لینا اور امتحان دے کر سند حاصل کر لینا یہ کوئی چیز نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا علم اور آپ کے دین کے کام میں آپ کی نیابت تو وہ عظیم نعمت ہے اور آپ کی وہ بیش بہا میراث ہے جس کے لیے سچے عاشقوں کی سی لگن اور محنت اور قربانی ہونی چاہیے۔ آپ کے اندر یہ عاشقانہ کیفیت اور لگن جب ہی پیدا ہوگی اور آپ عاشقوں والی محنت اور قربانی جب ہی کر سکیں گے جب آپ کو اس کا پورا شعور ہوگا کہ آپ کتنی بڑی دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس شعور کے بعد اور اس عاشقانہ کیفیت کے کے بعد آپ کی حالت کچھ اور ہوگی ـــــ آج ان مدرسوں کی وجہ سے علم حاصل کرنا بہت آسان ہوگیا ہے، ایک زمانہ وہ تھا کہ اللہ کے بندے اس علم کی طلب میں ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے تھے، ریل گاڑی نہیں تھی، موٹر نہیں تھے، ہوائی جہاز نہیں تھے، پیدل یا اونٹ پر سیکڑوں میل کا سفر کرتے تھے، علم دین کے عشق نے اللہ کے بندوں کے لیے یہ سب آسان کر دیا تھا۔ اور خود ہمارے قریبی بزرگوں میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس علم کو کیسی عاشقانہ کیفیت کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ میں نے اپنے بعض بزرگوں کے متعلق سنا ہے کہ وہ دہلی میں حدیث پڑھتے تھے۔ دہلی علم حدیث کا مرکز تھا۔ اس زمانہ میں وہاں ایسے مدرسے نہیں تھے جیسے آج ہیں جن میں ہماری تمام ضرورتوں کا انتظام ہے، اس زمانہ میں طالب علموں کو کڑوے تیل سے جلنے والا چراغ بھی نصیب نہیں ہوتا تھا تو ہمارے بعض بزرگ جو دہلی میں پڑھتے تھے، چاندنی راتوں میں تو چاند کی روشنی میں مطالعہ کرتے تھے اور جن راتوں میں چاندنی نہ ہوتی تو سڑکوں پر روشنی کے لیے جو سرکاری لالٹینیں ہوتی تھیں، ان کے پاس کھڑے ہو کر ان کی روشنی میں کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے ـــــ ایسی تکلیفیں اور مشقتیں عشق کے بغیر نہیں اٹھائی جا سکتیں۔ اسی عاشقانہ محنت سے حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی اور حضرت تھانوی جیسے علما بنے تھے۔ مشہور مقولہ ہے آپ نے بھی سنا ہوگا اور بالکل صحیح ہے کہ "جب تم اپنے کو بالکلیہ اور سو فیصدی علم پر لگا دو گے تو علم کا کچھ حصہ حاصل کر سکو گے۔"

دوسرے بھائیو! میری دوسری نصیحت اور دوسرا مشورہ آپ حضرات کو یہ ہے کہ جو علم حاصل کیا جا رہا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیش بہا ورثہ اور ترکہ ہے، اس کے شایان شان محنت کرو ... یہ ضابطہ کی جو سند فراغ آپ کو ملتی ہے آپ خود بھی جانتے ہیں کہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، وہ علم حاصل کیجئے جس کے بعد آپ خود سند بن جائیں اور اس کا راستہ یہی ہے کہ اپنے کو عاشقوں کی طرح علم کی تحصیل میں جھونک دو!

اس کے بعد میری تیسری نصیحت یا تیسرا مشورہ آپ بھائیوں کو یہ ہے کہ یہ علم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص ورثہ اور ترکہ ہے اور پھر کار نبوت میں آپ کی نیابت یہ اللہ تعالےٰ کی خاص الخاص نعمت ہے۔ یہ صرف محنت سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ دنیا کے دوسرے علوم و فنون ڈاکٹری، ریاضی، سائنس، فلسفہ وغیرہ اور ان میں مہارت و حذاقت سب محنت اور ذہانت سے حاصل ہو سکتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا علم جو ایک نور ہے، اور پھر حضور کی نیابت جو عظیم ترین منصب ہے اس کے لیے محنت و ریاضت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح تعلق اور تقویٰ بھی شرط ہے اس لیے میں پورے خلوص اور پیار سے آپ عزیزوں سے کہتا ہوں کہ اپنی زندگی کو اللہ سے تعلق والی، اور تقویٰ والی زندگی بنائیے ___ اللہ سے تعلق کا خاص ذریعہ عبادات مثلاً نماز، اور تلاوتِ قرآن اور ذکر اللہ وغیرہ ہیں لیکن یہ شرط ہے کہ نماز اور تلاوت اور ذکر کی صرف صورت نہ ہو بلکہ حقیقت ہو اور اس میں روح ہو ___ مجھے یقین کرنا چاہیے کہ آپ سب حضرات نماز پڑھنے والے ہیں۔ میں کئی دن سے گجرات ہی کے مدرسوں کا دورہ کر رہا ہوں جہاں بھی میں نے رات گزاری قریباً ہر جگہ اور ہر مدرسہ میں دیکھا کہ ہمارے طلبا فجر کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، لیکن یہ بات خود آپ کے سوچنے کی ہے کہ کیا آپ کی نماز اور آپ کی تلاوت ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ حدیث اور تفسیر پڑھنے والے طلبا کی ہونی چاہیے؟ ___ اگر ایسا ہی ہے تو بہت ہی مبارک ہے، لیکن میرا خیال ہے اور تجربہ یہ ہے کہ عام طور سے ہمارے طلبا کی نماز اور تلاوت ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ ہمارے عام مسلمانوں کی ہوتی ہے جو ثنا (سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ) اور الحمد شریف اور قل ہو اللہ شریف اور "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ" اور "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى"

کسی چیز کے بھی معنی نہیں جانتے — میرے بھائیو! آپ نے مشکوٰۃ شریف میں حدیث پڑھی ہوگی "انہ اذا قام احدکم یصلی فانہ یناجی ربہ، یعنی جب اللہ کا کوئی بندہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اور اُس سے ہمکلام ہوتا ہے اور اُس سے اپنے دل کی باتیں کرتا ہے — اسی طرح آپ نے وہ حدیث بھی پڑھی ہوگی جس میں فرمایا گیا ہے کہ جب بندہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے تو ہر آیت پر اللہ تعالیٰ اس کو جواب دیتا ہے جب وہ کہتا ہے "الحمد للہ رب العٰلمین" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "حمدنی عبدی" اور جب بندہ کہتا ہے "الرحمٰن الرحیم" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اثنیٰ علیّ عبدی" اور جب کہتا ہے "مالک یوم الدین" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مجّدنی عبدی" آگے پوری حدیث آپکو یاد ہوگی — تو خدا کے لیے سوچیے کہ جن بھائیوں نے یہ حدیثیں پڑھی ہیں اور وہ اس درجہ کو پہنچ گئے ہیں اور انکی تعلیم اتنی ہوگئی ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ اسکا مطلب جانتے اور سمجھتے ہیں اور اسکے باوجود اُن بیچارے عام مسلمانوں کی طرح جو ایک آیت کا بھی مطلب نہیں سمجھتے توجہ الی اللہ سے اور معنی مطلب سے غافل ہوکر نماز پڑھتے ہیں تو سوچیے کہ یہ اُن کے لیے کتنے بڑے خسارے کی بات ہے اور وہ اپنے ساتھ کیا ظلم کرتے ہیں — اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص کی جیب میں ہزاروں لاکھوں کے نوٹ بھرے ہیں اور وہ انھیں ردی کاغذ سمجھ کر اُن سے کام نہیں لیتا — — میرے عزیز بھائیو! اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ علم نصیب فرمایا ہے کہ جس وقت آپ نماز کے لیے اللہ کی حضور میں کھڑے ہوں تو "انہ یناجی ربہ" کی کیفیت کے ساتھ نماز پڑھیں، اور جب زبان سے عرض کریں "الحمد للہ رب العالمین" تو آپ کا دل اللہ کی طرف سے "حمدنی عبدی" کی آواز سنے اسی طرح "الرحمٰن الرحیم" اور "مالک یوم الدین" کہیں تو آپ کا دل "اثنیٰ علیّ عبدی" اور "مجّدنی عبدی" کی آواز سنے اور "ایاک نعبد وایاک نستعین" کہیں تو "ھذا بینی وبین عبدی ولعبدی ما سأل" کی بشارت سنے — اسی طرح جب تلاوت کریں تو آپ کا یہ دھیان ہو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور میری تلاوت سن رہا ہے اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ اللہ کیا ارشاد فرما رہا ہے پھر جب وہ آیتیں آئیں جن میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کا یا جنت کا ذکر ہو تو اللہ سے اس کے لیے دعا کریں اور جہاں اللہ تعالیٰ کے قہر و جلال کا اور دوزخ کا ذکر آئے تو وہاں اللہ تعالیٰ

... نماز ... پڑھو جو کہ حضورؐ کا طریقہ تھا۔

میرے بھائی! اگر آپ صرف اتنا ہی کرلیں کہ نماز اس طرح پڑھیں جس طرح آپ کو پڑھنی چاہئے اور روزہ اس طرح رکھیں جس طرح رکھنی چاہیے تو اللہ تعالیٰ کا تعلق حاصل ہونے کے لیے ان شاء اللہ اتنا ہی کافی ہے اور اگر اس کے ساتھ تھوڑے سے ذکر و تسبیح کی بھی عادت ہو جائے تو پھر تو ان شاء اللہ نور علیٰ نور ہے ــــ خدا کے لیے اس راستہ پہ چل کر دیکھو پھر دیکھو خدا کی طرف سے کیا انعام ہوتا ہے؟ میرے بھائی یہ ولایت کا راستہ ہے اور دوسروں کی بہ نسبت آپ کے لیے بہت آسان ہے۔

شاید آپ نے اپنے حضرات اساتذہ اور بزرگوں سے سنا ہو کہ ہمارے اکابر حضرت گنگوہی وغیرہ طالب علموں کو بیعت نہیں کرتے تھے جب تک وہ فارغ نہ ہو جائیں۔ ان کو سلوک کے ذکر شغل میں مشغول ہونے سے منع کرتے تھے۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے خود اپنا واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے طالبعلمی کے زمانہ میں حضرت گنگوہی قدس سرہ سے بیعت کی درخواست کی تو حضرت نے قبول نہیں فرمایا بلکہ ارشاد فرمایا کہ شیطانی وسوسہ ہے یعنی وہ علم نبوی کے شغف و انہماک سے ہٹا کر دوسری طرف لگا دینا چاہتا ہے تاکہ علم ناقص رہ جائے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس زمانے میں خاص کر ہمارے علمی حلقہ میں اس بیعت کا رواج نہیں تھا جو ہمارے زمانے میں چل پڑا ہے کہ بزرگوں سے بس بیعت ہو جاتے ہیں کرنا کرانا کچھ نہیں ہوتا بلکہ جو بیعت ہوتا تھا وہ سلوک کے مشاغل شروع کر دیتا تھا تو اگر حضرت تھانویؒ جیسے حضرات طالبعلمی کے زمانہ میں بیعت ہوتے تو سلوک کے اذکار و اشغال کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا اور پھر ذکر کے آثار و انوار اور واردات اور کیفیات کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ علم کی طرف توجہ کم ہو جاتی، جب آدمی ذکر کی راہ پر چل پڑتا ہے تو اس کے لیے اس سے زیادہ لذیذ اور مرغوب کوئی چیز نہیں ہوتی تو پھر وہ اسی کا ہو جاتا ہے پھر وہ ہدایہ، اور توضیح تلویح اور بیضاوی اور امور عامہ اور خیالی جیسی مشکل اور خشک کتابوں میں مغز زنی نہیں کر سکتا، اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے ــــ تو اگر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ طالبعلمی کے زمانہ میں بیعت ہو کر سلوک کے ذکر شغل میں لگ جاتے تو بس ایک بزرگ .... ہو کے رہ جاتے۔ علم کا وہ مقام ہرگز حاصل نہ ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا، وہ حکیم الامت

مجدد الملۃ نہ ہوتے اور وہ سیکڑوں اصلاحی تصانیف امت کو نہ ملتیں جو ان شاء اللہ صدیوں تک امت کی رہنمائی کرتی رہیں گی ـــــ تو میرے بھائیو! ہمارے اکابر حضرت گنگوہیؒ وغیرہ طالبعلموں کو اس لیے بیعت نہیں فرماتے تھے کہ ذکر شغل میں لگ کر وہ علم سے نہ رہ جائیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ طالب علموں کو تعلق باللہ کی اور تقوے اور اصلاح کی ضرورت نہیں ـــ اُس زمانہ میں مدرسوں کی یہ بہتات اور بھرمار نہیں تھی۔ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کا بھی ابتدائی دور تھا اور ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اسوقت کا حال یہ تھا کہ دارالعلوم کا دربان بھی صاحب نسبت ہوتا تھا۔ وہاں کی پوری فضا تعلق باللہ اور تقوے کی فضا تھی اور طالب علمی کے زمانہ میں جس درجہ کا تعلق باللہ اور جس درجہ کا تقویٰ اور جس درجہ کی اصلاح ضروری ہے وہ مدرسوں میں رہ کر آپ سے نصیب ہو جاتا تھا۔

میرے ایک استاد تھے حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ وہ میرے اساتذہ میں اس لحاظ سے میرے سب سے بڑے محسن ہیں کہ زیادہ تر درسی کتابیں میں نے انھیں سے پڑھیں اور وہ میرے تعلیمی سرپرست بھی تھے میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے انھیں کے سپرد کر دیا تھا۔ میں نے ۸ سال اُن سے پڑھا اور اُن کے ساتھ اس طرح رہا جس طرح ان ہی کے گھر میں رہتا تھا۔ انھوں نے صرف آخر کے دو سال دارالعلوم دیوبند میں پڑھا تھا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مفتی کفایت اللہؒ کے ہم سبقوں میں تھے۔ حالانکہ انھوں نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی زمانہ پایا لیکن مجھے معلوم نہیں کیوں انھوں نے سلوک اور ذکر شغل کی طرف بالکل توجہ نہیں کی اس لیے کسی بزرگ سے بیعت بھی نہیں کی لیکن دارالعلوم میں [illegible] شیخ الہند وغیرہ اساتذہ کی صحبت و محبت کی برکت سے وہ تقویٰ نصیب تھا کہ [illegible] سب کچھ ہے ـــــ لیکن اب ہمارے مدرسوں کی فضا وہ نہیں رہی کہ تقوے اور اصلاح کے لیے اور تعلق باللہ کے لیے مدرسہ میں رہنا اور پڑھنا کافی ہو۔ آج مدرسوں کی جو فضا ہے وہ [illegible] آپ کے سب کے سامنے ہے۔ اس لیے خود حضرت گنگوہیؒ کے خلفا اور ان کے خلفاء کے خلفا نے اپنا رویہ بدل دیا اور طالب علموں کو بھی بیعت فرمانے لگے۔ اس لیے میں آپ کو خلوص سے اور اصرار سے مشورہ دیتا ہوں کہ ابھی طالب علمی کے زمانہ میں کم از کم نماز روزہ تلاوت اور تقوے سے ذکر کا خاص اہتمام کیجئے۔ اگر آپ اس معاملہ میں غفلت کریں گے تو اگرچہ آپ پڑھیں گے

بخاری اور مسلم اور جلالین اور بیضاوی لیکن شیطان آپ کو اپنا بنائے گا ــــ میرے بھائیو! ایک بات پتہ کی کہتا ہوں یہ جو ہماری طالب علموں یا علماء کی جو برادری ہے اس کے لیے دو ہی راستے ہیں یا ہم اللہ والے ہوں گے اور یا خدانخواستہ پھر شیطان کے ہوں گے۔ ہمارے لیے بیچ کا راستہ نہیں ہے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ ابھی سے اللہ سے تعلق پیدا کرو اور تقویٰ اختیار کرو۔ــــ یعنی جن باتوں کو اللہ نے گندہ اور گناہ قرار دیا ہے، اُن سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرو، اللہ کا تعلق اور اللہ کی رضا نصیب ہونے کی یہ خاص شرط ہے ــــ اللہ تعالیٰ نے بڑا غیور ہے، اگر کوئی شخص گندگیوں اور گناہوں اور اُن باتوں سے بچنے کی فکر نہیں کرتا جو خدا کو ناراض کرنے والی ہیں تو وہ اپنے لیے خدا کی رحمت اور مقبولیت کے دروازے بند کر لیتا ہے ــــ میرے بھائیو! آپ کا منصب نبوت کی وراثت اور نیابت کا منصب ہے۔ آپ کو اس کے لیے اپنے کو تیار کرنا ہے اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کو گندہ اور حرام قرار دیا، جہاں تک ہو سکے اپنی زندگی کو اُن سے پاک رکھا جائے (لا یمسہ الا المطہرون)

یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ایک توبندہ کا یہ حال ہے کہ وہ سچے دل سے ارادہ اور عزم کر لیتا ہے کہ گناہ سے بچے گا لیکن نفس کے فریب اور شیطان کے بہکانے سے وہ کبھی اُس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر جب اللہ کی توفیق سے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو اللہ کے سامنے روتا ہے، توبہ کرتا ہے اور معافی مانگتا ہے، تو یہ تو ان شاء اللہ بالکل مضر نہیں ہے، بلکہ زندگی میں بار بار ہو جب بھی مضر نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ توبہ اور استغفار سچے دل سے ہو، اللہ تعالیٰ دلوں کا حال جانتا ہے (قرآن مجید میں ایسے ہی بندوں کے بارہ میں فرمایا گیا ہے "والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسہم ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبہم ومن یغفر الذنوب الا اللہ ولم یصروا علی ما فعلوا وھم یعلمون[1]" آگے ایسے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور جنت کی بشارت سنائی گئی ہے)

---

[1] آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان بندوں کا حال یہ ہے کہ جب اُن سے کوئی گندہ معصیت سرزد ہو جاتی ہے یا کوئی مجرمانہ گناہ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کر کے رنجیدہ اور پشیمان ہوتے ہیں اور اللہ سے گناہوں کی معافی اور بخشش کی درخواست کرتے ہیں اور گناہوں کا بخشنے والا بس اللہ ہی ہے) اور جو گناہ اُن سے ہو گیا اُس پر وہ اصرار نہیں کرتے (یعنی آئندہ اس سے بچنے کا عزم [illegible] ایسے بندوں کے لیے بھی اللہ کی طرف سے مغفرت اور جنت کا وعدہ ہے۔ (آل عمران ع ۱۴)

بلکہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ بعض بندے وہ ہوتے ہیں جن کی اسی راستہ سے ترقی ہوتی ہے کہ اُن سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے پھر اُس کے رنج و غم سے اُن کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ اللہ کے حضور میں خوب روتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں، اس سے اُن کے درجات میں وہ ترقی ہو جاتی ہے جو عبادتوں سے نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بندہ کا یہ حال کہ وہ گناہوں سے بچنے کا ارادہ اور عزم کرے لیکن نفس کے فریب یا شیطان کے بہکانے سے یا کسی وقتی خراب جذبہ سے اُس سے گناہ ہو جائے اور پھر اُسے رنج و غم ہو اور وہ سچے دل سے توبہ اور استغفار کرلے، یہ حالت مضر نہیں ہے بلکہ مقام ولایت کے منافی بھی نہیں ہے، معصوم تو صرف انبیاء علیہم السلام اور اللہ کے فرشتے ہیں۔ ہاں یہ چیز اللہ تعالےٰ کو ناراض کرنے والی اور اس کی رحمت اور مقبولیت سے محروم کر دینے والی ہے کہ بے فکری اور بے باکی سے گناہ ہوں اور معصیتیں عادت بن جائیں۔

میرے عزیز بھائیو! خدا کے لیے اپنے کو پہچانو! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت میں داخل ہو چکے ہو، آپ کے لشکر کے سپاہی ہو، حضور کی نیابت و وراثت کی ذمہ داری سنبھالنے کی تیاری کر رہے ہو، ایسی صورت میں اگر تم بھی دنیا کے عام آوارہ لوگوں کی طرح گناہوں اور فضولیات سے دلچسپی رکھو، تم بھی سینما دیکھو اور بدنظری کے ساتھ سڑکوں پر آوارہ گردی کرو تو معاف کرنا تمہاری مثال اُس شہزادہ کی ہے جو کسی سڑی ہوئی بھنگن یا چماری سے لگا ؤ رکھے ۔۔۔ اگر اللہ تعالےٰ حقیقت دیکھنے والی نگاہ عطا فرمائے تو اس زندگی کے ساتھ قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنا بالکل ایسا ہے جیسا کہ قرآن شریف یا بخاری شریف کو ناپاک غلاف میں رکھنا ۔۔۔ میں پھر کہتا ہوں اپنے کو پہچانو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی نسبت کو صحیح کرو!

بہت سے عزیز بھائی اس طرح سوچتے ہیں یا شیطان اُن کے دل میں ڈالتا ہے کہ ابھی عمر ہی کیا ہے، یہی تو ہمارے کھیلنے کودنے کے اور دنیا کے مزے چکھنے کے دن ہیں، ابھی تو طالب علمی ہے، آگے چل کر ہم بھی اپنے بزرگوں والی زندگی اختیار کر لیں گے ۔۔۔ آپ خود ہی سوچیں کہ یہ آپ کا اپنے پر کتنا بڑا ظلم ہے ۔۔۔ میرے عزیزو! مثال اچھی نہیں ہے لیکن بات بالکل سچی ہے کہ بڑھاپے میں تو سنا ہے رنڈیاں بھی توبہ کر کے تسبیح ہاتھ میں لے لیتی ہیں آپ نے وہ حدیث پڑھی یا سنی

ہو گی جس میں حضور نے فرمایا ہے کہ سات اللہ کے بندے وہ ہیں جو قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا وہ اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوں گے' ان میں ایک ہے "شَابٌ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللهِ" (یعنی وہ نوجوان جو اللہ کی عبادت اور فرمانبرداری میں بڑھا اور پروان چڑھا۔ یعنی جس نے شروع ہی سے عبادت اور تقوے والی زندگی اختیار کر لی) تو اگر اب تک آپ نے خیال نہیں کیا تھا تو اب حضور کی یہ حدیث سن کر اپنے کو ایسا بنانے کا فیصلہ کر لیجئے اور عرش الٰہی کے سایہ کا استحقاق بھی حاصل کر لیجئے!۔ یہ وہ نعمت ہے جس کو آپ ہی اس وقت کے فیصلہ سے حاصل کر سکتے ہیں' میں اگر چاہوں تو حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ میری عمر تو اب ستر کے قریب پہنچ چکی ہے' اللہ تعالیٰ آپ عزیزوں کو توفیق دے کہ اس نوجوانی میں فیصلہ کر کے ان خوش نصیبوں کی صف میں آجائیں جو قیامت کے سخت ترین دن میں عرش الٰہی کے سایہ میں ہوں گے۔

اس کے بعد بس ایک آخری بات آپ بھائیوں سے اور عرض کرنا ہے ــــ خدا توفیق دے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب و وارث بننا ہے اور آپ کے والے کام کی ذمہ داری سنبھالنا ہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو حضور سے خاص نسبت اور مناسبت حاصل ہو اور آپ کے خصوصی اور امتیازی اوصاف میں آپ کا حصہ ہو۔ میں نے اس پر بہت غور کیا ہے کہ حضور کی ذات پاک میں کس وصف کا غلبہ ہے؟ یوں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سارے ہی کمالات عطا فرمائے۔ " آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" لیکن آپ کی زندگی اور آپ کے احوال میں غور کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ آپ کے اوصاف میں سب سے زیادہ غالب وصف دعا اور اللہ سے مانگنا ہے۔ دنیا میں کسی نے اللہ سے اتنا نہیں مانگا جتنا آپ نے مانگا اور ایسے سوز و گداز سے اور لاچاری و محتاجی کے ایسے شدید احساس اور الحاح کے ساتھ کسی نے نہیں مانگا جیسا آپ نے اللہ سے مانگا۔ حدیث کی کتابوں میں حضور کی جو سیکڑوں دعائیں مروی ہیں آپ ان کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر دعا میں نیاز مندی اور عبدیت کی روح بھری ہوئی ہے۔ یہ دعائیں آپ کا خاص الخاص ورثہ ہیں۔

تو میرا آخری مشورہ یا آخری نصیحت آپ بھائیوں کو یہ ہے کہ اِن دعاؤں سے خاص مناسبت پیدا کیجئے! ــــ یہ بھی یاد رکھیے کہ دعا کی حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے لیے دعا کرنا ہو دل میں اُس چیز کی طلب اور حاجتمندی کا احساس ہو جس طرح پیاسے کو پانی کی طلب ہوتی ہے اور اللہ کے کرم پر اعتماد کر کے اس یقین کے ساتھ مانگے کہ وہ چیز بس اُس کے خزانے میں اور اس کی قدرت میں ہے اور وہ اپنے کرم سے مجھ محتاج اور بھکاری کو عطا فرمائے گا۔

دعا اگر دل سے نہ ہو، بس زبان بول رہی ہو اور ہاتھ اٹھے ہوئے ہوں تو وہ دعا نہیں ہے، دعا صرف وہی ہے جو دل سے ہو۔ دعا دراصل دل کا عمل ہے زبان سے تو اس کا بس ظہور ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ہاتھوں کا اٹھنا اور زبان سے دعا کے الفاظ کا نکلنا دعا کی صورت اور اس کی ظاہری شکل ہے۔ دعا کی حقیقت توجہ کے ساتھ دل کی طلب اور دل کا اللہ سے مانگنا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جب آدمی کو رنج و غم ہوتا ہے تو وہ روتا ہے، اُس کے منھ سے رونے کی آواز نکلتی ہے اور آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ لیکن یہ رونے کی آواز اور آنکھوں کے آنسو رنج و غم کی اصل حقیقت نہیں ہے بلکہ اس کی ظاہری شکل و صورت ہے، اصل رنج و غم وہ ہے جو دل میں ہوتا ہے اور آنکھوں سے اور منھ سے اس کا صرف ظہور ہوتا ہے۔ آج ہماری عام حالت یہ ہے کہ کم از کم ہر فرض نماز کے بعد ہم دعا کرتے ہیں اور بعض اوقات خوب دیر تک دعا کرتے ہیں لیکن یہ دعا صرف زبان کی اور ہاتھوں کی ہوتی ہے دل متوجہ نہیں ہوتا۔ بسا اوقات خود میرا یہی حال ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارا حال درست فرمائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دعا نہیں ہے، دعا کی صرف صورت ہے۔ ــــ آپ ابھی سے اس کی عادت ڈالیے کہ آپ کی دعا اصلی دعا ہو اور حقیقی دعا ہو دعا کی صرف شکل و صورت نہ ہو۔ خاص کر تنہائی میں دل کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی عادت ڈالیے، اُس سے ایمان کی حقیقت مانگیے، علم و معرفت مانگیے نماز کی حقیقت اور تقویٰ مانگیے، دین کی خدمت کی توفیق مانگیے، تنہائیوں میں رو رو کے اور گڑگڑا کے مانگیے پھر دیکھیے اللہ تعالیٰ کا کیسا فضل ہوتا ہے ــــ خاص کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ماثور دعاؤں سے مناسبت پیدا کیجئے، حدیث کی ہر کتاب میں کتاب الدعوات ہے جس میں مختلف موقعوں کی حضور کی سیکڑوں دعائیں جمع کر دی جاتی ہیں، یہ دعائیں حضور کا خاص الخاص ورثہ ہیں اور بڑا بیش بہا

خزانہ ہے اور اس کی کنجی ہمارے آپ کے ہی پاس ہے جو ان مدرسوں میں حدیث کی کتابیں پڑھتے ہیں، افسوس ہمیں اس خزانے کے جواہرات کی قدر نہیں، اگر کوئی ایسا آلہ یا میٹر ہوتا جس سے آخرت کے لحاظ سے چیزوں کی قدر و قیمت جانچی جا سکتی تو معلوم ہو سکتا کہ حضور کی چھوٹی چھوٹی دعائیں دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو توفیق دے کہ اس کی اس نعمت کی قدر جانیں اور اس کا شکر ادا کریں کہ اس نے اس عربی تعلیم اور ہمارے ان دینی مدرسوں کی برکت سے ہمارے لیے اس خزانے کا دروازہ کھول دیا ہے ـــــ ذرا حضور کی ان دعاؤں کے مضامین پر غور تو کیجئے!

حضور کی ایک مشہور مختصر دعا ہے:[1] "اللّٰھم اجعلنی اخشاك کانی اراك ابداً حتی القاك واسعدنی بتقواك ولا تشقنی بمعصیتك"۔

اسی طرح ایک دوسری دعا ہے:[2] "اللّٰھم افتح مسامع قلبی لذکرك وارزقنی طاعتك وطاعة رسولك وعملاً بکتابك"

ایک اور دعا ہے:[3] "اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ ایماناً دائماً واسألك قلباً خاشعاً واسألك یقیناً صادقاً واسألك دیناً قیماً واسألك العافیة من کل بلیة واسألك دوام العافیة واسألك الشکر علی العافیة واسألك الغنیٰ عن الناس ولا حول ولا قوة الا باللّٰہ"

ذرا ان دعاؤں کے مضامین پر غور تو کیجئے، ان میں کیا کیا مانگا گیا ہے اور ان میں کیا روح بھری ہوئی ہے؟ ـــــ اگر حدیثوں میں ان دعاؤں کو پڑھ کر ہم اپنی دعائیں نہ بنائیں تو ہماری بدقسمتی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

---

[1] اے اللہ مجھے ایسا کر دے کہ میں ہر وقت تجھ سے اس طرح ڈروں کہ گویا ہر دم تجھے دیکھ رہا ہوں اور مجھے تقوے کی صفت عطا فرما کے نیک نصیب بنا دے اور ایسا نہ ہو کہ تیری نافرمانی کر کے بدبخت ہو جاؤں۔ [2] اے اللہ اپنے ذکر اور اپنی یاد کے لیے میرے دل کے کان کھول دے اور اپنی اور اپنے رسول پاک کی فرمانبرداری کی اور اپنی مقدس کتاب پر عمل کرنے کی مجھے توفیق عطا فرما۔ [3] اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں ایسا ایمان جو ہمیشہ قائم رہے اور ایسا قلب جو تیرے حضور میں جھکا رہے اور تجھ سے سائل ہوں ایمان صادق کا اور دین مستقیم کا اور تجھ سے سوال کرتا ہوں عافیت کا اور دوام عافیت کا اور عافیت کی نعمت پر شکر ادا کرنے کا اور اس بات کا کہ بندوں کا محتاج نہ بنوں اور ہر چیز اور ہر نعمت کا حاصل ہونا اور ہر شر اور مصیبت سے بچنا تیرے ہی فیصلہ اور کرم پر منحصر ہے۔

تو میرے بھائیو! میری آخری نصیحت یا آخری مشورہ آپ عزیزوں کو یہ ہے کہ دعا اور اللہ سے مانگنا اور الحاح کے ساتھ مانگنا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص الخاص صفت ہے اُس کو اپنی عادت بناؤ۔ دل کی پوری توجہ کے ساتھ اور اللہ کے کرم پر بھروسہ کر کے اُس سے اپنی ہر طرح کی ضروریات مانگا کرو۔ دنیا کی ضرورتیں بھی مانگو، آخرت میں رحمت اور جنت بھی مانگو، ایمان اور تقویٰ اور ذکر و عبادت کی حقیقت بھی مانگو، علم نبوی کی دولت بھی مانگو، اللہ اور اُس کے رسول پاک کی محبت بھی مانگو، اللہ تعالیٰ سب کچھ عطا فرمانے والا ہے۔ اُس نے کسی بڑے سے بڑے کمال پر مہر نہیں لگائی ہے۔ اُس نے ہرگز ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے کہ جو اگلوں کو دیدیا گیا وہ بعد والوں کو نہیں دے گا۔ امام رازی اور امام غزالی ہمارے سر کے تاج ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ علم کا جو درجہ ان کو دیدیا گیا اب کسی کو نہیں دیا جائے گا، اسی طرح اگلے زمانوں کے تمام اولیاء کرام ہمارے اکابر ہیں ہم اُن کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہرگز ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ ولایت کا جو مقام اُن کو دیا گیا تھا اب کسی کو عطا نہیں ہوگا بلکہ جو بندہ کوئی کمال اور کوئی درجہ حاصل کرنے کی اخلاص کے ساتھ جدوجہد کرے اور اس کی شرائط پوری کرے اور اللہ سے مانگے جیسا مانگنے کا حق ہے تو اللہ تعالیٰ آج بھی عطا فرمائے گا۔

میرے عزیزو! تم سب کچھ بن سکتے ہو اور اللہ تعالیٰ سے وہ سب کچھ لے سکتے ہو جو اُس نے ہمارے اکابر اور اسلاف کو عطا فرمایا تھا مگر شرط یہی ہے کہ اُن کے طریقہ پر چلو، اپنے کو پہچانو، اپنے منصب، مقام اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو، اپنے اسلاف کی طرح طالب علم اور طالب دین اور طالب خدا بن جاؤ۔ اللہ و رسول کا علم حاصل کرنے کے لیے عشق والی محنت کرو، عبادت اور تقویٰ اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق پیدا کرو، اُسی سے اتباع سنت کا ذوق پیدا کرو۔ حضور کی خاص الخاص صفت دعا اور اللہ سے مانگنے کو اپناؤ اور ان ماثورہ دعاؤں سے مناسبت پیدا کرو اور اُن کو اپنی دعا بنالو، یہ دعائیں حضور کا چھوڑا ہوا بیش بہا خزانہ ہے، اس نعمت کی قدر کرو کہ اس خزانے کا دروازہ ہمارے لیے کھولا گیا ہے اور ہمیں اس تک پہنچا دیا گیا ہے۔

میرے عزیز بھائیو! اس وقت جو کچھ میں نے آپ سے کہا وہی اپنے نفس کو بھی میری نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی عمل کی توفیق دے۔ میں قیامت میں اس پر نہ پکڑا جاؤں کہ

تو دوسروں کو اچھی اچھی باتیں بتاتا تھا اور خود عمل نہیں کرتا تھا اور آپ اس پر نہ پکڑے جائیں کہ تم نے سب کچھ سنا اور عمل نہیں کیا۔ فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولٰئک الذین ھداھم اللہ واولٰئک ھم اولوا الالباب٥

(اس کے بعد دعا پر خطاب ختم ہوا)

شیخ الحدیث کی نہایت اہم تازہ تصنیف

"تبلیغی جماعت پر اعتراضات اور اُن کے مفصل جوابات"

تبلیغی جماعت اور اس کے طریق کار پر بہت سے لوگ نیک نیتی سے بھی اعتراضات کرتے ہیں، یہ اعتراضات عموماً ایسے لوگوں کی طرف سے ہوتے ہیں جو جماعت کے اصول اور طریق کار سے واقف نہیں ہیں۔ کچھ اعتراضات بعض تبلیغی کام کرنے والوں کی بے اصولیوں اور غلطیوں کی وجہ سے اور کچھ اعتراضات کرنے والوں کی کم علمی یا حسد وعناد کی وجہ سے بھی ہوتے ہیں ــــ ضرورت تھی کہ اصلاحی انداز میں ان سب اعتراضات کا جواب دیا جائے ــــ اللہ تعالیٰ نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کو جو تبلیغی جماعت کے سرپرست اور نگراں ہیں اس طرف متوجہ فرمایا، حضرت نے تقریباً سو ادو سو صفحے کی اس کتاب میں اس سلسلہ کے تمام اعتراضات کا بہت تفصیلی جواب دیا ہے ــــ امید ہے کہ یہ کتاب نیک نیتی سے اعتراض کرنے والوں کے لیے تسلی کا باعث اور تبلیغی کام کرنے والوں کو بھی غلط روی سے بچانے کا ذریعہ بنے گی۔ ــــ قیمت چار روپے

چند سبق آموز واقعات یہ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے ایک مسترشد اور مجاز صوفی محمد اقبال صاحب مقیم مدینہ طیبہ کا لکھا ہوا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں انھوں نے لوگوں کی سبق آموزی کے لیے حضرت شیخ کے چند سبق آموز واقعات قلمبند کیے ہیں قابل دید ہے قیمت ۵۰/-

اختلاف الائمہ اس رسالہ میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے بتلایا ہے کہ اُمت کے ائمہ اور مجتہدین میں اختلاف کیوں پیدا ہوا، اور یہ کہ یہ اختلاف اُمت کے حق میں سراسر رحمت ہے .. .. قیمت ــــ ۱/۵۰

صحبتے با اولیاء

حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے مجلسی ارشادات اور ملفوظات، زندگی کی اصلاح اور کیفیت احسانی پیدا کرنے کا پورا سامان

مرتبہ: مولانا تقی الدین ندوی مظاہری .. .. قیمت مجلد ــــ ۵/-

مسلمانوں کی پریشانیوں کا علاج حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کا یہ رسالہ اس سوال کا جواب ہے کہ مسلمان تباہ ہوتے جارہے ہیں۔ آخر ان کو کیا کرنا چاہیئے؟

ــــ بلاشبہ ایمانی نقطۂ نظر سے اس سوال کا جواب صرف وہی ہو جو اس رسالہ میں دیا گیا ہو۔ قیمت ۱/۲۵

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

جنوبی افریقہ

کچھ مشاہدات اور تأثرات

——— محمد منظور نعمانی

ناظرین کو الفرقان کے ذریعہ میرے سفرِ افریقہ کا کچھ حال معلوم ہو چکا ہے۔ اس سفر میں بہت سی ایسی چیزیں علم اور مشاہدہ میں آئیں جو الفرقان کے صفحات میں محفوظ کیے جانے کے لائق ہیں اور امید ہے کہ ناظرین کے لیے ان کا مطالعہ دلچسپی کے علاوہ معلومات میں اچھے خاصے اضافہ کا باعث ہوگا۔ اسی امید پر کچھ مشاہدات و تأثرات اور کچھ معلومات حوالۂ قلم کیے جا رہے ہیں۔

افریقہ ایک بہت ہی طویل و عریض برِاعظم ہے۔ گویا ایک مستقل دنیا ہے۔ اس میں بہت سے ملک اور بہت سی حکومتیں ہیں، ایک خاص قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مسلم حکومتوں کی سب سے زیادہ تعداد برِاعظم افریقہ ہی میں ہے ——— واقفین نے بتلایا کہ افریقہ کے مختلف ملکوں اور خطوں میں تقریباً دو سو زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں ۱۴۔ ۱۵ زبانیں تعلیمی، تصنیفی یا سرکاری زبانیں ہیں باقی صرف علاقائی بولیاں ہیں۔

افریقی ممالک میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ، خوشحال اور طاقتور ملک "جنوبی افریقہ" ہے اور مختلف حیثیتوں سے عجیب و غریب ملک ہے، لوگوں نے بتایا کہ اس کا رقبہ اتنا وسیع ہے جتنا پہلے مشرقی بنگال پاکستان کا تھا، اور آبادی صرف دو کروڑ کے قریب ہے، پھر زمین نہایت زرخیز ہے، پھل نہایت اعلیٰ قسم کے اور بڑی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے ملکوں کو بھی جاتے

ہیں، کاشت کی چیزوں میں سب سے زیادہ پیداوار گنے کی ہے، بعض کی سال میں دو فصلیں ہو جاتی ہیں، یعنی ۶ مہینے میں گنا بالکل تیار ہو کر مل میں چلا جاتا ہے۔ اس ملک میں اس کی پیداوار کسی وقت اور موسم کی بھی پابند نہیں ہے۔ اندرون ملک کے دورہ میں خود دیکھا کہ ایک جگہ کھیت میں گنا بویا جا رہا ہے، دوسری جگہ دیکھا کہ قد آدم ایکھ کھڑی لہلہا رہی ہے۔ تیسری جگہ دیکھا کہ گنا کٹ کر ملوں میں جانے کے لیے ٹرکوں میں بھرا جا رہا ہے ـــــ مقامی لوگوں نے بتایا کہ شکر بنانے والے کارخانے یہاں سال کے بارہ مہینے چلتے رہتے ہیں اور ان کو گنا ملتا رہتا ہے۔

موسم کا حال یہ ہے کہ تکلیف دہ گرمی کبھی نہیں ہوتی، وہاں گرم موسم کا مطلب صرف یہ ہے کہ سردی کی تکلیف نہیں، ہاں سردی سخت پڑتی ہے اور وہ ٹھیک اُن مہینوں میں، جن میں ہمارے ہاں سخت گرمی ہوتی ہے یعنی جون اور جولائی، میں مئی کے مہینے میں ٹرانسوال میں تھا، وہاں ایسی سردی تھی جیسی ہمارے ہاں آخر دسمبر اور جنوری میں ہوتی ہے، گھروں اور مسجدوں کو ہیٹر کے ذریعہ گرم کرنا پڑتا تھا۔ وسط مئی میں بعض مقامات پر ایسی برفباری ہوئی کہ زمین بالکل سفید پوش ہوتی تھی اور موٹر بہت احتیاط سے چلانی پڑتی تھی۔

اس ملک میں ہموار میدانی زمین بہت کم نظر آئی۔ زیادہ تر پہاڑیوں کے نشیب و فراز ہیں، پہاڑیاں بھی عجیب قسم کی ہیں نیچے پتھر ہے جیسا کہ پہاڑوں میں ہوتا ہے لیکن اوپر مٹی کی سطح ہے جو نہایت زرخیز ہے، پہاڑیوں پر گنے کے سرسبز و شاداب کھیتوں کا منظر بڑا دلکش ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سبز مخمل کا فرش ہے جس میں کہیں شکن نہیں ـــــ کھیتی کا سارا کام بجلی کی طاقت اور مشینوں سے ہوتا ہے۔ گنے کے کھیتوں کو پانی بجلی کے ذریعہ فواروں سے اس طرح دیا جاتا ہے کہ دور سے معلوم ہوتا ہو کہ کھیت پر تیز بارش ہو رہی ہے۔

زمین کی زرخیزی اور پیداوار کی کثرت کے علاوہ ملک کے بعض حصوں میں سونے اور ہیرے اور لوہے کی کانیں بھی ہیں، ایک صاحب نے بتایا کہ دنیا کا ساٹھ فیصدی سونا اس ملک کی کانوں سے نکلتا ہے۔ ان سب چیزوں کی وجہ سے دولت کی بڑی فراوانی ہے۔ غریبی اور مفلسی کا کم از کم شہروں میں کہیں نام و نشان نظر نہیں آتا ـــــ دولت کی فراوانی کا کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے مرکزی اور سب سے بڑے شہر جوہانسبرگ کی آبادی بتلایا گیا کہ ۱۲ لاکھ کے قریب ہے اور موٹروں کی

تعداد تین لاکھ سے زیادہ ، گویا ہر ۳۰-۴۰ آدمیوں کے پاس ایک موٹر کار ہے اور موٹر کاریں بھی نہایت اعلیٰ قسم کی بیش قیمت ، میرے ساتھ بمبئی کے ایک تبلیغی بھائی موسی سیٹھ تھے ۔ انھوں نے ایک موٹر کار کے بارے میں مجھے بتایا کہ بمبئی میں اس کی قیمت تین لاکھ ہے ___ ملک کے دور دراز خالص پہاڑی علاقوں اور جنگلوں میں بھی سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے اور سڑکیں ایسی ہموار اور بہتر حالت میں کہ گویا مشین میں ڈھالکر ابھی بچھائی گئی ہیں ، اس لیے موٹروں پر سیکڑوں میل کا سفر بھی بالکل محسوس نہیں ہوتا ، اس کے علاوہ بھی عام صفائی ستھرائی بڑی قابل تحسین ہے ۔

ملک کی آبادی جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے دو کروڑ کے قریب ہے ۔ ان میں نصف بلکہ نصف سے بھی کچھ زیادہ آبادی ملک کے اصل باشندوں ، سیاہ فام حبشیوں کی ہے ۔ یہ تعلیم تمدن اور ہر چیز میں بہت پسماندہ ہیں اگرچہ انمیں اب کچھ لوگ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر ، انجینئر ، وکیل اور بیرسٹر بھی ہو گئے ہیں اور ان میں قومی سیاسی شعور بھی بیدار ہو گیا ہے اور وہ اپنی قوم کو بھی بیدار کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں ، جس کے نتائج بہت دور رس اور غیر معمولی ہو سکتے ہیں ، لیکن عمومی حیثیت سے ابھی یہ حبشی نسل بہت پیچھے ہے ۔ ان لوگوں میں سے جو شہروں یا شہروں کے قرب و جوار میں ہیں وہ ملوں کارخانوں یا کھیتی کے بڑے فارموں پر مزدوری یا ملازمت کرتے ہیں ، جو شہروں سے زیادہ دور ہیں وہ معمولی سی خود اپنی کھیتی باڑی یا گائے بکری وغیرہ جانور پال کر گزارہ کرتے ہیں ___ گائے بکری بھیڑ اور دنبے کی نسل وہاں بہت زیادہ ہے ۔ ان کے لیے وسیع جنگل چھوٹے ہوئے ہیں ، گھر پر باندھکر کھلانے کی ضرورت بالکل نہیں ہوتی سیکڑوں اور ہزاروں کے غول کے غول پھرتے ہیں اس لیے گوشت کی بھی فراوانی ہے اور عموماً بہت اچھا ہوتا ہے ، مہنگا بھی نہیں ہے ، معلوم ہوا کہ مرغ کا گوشت ، گائے اور بکری کے گوشت سے بھی سستا ہے جس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ مرغ پروری کے بڑے بڑے فارم ہیں اور وہاں مرغ کے بچوں کی پرورش اس طرح کی جاتی ہے اور ایسی غذا کھلائی جاتی ہے کہ صرف چھ ہفتہ میں وہ پورا مرغ ہو جاتا ہے ___ بھینس اُس ملک میں بالکل ہی نہیں ہے ___

ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ ملک کے اصل باشندے وہاں کے سیاہ فام حبشی ہیں اور ان کی

تعداد ملک کی پوری آبادی میں نصف سے بھی زیادہ یعنی ایک کروڑ اور سوا کروڑ کے درمیان ہے۔

ان کے بعد سب سے بڑی تعداد یورپین سفید فاموں کی ہے ـــ یہ دو نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں ایک انگریز دوسرے ڈچ۔ معلوم ہوا کہ اب سے سوا تین سو ساڑھے تین سو سال پہلے سترھویں صدی کے وسط میں سب سے پہلے یہاں ڈچ آئے اور انھوں نے اپنی خداداد صلاحیت، قابلیت اور محنت صرف کر کے اور اس وقت تک کی سائنسی ایجادات سے کام لے کے اس ملک کو بنایا۔ پھر ایک وقت انگریزوں نے حملہ کر کے اس ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انگریزوں اور ڈچوں میں بار بار جنگیں ہوئیں۔ بالآخر اسی بیسویں صدی میں دونوں قوموں نے مصالحت کر کے اپنے کو ایک قوم بنا لیا اور اس وقت سے انگریز اور ڈچ ایک قوم بن کر حکومت کر رہے ہیں۔ ملک میں ان کی مجموعی آبادی اب ۴۰ لاکھ سے اوپر ہے۔ ان کی حیثیت وہ نہیں ہے جو ہمارے ملک ہندوستان میں انگریز حکمرانوں کی تھی۔ وہ ہندوستان پر صرف حکومت کرتے تھے وطن ان کا انگلستان ہی تھا۔ جنوبی افریقہ کے یہ سفید فام انگریز ہوں یا ڈچ، انھوں نے اس ملک ہی کو اپنا وطن بنا لیا ہے اور اسی سے اپنی قسمت وابستہ کر دی ہے کسی دوسرے ملک سے ان کا وطنی تعلق نہیں ہے۔

نظام حکومت جمہوری اور پارلیمنٹری ہے لیکن ووٹ کا حق صرف سفید فاموں کو ہے، ہندوستانی نسل یا حبشی نسل یا مخلوط نسل کے افراد اگر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ یا کروڑپتی تاجر بھی ہوں تب بھی ان کو ووٹ کا حق حاصل نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ ان سفید فاموں میں دو سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ایک وہ جس کو انگریزوں کی حمایت حاصل ہے یا کہنا چاہیے کہ جس کی قیادت انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ دوسری وہ جو گویا ڈچوں کی ہے۔ ابھی تک کچھ سالوں پہلے تک اس پارٹی کی حکومت تھی جو انگریزوں کی سمجھی جاتی ہے لیکن ادھر کچھ عرصہ سے ڈچوں والی پارٹی برسر اقتدار ہے۔ اس کی وجہ لوگوں نے یہ بتلائی کہ پہلے انگریز نسل کی تعداد ڈچوں سے زیادہ تھی لیکن ان میں عیاشی پسندی زیادہ ہونے کی وجہ سے نسلی اضافہ کا تناسب بہت کم ہے اور ڈچوں میں نسبۃً زیادہ ہے اس کی وجہ سے ڈچوں کی آبادی اب سفید فاموں میں ۵۰ فیصدی ہو گئی ہے۔ اس میں برتھ کنٹرول اور تحدید نسل والوں کے لیے اچھا سبق ہے۔

ملک کے اصل باشندے سیاہ فام حبشیوں اور یورپین سفید فاموں کے علاوہ ایک

تیسرا طبقہ اس ملک میں مخلوط نسل کا ہے۔ ان کو ہمارے ملک کے اینگلو انڈین سمجھنا چاہیے' یہ وہ ہیں جو ایسے ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں جن میں سے ایک گورا تھا اور دوسرا کالا۔ ان لوگوں کو وہاں "کلرڈ" کہا جاتا ہے۔ ان کی تعداد ۲۰ لاکھ کے قریب ہے۔

چوتھا طبقہ ہندوستانی نسل کا ہے۔ ان کی تعداد اس ملک میں مذکورہ بالا تینوں طبقوں سے کم ہے ان میں ۷۰۔۷۵ فیصدی ہندو ہیں' لوگوں نے بتلایا کہ اب سے سوا سو ڈیڑھ سو سال پہلے کارخانوں اور فارموں میں کام کرنے کے لیے مزدوروں کی حیثیت سے ان کو جنوبی ہند کے علاقوں سے لایا گیا تھا' لیکن یہاں آجانے کے بعد انھوں نے اپنے قدیمی وطن سے کوئی رشتہ ناطہ باقی نہیں رکھا' اب یہ زیادہ تو ملازمت وغیرہ کرتے ہیں۔ تجارت کے میدان میں بھی بڑھ رہے ہیں۔ لیکن ابھی تجارت میں ان کا حصہ زیادہ نہیں ہے۔ ___ ہندوستانیوں میں قریباً چوتھائی تعداد مسلمانوں کی ہے۔ ان میں زیادہ تر گجرات اور کاٹھیاواڑ سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد تجارت ہی کے لیے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی اور تجارت میں بہت کامیاب ہوئے۔ سفید فام نسل کے بعد تجارت میں ان ہی کا حصہ زیادہ ہے۔

اس ملک میں رنگ و نسل کی بنیاد پر تفریق ہم جیسوں کے لیے جو کسی جمہوری ملک کے رہنے والے ہوں بہت ہی محسوس ہونے والی چیز ہے۔ یہ تو اوپر ذکر ہی کیا جا چکا ہے کہ حکومت بنانے کے لیے ووٹ کا حق صرف سفید فاموں کو ہے۔ ملک کے اصل باشندے حبشیوں اور ہندوستانیوں بلکہ مخلوط نسل والوں کو بھی نہیں ہے جن کو وہاں کلر کہا جاتا ہے ___ اس کے علاوہ یورپینوں اور غیر یورپینوں کے لیے ریل کے ڈبے تک بھی ہر کلاس کے لیے الگ ہوتے ہیں۔ اوپر بورڈ لگا ہوتا ہے کہ یہ گوروں کے لیے ہے اور یہ کالوں کے لیے۔ اسی طرح شہر میں چلنے والی بسیں بھی الگ الگ ہیں۔ گوروں کی بس میں دوسری نسل کا کوئی آدمی نہیں بیٹھ سکتا۔ اسٹیشن پر ٹکٹ ملنے کی کھڑکیاں بھی الگ الگ ہیں۔ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارموں پر یا پارکوں میں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے جو بنچ پڑے رہتے ہیں ان پر بھی لکھا ہوتا ہے کہ یہ گوروں کے لیے ہے اور یہ کالوں کے لیے۔ گوروں والی بنچ پر دوسرا آدمی نہیں بیٹھ سکتا۔ اسٹیشن سے باہر آنے کے لیے

گیٹ بھی الگ الگ ہیں۔ اسکول اور کالج بھی ہر نسل کے لیے الگ الگ ہیں حد یہ ہے کہ اسپتال بھی الگ الگ ہیں ۔۔۔ اسی طرح نسلی بنیاد پر ملکی اور شہری قوانین اور حقوق میں بھی فرق ہے ۔۔۔ اب ہر نسل کے بازار اور اُن کی بستیاں بھی الگ الگ کی جارہی ہیں۔ وہ لوگ جن کی دکانیں یا رہائش کے مکان شہر کے کسی بازار یا محلہ میں ۵۰ برس یا اس سے بھی زیادہ مدت سے تھے، اب اُن کو نوٹس دیا گیا ہے کہ یہ پورا بازار یا علاقہ یورپینوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ آپ لوگوں کے لیے حکومت نے دوسری جگہ تجویز کر دی ہے۔ آپ وہیں منتقل ہو جائیے۔ اسی طرح جو یورپین دکاندار یا مکان دار کسی ایسے علاقہ میں تھے جس کو دوسرے لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اُن کو بھی منتقلی کا نوٹس دیدیا گیا ہے اور اس اسکیم پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ حکومت کی اس پالیسی سے ایک اہم اور مشکل مسئلہ خاصکر مسلمانوں کے لیے یہ پیدا ہو گیا ہے کہ جن بازاروں یا بستیوں کو اب یورپینوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اور قدیم مسلمان باشندوں کو وہاں سے منتقلی کا نوٹس دیدیا گیا ہے وہاں کی قدیم مساجد کا کیا ہوگا؟ لوگوں نے بتلایا کہ حکومت کو اس پر اصرار نہیں ہے کہ ان مساجد کو ختم کر دیا جائے وہ احترام کے ساتھ ان کو جوں کا توں باقی رکھنے پر آمادہ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب وہاں خالص یورپین غیر مسلم آبادی ہوگی تو ان مساجد میں نماز پڑھنے کے لیے کون اور کہاں سے آئے گا؟

ملک ۴ صوبوں میں منقسم ہے۔ ٹرانسوال جس کا مرکزی شہر جوہانسبرگ ہے جو ملک کا سب سے بڑا شہر بھی ہے ۔۔۔ دوسرا نیٹال جس کا مرکزی شہر ڈربن ہے جو ملک کا دوسرے نمبر کا شہر ہے۔ تیسرا کیپ جس کا مرکزی شہر کیپ ٹاؤن ہے، جو پورے ملک کا دارالحکومت بھی ہے۔ پارلیمنٹ کا اجلاس وہیں ہوتا ہے۔ آب و ہوا اور مناظر کے لحاظ سے یہ دنیا کے بہترین اور خوبصورت ترین شہروں میں سمجھا جاتا ہے۔

چوتھا صوبہ اورنج فری اسٹیٹ ہے۔ اسمیں مسلمان بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں اسلیے اس صوبہ میں میرا جانا بھی نہیں ہوا۔ مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد نیٹال کے شہروں میں ہے اور اس کے بعد ٹرانسوال کے شہروں میں۔ اس لیے میرا زیادہ وقت تقریباً ۴۰ دن ان ہی دونوں صوبوں کے دورہ میں گزرا ۔ کیپ ٹاؤن میں صرف تین دن قیام رہا، اور اس صوبہ کے ایک

دوسرے شہر پورٹ الزبتھ میں صرف ایک دن ــــ اس شہر میں ایک عجائب خانہ ہے بعض مقامی دوست بہت اصرار کر کے مجھے بھی لے گئے۔ وہاں سب سے عجیب چیز یہ دیکھی کہ ایک بہت بڑا تالاب ہے اس میں بڑی بڑی مچھلیاں ہیں، قد اور وزن کے لحاظ سے ہمارے ملک کی بھینس کے برابر ہوں گی* ان میں اس طرح کی سمجھ ہے جس طرح بندر میں ہوتی ہے۔ انھیں خاص تربیت دی گئی ہے۔ بہت سے کام وہ کر کے دکھاتی ہیں جو انسان ہی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اپنی مخلوق میں عجیب صلاحیتیں رکھی ہیں۔

* وما یعلم جنود ربک الا ھو وما ھی الا ذکریٰ للبشر۔

صوبہ ٹرانسوال اور نیٹال کے شہروں میں جو مسلمان ہیں وہ عموماً گجراتی نسل کے ہیں۔ ان کے اکثر گھروں میں ابھی تک گجراتی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مذہبی تعلق سے اردو سے بھی رابطہ ہے۔ اردو پڑھنے لکھنے والے تو بہت کم ہیں۔ لیکن چھوٹے بچوں اور کم عمر نوجوانوں کے علاوہ آسان اردو سمجھتے سب ہیں۔ نیٹال اور ٹرانسوال کے شہروں میں تقریریں صرف اردو ہی میں ہوتی تھیں میں کوشش کرتا تھا کہ زبان ممکن حد تک آسان ہو۔ لوگوں نے بتایا کہ میری تقریر عام طور سے سمجھی جاتی تھی۔ ہاں کیپ ٹاؤن میں اردو سمجھنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں اس لیے وہاں تقریر کا ترجمہ انگریزی میں کیا جاتا تھا۔ کیپ ٹاؤن کے دورہ میں میرے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے ایک نوجوان فاضل مولانا محمد یونس پٹیل تھے۔ عالم بھی ذی استعداد ہیں۔ اور انگریزی زبان پر بھی اچھی قدرت ہے۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا بہت ہی اچھی ترجمانی کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں قرآن مجید کی آیت یا کسی حدیث کا متن پڑھتا تو اس کو اسی طرح پڑھتے۔

کیپ ٹاؤن ڈربن اور جوہانسبرگ دونوں شہروں سے بہت فاصلہ پر ہے۔ لگ بھگ ۔ ہزار میل کی مسافت ہوگی۔ اس لیے وہاں جانا بھی ہوائی جہاز سے ہوا اور آنا بھی۔ وہاں کے ایک دوست سلیمان جعفر خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے یہ جاننے کے باوجود کہ وہاں میری اردو تقریر سمجھنے والے نہیں ہیں، وہاں کا طویل سفر سلیمان جعفر صاحب ہی کی وجہ سے منظور کیا تھا۔ یہ کیپ ٹاؤن کے ایک تاجر ہیں جو اردو سے بالکل ناآشنا ہیں۔ ان کا قصہ یہ ہے کہ اب سے غالباً دو ڈھائی سال پہلے انھیں میری کتاب "اسلام کیا ہے؟" کا انگریزی ترجمہ " What Islam is ? " کہیں سے مل گیا۔ اس کے مطالعہ سے ان پر بے حد

اثر پڑا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اب تک میری جو زندگی گزری بالکل غیر اسلامی گزری۔ اور اگر خدانخواستہ اسی حال میں کسی وقت دنیا سے چل دیا ہوا تو میرا انجام اور ٹھکانا بہت برا ہوگا۔ اس خیال نے ان کے دل و دماغ کو بے حد متاثر کیا۔ پہلے تو انھوں نے طے کیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے مدینہ منورہ جا پڑوں اور بقیہ زندگی جس طرح بھی گزرے وہیں گزار کے وہاں کی پاک زمین کا پیوند ہو جاؤں اس کے لیے انھوں نے سعودی حکومت سے مراسلت بھی کی، لیکن وہاں سے مستقل قیام کے لیے آنے کی اجازت نہیں ملی تو پھر انھوں نے اپنی اصلاح اور گزشتہ زندگی کی تقصیرات کی تلافی کے لیے ہندوستان کا رخ کیا۔ کچھ دن بعض دوسرے مقامات پر بھی رہے۔ آخر میں لکھنؤ آگئے۔ یہاں زیادہ دنوں اُن کا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے درجۂ حفظ قرآن کے غریب طلبہ کے ساتھ ایک ایسے کمرہ میں رہا جس میں پنکھا بھی نہیں تھا اور موسم انتہائی گرم۔ مدرسہ کے "لنگر خانہ" سے جو عام کھانا طلبہ کو ملتا تھا وہی یہ بھی بقیمت لے کے کھاتے تھے۔ کئی مہینے لکھنؤ میں اس طرح قیام کرنے کے بعد گزشتہ رمضان (۹۱ھ) سے پہلے وہ حج کے ارادہ سے حجاز مقدس چلے گئے اور وہاں ۵ مہینے حرمین شریفین میں قیام کے بعد اپنے وطن کیپ ٹاؤن پہنچ گئے۔ میرے وہاں پہنچنے سے کچھ ہی دن پہلے یہ حجاز مقدس سے واپس گئے تھے۔ کیپ ٹاؤن میں میرا قیام اُن ہی کے مکان پر رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ ان کا یہ مکان اس قدر عالیشان اور آراستہ تھا کہ ہمارے ملک کے کروڑ پتیوں کی رہائش گاہیں بھی شاید اس سے زیادہ آراستہ اور شاندار نہ ہوں گی۔ ان کی دوکان پر بھی جانا ہوا۔ یہ کھانے پینے کی چیزوں کی دوکان ہے۔ ایک طرح کا بہت بلند معیار ہوٹل ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کا بیج ماہانہ کرایہ وہ ادا کرتے ہیں، ہمارے ہندوستانی سکّہ کے حساب سے وہ پانچ ہزار روپے کے قریب ہوتا ہے ـــــ اس زندگی اور اس حیثیت کے آدمی نے لکھنؤ میں کئی مہینے اس طرح گزارے جس طرح ہمارے مدارس میں بہت ہی غریب اور مسکین طالب علم گزارتے ہیں۔ اُن کے صبر و ثبات اور مجاہدہ سے طبیعت پہلے بھی متاثر تھی، مگر اُن کے رہائشی مکان اور وہاں کی اُن کی زندگی کو دیکھ کر بہت ہی تاثر ہوا اور بڑی عبرت حاصل ہوئی۔ ـــــ اتنی تفصیل سے ان کا تذکرہ یہاں اسی لیے کر دیا ہے کہ اللہ کے بندے عبرت اور سبق حاصل کریں۔

ابھی اوپر ذکر کیا جا چکا ہے جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی زیادہ تعداد صوبہ نیٹال اور ٹرانسوال میں ہے اور میرا زیادہ تر وقت ان ہی دونوں صوبوں میں گزرا۔ جہاں تک میں نے محسوس کیا ان کی زندگی میں ایک عجیب قسم کا تضاد ہے۔ ان میں خاصی بڑی تعداد صوم و صلوٰۃ بلکہ جماعت کی پابند ہے جس کی وجہ سے مساجد خوب آباد ہیں، معلوم ہوا کہ ان کے بہت سے گھرانوں میں عورتیں بھی نماز کی پابند ہیں بلکہ روزانہ صبح قرآن مجید کی تلاوت بھی ان کا معمول ہے۔ ایسے لوگ بڑی تعداد میں ہیں۔ جو شرعی ڈاڑھی رکھتے ہیں، جو اس زمانہ میں بلاشبہ گہری مذہبیت کی علامت ہے۔ خیر کی راہوں میں بڑی کشادہ دستی اور فیاضی سے خرچ بھی کرتے ہیں اور ثواب آخرت کی امید پر خرچ کرتے ہیں جو یقیناً دینداری کی نشانی ہے۔ اپنے بچوں اور بچیوں کو دنیوی تعلیم کے ساتھ قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم بھی دلاتے ہیں اور اس کا بڑا اہتمام کرتے ہیں اور اب تو اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنے بچوں کو حافظ یا عالم بنانے کے لیے ہندوستان یا پاکستان کے مدرسوں میں بھیجتے ہیں جو ان جیسوں کے لیے دین کی راہ میں یقیناً بڑی قربانی ہے ــــ مگر ان سب چیزوں کے ساتھ خانگی معاشرت معلوم ہوا کہ بڑی حد تک مغربی ہے۔ بہت ہی خاص بلکہ ... خاص الخاص گھرانوں میں کچھ پردہ ہے ورنہ اکثر گھرانوں کی بیویاں اور بہو بیٹیاں دوکان پر بیٹھ کر کاروبار کرتی ہیں، انھیں دیکھ کر ہم جیسے آدمی کو اس کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ کسی ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں جس میں دینداری کا کچھ بھی اثر ہے، بعض دوستوں نے بڑے دکھ کے ساتھ بتایا کہ اس طرز زندگی کے بہت ہی افسوسناک بلکہ شرمناک نتائج پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ بعض مخلص دیندار بھائی اس کے لیے بہت فکرمند ہیں۔ یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ بعض حضرات جن کو تبلیغی کام سے زیادہ مناسبت اور دلچسپی ہو گئی ہے ان کے گھروں میں شرعی پردہ بھی آگیا ہے اور ان گھروں کی خواتین جو پہلے آزادانہ طور پر باہر نکلتی یا دوکانوں پر بیٹھتی تھیں اب برقعہ پہننے لگی ہیں جو وہاں کی دنیا میں ایک عجیب سی بات ہے۔ لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ یہاں یہ بہت بڑا اقتصادی مسئلہ ہے۔ دوکانوں پر جو کام گھر کی خواتین کرتی ہیں، اگر وہ نہ کریں تو ان کی جگہ اچھی قابلیت کے نوکر رکھنے پڑیں گے اور ایک نوکر کی تنخواہ ہندوستانی سکہ کے حساب سے قریباً دو ہزار ماہوار ہو گی۔ ظاہر ہے کہ اس کا کاروبار پر بہت ... اثر پڑے گا اور پھر نوکروں پر بھروسہ بھی نہیں کیا جا سکتا ــــ یہ معلوم ہونے کے بعد ان دوستوں

کی دینداری کی دل میں بڑی قدر و عظمت پیدا ہوئی جنھوں نے اپنے گھر کی خواتین کے لیے شرعی فیصلہ کر کے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے اس کا صلہ اس دنیا میں بھی انکو عطا فرمائے۔

مغربی معاشرت اور بے پردگی کے علاوہ ایک دوسری خرابی جو جنوبی افریقہ کے مسلمان بھائیوں میں نظر آئی وہ اُن کی انتہائی مسرفانہ زندگی ہے۔ جن لوگوں میں دینداری اور آخرت کی فکر بالکل نہیں ہے اُن کی فضول خرچیوں کا حال تو یہ ہے کہ معلوم ہوا ایک صاحب نے اپنی پلی ہوئی بلی کی سالگرہ منائی اور اس تقریب پر ہندوستانی سکہ کے حساب سے قریباً بیس ہزار روپے صرف کیے۔ لیکن جن بھائیوں میں خدا کے فضل سے دینی احساس اور آخرت کی فکر ہے اُن میں بھی دیکھا کہ کھانے پینے اور لباس میں بڑا اسراف ہے اور غالباً سب سے زیادہ اسراف مکانات کی شان و شوکت اور آرائش میں ہے۔ بعض مکانات کے متعلق معلوم ہوا کہ ان کی تعمیر پر ایک لاکھ پونڈ یا پچاس ہزار پونڈ صرف ہوا ہے۔ ایک پونڈ کم از کم ہمارے ۲۰ روپے کے برابر ہوتا ہے۔ مساجد کی تعمیر میں بھی بیحد اسراف سے کام لیا جاتا ہے۔ صوبہ نیٹال میں ایک شہر "لیڈی اسمتھ" ہے وہاں ایک بڑی ہی شاندار اور انتہائی حسین و جمیل مسجد بنائی گئی ہے یقیناً وہ لاکھوں پونڈ کے صرفہ سے تیار ہوئی ہوگی۔ بلاشبہ تعمیری صنعت کا شاہکار ہے، معلوم ہوا کہ دور دور سے لوگ اُس کو دیکھنے آتے ہیں۔ کاش اس کی لاگت سے ایسے مقامات پر جہاں مسجدوں کی ضرورت ہے چالیس پچاس مسجدیں بنا دی گئی ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بھائیوں کو ان باتوں پر غور کرنے کی توفیق دے۔

جب مساجد کا ذکر آ گیا ہے تو ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے۔ وہاں یہ بہت اچھا رواج ہے کہ ہر مسجد میں وضو خانہ کے قریب دس بیس یا اس سے زیادہ عبائیں ٹنگی رہتی ہیں جو لوگ کوٹ پتلون پہنے نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آتے ہیں وہ اوپر سے وہ عبائیں پہن کر نماز پڑھتے ہیں۔ مساجد میں نمازیوں کے لیے وضو کا انتظام بھی نہایت اعلیٰ اور آرام دہ ہے۔ بہر حال مساجد سے بڑی دلچسپی ہے۔ مسجد میں جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے بہت سے لوگ کئی کئی میل سے اپنی موٹروں پر آتے ہیں۔ بعض دوستوں نے بتلایا کہ اس کی وجہ سے اب حکومت نے پابندی

لگادی ہے کہ کسی جگہ مسجد کی تعمیر کی اجازت اُس صورت میں دی جائے گی جبکہ وہاں بہت سے موٹروں کے کھڑے ہونے کے لیے میدان بھی ہو۔

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ وہاں بچوں اور بچیوں کو قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم دلانے کا بڑا اہتمام ہے اس کے لیے وہاں دو نظام جاری ہیں۔ کچھ اچھے معیاری اسکول بعض مسلم انجمنوں یا اداروں کے اہتمام میں چل رہے ہیں۔ ان میں تعلیم کا وہی نظام و نصاب جاری ہے جو عام سرکاری اسکولوں میں ہے۔ اس لحاظ سے یہ مدرسے بھی سرکاری نظام تعلیم کا جز ہیں۔ لیکن انہیں ہر درجہ کے لیے قریباً ایک گھنٹہ قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم کے لیے مخصوص ہے جس کی حکومت نے اجازت دے رکھی ہے۔ یہ دینیات کی تعلیم بھی اسی زبان کے ذریعہ ہوتی ہے جو وہاں کی عام تعلیمی زبان ہے یعنی "انگریزی" اور "افریکان"[1]۔ یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اس تعلیم میں میری کتاب "اسلام کیا ہے" اور "دین و شریعت" کے انگریزی ترجموں سے مدد لی جاتی ہے اور ان کے کچھ مخصوص حصے مختلف درجات میں پڑھائے جاتے ہیں[2]۔ دینیات کی اس تعلیم پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ خود مسلمان برداشت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکول کا سارا خرچ گورنمنٹ کے ذمہ ہوتا ہے۔ وہاں اسکولوں یا کالجوں کی تعلیم پر کسی کو ایک پائی بھی خرچ نہیں کرنی پڑتی... بلکہ کتابیں وغیرہ بھی حکومت فراہم کرتی ہے۔

دینیات کی تعلیم کا دوسرا انتظام وہاں یہ ہے کہ جو بچے سرکاری اسکولوں میں عام ملکی اور دنیاوی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد دو گھنٹے کے لیے دینی مدرسہ میں جاتے ہیں۔ اور قریباً ہر جگہ ایسے جز وقتی مدرسے قائم ہیں۔ اور یہ بہت زیادہ تر ان اسکولوں کے قریب ہی قائم کیے گئے ہیں۔ گویا سرکاری عمومی تعلیم کے بالکل متوازی مسلمان بچوں کے لیے دینی تعلیم کا یہ مستقل نظام خود مسلمانوں نے قائم کر رکھا ہے۔ ان مدرسوں میں دینیات کی تعلیم عام طور سے اردو کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی تعلیم الاسلام

---

[1] "افریکان" دراصل ڈچوں کی زبان ہے جو انگریزی رسم الخط ہی میں لکھی جاتی ہے۔ یہ دونوں زبانیں (انگریزی اور افریکان) ملک کی سرکاری زبانیں ہیں اور ان کی تعلیم لازمی ہے۔ [2] بعد میں ایک صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ آئندہ تعلیمی سال سے یہ دونوں کتابیں اوپر کے دو درجوں میں جزو نصاب بنادی گئی ہیں۔

اور اسی طرح کی بعض اردو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ میں نے خود دیکھا کہ بعض اوقات چھوٹے بچوں کو ان کتابوں کی کسی اردو عبارت کا مطلب ان کے استاد گجراتی یا عام ملکی زبان افریکان میں سمجھاتے ہیں۔ اس نظام تعلیم پر لاکھوں کا روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔

ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ صوبہ نیٹال میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ غالباً "ریچمنڈ" نام ہے وہاں جانا ہوا۔ وہاں دینیات کا مدرسہ مسجد کے قریب ہے۔ ہم نے عصر سے پہلے وہاں کے دوستوں کی خواہش پر مدرسہ اور اس کی تعلیم کو دیکھا۔ اس کے بعد جب عصر کی نماز کا وقت قریب آیا تو ہم لوگ نماز کے لیے مسجد میں آگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مدرسہ کے سارے بچے اور بچیاں بھی جماعت سے نماز پڑھنے مسجد آگئے۔ میں نے دیکھا کہ ان بچوں نے وضو نہیں کیا۔ جماعت شروع ہوئی تو سب شریک ہوگئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مدرسہ کے اساتذہ سے اس بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ بچے اور بچیاں چونکہ مدرسہ میں قرآن شریف بھی پڑھتے ہیں اس لیے یہ پابندی ہے کہ وضو کے ساتھ پڑھیں جس کا وضو نہ ہوتا وہ جا کر وضو کر لیتا ہے۔ الغرض یہ سب مدرسہ میں با وضو پڑھتے ہیں، اس لیے یہ مسجد آکر وضو نہیں کرتے۔ مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی۔ کئی ایک دوسرے شہروں میں بھی دیکھا کہ مسجد کے قریب ہی وہ دینی مدرسہ ہے جس میں بچے اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد قرآن مجید اور دینیات پڑھنے کے لیے آتے ہیں اور خاص طور سے عصر کی نماز میں سب کے سب شریک ہوتے ہیں۔ یہاں بچیوں کا لباس بہت با پردہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مدرسہ کی طرف سے اس لباس کی پابندی ہے۔ کاش ایسا اہتمام اس وقت بھی ہو جب یہ بچیاں بچپن کی حدود سے آگے بڑھ جائیں۔

دینی تعلیم کے سلسلہ میں دو مدرسے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایک جوہانسبرگ شہر کے اندر ہے۔ نام شاید "نور الاسلام" ہے۔ اس کا واقعہ بڑا عجیب اور سبق آموز معلوم ہوا۔ اس وقت جو صاحب اس مدرسہ کے ذمہ دار و کفیل اور گویا روح رواں ہیں، اُن کا نام حاجی حسن موسیٰ مایت ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ میرے والد صاحب حاجی موسیٰ مایت سخت بیمار ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک رات کو ڈاکٹروں نے بالکل مایوسی ظاہر کر دی اور کہہ دیا کہ اب کسی علاج اور تدبیر کا وقت نہیں رہا۔ میرے والد صاحب نے اُسی وقت دعا کی۔ اور اللہ تعالیٰ سے نذر

مانی کہ اگر مجھے صحت ہوگئی تو میں اپنی فلاں بلڈنگ اللہ کے لیے وقف کردوں گا اور مدرسہ قائم کردوں گا۔ اختر کی شان! اسی وقت سے اُن کی حالت سنبھلنے لگی اور صبح تک معلوم ہوا کہ گویا بالکل اچھے ہیں۔ معالج ڈاکٹر سے چونکہ خاص تعلق تھا اس لیے اُس نے صبح کو خود ٹیلیفون کر کے دریافت کیا۔ اس کو بتلایا گیا کہ ان کی حالت تو بہت اچھی ہے۔ ڈاکٹر نے خود آکر دیکھا اور حیرت سے پوچھا کہ آپ نے رات میرے جانے کے بعد کیا دوا استعمال کی؟ انھوں نے بتلایا کہ میں نے کوئی دوا استعمال نہیں کی، بس اللہ سے یہ عرض کیا اور اس نے فضل فرمایا — جس مدرسہ کا ابھی میں نے ذکر کیا وہ اسی عمارت میں قائم ہے۔ یہ بہت وسیع و عریض بلڈنگ ہے اوپر کے تمام کمروں میں مدرسہ کے درجات ہیں اور نیچے کی عمارت جو کرایہ پر ہے اس سے مدرسہ کے مصارف پورے ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ مدرسہ کے مصارف ہمارے ملک کے حساب سے پندرہ بیس ہزار ماہوار سے کم نہ ہوں گے۔ اس مدرسہ میں کئی سو بچے اور بچیاں قرآن مجید اور اردو اور دینیات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور ملکی و دنیاوی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکول جاتے ہیں۔ حاجی حسن موسیٰ امیت صاحب کی خواہش پر میں نے اس مدرسہ کو کسی قدر تفصیل سے دیکھا اور اُن کے والد صاحب کا واقعہ اُن سے سن کر ایک رات اُن کے مکان پر قیام بھی کیا۔ بڑے سادہ اور نیک آدمی معلوم ہوئے۔

دوسرا قابل ذکر مدرسہ "المعہد الاسلامی" ہے۔ یہ جنوبی افریقہ کا غالباً سب سے بڑا دینی ادارہ ہے۔ ہمارے ایک دوست اور دارالعلوم دیوبند کے رفیق مولانا محمد موسیٰ میاں افریقی مرحوم تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ میں گھر کے بڑے دولتمند اور نوجوان ہونے کے باوجود بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ اب سے قریباً دس سال پہلے افریقہ ہی میں ان کا وصال ہوچکا ہے۔ الفرقان میں ان پر جو تعزیتی نوٹ لکھا گیا تھا اس میں اُن کا کسی قدر تفصیل سے تذکرہ بھی آگیا تھا — اُن کے والد ماجد حاجی موسیٰ میاں تھے۔ یہ اصل متوطن سملک ڈابھیل (ضلع سورت) کے تھے۔ اب سے لگ بھگ ایک صدی پہلے یہ جنوبی افریقہ پہنچے۔ کوئی بڑا سرمایہ بھی ساتھ نہیں تھا۔ کسی طرح کچھ کام شروع کیا۔ اللہ نے بہت برکت دی۔ اور اُن کا سرمایہ اُس زمانہ میں لاکھوں تک پہنچ گیا۔ پھر جب وہ وقت آیا کہ ان کے صاحبزادے (جو سب ان ہی کی طرح نیک اور باخدا ہیں) کاروبار سنبھالنے کے لائق ہوگئے تو انھوں نے ایک دن اُن سے کہا کہ

"میں جب اس ملک میں آیا تھا تو بالکل خالی ہاتھ تھا، اب اللہ نے اتنا دیدیا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے عطا فرمایا ہے وہ سب اسی کی راہ میں خرچ کر دوں اور جس طرح خالی ہاتھ آیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ اپنے مالک کے حضور میں پہونچ جاؤں۔ اور میں نے اس کی صورت یہ سوچی ہے کہ اس وقت جو کچھ کاروبار ہے یہ سب تم لوگ مجھ سے بقیمت خرید لو۔ اور وہ قیمت اسی کاروبار سے قسطوں میں ادا کرتے رہو اس طرح تمہارا یہ کاروبار بھی انشاء اللہ چلتا رہے گا اور قیمت بھی ادا ہوتی رہے گی اور وہ پوری رقم اللہ کے لئے کسی کام میں لگادی جائے گی۔ نیک اور صالح بیٹوں نے خوشی سے اس تجویز کو منظور کر لیا، کاروبار میں جو کچھ سرمایہ لگا ہوا تھا اس کا اندازہ اس وقت چالیس ہزار پونڈ کا کیا گیا اور صاحبزادوں نے چالیس ہزار پونڈ کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لی اور کاروبار سنبھال لیا۔ ان کے والد ماجد حاجی موسیٰ میاں مرحوم نے اس پوری رقم سے ایک دینی ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ــــــ "المعهد الاسلامی" یہی دینی مدرسہ اور ادارہ ہے۔ اپنی بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے منفرد اور قابل دید ہے۔ جب تک ہمارے رفیق اور دوست مولانا محمد موسیٰ میاں حیات رہے، وہ اس کے مدیر رہے۔ اب مولانا مرحوم کے خلف الصدق مولانا ابراہیم میاں اس کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ رات دن اسی میں قیام رہتا ہے۔ قدیم تعلق کی بناء پر یہ عاجز وہاں بھی گیا، ایک رات قیام بھی کیا، ادارہ کے تمام شعبوں کو دیکھا، دل بہت خوش ہوا ــــ سارا خاندان جس کو وہاں "میاں فیملی" کہا جاتا ہے، وہیں آباد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دین اور دنیا کی نعمتوں کو جس طرح اس پورے خاندان میں جمع کر دیا ہے۔ اس کی مثالیں پورے عالم اسلامی میں شاذ و نادر ہی ہوں گی۔

ہمارے دوست مولانا محمد موسیٰ میاںؒ اور ان کے والد ماجد حاجی موسیٰ میاںؒ "المعهد الاسلامی" کے قریب ہی مدفون ہیں۔ یہ عاجز قبروں پر بھی گیا اور مسنون طریقہ پر سلام و دعا کی توفیق نصیب ہوئی۔

دینی کاموں اور کوششوں کے سلسلہ میں تبلیغی جماعت کے کام کا ذکر ابھی تک نہیں آیا۔ خدا کے فضل سے اس کام کو وہاں قبول عام حاصل ہے۔ عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ مخلص ہیں۔ اور صرف اللہ اور اجر آخرت کے لیے یہ محنت اور کوشش کرتے ہیں اور

دوسروں کو بھی لگانا چاہتے ہیں ــــ اللہ کے بعض بندوں کو دیکھا کہ اس کام ہی کے ذریعہ انھیں بڑی دینی ترقی نصیب ہوئی، اُن کا حال دیکھ کر بڑا ہی رشک آیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت جنوبی افریقہ کے شہروں میں جو خاص قسم کی دینداری کی فضا ہے اور مساجد زیادہ آباد ہیں اس میں تبلیغی جماعت کی محنت کا خاص حصہ ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ اب سے ۴۔۵ سال پہلے یہ بات نہیں تھی۔ میں ۸ر اپریل کو جوہانسبرگ پہنچا تھا۔ اس سے ایک ہی ہفتہ پہلے پورے ملک کا تبلیغی اجتماع ہوا تھا۔ دوستوں نے اس کی پوری کوشش کی تھی کہ میں ایسے وقت پہنچوں کہ اجتماع میں میری شرکت ہو سکے لیکن کچھ قانونی مجبوریوں کی وجہ سے میرے لیے یہ ممکن نہ تھا۔ میں اجتماع کے ایک ہفتہ بعد پہنچا۔ مگر اجتماع سے جو جماعتیں ملک میں کام کرنے کے لیے روانہ ہوئی تھیں وہ شہروں شہروں پھر رہی تھیں۔ ایک جماعت ہندوستان سے بھی گئی ہوئی تھی اور ان ہی دنوں میں ایک جماعت انگلستان سے بھی آئی ہوئی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جس شہر میں میرا جانا ہوتا تھا اس شہر میں جماعت ایک دو دن پہلے پہنچ جاتی۔ اس لیے یہ اندازہ کرنے کا پورا موقع ملا کہ الحمدللہ پورے ملک میں جماعت کے کام کو مقبولیت حاصل ہے۔

بعض اہل علم نے بعض جماعتوں یا بعض افراد کی بے اصولیوں کی بھی شکایت کی۔ ایسے حضرات کو اس عاجز کا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ خود کام میں شریک ہوں اس سے ان شاء اللہ غلطیوں کی اصلاح ہوگی اور اگر دوری کی وجہ سے غلط فہمیاں ہیں تو وہ دور ہوں گی۔ اور ان شاء اللہ اس سے ان کی غیر معمولی دینی ترقی ہوگی۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کی ایک کتاب حال میں شائع ہوئی ہے۔ اسمیں جماعت والوں کی غلطیوں کی اصلاح اور اس کے بارہ میں دوسروں کی غلط فہمیوں کے ازالہ کا پورا سامان ہے۔ تبلیغی کام کرنے والوں کو بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہیے اور ان کے نیک نیت ناقدین کو بھی۔ اس عاجز کے نزدیک بہت ہی نفعمند کتاب ہے [1]

گزشتہ ماہ جولائی کے وسط میں انگلستان میں جو عالمی تبلیغی اجتماع ہوا ہے اُس کے

---

[1] اس کتاب کا نام ہے "تبلیغی جماعت پر اعتراضات کا جواب" اس کی قیمت چار روپے ہے ــــ کتب خانہ الفرقان لکھنؤ سے بھی طلب کی جاسکتی ہے ــــ ناظم کتب خانہ۔

لیے دعوت اور تشکیل کا کام ہوتا رہے۔ ہمارے قیام میں برابر ہوتا رہا۔ ۲۳ مئی کو جب میں ڈربن سے ماریشس کے لیے روانہ ہوا تو یہ معلوم ہوا تھا کہ قریباً ۸ حضرات اب تک انگلستان کے اجتماع میں جانے اور کچھ وقت لگانے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ بعد میں آنے والے خطوط سے معلوم ہوا کہ الحمد اللہ ایک مستقل ہوائی جہاز کے ذریعہ تو سے زیادہ افراد کا قافلہ جنوبی افریقہ سے گیا۔ یہ حضرات اپنے ملک سے روانہ ہو کر پہلے حجاز مقدس پہنچے اور حرمین شریفین میں عمرہ و زیارت کی سعادت حاصل کر کے اور وہاں دعائیں کر کے انگلستان گئے۔

جنوبی افریقہ والوں کے لیے انگریزی زبان چونکہ اردو زبان کی طرح ہے اور اللہ نے اپنے فضل خاص سے ان کو وسعت و استطاعت بھی بخشی ہے اس لیے اس کی بڑی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ یورپین ممالک میں دین کی دعوت کا کام لے۔

جوہانسبرگ میں میری آخری تقریر ۲۰ مئی کو ہوئی تھی اس میں مجمع بھی بہت زیادہ تھا اور معلوم ہوا کہ بہت منتخب تھا۔ میں اگلے دن وہاں سے روانہ ہونے والا تھا۔ اس تقریر میں میں نے خصوصیت کے ساتھ اس پر زور دیا تھا کہ اللہ نے آپ کو بڑی وسعت اور فراغت دی ہے اور بڑے انعامات سے نوازا ہے۔ اس کا شکریہ ہے کہ آپ یہ طے کریں کہ آپ کی اولاد میں جس بچہ میں زیادہ صلاحیت اور ذہانت ہو گی، ہم اس کو اللہ کے لیے اور دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے اور اس کو ایسی تعلیم دلائیں گے اور اس کے لیے تیار کریں گے کہ وہ خاص کر مغربی ممالک میں دین کی خدمت و دعوت کا کام کر سکے۔ آپ اپنے کاروبار میں اس کا پورا حصہ رکھیے اور اس کے دوسرے بھائی اس کی طرف سے بھی کاروبار کریں ۔۔۔ مولانا محمد موسیٰ میاں مرحوم جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے معلوم ہوا کہ وہ دین کے لیے وقف تھے کاروبار دوسرے بھائی دیکھتے تھے اور ان کا اس میں پورا حصہ تھا اور اب معلوم ہوا کہ اُن کے صاحبزادے مولانا ابراہیم میاں کے ساتھ بھی اُن کے اہل خاندان کا یہی معاملہ ہے، وہ کاروبار اور کاروباری ذمہ داریوں سے بالکل سبکدوش صرف دینی کاموں کی فکر کے لیے وقف ہیں اور کاروبار میں ان کا برابر حصہ ہے ۔۔۔

ڈربن کے بعض مخلص دوستوں کے متعلق بھی یہی معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے بعض شرکا کو دین کے لیے بالکل فارغ اور وقف کر دیا ہے اور کاروبار میں ان کا پورا حصہ رکھا ہے۔ بڑے

ہی مبارک اور خوش نصیب ہیں اللہ کے ایسے بندے۔

ڈربن کے مولانا عبدالحق عمر جی کو اللہ تعالیٰ نے جو خاص صلاحیتیں دی ہیں ان کی بنا پر اُن سے میں نے خاص طور سے اصرار کیا کہ وہ اپنے کو کاروبار کی فکروں اور مشغولیتوں سے بالکل فارغ کر لیں اور کاروبار کا سارا بوجھ ان کی طرف سے بس اُن کے بھائی اور بھتیجے اٹھا لیں ــــ اللہ تعالیٰ اس کو آسان اور مقدور فرما دے۔

تبلیغی جماعت کے سلسلہ سے ایک واقعہ کا ذکر کرنے کا اور جی چاہتا ہے ــــ ایک دن حاجی موسیٰ بھانیا کے ساتھ (جو میرے خاص داعیوں اور میزبانوں میں تھے) جوہانسبرگ سے اُن کی رہائش گاہ لوڈی پورٹ جا رہے تھے۔ راستہ کی ایک مسجد میں ظہر کی جماعت تیار تھی۔ موٹر سے وہیں اتر کے نماز میں شریک ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام "محمد عادل" بتایا گیا۔ یہ اپنی مولویانہ ڈاڑھی نیچے کرتے اور ٹخنوں سے اونچے پاجامے اور خاص قسم کی ٹوپی سے بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے کہ مظاہر علوم سہارنپور کے کوئی نیک طالب علم ہیں ــــ لیکن بتایا گیا کہ یہ ہیرا تراشی کے خاص کاریگر ہیں۔ یہاں کے ایک کارخانہ میں بہت اونچی تنخواہ پاتے ہیں، ان کا قصہ یہ ہے کہ یہ سوٹ بوٹ میں رہتے تھے، اردو بالکل نہیں جانتے سمجھتے تھے، کہیں تبلیغی جماعت والوں کے ہاتھ آ گئے، انھوں نے اُن سے دین کی اور آخرت کی باتیں کیں اور اپنے طریقہ کے مطابق زندگی میں تبدیلی لانے کے لیے ۴ مہینے کی دعوت دی، اُن کی بات اللہ کے اس بندہ کے دل نے قبول کر لی اور کارخانہ کے مالک کو ۴ مہینے کی چھٹی کی درخواست دے دی، اُس نے بلا کے پوچھا تو انھوں نے پوری بات بتا دی کہ میں دین سیکھنے کے لیے اور اپنی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی بنانے کے لیے جانا چاہتا ہوں، ان کی چھٹی منظور ہو گئی اور یہ ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان کے تبلیغی مرکز نظام الدین آ گئے۔

ــــ ۴ مہینے کے بعد یہاں سے واپس پہنچے تو ان کی صورت اور لباس تک ہر چیز بدل چکی تھی اب یہ اپنی جگہ پر کام کرنے کارخانے گئے تو ان کے ساتھ کام کرنے والوں نے کہا کہ ہم ان کے ساتھ اس وقت تک کام نہیں کریں گے جب تک کہ یہ کارخانہ کا دستی لباس نہ پہنیں جو ہم سب پہنتے ہیں۔ انھوں نے کارخانہ کے مالک سے کہہ دیا کہ میں لباس نہیں بدلوں گا، آپ چاہیں تو میری ملازمت ختم کر دیں مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی ــــ کارخانہ کا مالک یہودی تھا ان سے باتیں کرنے کے بعد

اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے دوسرے سب ملازم کاریگروں سے کہدیا کہ آپ لوگوں کا جی چاہے تو داڑھی رکھیں یا نہ رکھیں، یہ اسی لباس میں رہیں گے اور کام کریں گے۔ انھوں نے کارخانہ کے مالک سے یہ بھی کہا کہ اب میں ہر مہینے تین دن اور سال بھر میں ایک دفعہ چالیس دن جماعت کے ساتھ جایا کروں گا اور ان دنوں کی تنخواہ وصول نہیں کروں گا، کارخانہ کے یہودی مالک نے یہ بھی بخوشی منظور کر لیا اور معلوم ہوا کہ وہ یہودی ان سے بڑا عقیدتمندانہ تعلق رکھتا ہے۔ ہندوستانی جماعتوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اب یہ محمد عادل اردو بھی کچھ بولنے اور سمجھنے لگے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ترقی اور استقامت نصیب فرمائے اور دوسروں کو اس مثال کی پیروی کی توفیق دے۔

حکومتی نظام سے متعلق بعض تاثرات

جنوبی افریقہ کی حکومت کی نسلی تفریق کی پالیسی کے بارے میں اپنے تاثرات پہلے ظاہر کیے جا چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے جیسے کسی جمہوری ملک کے باشندے کے لیے اس بیسویں صدی کی آخری تہائی میں یہ پالیسی بڑی ہی عجیب اور ناقابلِ فہم ہے اور اندازہ یہ ہے کہ اب زمانہ اس کو زندگی کی زیادہ مہلت نہ دے گا — لیکن اسی کے ساتھ اس حکومت کی اچھی باتوں کی قدر و تحسین نہ کرنا بھی بے انصافی ہوگی۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگوں نے بتایا کہ حکومت کے پورے نظام میں نیچے سے اوپر تک رشوت اور بددیانتی اور ناجائز استحصال کے قسم کی کسی چیز کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ سرکاری ملازمین پوری فرض شناسی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں اور عوام کی تکلیف اور اپنی ذمہ داری کا پورا احساس رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے عوام کو کارپردازانِ حکومت سے اس طرح کی کوئی شکایت نہیں ہے جو ہمارے ملک میں ہر اس شخص کو ہوتی ہے جس کا حکومت کے کسی دفتر سے واسطہ پڑتا ہو اور وہ رشوت نہیں دے سکتا اور نہ کوئی دباؤ ڈال سکتا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ ملک کے شہریوں کو اپنے عزیزوں اور اہلِ تعلق کے واسطے ایک معقول حد تک ملک سے باہر رقم بھیجنے کی اجازت ہے۔

مسلمانوں کے لیے حج پر بھی تعداد وغیرہ کی کوئی پابندی نہیں ہے، جس کا جتنی بار جی چاہے حج کو جا سکتا ہے اور ہر دفعہ آمد و رفت کے کرایہ کے علاوہ ایک ہزار پونڈ تک کی رقم اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے جو ہمارے سکہ کے حساب سے بیس ہزار روپے کے قریب ہوتی ہے اور قوتِ خرید کے لحاظ سے بیس ہزار کے قریب ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوا کہ خاص حالات میں اس سے زیادہ کی بھی اجازت مل جاتی ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کے سفید فاموں میں اہلِ مغرب کی تمام آزادیوں اور عیاشیوں کے ساتھ مذہبیت ہے اور اس کی وجہ سے مذہبی زندگی رکھنے والوں کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مولانا نعمانی کی تالیفات

جو قرآن و حدیث کی تعلیمات کی ترجمان اور دینی اصلاح کا مکمل نصاب ہیں

اسلام کیا ہے؟ نہایت آسان زبان اور سنجیدہ دلنشیں انداز میں اسلامی تعلیمات کا مکمل خلاصہ۔ جو دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ کافی ہے۔ ۲/۵۰

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اس کتاب میں سیکڑوں عنوانات کے تحت قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، جو پڑھنے والے کو قرآنی دعوت اور تعلیم کے ساتھ اس کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔ غیر مسلموں کے لیے خاص تحفہ
قیمت مجلد ۵/۵۰ انگریزی ایڈیشن -/۱۲

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس رح جن لوگوں نے حضرت مولانا محمد الیاس رح کو نہیں پایا وہ اس کتاب کے مطالعہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو پوری طرح جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لیے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ مجلد ۲/۵۰ غیر مجلد -/۲

تذکرہ مجدد الف ثانی رح اس کتاب میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رح کی سوانح حیات آپ کی عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور آپ کا عظیم کارنامے کی تفصیل بیان کی گئی ہے جس نے سلطنت مغلیہ کا رخ الحاد سے اسلام کی طرف موڑ دیا۔ قیمت -/۴

مکتوبات خواجہ محمد معصوم رح یہ کتاب حضرت خواجہ رح کے ارشاد و ہدایت کے پورے نام کا آئینہ ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم رح حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ اور خلیفہ ہیں۔ آپ ہی کی تربیت نے اورنگ زیب عالمگیر کو ایک مثالی حکمران بنا دیا تھا قیمت مجلد ۵/۵۰

کلمۂ طیبہ کی حقیقت توحید اور رسالت کی شہادت کا کیا مطلب ہے اور اس کے کیا تقاضے اور کیا مطالبے ہیں۔ -/۵۰

نماز کی حقیقت اپنی نماز کو حقیقی نماز بنانے اور اس میں روح پیدا کرنے کے لیے اس کا مطالعہ ضرور کیجیے۔ شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی اور دیگر اکابر کے افادات کا نچوڑ ہے۔ قیمت ۱/۲۰

برکات رمضان اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ -/۱

دین و شریعت اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت، اور احسان و تصوف پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت -/۴

معارف الحدیث احادیث نبوی کا ایک جامع انتخاب، اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ۔ اس کتاب میں صرف وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن میں امت کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے اور جن کا انسانوں کی ظاہری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے۔
جلد اول ۶/۲۵ جلد دوم ۷/۲۵، جلد سوم -/۹ جلد چہارم ۶/۵۰ جلد پنجم ۸/۵۰ (مجلد کے لیے ۲۵ پیسے فی جلد مزید)

صحبتے با اہل دل (مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) حضرت شاہ محمد یعقوب بھوپالی (پیر نھے میاں) آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ہم آج بھی ان کی اصلاحی مجالس میں شریک ہو سکتے ہیں اور ان کے ارشادات سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب اُن کی عرفانی و اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان کے ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ہے۔
قیمت مجلد -/۹

انسانیت زندہ ہے یہ مولانا نعمانی کے چار چھوٹے چھوٹے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں کے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پر تاثیر واقعہ اور تجربہ نہایت سادہ انداز میں بیان کیا ہے قیمت -/۵۰

شاہ اسمٰعیل شہید حضرت شاہ اسمٰعیل شہید پر لگائے گئے معاندین اہل بدعت کے الزامات کا مدلل اور مسکت جواب قیمت -/۱

مستند تفاسیر و علوم قرآنی

تفسیر ماجدی | از مولانا عبدالماجد دریابادی قرآن مجید کی یہ تفسیر متعدد حیثیتوں سے منفرد و ممتاز اور بہت قابل قدر ہے۔ عربی کی تمام مستند تفاسیر اور مفردات القرآن کی پر لغوی تحقیقات کا عطر کشید کر دیا گیا ہے۔ ایک عام آدمی کامل اعتماد کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔

قیمت مجلد اول -/۱۵ ، دوم مجلد -/۱۷

تفسیر ابن کثیر محشّٰی (اردو) | علامہ ابن کثیر کی عظیم الشان تفسیر جس کو جدید و مفید حاشیہ اور مسائل کی وضاحت کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ نہایت ہی جامع و مفید کتاب ہے۔ چار جلدوں میں مکمل غیر مجلد -/۶۰ مجلد -/۷۵

تفسیر بیان القرآن | حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی مشہور زمانہ تفسیر۔ تین جلدوں میں مکمل سٹ مجلد -/۶۳ ۔ مکمل سٹ کی خریداری پر رعایتی قیمت -/۶۰

تفسیر حقانی مکمل | مولانا عبدالحق حقانی دہلوی کی شہرۂ آفاق تفسیر الگ الگ پاروں میں ۲۸ قسطوں میں مکمل ہوئی ہے۔ جس میں مقدمہ بھی شامل ہے۔ مجلد پانچ جلدوں میں مکمل ہے۔ قیمت کامل مجلد -/۶۰

تفسیر موضح القرآن | شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کی مشہور و مقبول تفسیر جو تفاسیر میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے بڑے سائز کی ایک ہی جلد میں مکمل ہدیہ مجلد -/۲۶

کشف الرحمٰن مع تیسیر القرآن و تسہیل القرآن | (از مولانا احمد سعید صاحب دہلوی) قرآن شریف کا ترجمہ اور تیسیر القرآن و تسہیل القرآن کی ترتیب و تالیف، مولانا موصوف کی ۱۸ سالہ محنت اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ قیمت مکمل -/۳۰

تفسیر مظہری | حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی یہ تفسیر اب تک عربی زبان میں چھپتی رہی۔ اب اسے اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ نہایت معتبر اور مشہور و مقبول تفسیر ہے۔ ۱۶ پاروں کی تفسیر چھپ کر آ چکی ہے۔

قیمت .... ۱۰۶ روپے

قصص القرآن | (از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم) جس میں امم سابقہ کے سلسلہ میں قرآن کے بیانات پر تاریخ و حدیث اور علوم قرآنی کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ان واقعات کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔

قیمت جلد اول -/۱۰ جلد دوم -/۸ جلد سوم -/۷ چہارم -/۸ (مجلد کے لیے -/۲ فی جلد مزید)

ارض القرآن | یعنی قرآن مجید کی تاریخی آیات کی تفسیر، سرزمین قرآن (عرب) کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا تذکرہ ہے ان کی تاریخی اور اثری تحقیق مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قیمت مکمل غیر مجلد -/۱۰

قرآن اور تعمیر سیرت | (از ڈاکٹر میر ولی الدین) اس کتاب میں سیرت و کردار سازی کے جامع نقطۂ نظر سے قرآن کی بعض اہم تعلیمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب متعدد مقالوں پر مشتمل ہے۔ قیمت صرف -/۶

قرآن اور تصوف | یہ بھی ڈاکٹر میر ولی الدین کی تصنیف ہے ڈاکٹر صاحب دینی جدید تعلیم کے باوجود تصوف کے حامل اور داعی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے تصوف کے بارے میں بہت سے شکوک رفع ہو سکتے ہیں۔ قیمت -/۳

قاموس القرآن (نیا ایڈیشن) | تالیف مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ اس میں الحمد سے لے کر والناس تک بہ ترتیب حروف تہجی تمام الفاظ قرآنی کے معانی اور ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح درج کر دی گئی ہے۔ طباعت و کاغذ اعلیٰ، صفحات آٹھ سو، قیمت مجلد -/۱۱

لغات القرآن | قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب حل کرنے اور سمجھنے کے لیے اردو زبان میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ ایک عام آدمی دیکھ کر پڑھنے سے قرآن کا ترجمہ اچھی طرح سے کر سکتا ہے۔

قیمت کامل غیر مجلد -/۴۴ ، مجلد -/۵۰

فہم قرآن | قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنا کن علوم و شرائط پر موقوف ہے؟ قیمت -/۴

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

علم حدیث اور فقہ پر اہم اور مستند کتابیں

کتاب الزہد والرقائق

امت کے جلیل القدر امام عبداللہ بن مبارک کی مقبول و مشہور تالیف جو عرصہ سے نایاب تھی اس کو ہمارے ملک کے مایۂ ناز محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ایڈیٹ کرکے نہایت مفید اور ایمان افروز مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا ہے کوئی کتب خانہ اور لائبریری اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں قیمت مجلد صرف -/۳۰

ترجمان السنہ مکمل

(تالیف: مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی) اردو زبان میں ضروری تشریح و مباحث کے ساتھ ارشادات نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ ہے — حدیث کے مستند لٹریچر میں یہ کتاب بلاشبہ عدیم النظیر ہے۔

قیمت جلد اول -/۱۶ جلد دوم -/۱۰ جلد سوم -/۱۲ جلد چہارم -/۱۲

(مجلد کے لیے فی جلد -/۲)

نصرۃ الحدیث

کیا حدیث بھی قرآن کی طرح واجب العمل ہے؟ ہمارے وقت کے مشہور صاحب نظر فاضل و محقق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اپنی اس کتاب میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور حدیث کی حجیت کے مسئلہ کو بے غبار کردیا ہے۔ قیمت ۲/۵۰

محدثین عظام اور انکے علمی کارنامے

مؤلفہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری

اس کتاب میں ائمہ اربعہ اور ارباب صحاح ستہ اور امام طحاوی کا تحقیقی تذکرہ و تاریخ تدوین حدیث اور محدثین عظام کی کوششوں کا ذکر ہے نیز محدثین عظام کے علمی کارناموں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے قیمت ۲/۵۰

فن اسماء الرجال

یعنی تاریخ رجال حدیث کی تدوین و تحقیق کتب اسماء الرجال سے استفادہ کا طریقہ، اہم مشہور کتب رجال پر تبصرہ و تعارف۔ مؤلفہ مولانا تقی الدین ندوی قیمت ۱/۷۵

مظاہر حق (اردو مع متن عربی)

حدیث کی مشہور و مقبول ترین کتاب "مشکوٰۃ شریف" کی اردو زبان میں شرح۔ پانچ جلدوں میں مکمل۔ قیمت غیر مجلد کامل -/۶۵

ایضاح البخاری

احادیث کی سب سے مستند کتاب (بخاری شریف) کی اردو شرح۔ افادات حضرت مولانا فخر الدین صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) ۱۲ حصے طبع ہوچکے ہیں۔ قیمت فی حصہ ۲/۲۵

زاد سفر

"ریاض الصالحین" کا اردو ترجمہ۔ از امۃ اللہ تسنیم۔ یہ کتاب بہترین مصلح و مرشد کا کام کرتی ہے۔ عنوان کے نیچے پہلے قرآن مجید کی آیات مع ترجمہ پھر احادیث ہیں۔

قیمت جلد اول ۴/۵۰

شمائل ترمذی و خصائل نبوی (اردو)

شمائل ترمذی کی عام فہم و فاضلانہ شرح جس میں احادیث کی روشنی میں حضور کی سیرت و صورت، عادات، خصلتیں، معمولات و لباس وغیرہ کی تفصیل ہے۔ قیمت -/۶

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند

افادات حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ۔ دارالعلوم دیوبند سے پوچھے گئے ہزارہا فقہی سوالات اور اُن کے جوابات کا یہ بے نظیر مجموعہ جو اب تک بطون اوراق میں محبوس تھا مولانا ظفیر الدین صاحب نے ۸ جلدوں میں مرتب کیا ہے قیمت کامل سٹ -/۵۶

فتاویٰ رشیدیہ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی شخصیت علمی حلقہ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کو تمام علوم اسلامیہ میں منصب امامت حاصل تھا مگر خصوصی مناسبت آپ کو فقہ و حدیث میں تھی۔ زندگی کے تمام ضروری مسائل کے بارے میں آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ -/۸

فتاویٰ مولانا عبدالحی فرنگی محلی (اردو)

مولانا عبدالحی لکھنوی کا مجموعہ فتاویٰ جو فقہی اور اعتقادی مسائل کا ایک نادر ذخیرہ ہے۔ اردو فتاویٰ کے ساتھ عربی و فارسی فتاویٰ کا نہایت سہل و سلیس اردو میں ترجمہ بھی ہے۔

تینوں حصے یکجا، قیمت مکمل مجلد -/۱۶

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

سیرت نبوی پر منتخب کتابیں

سیرۃ النبیؐ | علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی مشہور ومقبول تالیف ــــ یہ رسول اللہؐ کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشادات کا ذخیرہ ہے سیرت کے موضوع پر ایک عظیم شاہکار ہے چھ جلدوں میں مکمل قیمت مکمل غیر مجلد ٨٥/-

رحمۃ للعالمین | از علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصورپوری یہ کتاب جامعیت و کاملیت اور تاریخی تحقیق میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ حوالہ جات مستند، دلائل مضبوط، انداز بیان شگفتہ اور عشق نبوی میں سرشار کر دینے والا ہے۔ تین ضخیم جلدوں میں مکمل۔ حسین و رنگین گردپوش سے مزین۔ قیمت کامل سیٹ ... ــ ٣٠/-

سیرت طیبہ از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی سیرت نبوی کے موضوع پر ایک عظیم شاہکار حدیث کی مستند کتابوں کی بنیاد پر جدید انداز تعبیر کے ساتھ۔ ٥٠٠ سفحات قیمت صرف ٥/-

رحمت عالم علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت کے موضوع پر یہ کتاب خاص طور سے مدارس کے طلباء کے لیے لکھی ہے قیمت صرف ٢/-

محسن انسانیت اس میں سیرت رسولؐ ایک نئے اور دلآویز انداز میں بیان کی گئی ہے۔ آپ کے عہد کی ایک مکمل تاریخ ہے ایک مفید ترین کتاب۔ قیمت ... ــ ١٠/-

خطبات مدراس | حیات نبوی کے مختلف پہلوؤں پر علامہ سید سلیمان ندوی کے خطبات جو مرحوم کے علم و تحقیق کا نچوڑ ہیں قیمت ٣/-

مقالات سیرت سیرت نبوی پر آٹھ گرانقدر مقالات کا مجموعہ۔ از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ قیمت ٥/-

تقریر سیرت سیرت پاک پر مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی دو معرکۃ الآرا تقریریں۔ پہلی تقریر سیرت ١/٧٥ دوسری تقریر سیرت ٢/٧٥

نبی عربیؐ | اس کتاب میں متوسط استعداد کے بچوں کیلئے سیرت نبوی کے تمام واقعات کو اختصار کیساتھ سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد .. ١/٧٥ مجلد .. ٢/-

ہمارے حضور | سیرت نبوی کے صحیح اور مستند واقعات پر مبنی یہ کتاب خاص طور پر کم سن طالب علموں کے لیے نہایت شیریں اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ قیمت ... ١/٨٠

سیرت صحابہ و تابعین

حیاۃ الصحابہ | حضرت جی حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی حیاۃ الصحابہ" کا اردو ترجمہ صحابہ کرامؓ کی دعوت اسلام کے لیے محنت وجد وجہد ان کے سرفروشانہ مجاہدات مخصوص صفات و کمالات پاکیزہ حالات، فقر و صبر، زہد و قناعت اور ایمان و یقین سے متعلق احادیث و قصص کا دلکش مجموعہ ہے۔ تین جلدوں میں مکمل قیمت مکمل سیٹ ٣٢/-

سیرت خلفاء راشدین | سیرت خلفاء راشدین پر مولانا عبد الشکور لکھنویؒ کی عظیم تصنیف جس میں اس دور کے اہم تاریخی واقعات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ قیمت مجلد ٢/٥٠

صدیق اکبرؓ | اس کتاب میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے مفصل سوانح حیات اور اُن کے عہد کے تمام حالات کا محققانہ اور فاضلانہ تذکرہ ہے اس کتاب نے ایک بڑے خلاء کو پر کر دیا ہے۔ از مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ قیمت مجلد ١٠/-

الفاروق | علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے اس کتاب میں حضرت عمر فاروقؓ کے مفصل سوانح حیات عادات و خصائل علمی کمالات ان کے عہد کے تمام ملکی اور فوجی انتظامات اور اُن کے مجاہدانہ کارناموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قیمت مجلد ٦/-

سیرت عائشہ | از علامہ سید سلیمان ندوی۔ اس کتاب میں حضرت عائشہؓ کے واقعات زندگی اور اخلاق و عادات کی تفصیل اور اُن کے علوم و مجتہدات پر بحث کی گئی ہے۔ قیمت صرف .. ــ ٧/-

خلفاء راشدین | از مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی اس کتاب میں خلفاء راشدین کے سوانح حیات اور انکے سیاسی، انتظامی، مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ قیمت ٥/-

مہاجرین | اس میں بقیہ حضرات عشرۂ مبشرہ و اکابر بنی ہاشم اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے اکثر صحابہ کرام کے حالات مجاہدات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں قیمت اول ٨/- دوم ٦/-

سیر انصار | اس کتاب کے پہلے حصے میں پچاس انصار کرامؓ اور دوسرے حصہ میں ٩٤ انصار کرامؓ کے سوانح حیات اور ان کے فضائل و کمالات کا تذکرہ ہے۔

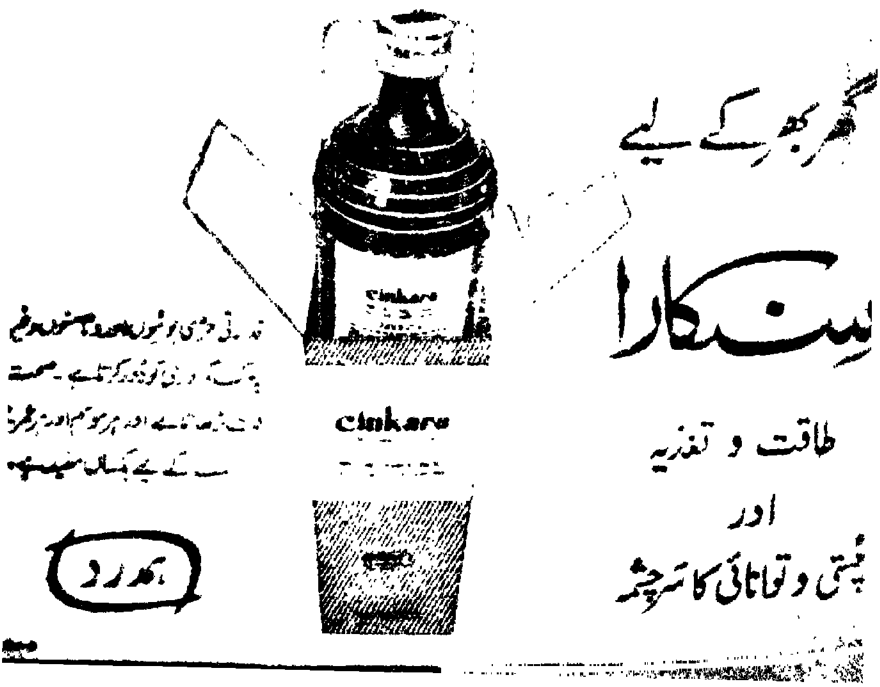
قیمت اول ٨/- دوم ٥/-

نوٹ: تفصیلات کے لیے کتب خانہ کی مکمل فہرست مفت طلب کیجیے

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ



PHONE: 4301
ماءُ اللحم مصطفائی
طاقت اور خون پیدا کرنیوالا
مشہور و معروف ٹانک
MUSTAFAI
MAUL LAHM
ماءُ اللحم مصطفائی
دارالشفاء مصطفائی میرٹھ (رجسٹرڈ)
دارالشفا مصطفائی میرٹھ رجسٹرڈ



گھر بھر کے لیے
سنکارا
طاقت و تغذیہ
اور
چستی و توانائی کا سرچشمہ
Cinkara
ہمدرد

Regd. No. L 353

Monthly **'ALFURQAN'** Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 40 NO. 7 SEPT. 1972 Phone No. 25547



RECEIVED
21-X-72

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
بنگلادیش سے ۸/-
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی ...... ۷۵ پیسے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۴۰ | بابت ماہ شعبان ۱۳۹۲ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۲ء | شمارہ ۸

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲ ر نومبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ـــــــ عتیق الرحمن سنبھلی

یہ شمارہ ناظرین کے ہاتھوں میں پہونچے گا تو رمضان کا مقدس مہینہ شروع ہو چکا ہوگا۔ آج کا مادہ پرستانہ ماحول وسوسہ اندازی کرتا ہے کہ مہینے بھر کے روزے اس دور کے مناسب ہیں بھی؟ آج ہمہ وقت جہد و عمل کی طالب دنیا میں کوئی قوم پورے مہینے روزے رکھنے لگے تو دنیا کی رفتار کا ساتھ کیسے دے گی؟ اتفاق سے ان دنوں مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کی تفسیر "تدبر قرآن" کا وہ مقام نظر سے گزرا جس میں روزوں سے متعلق آیات کی تفسیر کی گئی ہے۔ اس کے اختتام پر مولانا نے اس طرز فکر پر بھی چند صفحات لکھے ہیں اسی کا ایک ٹکڑا ذیل میں پیش ہے۔

مولانا اس طرز فکر کے لوگوں کی نسبت فرماتے ہیں:

"ان لوگوں کی نظر میں انسان کی جو کچھ قدر و قیمت ہے وہ محض اس کے مادی وجود کی ہے۔ اس کے روحانی وجود کی ان لوگوں کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح ایک فربہ بیل زیادہ ہل چلا سکتا ہے اسی طرح ایک آسودہ اور پیٹ بھرا آدمی زیادہ کام کر سکتا ہے۔ یہ لوگ سیدنا مسیحؑ کی اس حکمت سے بالکل ناآشنا ہیں کہ "آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اُس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔" اسی طرح یہ لوگ اس حقیقت سے بھی بالکل بے بہرہ ہیں جس کی طرف ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے کہ "اِنِّي أَبِيتُ لِي مُطْعِمٌ يُطْعِمُنِي وَسَاقٍ يَسْقِينِي" "میں اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ ایک کھلانے والا مجھے کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا مجھے پلاتا ہے۔

انسان اگر صرف گوشت، پوست کا مجموعہ ہے تو بلاشبہ ان معترضین کے اعتراض کے اندر کچھ وزن ہے لیکن اگر انسان کے اندر روح نامی کوئی شے بھی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کی زندگی اور توانائی کے لیے بھی کوئی غذا اور تدبیر ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کیا یہی دودھ مکھن جس سے ہمارے جسم کی پرورش ہوتی ہے اُسکے لیے بھی کافی ہیں یا اس کے لیے کسی اور تدبیر و غذا کی ضرورت ہے؟ مذہب اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ انسان کے اندر روح کا جوہر ارضی نہیں بلکہ آسمانی اور خدائی ہے اس وجہ سے اس کی غذا اس زمین سے نہیں بلکہ خدا کے تعلق اور توسل اور اسکے کلام و

الہام سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا تعلق خدا سے قریب تر اور قوی تر اُسی وقت ہوتا ہو جب یہ جسم کے (جو اس کے لیے صرف ایک مرکب کی حیثیت رکھتا ہو) تقاضوں، اُس کی خواہشات اور اُسکے جذبات و میلانات سے فی الجملہ آزاد ہوتی ہو۔ جب تک یہ انہی سفلی پابندیوں میں گرفتار رہتی ہے اسوقت تک یہ اُن بلندیوں میں پرواز نہیں کر سکتی جو اس کی فطرت کے لحاظ سے اُس کی اصل جولانگاہ ہیں اور جن میں پرواز کرنے ہی سے اُسکے وہ شاہینی کارنامے ظہور میں آتے ہیں جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔

روزہ رُوح کو یہ آزادی دلانے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ اس سے انسان کے نفس کی جو تربیت ہوتی ہے اُس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ رُوح پر خواہشات و شہوات کا غلبہ کمزور ہو جاتا ہو۔ انسان کی قوتِ ضبط اور قوتِ ارادی مضبوط ہو جاتی ہے اور اس طرح اُس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایک فرمانبردار غلام کی طرح ہاتھ باندھے ہوئے اپنی خواہشات کے پیچھے پیچھے چلے وہ ایک صاحبِ عزم و ایمان کی طرح اپنی خواہشات و جذبات کو اپنے رب کی رضا اور اُس کے احکام کے پیچھے لگا دیتا ہے۔

غور کیجئے تو یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گی کہ انسان کے اندر قوت اور طاقت کا اصل خزانہ اُس کے جسم کے اندر نہیں بلکہ اُسکے دل اور اُسکی رُوح کے اندر ہے۔ اگر دل کمزور اور روح پراگندہ ہو تو نہایت راحت و تنعم میں پلے ہوئے جسموں کا یہ حال ہوتا ہے کہ گویا وہ لکڑی کے کندے ہیں جن کو خوبصورت پوشاک پہنا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو "خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اور اُن کے خوف اور بزدلی کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ "یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ" دُنیا کے کسی گوشہ میں بھی کوئی خطرہ نمودار ہو اُن کے دل دھڑکنے لگتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ بجلی ہمارے ہی خرمن پر گرنے والی ہے۔ برعکس اس کے جن کی رُوح بیدار، جن کے دل پُر عزم اور جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں وہ نانِ جویں پر گزارہ کر کے بھی بازوئے حیدرؓ کے کارنامے دکھاتے ہیں ...... اسی چیز کی طرف شاعر نے بھی اشارہ کیا ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے ۔۔۔ کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے"

اگست اور ستمبر کا مشترک الفرقان دفتر میں کم رہ گیا ہو۔ جو صاحب فائل نہ رکھتے ہوں اُن سے درخواست کی جاتی ہو کہ قیمتاً یا ہدیۃً ہمیں واپس فرما دیں
منیجر

جرح و تعدیل

(۲)

(مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی
استاد شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(۳) جرح و تعدیل کے اقسام

جرح (کسی راوی کو نامعتبر قرار دینا) اور اسی طرح تعدیل (معتبر قرار دینا) کبھی مفصل ہوتی ہے اور کبھی مبہم، بایں طور کہ جارح یا صفائی دینے والا، وجہِ جرح اور وجہِ تعدیل بھی بیان کر دیتا ہو — یہ مفصل اور مفسر ہوئی ..... اور کبھی نہیں بیان کرتا ہے، یہ جرح مبہم یا تعدیل مبہم ہوئی۔

اس بات پر تو سب علماء متفق ہیں کہ جرح مفسر اور تعدیل مفسر، جب کہ ان شرائط کے مطابق ہوں جن میں سے بعض مذکور ہو چکی ہیں اور بعض آگے آئیں گی، دونوں قابلِ قبول ہیں۔ اختلاف رائے 'مبہم' کے سلسلے میں ہے، اس بارے میں حسب ذیل آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔

(الف) تعدیل مبہم — وہ صفائی جو بغیر وجہ بیان کیے ہو — مقبول ہے، اس لیے کہ صفائی کے وجوہ بہت سے ہوتے ہیں اور ان سب کا بیان باعثِ زحمت ہے۔ اگر تعدیل کرنے والے کے لیے وجوہ کی تشریح لازم قرار دے دی جائے تو اس کو کہنا ہوگا کہ "وہ یہ نہیں کرتا، یہ نہیں کرتا نہ یہ کرتا ہے"۔ وہ تمام باتیں گنوائے گا جن سے دامن بچانا لازم ہے، پھر یہ بھی کہے گا کہ "اور وہ یہ کرتا ہے، یہ کرتا ہے، اور یہ بھی کرتا ہے"۔ وہ سب امور ایک ایک کر کے گنانا جن کا کرنا کسی کے معتبر ہونے کے لیے ضروری ہے۔

رہا جرح کا سوال تو وہ جب تک مفسر نہ ہو اور وجہِ جرح وضاحت کے ساتھ نہ بیان کی گئی ہو اُسے قبول نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ جرح کا حق تو ایک ہی سبب اور وجہ بیان کر دینے سے ادا ہو جاتا ہے۔ برخلاف تعدیل مفسر کے کہ اس میں تمام واجب العمل اور واجب الترک امور کا بیان ضروری ہوگا تو

جرح مفسر کرنے میں کوئی زحمت نہیں کرنا پڑتی۔

اس کے علاوہ مختلف حضرات کے نزدیک اسباب جرح الگ الگ ہیں، بہت ممکن ہے کہ جارح اپنی رائے کے مطابق کسی ایسی وجہ پر جو در حقیقت وجہ جرح ہے ہی نہیں (بلا تشریح وجہ) کسی کو مجروح قرار دے رہا ہے اس لیے جرح کا مفسر اور مشرح ہونا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کسی واقعی وجہ جرح کی بنا پر جارح کسی کو مجروح قرار دے رہا ہے یا محض اپنی من مانی وجہ پر، اس کی مثالیں بہت ہیں، خطیب بغدادی نے (وفات ۴۶۳ھ) اپنی کتاب "الکفایہ" میں ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثلاً محدث شعبہ سے پوچھا گیا کہ فلاں شخص کی حدیث کو وہ کیوں قبول نہیں کرتے؟ انھوں نے جواب دیا کہ "میں نے اُسے خچر پر سوار کودتے اُچکتے جاتے خود دیکھا ہے" (شعبہ کے نزدیک محض اس بنا پر وہ محدث مجروح و متروک ہوگیا) حالانکہ سب جانتے ہیں کہ خچر پر سواری وجہ جرح ہرگز نہیں ہے۔

یا مثلاً: شعبہ ایک دفعہ منہال بن عمرو کے یہاں گئے اُن کے گھر سے کسی ساز (آلۂ موسیقی) یا خوش الحانی کی آواز، انھوں نے سُنی اس کے بعد سے انھوں نے منہال سے حدیث روایت کرنا ترک کر دیا۔ (۱)

یا مثلاً: حکم بن عُتیبہ سے کسی نے پوچھا کہ "آپ فلاں راوی سے روایت کیوں نہیں کرتے؟" حکم نے وجہ یہ بتائی کہ "وہ باتیں بہت کرتا ہے" (یعنی بکّی ہے) (۲)

---

(۱) "الکفایہ" میں معاملے کی پوری تفصیل یوں ہے کہ "شعبہ نے کہا" جب میں نے اُن کے گھر سے طنبورہ کی آواز سنی تو میں پلٹ آیا۔" وھب ابن جریر نے جن سے شعبہ سے اس سلسلے میں بات چیت ہو رہی تھی اور جو شعبہ کے شاگرد بھی تھے پوچھا "آپ نے منہال سے پوچھا ہوتا کہ یہ کیسی آواز ہے؟ شاید اُن کو خود بھی پتہ نہ ہو کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے؟" سخاوی نے اپنی کتاب "شرح الفیہ" میں لکھا ہے کہ ہمارے استاد حافظ ابن حجر کہتے تھے کہ وھب بن جریر کا اعتراض درست تھا اور گھر سے آواز آنا منہال کو مجروح نہیں قرار دیتا۔" (عبدالفتاح ابو غدہ)

(۲) سخاوی نے اپنی کتاب "شرح الفیہ" میں لکھا ہے کہ حکم نے "باتیں بہت کرنے والے" کو شاید اس بنا پر مجروح قرار دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "جو شخص باتیں بہت کرے گا وہ غلط بیانی بھی بہ کثرت کرے گا۔ اور جو بکثرت غلط بیانی کرے گا، اس کے گناہ کا بوجھ بھی زیادہ ہوگا، اور جس کے گناہ زیادہ ہوں گے وہ دوزخ کا زیادہ مستحق ہوگا" یہ حدیث

(باقی اگلے صفحہ پر)

یا مثلاً "جریر ابن عبد الحمید الضبی کوفی نے سماک بن حرب کو کھڑے کھڑے پیشاب کرتے دیکھا تو ان سے حدیث روایت کرنا ترک کر دیا۔ (۱)

یا مثلاً: وہ علماء جو 'عمل' کو ایمان کا جزء مانتے تھے، ان لوگوں پر جو جزء نہیں مانتے تھے (یعنی عموماً اہل کوفہ پر) ارجاء (۲) کی اصطلاح کا اطلاق کرتے تھے اور ان سے روایت حدیث نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی گواہی بھی قبول نہیں کرتے تھے، حالانکہ یہ مسلک کہ 'عمل' ایمان کا جزء نہیں ہے۔ ایسا سبب جرح نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس مسلک پر چلنے والوں کی روایت حدیث کو متروک قرار دے دیا جائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) طبرانی نے "اوسط" میں روایت کی ہے اس کی سند ضعیف ہے۔ اس سلسلے میں مناوی کی "فیض القدیر" دیکھئے ۱۲ عبد الفتاح۔

(۱) سخاوی کا خیال ہے کہ کھڑے کھڑے پیشاب کرنے کی بنا پر جریر نے راوی کو ترک نہیں کیا ہوگا۔ شاید اس بنا پر ترک کیا ہو کہ اس طرح اس کی ستر کھل گئی ہوگی ۱۲ عبد الفتاح۔

(۲) ہمارے استاد امام محمد زاہد الکوثریؒ نے اپنی کتاب "تأنیب الخطیب علی ماساقه فی ترجمة ابی حنیفة من الاکاذیب" میں لکھا ہے: "امام ابو حنیفہ کے زمانے میں اور اُن کے بعد بھی بہت سے ایسے متدین حضرات تھے جن کا مسلک تھا کہ 'ایمان' نام ہے 'اقرار اور عمل' کا اور ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے، جو لوگ 'ایمان' کو 'عقیدہ اور اقرار' کہتے تھے (اور 'عمل' کو جزو ایمان نہیں مانتے تھے) ان پر "ارجاء" کا الزام اول الذکر حضرات لگایا کرتے تھے، جہاں تک دلائل شرعیہ کا معاملہ ہے کھلی حقیقت یہ ہے کہ آخر الذکر مسلک ہی درست ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ولما یدخل الایمان فی قلوبکم" (اور ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہوا ہی نہیں ہے)، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "ایمان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یوم آخرت پر یقین کرو اور قضا و قدر کے خیر و شر پر یقین کرو۔" یہ حدیث امام مسلم نے حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت کی ہے اور تمام اہل سنت اسے قبول کرتے ہیں۔

یہ متدین حضرات (جو عمل کو ایمان کا جزء مانتے ہیں) اپنے اس عقیدے کی بنا پر حتماً معتزلہ اور خوارج کے ہم خیال ہیں اگر یہ بھی ان کا خیال ہے کہ ان کے مسلک کے خلاف جو مسلک ہے (عمل کو ایمان کا جزء نہ ماننے والا مسلک) وہ بدعت اور گمراہی ہے! اس لیے کہ جب ان کی نظر میں عمل، ایمان کا جزء ہے تو کسی ایک عمل میں بھی خلل پڑنے سے ایمان میں بھی خلل پڑنا لازمی ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

یا مثلاً: بہت سے اصحابِ جرح و تعدیل وہ ہیں جو امام ابو حنیفہ اور کوفہ کے بعض دوسرے عالموں پر "اصحابِ رائے" کا اطلاق کرتے ہیں (اور چونکہ ان کو "اصحابِ رائے" قرار دے لیا ہے اس لیے) ان کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی طرف توجہ نہیں کرتے، یہ طریقہ "کا، دیگر اصحابِ جرح و تعدیل کے نزدیک لغو (باطل) ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اب جو شخص کسی عمل کے سلسلے میں خلل میں مبتلا ہوا وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہو گیا ایمان سے باہر ہوا تو یا تو کفر میں داخل ہو گیا جیسا کہ خوارج کا مسلک ہے یا کفر میں نہیں داخل ہوا (مگر ایمان سے باہر ہو گیا) تو وہ دونوں درجوں "ایمان و کفر" کے درمیان کے درجے میں آ گیا، جیسا کہ معتزلہ کا مسلک ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات خوارج اور معتزلہ کے ایسے فرقوں سے کوسوں دور ہیں (انتہائی بیزار ہیں) اب جبکہ وہ اس مسلک سے بھی بیزار ہوئے جس پر امام ابو حنیفہ اور ان کے ہم خیال دوسرے ائمہ ہیں تو ان کا مطلب اور مسلک بے معنی اور مردہ ہو کر رہ گیا!! اگر یہ لوگ 'عمل' کو کمالِ ایمان کی شرط قرار دیتے تو اختلاف و ردّ و قدح کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، لیکن جب وہ اس قدر تشدد کرتے ہیں تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عمل کو محض کمالِ ایمان کی شرط نہیں مانتے بلکہ ایمان کا جزءِ اصلی قرار دیتے ہیں۔ اب اس کا جو نتیجہ نکلا وہ آپ نے دیکھ ہی لیا!۔

لطف کی بات یہ ہے کہ بعض وہ حضرات جو حدیث میں امیر المؤمنین کا درجہ رکھتے ہیں ایک طرف فخریہ انداز میں فرماتے ہیں "میں نے اپنی تصنیف میں ان لوگوں کی حدیثیں درج نہیں کی ہیں جو ایمان کو "عمل اور اقرار" نہیں مانتے اور ایمان میں کمی بیشی کے قائل نہیں ہیں" دوسری طرف ان کی تصانیف میں غالی خوارج اور ان کے ایسے دوسرے فرقوں کی حدیثیں تک درج ہیں! حالانکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ایمان کو قول و عمل قرار دینے اور ایمان میں کمی بیشی کا عقیدہ جس حدیث پر مبنی سمجھا جاتا ہے ناقدینِ حدیث کی نظر میں وہ غیر مستند اور غیر ثابت حدیث ہے! یہ حال ہو بعض ان لوگوں کا جو حدیث میں امیر المومنین سمجھے جاتے ہیں، اُن حضرات کا کیا ذکر جو سیدھے اُلٹے کا فرق بھی نہیں جانتے! مسئلہ زیر بحث کی دلیل کے ساتھ وضاحت کے بعد اس شخص پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ 'عمل' ایمان کا جزء نہیں بلکہ ایمان کا اصلی رکن ہے۔ یہی تو وہ مسلک ہے جو قرآن میں ہے حدیث میں ہے جس پر جمہور صحابہ کا عمل در آمد رہا ہے اور جس پر تمام اہلِ سنت کا، وہ اہلِ سنت جو معتزلہ اور خوارج دونوں کے مسلک کے منکر ہیں۔ عمل در آمد رہا ہے، تو عمل کو ایمان کے ارکانِ اصلیہ میں شمار کرنا سنت ہے۔ ارجاء کا جو مفہوم بعد میں ہو گیا وہ ضرور بدعت ہے۔ یعنی یہ کہنا کہ "ایمان ہے تو پھر کوئی گناہ نقصان دہ نہیں ہے"۔ ہمارے علمائے احناف اس قسم کے قول سے اسی طرح

(باقی اگلے صفحہ پر)

مثالیں اس کی بہت سی پیش کی جا سکتی ہیں۔ (۱)

(ب) دوسرا مسلک پہلے مسلک کا بالکل الٹا ہے، تعدیل (راوی کے معتبر قرار دیے جانے) کی وجہ بیان کرنا ضروری ہے، تبھی وہ معتبر ہوگی، رہا جرح کا معاملہ تو وہ مقبول ہوگی اگرچہ اسباب جرح نہ بھی بیان کیے گئے ہوں، کیوں؟ اس لیے کہ اس مسلک والوں کے خیال میں تعدیل کے اسباب و وجوہ میں سے اکثر خودساختہ ہوتے ہیں اس لیے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ فلاں شخص اس وجہ سے معتبر ہے، جرح کے اسباب بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بری الذمہ ہیں جس طرح حضرت یوسف کے خون سے بھیڑیا! ——— بہرحال اگر امام ابوحنیفہ کا یہ مسلک نہ ہوتا کہ ایمان عقیدہ اور اقرار کا نام ہے اور عمل ایمان کا جزء نہیں ہے تو سوائے معصوم حضرات کے تمام مسلمانوں کا کافر ہونا لازم آجاتا اس لیے کہ کسی نہ کسی وقت بڑے سے بڑے مسلمان سے کسی نہ کسی عمل کے سلسلے میں غلل ضرور وقوع پذیر ہو جاتا ہے، پھر تو بڑی مصیبت ہو جاتی۔"

ہمارے استاد امام کوثری کے اس واضح اور شافی بیان کے بعد آپ پر امام ابوحنیفہ کا وہ قول بھی پوری طرح واضح اور منکشف ہو گیا ہوگا جو انھوں نے عثمان البتی (بصرے کے ایک عالم) کے نام اپنے خط میں درج کیا ہے، عثمان البتی نے امام ابوحنیفہ کو لکھا تھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ فرقۂ مرجیہ میں ہیں؟ امام صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا: "یہ جو "مرجیہ" کی اصطلاح کا آپ نے ذکر کیا ہے تو ہم بتلائیے کہ ان لوگوں کا اس میں کیا قصور ہے جو 'عدل' کی بات کریں اور بدعتی لوگ انھیں 'مرجیہ' کے نام سے موسوم کر دیں، یہ لوگ اہل عدل اور اہل سنت ہیں، مرجیہ کے نام سے انھیں دشمنوں نے پکارنا شروع کر دیا ہے۔" عبدالفتاح ابوغدہ

(۱) کوفہ کے علماء اور فقہاء پر 'اصحاب رائے' کے لقب کا اطلاق اُن راویان حدیث نے کیا ہے جن کا خاص کارنامہ حدیث کے ظاہری الفاظ کی خدمت میں لگے رہنا تھا، یہ راویان حدیث، حدیث کے مطالب کی باریکیوں اور اس سے مستنبط ہونے والے اہم فوائد کے سمجھنے کا قصد ہی نہیں کرتے تھے، یہ راویان حدیث ہر اُس شخص سے تنگ دلی برتتے ہیں جو الفاظ حدیث (نص) کے سمجھنے اور اس حدیث سے نکلنے والے حکم کی وجہ اور علت کو ڈھونڈنے میں عقل سے کام لیتا ہو اور وہ امور جو ان راویان حدیث پر ظاہر نہیں ہو پاتے اُن کو تلاش کر کے سامنے لاتا ہے، عقل سے کام لینے والے ہر ایسے شخص کو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جادۂ حق سے منحرف ہو گیا ہے اور حدیث کو ترک کر کے اپنی رائے اور قیاس کا عامل ہے، اسی بنا پر یہ راویان حدیث اپنے زعم کے مطابق عقل سے کام لینے والے کی مذمت کرتے ہیں اور اس کی روایت کو متروک قرار دیتے ہیں۔"

(باقی اگلے صفحہ پر)

(اس مسلک ــــ مسلک دوم ــــ والوں کی دلیل، خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "الکفایہ" میں جو بیان کی ہے وہ یہ ہے: "یعقوب الفسوی نے اپنی سند سے اپنی تاریخ میں یہ واقعہ بیان کیا کہ میں نے ایک شخص کو احمد بن یونس سے پوچھتے سنا کہ کیا عبد اللہ العمری روایت حدیث میں ضعیف ہیں؟ احمد بن یونس نے کہا "ضعیف ان کو رافضی نے قرار دیا جو ان کے آباؤ اجداد (یعنی حضرت عمرؓ) سے عداوت رکھتا ہے، تم خود اگر عبد اللہ العمری (فاروقی) کی داڑھی، خضاب، اور پوشاک وغیرہ دیکھتے تو یقین کر لیتے کہ وہ ثقہ ہیں"۔ خطیب بغدادی نے اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: "دیکھو احمد بن یونس نے عبد اللہ العمری (فاروقی) کو جس بنا پر ثقہ قرار دیا ہے وہ ہرگز معقول وجہ نہیں، خوش قطع اور اچھی ہیئت وہ اوصاف ہیں جن میں ثقہ اور غیر ثقہ دونوں یکساں ہیں۔ ۱۲ ابو غدہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) "اصحاب رائے" کا لقب، ان تمام آثار و دلیلوں کے حق میں جو فقیہ بھی ہیں استعمال کر کے یہ علمائے حدیث ان کو مجروح کر دیتے ہیں اس کی مثالیں ان راویان حدیث کی رجال حدیث کے موضوع پر تصانیف میں آپ دیکھ سکتے ہیں حالانکہ حق یہ ہے کہ یہ فقیہ محدثین ہر طرح کی توقیر اور احترام کے مستحق ہیں اور ان کا فقیہ ہونا کسی طرح بھی ان کے فسق کا یا ان کے بارے میں طعن کا سبب نہیں بن سکتا۔ جیسا کہ ابن حجر مکی شافعی نے اپنی کتاب "الخیرات الحسان فی مناقب ابی حنیفۃ النعمان" میں لکھا ہے "یہ خوب سمجھ لو کہ ابو حنیفہ اور اُن کے شاگردوں کے بارے میں علماء کے اس کہنے کا کہ وہ "اصحاب رائے" ہیں یہ مطلب نہ سمجھ بیٹھنا کہ اس سے مقصد توہین یا تنقیص ہے اور نہ یہ انتساب صحیح ہے کہ ابو حنیفہ اور ان کے شاگرد اپنی رائے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یا اقوال صحابہ پر مقدم رکھتے تھے۔ اس الزام سے یہ حضرات بالکل بری ہیں"۔ ابن حجر مکی نے اس کے بعد اس طریقہ کار کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں نے فقہی احکام میں قرآن، حدیث اور اقوال صحابہ سے استنباط کے سلسلے میں متعین اور مقرر کیا ہے۔

ہمارے استاد امام کوثری نے "نصب الرایہ" کے مقدمہ میں لکھا ہے "میں منکر نہیں ہوں کہ متقدمین اور متاخرین اکابر اصحاب حدیث میں ایسے حضرات پائے جاتے ہیں جو فقہاء کے گروہ میں سے خاص طور پر امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کی مذمت کرتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان اصحاب حدیث کی توجہ ان کمزوریوں کی طرف نہیں جاتی جو ان حدیثوں میں پائی جاتی ہیں جن کو امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں نے قبول نہیں کیا ہے۔ ان کمزوریوں پر آگاہ نہ ہونے کے نتیجہ میں یہ گمان قائم کر لیتے ہیں کہ ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں نے حدیث کو ترک کر کے "رائے" کو مقدم کر دیا ہے، یہ غلط گمان اکثر اس وجہ سے قائم کیا جاتا ہے کہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

(ج) تیسرا مسلک یہ ہے کہ اسبابِ تعدیل کا بھی بیان کرنا ضروری ہے اور اسبابِ جرح کا بھی۔ (یعنی تعدیلِ مفسّر اور جرحِ مفسّر ہی معتبر ہیں، تعدیلِ مبہم اور جرحِ مبہم دونوں ناقابلِ اعتبار ہیں)

(د) چوتھا مسلک اس کا بالکل الٹا ہے، وہ یہ کہ اگر تعدیل بیان کرنے والا یا جرح کرنے والا خود اسبابِ جرح و تعدیل کا ماہر اور عارف ہے، تو اس کو نہ وجہِ تعدیل بیان کرنا لازم ہے نہ وجہِ جرح۔

ان چاروں مسالک کو حافظ ابن صلاح نے (اصولِ حدیث کی مشہور و مقبول کتاب "مقدمہ ابن صلاح" کے مصنف جن کا پورا نام تقی الدین ابو عمرو عثمان بن صلاح الدین عبد الرحمٰن شہرزوری (اصلاً) موصلی دمشقی (قیاماً) ہے اور جن کی وفات [illegible] میں دمشق میں ہوئی اور ولادت شہرزور میں ۵۷۷ھ میں ہوئی۔ ان کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دلیل (نصِ حدیث) سے حکم نکالنے کی علت کا ادراک بدگمانی قائم کرنے والوں کے فہم سے بلند ہوتا ہے جب وہ طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں کہ ان فقہا کو دیکھو کہ حدیث کو چھوڑ کر رائے کو اختیار کیے ہوئے ہیں، بہرحال اس بدظنی سے اگر ایذا رسانی مقصود ہے تو اس کا نشانہ فقہا نہیں بلکہ یہ لوگ خود بن گئے ہیں۔

ہمارے استاذ امام کوثری نے علامہ ذہبی کی کتاب "بیان زغل العلم والطلب" کے حواشی میں لکھا ہے کہ "چونکہ فقہا کی بالغ نظری راویانِ حدیث کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے اس لیے وہ فقہا کے بارے میں حکم لگا دینے میں جلدبازی کر بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ یہ حکم لگانے کے لیے کتاب و سنت، مشترک الحدیث، علمِ مناظرہ، کلام اور اصولِ فقہ پر عبور کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن احادیث یا آیات سے حکم اخذ کیے گئے ہیں اُن پر اور کیوں حکم اخذ کیے گئے ہیں اس کی علتوں اور وجہوں پر نیز حدیثوں کے قبول کرنے اور ایک حدیث کو دوسری پر ترجیح دینے کے سلسلہ میں علما کے درمیان شرائط پر جو اختلاف رائے ہے اُس پر وسیع نظر بھی ہو۔ اور جو شخص ان میں سے کسی سے بھی تہی دامن ہے وہ اس دوڑ میں شرکت کا حقدار نہیں ہے"

اس موقع پر ملا علی قاری کی کتاب "ادلۃ معتقد ابی حنیفۃ الامام فی ابوی الرسول علیہ الصلوٰۃ والسلام" میں جو ہم نے پڑھا ہے اس کو نقل کر دینا مناسب ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں "بزرگوں کا کہنا ہے کہ وہ محدث جو فقہ نہیں جانتا اس دوا فروش کی طرح ہے جسے علمِ طب سے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ اس کی دوکان میں دوائیں تو بھری ہوئی ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ کون دوا کس مرض میں مفید ہے۔ اور وہ فقیہ جو حدیث کا علم نہیں رکھتا تو اس کی مثال اس طبیب کی سی ہے جو دوا فروش نہیں ہے۔ یہ تو وہ جانتا ہے کہ فلاں دوا فلاں مرض کی ہے لیکن کوئی دوا خود اس کے پاس موجود نہیں ہے۔" ۱۲ ــــ عبد الفتاح ابو غدہ۔

ایک تصنیف "طبقات شافعیہ" بھی ہے اور صحیح مسلم کے بعض اجزاء کی شرح بھی انھوں نے کی ہے" مصنف، پہلے مسلک ہی کو قابلِ قبول قرار دیا ہے ان کا کہنا ہے "خطیب بغدادی (حافظ حدیث) نے اپنی تصنیف "الکفایہ" میں تحریر کیا ہے کہ یہی مسلک (تعدیل مبہم اور جرح مفسر کا معتبر ہونا) علمائے حدیث اور ناقدین فن حدیث" جیسا امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ کے ایسے ائمۂ فن کا ہے، یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اُن بہت سے راویانِ حدیث کو مقبول قرار دیا ہے جن کے بارے میں ان سے پہلے کے بعض حضرات نے جرح کی تھی جیسے عکرمہ جو ابن عباسؓ کے شاگرد اور غلام تھے، یا جیسے اسماعیل بن ابی اُویس یا جیسے عاصم بن علی اور عمرو بن مرزوق وغیرہ۔ اسی طرح امام مسلم نے سُوید بن سعید کو اور اُن جیسے راویوں کو جن کے بارے میں جرح مشہور ہو چکی تھی معتبر اور مقبول قرار دے کر ان سے روایتِ حدیث کی ہے، اور بالکل یہی طریقِ عمل ابوداؤد سجستانی نے بھی اختیار کیا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام بخاری امام مسلم اور ابوداؤد وغیرہ کا خیال یہی ہے کہ وہ جرح معتبر نہیں ہے جس میں سببِ جرح کی تشریح نہ ہو"

علامہ زین العراقی نے اپنی "شرح الفیہ" میں (پورا نام حافظ زین الدین عبدالرحیم بن الحسین ابوالفضل العراقی المصری وفات ۸۰۶ھ) اسی مسلک ۔۔۔ مسلکِ اول ۔۔۔ کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہی درست اور مشہور مسلک ہے" دوسرے مسلک کے بارے میں عراقی کا کہنا ہے کہ "صاحب "المحصول" کے مصنف وغیرہ نے اس کی نقل میں امام الحرمین نے اپنی کتاب "البرھان" میں اور امام غزالی نے امام الحرمین کی اتباع میں اپنی کتاب "المنخول" میں قاضی ابوبکر الباقلانی کی طرف منسوب کیا ہے (قاضی باقلانی اپنے زمانے میں کلام اور مناظرے کے استاد تھے، ان کی وفات ۴۰۳ھ میں ہوئی) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں (صاحب المحصول اور امام الحرمین) وہم میں مبتلا ہو گئے۔ ابوبکر الباقلانی کا یہ مسلک ۔۔۔ مسلکِ دوم ۔۔۔ نہیں ہے ان کا مشہور مسلک تو یہ ہے کہ نہ اسبابِ جرح کے ذکر کی ضرورت ہے نہ اسبابِ تعدیل کی۔ (یعنی وہ چوتھے مسلک کے قائل ہیں)

تیسرے مسلک کے بارے میں ۔۔۔ اسبابِ جرح اور اسبابِ تعدیل دونوں کا اظہار و بیان لازمی ہونا ۔۔۔ زین العراقی نے لکھا ہے کہ "یہ قول خطیب بغدادی اور اصول حدیث کے عالموں ۔۔۔ اصولیوں ۔۔۔ کا ہے"

زین العراقی نے چوتھے مسلک کو ۔۔۔ جارح اور معدّل اگر ماہرینِ فن ہیں تو ان دونوں میں سے کسی کو اپنے [illegible] وجوہ کی وضاحت لازم نہیں ہے ۔۔۔ قاضی ابوبکر باقلانی کا [illegible] کردہ

مسلک قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ قاضی باقلانی نے اسی مسلک کو جمہور علماء کا مسلک بتایا ہے، قاضی باقلانی کا کہنا ہے کہ اہلِ علم و فن کی اکثریت کا کہنا ہے کہ اگر وہ آدمی جرح کرے جو جرح کی ماہیت کو پوری طرح نہیں جانتا ہے تو اس کو اسباب و وجوہ جرح کا انکشاف لازم ہے ان ائمہ فن حدیث (نقد حدیث) کے لیے اسباب جرح کی وضاحت، یہ لوگ (اہل علم کی غالب تعداد) لازم نہیں مانتے ہیں۔"

باقلانی نے مزید کہا کہ جرح کے فن کے عالم سے اسباب جرح کی وضاحت کا مطالبہ نہ کرنے کے نقطۂ نظر کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ معدل سے (صفائی کرنے والے سے) یہ پوچھنا ضروری نہیں مانا گیا ہے کہ کسی راوی کو کس وجہ سے اس نے معتبر سمجھا ہے...... قاضی ابوبکر باقلانی سے اس مسلک کی روایت جن لوگوں نے کی ہے ان میں امام الحرمین جوینی ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "المستصفیٰ" میں اسے نقل کیا ہے امام غزالی نے اپنی کتاب "المنخول" میں اس باقلانی کا مسلک روایت کیا ہے، جو کچھ انھوں نے "المستصفیٰ" میں قاضی باقلانی کا مسلک روایت کیا ہے وہی "المحصول" کے مصنف نے اور آمدی نے بھی مسلک قاضی کے بارے میں لکھا ہے اور یہی مسلک قاضی باقلانی کا مشہور و معروف ہے جیسا کہ خطیب بغدادی نے "الکفایہ" میں لکھا ہے۔"

علامہ نووی (شارح مسلم) نے بھی ابن صلاح کی طرح اپنی کتاب "التقریب" میں مذکورہ چاروں مسلکوں میں سے مسلک اول ـــ اسباب تعدیل کا عدم انکشاف اور اسباب جرح کی لازمی وضاحت ـــ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہی مسلک صحیح اور درست ہے۔"

علامہ سیوطی "التقریب" کی شرح "التدریب" میں کہتے ہیں کہ "اس صحیح اور درست مسلک کے مقابل تین مسلک اور ہیں" پھر بقیہ مذکورہ تینوں مسلکوں کو نقل کر کے وہ لکھتے ہیں کہ "مسلک دوم کے ناقل امام الحرمین، امام غزالی اور امام رازی ہیں جنھوں نے "المحصول" میں اس مسلک کا ذکر کیا ہے۔" "مسلک سوم کے راوی خطیب بغدادی اور دیگر ماہرین اصول حدیث ہیں۔" مسلک چہارم کے قائل قاضی ابوبکر باقلانی ہیں اور اس کو جمہور کا مسلک بتاتے ہیں اور اسی مسلک کو امام غزالی، امام رازی اور خطیب بغدادی نے اختیار کیا ہے اور ابوالفضل العراقی نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے اور بلقینی نے اپنی کتاب "محاسن الاصطلاح" میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

علامہ بدر بن جماعہ نے اپنی کتاب "المختصر" میں مسلک اول کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

یہی مسلک صحیح اور مختار ہے اور امام شافعی بھی اسی کے قائل ہیں۔

علامہ طیبی نے (پورا نام حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی وفات ۷۴۳ھ) اپنی کتاب "خلاصہ" میں اسی مسلک اول کے بارے میں لکھا ہے کہ یہی صحیح اور مشہور مسلک ہے۔

"امعان النظر بشرح شرح نخبۃ الفکر" میں ہے "حفاظ حدیث کی اکثریت کا یہی مسلک ہے کہ بلا اظہار سبب تعدیل مقبول ہے اور جرح اس وقت تک مقبول نہیں ہے جب تک کہ سبب جرح بیان نہ کر دیا جائے۔" (۱)

ملا علی قاری (پورا نام ملا علی بن سلطان محمد یا محمد سلطان الھروی وفات ۱۰۱۴ھ) کی شرح شرح نخبۃ الفکر میں ہے کہ "جرح اس وقت تک قبول نہیں کی جائے گی جب تک وجہ جرح بیان نہ کر دی جائے بخلاف تعدیل کے کہ اس میں محض یہ کہنا مثلاً کافی ہے کہ فلاں عادل ہے یا ثقہ ہے۔"

علامہ ابن دقیق العید (پورا نام شیخ الاسلام تقی الدین محمد بن علی بن وہب بن مطیع القشیری المصری المالکی وفات ۷۰۲ھ جن کو ساتویں صدی ہجری کا مجدد مانا جاتا ہے) اپنی تصنیف "الالمام باحادیث الاحکام" کی جو خود شرح کی ہے یعنی "الامام فی شرح الالمام" اس میں لکھا ہے کہ:

---

(۱) میں نے اس عظیم شرح ـــ امعان النظر ـــ کو ۱۳۸۳ھ کے اپنے دورہ سندھ و پاکستان کے دوران شیخ [illegible] رحمہ پیر جھنڈا کے کتب خانہ میں دیکھا تھا۔ یہ کتب خانہ حیدرآباد سندھ کے مضافات میں واقع قصبہ پیر جھنڈا میں ہے۔ یہ شرح نخبۃ الفکر کی بے حد ضخیم شرح ہے جس کے بڑے سائز کے [illegible] صفحات لگ بھگ [illegible] کتب خانہ [illegible] فن اصول حدیث میں اس کا نمبر ۱۲ ہے۔ اس شرح شرح نخبۃ الفکر [illegible] امام عبدالحئی لکھنوی مؤلف "الرفع والتکمیل" ـــ کا یہ قرار دینا بہت [illegible] ہے کہ "شرح نخبۃ الفکر کی شرح میں یہ بہتر" میں نے جن مخطوطے کو دیکھا ہے ان میں [illegible] ہندو پاکستان کے اپنے دورے میں میں نے مخطوطات کے جتنے بھی کتب خانے دیکھے ان میں یہ سب سے زیادہ جامع ہو۔ اس کتب خانے میں حدیث اور علوم حدیث کی جو کتابیں ہیں [illegible] میں پورے دو روز اس کتب خانے کے دیکھنے کے لیے [illegible] اللہ تعالیٰ اس کتب خانے کے بانی اور اس کے مالک کو بہترین جزا عطا فرمائے۔ [illegible] عبد الغفار [illegible]

یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک راوی جس کو علمائے جرح و تعدیل نے ثقہ قرار دیا ہے، بعض لوگ اس کے بارے میں مبہم جرح کرتے ہیں اور وجہ جرح نہیں بیان کرتے، فن جرح و تعدیل کے قواعد و ضوابط کا تقاضا یہ ہے کہ جرح جو مفسر نہ ہو قبول نہ کی جائے۔"

علامہ نووی کی شرح صحیح مسلم میں ہے کہ "جرح جب ہی قبول کی جائے گی جب وہ مفسر ہو اور سبب جرح کی منظر۔"

"شرح اصول البزدوی" میں جس کا نام "کشف الاسرار" ہے (شارح علامہ عبدالعزیز احمد بن محمد بخاری مؤلف "التحقیق شرح المنتخب الحسامی" وغیرہ وفات ۷۳۰ھ) لکھا ہے "اماماں حدیث کا راوی کے یا حدیث کے بارے میں طعن (یعنی جرح) کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ اگر مجمل۔ مبہم۔ ہے تو نہیں قبول کیا جائے گا مثلاً کوئی یہ کہے کہ "یہ حدیث ثابت نہیں ہے" یا "یہ حدیث منکر ہے" (کمزور ترین راوی کی بیان کی ہوئی حدیث ہے) یا یہ کہے کہ "یہ راوی وہ ہے جس کی روایت متروک ہے" یا "جس کی روایت ترک کر دی گئی ہے" "ذاہب الحدیث" ہے یا "یہ راوی مجروح ہے" یا "یہ راوی عادل نہیں ہے" کہنے والا یہ سب کہتا ہے مگر اس کہنے کی وجہ کیا ہے اس کو بیان نہیں کرتا ہے تو عام طور پر فقہاء اور محدثین کا مسلک یہی ہے کہ ایسا طعن مقبول نہ ہوگا۔"

علامہ ابن الہمام (پورا نام کمال الدین محمد بن ہمام الدین عبدالواحد السکندری السواسی "فتح القدیر" کے مصنف وفات ۸۶۱ھ) کی تصنیف "تحریر الاصول" میں ہے "بیشتر فقہاء جن میں حنفیہ شامل ہیں اور بیشتر محدثین اس رائے کے ہیں کہ "جرح اگر مفسر نہ ہو تو قبول نہیں کی جائے گی اور تعدیل قبول کی جائے گی اگرچہ مفسر نہ ہو، بعضوں کی رائے یہ بھی کہی جاتی ہے کہ تعدیل نہیں قبول کی جائے گی اگر مشرح نہ ہو اور جرح مبہم قبول کر لی جائے گی، بعضوں کی یہ رائے بتائی جاتی ہے کہ دونوں کو مفسر ہونا چاہیے اور بعضوں کا یہ خیال بھی بیان کیا گیا ہے کہ جرح اور تعدیل دونوں میں اظہار سبب ضروری نہیں ہے۔"

۷ - "المنار" میں (جس کے مصنف کنز الدقائق، اور تفسیر مدارک وغیرہ کے مصنف ہیں اور جن کا نام حافظ الدین عبداللہ بن احمد النسفی ہے وفات ۷۱۰ھ) اور "المنار" کی شرح "فتح الغفار" میں جو شارح کا نام زین العابدین ابن ابراہیم بن نجیم المصری ہے جو "کنز الدقائق" کی شرح "بحر الرائق" کے اور "الاشباہ والنظائر" کے مؤلف بھی ہیں وفات ۹۷۰ھ) کہ "ائمہ حدیث کا طعن مبہم مثلاً یہ کہنا کہ "یہ

حدیث ثابت نہیں ہے۔" یا "منکر ہے" یا "مجروح ہے" یا "اس حدیث کا راوی متروک ہے" یا "غیر عادل ہے۔" کسی راوی کو مجروح نہیں کرتے بجرح جب ہی مقبول ہوگی جب اس وضاحت کے ساتھ ہو کہ" اس متفق علیہ وجہ سے مجروح ہے۔"

علامہ قاسم بن قطلوبغا کی "شرح مختصر المنار" میں ہے (شارح کا پورا نام قاسم بن قطلوبغا زین الدین ہے جو بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے شاگرد رشید علامہ سخاوی نے "الضوء اللامع" میں ان کا مفصل ذکر کیا ہے۔ وفات ۸۷۹ھ) کہ "کسی راوی کے بارے میں جرح اس وقت تک قبول نہیں کی جائے گی جب تک یہ وضاحت نہ ہو کہ کس بنا پر اُسے مجروح کیا گیا ہے۔"

علامہ ابن الملک کی "شرح المنار" میں ہے (شارح کا پورا نام عبداللطیف بن عبدالعزیز ابن ملک "مبارق الازھار شرح مشارق الانوار" اور "شرح مجمع البحرین" کے مصنف وفات ۸۸۵ھ) بعض علماء نے کہا ہے کہ طعن مبہم اسی طرح مقبول ہے جس طرح تعدیل مطلق (غیر مفسر اور غیر مشرح) مقبول ہے، ہمارا جواب یہ ہے کہ تعدیل کے اسباب بہت ہوتے ہیں جن کی یکجائی اور انضباط نہیں ہو سکتا ہے، لیکن جرح کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔"

"الامتاع باحکام السماع" میں ہے (جس کے مصنف کمال الدین جعفر بن ثعلب الادفوی الشافعی ہیں، وفات ۷۴۸ھ جو ابن دقیق العید کے شاگرد تھے "سماع" (گانا) سے خاص ذوق رکھتے تھے جواز سماع میں ان کا رسالہ "الامتاع" بڑی معلومات کا حامل ہے) "ناقدین کا یہ کہنا کہ "یہ راوی ضعیف ہے" اور وجہ نہ بتانا کہ کیوں ضعیف ہے" جرح مطلق "ہے (یعنی مبہم ہے) ایسی جرح کو قبول کرنے میں اختلاف بین العلماء ہے جس کی تفصیل ہم نے 'اصول' کی بحث میں بیان کی ہے۔ اولیٰ اور افضل یہی ہے کہ ان محدثین سے جو متاخرین میں ہیں ایسی جرح (جرح مطلق) قبول نہ کی جائے کیونکہ یہ متاخرین ایسے امور کی بنا پر جو در حقیقت وجہ جرح ہی نہیں، راوی کو مجروح قرار دیدیتے ہیں، اسی طرح یہ کہنا کہ "یہ راوی حافظہ کے اعتبار سے ناقص ہے۔" یا "حافظے کا مالک نہیں ہے" بالکل جرح نہیں ہے، ایسے موقعوں پر حدیث بیان کرنے والے کا اور خود حدیث کا حال جانچنا چاہیے۔"

"التحقیق شرح المنتخب الحسامی" میں ہے "مبہم طعن (جرح) اگر کسی نے کیا ہے تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا جس طرح گواہی میں مبہم بات کو قبول نہیں کیا جاتا، اسی طرح وہ طعن بھی مقبول

نہیں ہے جو کسی ایسی وجہ کے انکشاف کے ساتھ ہو جس میں تکلف پایا جاتا ہو (یعنی کسی دور از کار بات کو بنیاد جرح بنایا گیا ہو) اور اسی طرح وہ جرح بھی مقبول نہیں ہے جس میں سبب جرح تو وہی ہو جو بالاتفاق سبب جرح ہے لیکن جرح کرنے والا خود تعصب میں مشہور اور بدنام ہو۔"

"التبیین شرح المنتخب الحسامی" میں ہے (جس کے مؤلف امیر کاتب بن امیر غازی قوام الدین اتقانی متوفی ۷۵۸ھ ہیں) "اگر ائمہ فن میں سے کسی نے کسی راوی کو معتبر قرار دینے سے انکار کیا ہو تو اگر محض یہ کہہ کر انکار کیا ہے کہ "یہ راوی مطعون ہے" یا "مجروح ہے" (یعنی مبہم طعن کیا ہے) تو ایسا مبہم انکار مقبول نہیں ہے۔"

"التوضیح شرح التنقیح" میں ہے (جس کے مصنف اور شارح ایک ہی ہیں یعنی صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود بن تاج الشریعہ مصنف شرح وقایہ متوفی ۷۴۷ھ یا ۷۴۵ھ) "اگر طعن مجمل ہے تو غیر مقبول ہے، اگر مفسر ہے اور وجہ طعن وہ ہے جو بالاتفاق وجہ طعن ہے اور طعن کرنے والا مخلصوں اور خیر خواہوں میں ہے نہ کہ عداوت اور تعصب رکھنے والوں میں تو ایسے طعن کو جرح مانا جائے گا ورنہ نہیں۔"

"البنایہ شرح الہدایہ" میں ہے (جس کے مؤلف قاضی بدر الدین محمود بن احمد العینی متوفی ۸۵۵ھ ہیں اور جنھوں نے صحیح بخاری کی ضخیم شرح بھی لکھی ہے جس کا نام "عمدۃ القاری" ہے) مردار کے بالوں کی بحث میں ہے "اصول حدیث کے ناقدوں کے نزدیک جرح مبہم غیر مقبول ہے" اسی کتاب (شرح ہدایہ) میں کتے کے جھوٹے کے بارے میں "تجرید القدوری" سے منقول ہے کہ "جرح مبہم غیر معتبر ہے۔"

"مرآۃ الاصول شرح مرقاۃ الوصول" میں ہے (شرح اور اصل دونوں کے مصنف محمد بن فراموز الرومی ہیں جو ملا خسرو کے نام سے مشہور ہیں وفات ۸۸۵ھ) "طعن کرنے والا اگر ماہرین فن حدیث میں ہے تو بھی اس کا طعن مجمل مقبول نہیں ہے جیسے یہ کہنا کہ "یہ حدیث ثابت نہیں ہے" یا "مجروح ہے" یا "متروک ہے" یا "اس کا راوی عادل نہیں ہے" اور اگر طعن مفسر ہے اور وجہ طعن وہ ہے جو بالاتفاق وجہ طعن ہے نیز طعن کرنے والا خیر خواہوں میں سے ہے تو ایسے طعن کو جرح مانا جائے گا ورنہ نہیں"

"فتح الباقی بشرح الفیۃ العراقی" میں (شارح کا نام شیخ الاسلام زکریا بن محمد الانصاری المصری

وفات ۹۰۲ھ جو علامہ ابن حجر اور علامہ ابن ہمام کے شاگردوں میں تھے، مسلک اول (تعدیل مبہم معتبر ہے اور جرح مبہم غیر معتبر ہے) کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہی مسلک چاروں مسلکوں میں سے صحیح ہے اور فقہ واصول فقہ میں مستند مانا گیا ہے، اور خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک یہی مسلک درست اور حق ہے۔"

اسی کتاب (فتح الباقی) میں چوتھے مسلک کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس کو قاضی ابوبکر باقلانی نے اختیار کیا ہے اور اسے جمہور کا مسلک کہہ کر نقل کیا ہے، اور چونکہ یہ مسلک علامہ ابن صلاح کے اختیار کردہ مسلک کے خلاف ہے (ابن صلاح کے نزدیک جرح مبہم غیر مقبول ہے) اس لیے بعض علماء نے جن میں علامہ تاج الدین السبکی بھی شامل ہیں، کہا ہے کہ یہ مسلک (جرح مبہم کا مقبول ہونا جس کو قاضی ابوبکر باقلانی نے اختیار کیا ہے) کوئی جداگانہ مسلک نہیں ہے بلکہ محل اختلاف کی توضیح ہے اس لیے کہ جو شخص اسباب جرح وتعدیل کا ماہر اور عارف نہیں ہے اس کی جرح اور تعدیل چاہے مجملاً ہوں یا مفسراً مقبول نہیں ہیں اس لیے کہ کسی شئی کے بارے میں کوئی حکم کرنا اس شئی کے تصور کی ایک شاخ ہے یعنی اختلاف اس امر میں ہے کہ ماہر اور عارف کی مبہم جرح یا تعدیل مقبول ہے یا نہیں، غیر ماہر کا کوئی سوال نہیں ہے۔"

علامہ سخاوی کی "فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث" میں بھی چوتھے مسلک کے بارے میں بعینہ وہی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے جو "فتح الباقی" کے حوالے سے ابھی مذکور ہوا ہے۔

یہ اقتباسات جو مذکور ہوئے، اسی طرح کی بے شمار عبارتیں اصول فقہ، اصول حدیث اور فقہ کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ شریعت کے ماہرین ان سے بخوبی واقف ہوں گے۔ یہ سب اقتباسات اور عبارات گواہ ہیں کہ جرح مبہم کا نامقبول ہونا ہی صحیح اور کامیاب مسلک ہے، یہی حنفیوں کا مسلک ہے اور بیشتر محدثین کا بھی یہی مسلک ہے۔ ان محدثین میں امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ بھی شامل ہیں، یہی جمہور کا مسلک ہے اور یہی وہ قول ہے جس کی عام طور پر تائید کی گئی ہے۔

بعض لوگوں کا جو یہ گمان ہے کہ "ماہر اور عارف کی جرح مبہم مقبول ہوتی ہے اور یہی مسلک جمہور علماء کا بھی ہے نیز یہی محدثین اور اصولیین کے نزدیک صحیح مسلک ہے" تو آپ نے

جان لیا ہوگا کہ یہ قاضی ابوبکر باقلانی اور بعض اصولیوں کی ایک رائے ہے۔ محققین کے نزدیک کوئی مستقل مسلک نہیں ہے۔ بالفرض مستقل مسلک بھی ہو تو امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ کے ایسے ماہرین و حذاقِ حدیث کے مسلک کے مقابلے میں قاضی باقلانی کے مسلک کا کوئی مقام نہیں۔

ازالۂ شک

ابن صلاح نے اپنے "مقدمہ" میں اس مسلک کو صحیح قرار دیتے ہوئے کہ جرح مبہم مطلقاً معتبر نہیں ہے، خیال ظاہر کیا ہے کہ "اس موقع پر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ "راویوں پر جرح اور ان کی بیان کردہ احادیث کے رد و قبول کے معاملے میں سارا دار و مدار ان تصانیف پر ہے جو جرح یا جرح و تعدیل کے موضوع پر ائمہ حدیث نے تصنیف کی ہیں اور ان مصنفین کا معاملہ یہ ہے کہ سبب جرح (و تعدیل) کے بیان کی طرف بہت ہی کم توجہ کرتے ہیں، بس اتنا ہی کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں "یہ راوی ضعیف ہے" "یہ راوی کچھ نہیں ہے" وغیرہ یا "یہ حدیث ضعیف ہے" یا "یہ حدیث ثابت نہیں ہے" وغیرہ تو اگر سبب جرح کا اظہار و بیان ضروری قرار دیا جاتا ہے تو اکثر و بیشتر جرح کا دروازہ بند ہی رہے گا اور سارا معاملہ تعطل کا شکار ہو کر رہ جائے گا" اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جرح کے اور حکم حدیث کے اثبات کے سلسلے میں ہم ان مصنفین پر دار و مدار نہیں مانتے ہیں بس اس حد تک دار و مدار رہتا ہے کہ جس حدیث کے بارے میں ان مصنفین نے مذکورہ الفاظ کہے ہیں ان کے قبول کرنے میں اس بنا پر ہم توقف سے کام لیتے ہیں کہ ان الفاظ مذکورہ نے ایک قوی شک پیدا کر دیا ہے جس کے بعد توقف سے کام لینا ضروری ہو گیا ہے، اب اگر حدیث اور راوی کے بارے میں تحقیق اور جستجو کے نتیجے میں یہ شک رفع ہو گیا تو توقف ختم کر کے ہم اُسے قبول کر لیں گے مثلاً کچھ ایسے راوی ہیں جن کے بارے میں دوسرے ائمہ حدیث نے اسی طرح کی مبہم جرح سے کام لیا ہے لیکن امام بخاری اور امام مسلم اور اسی درجے کے دوسرے اماماِن حدیث نے ان کی روائتیں قبول کی ہیں تو ان کے بارے میں کتب مصنفہ جرح و تعدیل سے جو توقف عارض ہو گیا تھا وہ ختم ہو جائے گا۔"

جرح مبہم کے بارے میں مشہور اور صحیح مسلک — یعنی عدم قبول — کے سلسلے میں اس نادر نکتہ کو جو ابن صلاح نے پیش کیا ہے، اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے، اور ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو نہ حدیث کی معرفت رکھتے ہیں نہ اصول و فروعِ حدیث کی، ایسی حدیثوں کو محض اُن مبہم اقوال اور غیر مشرح جرح کی بنا پر جو نقادان حدیث نے ان کے راویوں کے بارے میں کہہ دیئے ہیں۔

ضعیف اور کمزور قرار دینے کی طرف مت جھپٹیے!

اللہ تعالیٰ ہی سے ہمارے زمانے کے ان لوگوں کے اس طرز عمل کے بارے میں فریاد کی جاسکتی ہے جو ہمارے متقدمین ائمہ شریعت کے طریقے کے برخلاف بغیر غور و فکر کے اور بلا محنت اور دور بینی سے کام لے کر قوی کو ضعیف اور صحیح کو کمزور کرنے کی طرف دوڑے پڑتے ہیں۔

ایک نکتہ اور!

علامہ حافظ ابن حجر نے اپنی تصنیف "نخبۃ الفکر" اور اس کی "شرح" میں جرح مجمل و مبہم کے بارے میں ایک نیا پہلو اختیار کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ وہ راوی جس کے بارے میں کسی ناقد حدیث نے معتبر ہونے کی کوئی بات نہیں کہی ہے (یعنی وہ تعدیل سے خالی ہے) اس کے حق میں جرح مبہم مقبول ہو جائے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ جب راوی تعدیل سے خالی ہے تو وہ "مجہول" (جس کا حال کسی کو نہیں معلوم) کے درجے میں ہوا اور مجہول کے حق میں جرح کرنے والے کے اقوال کو بامعنی قرار دینا، مہمل ٹھہرا دینے سے بہتر ہے، ہاں جس راوی کی توثیق کی گئی ہے اور وہ عادل بتایا گیا ہے اس کے بارے میں جرح مبہم بے شک قبول نہیں کی جائے گی۔

علامہ حافظ ابن حجر کا یہ قول اگرچہ علامہ ابن صلاح وغیرہ کی تحقیق کے خلاف جاتا ہے کہ وہ جرح مبہم کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتے ہیں، پھر بھی یہ پسندیدہ قول ہے اور عمدہ نکتہ یہی ہے، اس قول ابن حجر کے بعد سمجھ لینا چاہیے کہ جرح اور تعدیل کے بارے میں چار مسلک نہیں بلکہ پانچ مسلک ہیں۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا　　ہر ایک کی ایک سمت ہے جو جدھر وہ منہ کیے
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔　　ہوتے ہے تو تم بھی نیکیوں کی طرف سبقت کرو

BOMBAY ANDHRA TRANSPORT Co.
(TRANSPORT CONTRACTORS)
113, BHANDARI STREET (CHAKLA)
BOMBAY - 3

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم

حضرت شاہ ولی اللہ اور اکابر جماعت دیوبند کی نظر میں

محمد منظور نعمانی

(۲)

[گزشتہ اشاعت میں اس سلسلہ کی پہلی قسط شائع ہو چکی ہے جس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ایک مفصل مکتوب کئی صفحہ کا درج کیا جا چکا ہے جو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ہی سے متعلق ہے۔ اس میں شاہ صاحبؒ نے بلند الفاظ میں ان کی عظمت و جلالت کا اعتراف و اظہار فرمایا ہے اور ان اعتراضات اور الزامات کا جواب بھی دیا ہے جو بعض حلقوں کی طرف سے ان پر لگائے جاتے ہیں — اس مضمون کا بقیہ حصہ اس شمارہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔]

جماعت دیوبند کے اکابر میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا مقام سمجھا جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ اپنی کتاب "بستان المحدثین" میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں۔

"شیخ تقی الدین ابن تیمیہ سے یہ بات بطور تواتر و شہرت نقل ہے کہ آپ نے سورۂ نوح کی تفسیر ایک سال تک بیان کی۔ ذہبی نے اس واقعہ کو اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ سبحان اللہ امت مرحومہ کو بھی اس ذات مقدس علیہ الصلوٰۃ والتحیہ کے طفیل جن کی دعا "رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا" تھی، کیسی وسعت علمی نصیب ہوئی کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"

(اردو ترجمہ بستان المحدثین صد ۱۲۹)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی اس عبارت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ شیخ الاسلام

نیمیہ کے بارے میں کیسی بلند رائے رکھتے ہیں اور اُن کی علمی رفعت و جلالت کو رسول اللہ صلی اللہ ہ وسلم کی دعا قرآنی "رَبِّ زِدْنِي عِلْماً" کا صدقہ اور اس کی برکات میں سے سمجھتے ہیں کیا کسی رو زندیق یا مبتدع کے بارے میں کسی عالم ربانی کے قلم سے ایسے کلمات نکل سکتے ہیں۔

"بستان المحدثین" کی اس عبارت سے یہ بات بھی واضح طور پر معلوم ہوگئی کہ مطبوعہ فتاویٰ عزیزی ، ایک مقام پر سیاق و سباق سے بالکل غیر متعلق اور بے جوڑ جو چند سطریں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے ے میں چھپی ہوئی ہیں جن میں اُن کی طرف وہی غلط باتیں منسوب کی گئی ہیں، جو ان کے بعض معاند یا ناواقف لفین نے لکھی ہیں (اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے مذکورہ بالا مکتوب میں اُن کا تفصیل کے تھ مدلل رد کیا ہے) وہ سطریں شاہ عبدالعزیز صاحب کی ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ یہ بات ناقابلِ فہم ، کہ ان کو اپنے والد ماجد اور معلم و مربی حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اس اہم مکتوب کی خبر نہ ہو، یا ن تیمیہ کے بارے میں وہ اُن کے خلاف رائے رکھتے ہوں، جبکہ ان کو شیخ الاسلام کی کتابوں کے و راست مطالعہ کا وہ موقع بھی نہیں ملا جو حضرت شاہ ولی اللہ کو ملا تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ "فتاویٰ عزیزی" کے نام سے جو مجموعۂ فتاویٰ چھپا ہوا ہے ، کی نوعیت اور تاریخی حیثیت یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی وفات سے تقریباً ۱۰۰ ال کے بعد جبکہ شاہ صاحب کے شاگرد بھی اس دنیا میں نہیں رہے تھے مطبع مجتبائی دہلی کے نی و مالک مولوی عبدالاحد مرحوم نے اپنے شناسا بعض علماء سے یہ کام لیا تھا کہ شاہ عبدالعزیز احب کے جو فتاویٰ کہیں سے حاصل ہو سکیں وہ ان کو ایک مجموعہ میں مرتب کر دیں، انہی حضرات نے اس طرح یہ مجموعہ مرتب کیا تھا جیسا کہ "فتاویٰ عزیزی" کے دیباچہ میں خود مولوی عبدالاحد رحوم نے لکھا ہے ـــــ اس طرح جو چیزیں مرتب کی جاتی ہیں ظاہر ہے کہ اُن کا درجہ مستند تصنیف نہیں ہوتا اور بسا اوقات ان میں غیر صحیح اور غیر مستند چیزیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ن فتاویٰ عزیزی" میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے متعلق ان سطروں کے علاوہ بھی بعض ایسے مسائل وجود ہیں جن کی نسبت حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔

اگر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فتاویٰ کو شاہ اسحاق صاحب یا مولانا عبدالحی صاحب جیسے ناہ صاحب کے کوئی معتمد شاگرد مرتب کرتے تو یقیناً اس طرح کی چیزیں شامل نہ ہو سکتیں۔

مطبوعہ "فتاویٰ عزیزی" کے سلسلہ میں سارا اعتماد مولوی عبدالاحد صاحب اور اُن حضرات پر کرنا پڑتا ہے جن سے اُنھوں نے اس سلسلے میں کام لیا اور ان حضرات کی واقفیت کا حال یہ ہے کہ اس کے شروع میں ۱۰۔۱۲ صفحہ کا جو مقدمہ ہے جس میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے حالاتِ زندگی لکھے گئے ہیں اُن میں لکھا ہے۔

بعد حضرت مولانا ہر سہ برادران ایشاں قائمقام ایشاں شدند و بدرس وتدریس مشغول گشتند۔ صہ۱۱	حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کی وفات کے بعد اُن کے تینوں بھائی (شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی) اُن کے جانشین ہوئے اور تعلیم وتدریس کا کام انھوں نے سنبھالا

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے یہ تینوں بھائی جو عمر میں ان سے چھوٹے تھے، یکے بعد دیگرے ان کے سامنے ہی وفات پا چکے تھے۔ اور جب ۱۲۳۹ھ میں شاہ صاحب کی وفات ہوئی تو اُن کے بھائیوں میں سے کوئی بھی باقی نہیں تھا۔

مطبوعہ "فتاویٰ عزیزی" کی نوعیت اور اُس کے استناد کے بارے میں یہاں یہ گفتگو صرف اس لیے کی گئی ہے کہ اس میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بارے میں جو چند سطریں چھپی ہوئی ہیں جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی مستند تالیف "بستان المحدثین" کی مندرجۂ بالا عبارت کے صریح خلاف ہیں وہ کسی کے لیے باعثِ خلجان نہ بنیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو ان باتوں کا کچھ بھی ادراک دیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ سطریں ہرگز شاہ عبدالعزیز صاحب کی نہیں ہو سکتیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد ہمارے اسلاف اور اکابر میں جس نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم کی کتابوں کا براہِ راست زیادہ مطالعہ کیا ہے وہ استاذنا حضرت مولانا سید انور شاہ قدس سرہٗ ہیں۔ وہ اپنے درسِ حدیث میں مختلف مسائل ومباحث میں ان دونوں حضرات پر تعاقب کر شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر بعض اوقات سخت تنقید بھی فرماتے تھے، لیکن ان کی علمی عظمت وجلالت کا بلند الفاظ میں اعتراف بھی فرماتے تھے وہ ان کو "جبل العلم"[۵] اور "بحرٌ لا ساحل لہ"[۶] فرمایا کرتے تھے۔ اُن کی ایک تقریر کا ؟؟

---

۵ علم کے پہاڑ۔ ۶ سمندر نا پیدا کنار۔

بھی اوپر گزر چکا ہے، اس کے علاوہ اُن کی تصانیف میں بھی اس کی شہادت محفوظ ہے۔

اپنے رسائل "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسٰی علیہ السلام" اور "اکفار الملحدین" وغیرہ میں جس طرح وہ دوسرے اکابر علماء متقدمین کا احترام سے ذکر فرماتے ہیں، اسی طرح اور اسی احترام سے ان دونوں بزرگوں کا بھی ذکر فرماتے ہیں اور ان کی تصانیف سے استناد کرتے ہیں، اور اُن کے نام کے ساتھ "رحمہ اللہ" لکھتے ہیں ——— "عقیدۃ الاسلام" میں "شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی مشہور تصنیف "الجواب الصحیح" اور ابن القیم کی "ہدایۃ الحیارٰی" سے وہ عبارتیں نقل فرمانے کے بعد جن میں ان دونوں حضرات نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی حیات کے بارے میں اپنا وہی عقیدہ ظاہر فرمایا ہے اور اسی کو کتاب و سنت سے ثابت کیا ہے جو جمہور اُمت کا عقیدہ ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں

وقد علم بھٰذہ العبارات	ان عبارتوں سے ان دونوں بلند ترین
اعتقاد ھٰذین الطودین	اور عظیم ہستیوں (ابن تیمیہ و ابن القیم) کا اس
العظیمین فی ھٰذہ المسألۃ و	مسئلہ حیات مسیحؑ میں عقیدہ معلوم ہو گیا اور
ھو حیاتہ علیہ السلام علیٰ	وہ اُن کی حیات کا عقیدہ ہے جیسا کہ ہمیشہ
ما استمر اجماع اھل الاسلام علیہ حمشہ	سے اُمتِ مسلمہ کا اس پر اجماع رہا ہے۔

اور "اکفار الملحدین" میں حافظ ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "الصارم المسلول" سے چند عبارتیں نقل فرمائی ہیں، ان کے شروع میں بطور تمہید حضرت شاہ صاحب ارقام فرماتے ہیں۔

"قطرۃ فی بحرۃ من کتاب'	حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب
'الصارم المسلول علی شاتم الرسول'	"الصارم المسلول علی شاتم الرسول" کے
للحافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ	سمندر سے ایک قطرہ جس میں ثابت کیا گیا ہے
فی ان الحاق نقص او شین الحضرۃ	کہ انبیاء علیہم السلام کو کسی عیب اور نقص سے
الانبیاء علیہم السلام کفر بل	آلودہ کرنا کفر ہے اور بھرپور کفر ہے اور
کل الکفر واستوعب فی کتابہ	مصنف ممدوح نے اپنی اس کتاب میں اس
ھٰذہ المسألۃ واوعب من	مسئلہ کے تمام اطراف و جوانب پر کلام کیا ہو۔

الکتاب والسنۃ والاجماع و اور نصوص کتاب و سنت اور اجماع و قیاس
القیاس۔" (الکفار الملحدین صنے) سے پوری طرح مبرہن کیا ہے۔

اسی طرح ہمارے شیخ المشائخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نور اللہ مرقدہ نے "بذل المجہود فی حل ابی داؤد" میں جہاں جہاں ان بزرگوں کا نام نقل کیا ہے یا کسی سلسلہ سے ان کا ذکر فرمایا ہے ہر جگہ ان کا نام پورے اعزاز و احترام سے لیا ہے۔ کہیں "شیخ الاسلام ابن تیمیہ" اور کہیں "الحافظ ابن تیمیہ" لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو مثلاً بذل المجہود جلد ۲ صفحہ ۲۲ وجلد ۲ صفحہ ۲ وجلد ۵ صفحہ ۱۲۵۔

علیٰ ہذا شیخ ابن القیم کو بھی کہیں الحافظ ابن القیم اور کہیں شیخ الاسلام ابن القیم کے الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو جلد ۵ صفحہ ۳۱۔

یہی رویہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں حضرت علامہ عثمانیؒ کا بھی ہے کتاب الایمان کے بالکل شروع میں ایمان سے متعلق جو اصولی بحث چند صفحات پر ہے اس میں کم از کم ۸۔۱۰ جگہ حافظ ابن تیمیہ کا حوالہ ہے اور ہر جگہ الحافظ ابن تیمیہؒ یا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھا ہے۔

اس سلسلہ میں حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے دو ملفوظ بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں ملفوظ حضرت کے مجموعہ ملفوظات "الفصل للوصل" میں منقول ہیں —— ان دونوں ملفوظوں کی روح یہی ہے کہ مسائل اور تحقیقات میں بہت سے اختلافات کے باوجود ان حضرات (شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن القیم) کے ساتھ ہمارے اکابر کا رویہ ادب و احترام کا ہے جیسا کہ امت کے اکابر علماء کے ساتھ ہونا چاہیے۔

فرمایا۔ ابن القیمؒ اور ابن تیمیہؒ دونوں استاد شاگرد بہت سے مسائل میں متفرد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جماہیر علماء ان سے خوش نہیں۔ لیکن باوجود اس کے خود علماء ان کے علم و فضل کی بہت عظمت کرتے ہیں۔

ایک عالم صاحب سے کسی نے ان کے متعلق دریافت کیا کہ یہ دونوں بزرگ کس پایہ کے تھے؟ انھوں نے ایک عجیب عنوان سے جواب دیا کہ "علمهما اكثر من عقلهما" یعنی ان دونوں کا علم و فضل ان کی عقل و اجتہاد سے زیادہ ہے، اس وجہ سے ان کا صحیح درجہ بھی بتا دیا کہ ان کی نقل تو معتبر ہے مگر ان کا اجتہاد جمہور کی خلاف میں غیر معتبر ہے اور ان کے احترام کو

کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ (الفضل للوصل ص۳۲۹)

دوسرا ملفوظ توسل کے مسئلہ سے متعلق کئی صفحہ کا ایک طویل ملفوظ ہے گویا اس مسئلہ پر حضرت حکیم الامتہؒ کی ایک مبسوط تقریر ہے ـــــ اس میں سے صرف وہ حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن میں توسل کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے مسلک اور اس کے بارے میں اپنی رائے اور تحقیق کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

..... فرمایا کہ "اوّل میں ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مذہب بیان کیے دیتا ہوں۔ پھر توسل کی حقیقت عرض کروں گا۔

ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ توسل اعمال صالحہ سے تو مطلقاً جائز ہے اور اعیان میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ زندہ ہوں تو یاں معنی جائز ہے کہ ان سے دعا کی درخواست کی جاتی ہے۔ اور اموات سے ناجائز کیونکہ وہاں یہ معنی متحقق نہیں اور اس پر احادیث سے استدلال کیا گیا ہے ....."

۔ توسل بالاعمال کو تو ابن تیمیہ بھی جائز کہتے ہیں، اگر میں ان کے زمانہ میں ہوتا یا وہ میرے زمانے میں ہوتے تو میں نہایت ادب سے عرض کرتا کہ حضرت اس توسل بالاعمال کی حقیقت ہے کیا! میری سمجھ میں تو اس کی حقیقت یہ آئی ہے کہ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اے اللہ فلاں عمل کے طفیل و صدقہ میں یہ کام کر دے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اے اللہ یہ عمل آپ کے نزدیک محبوب ہے اور آپ کا وعدہ ہے کہ آپ کے عمل محبوب سے جس کو تلبس ہو اس پر خاص رحمت ہوتی ہے اور اس عمل کے ساتھ ہم کو بھی کسب اور صدور کا تلبس ہے لہٰذا اس تلبس پر جو وعدہ رحمت کا ہے ہم آپ سے اس رحمت کو طلب کرتے ہیں۔

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اگر کوئی توسل بالاعیان بھی کرے تو توسل بالاعیان اور توسل بالاعمال میں کیا فرق ہے؟ پھر خواہ وہ اعیان احیاء ہوں یا اموات، کیونکہ اب اس توسل بالاعیان کا حاصل یہ ہوگا کہ اے اللہ یہ بزرگ زندہ یا مردہ آپ کے محبوب ہیں اور آپ کا وعدہ ہے کہ آپ کے محبوب سے جس کو تلبس ہو اس پر رحمت ہوتی ہے اور ہم کو ان بزرگ کے ساتھ عقیدت و محبت کا تلبس ہے اس لیے ہم آپ کی اس رحمت موعودہ کے طلب گار ہیں۔

اب فرمائیے کہ اس میں احیاء اور اموات کا کیا فرق رہ گیا۔ مجھ کو یقین ہے کہ اس حقیقت

کے واضح ہو جانے کے بعد ابن تیمیہؒ اگر زندہ ہوتے تو علی الاطلاق توسل بالاعیان الموتیٰ کی ممانعت سے رجوع فرما لیتے۔

الفصل للوصل ص۳۳۲ تا ص۳۳۹

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ سابق مکتوب سے لے کر حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ کے اس ملفوظ تک جو حوالے دیئے گئے ہیں وہ یہ جاننے کے لیے کافی ہیں کہ جماعت دیوبند کے اکابر و اساطین بہت سے مسائل میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیم سے اختلاف رائے کے باوجود ان کو اکابر علماء امت میں سمجھتے تھے اور امت کے دوسرے اکابر علماء متقدمین کی طرح اُن کا ذکر بھی عظمت و احترام کے ساتھ کرتے تھے جس کی حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے مکتوب میں خاص اہتمام سے وصیت اور تاکید فرمائی ہے[۱]

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا، امید ہے کہ اس سے واقف ہونے کے بعد کسی کو بھی اس میں شک

---

[۱] یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ راقم سطور اس سے ناواقف نہیں ہے کہ ان حضرات شیخین (ابن تیمیہ وابن قیم) کے بارے میں ہمارے بزرگوں میں سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں شدت تھی۔ لیکن ان کے اکابر اور اساتذہ میں سے کسی کی بھی وہ رائے نہیں تھی۔ بلکہ حضرت مولانا اس میں متفرد تھے اور اس کے کچھ خاص اسباب تھے جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں ناچیز راقم سطور نے ایک مفصل نیاز مندانہ عریضہ بھی حضرت مولانا کی خدمت میں لکھا تھا جس میں ان چیزوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا جو اس مضمون میں عرض کی گئی ہیں ـــــ مجھے پوری امید تھی کہ میری ان معروضات کے ملاحظہ کے بعد حضرت مولانا کی رائے میں وہ شدت نہیں رہے گی۔ میں نے اس عریضہ میں یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ اس کا جواب مطلوب نہیں ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس پر غور فرما لیا جائے۔

اس کے بعد مجھے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا اور میں نے معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ میرے اس عریضہ کا کوئی اثر حضرت مولانا کی رائے پر پڑا یا نہیں۔ لیکن حضرت کے رویہ سے میں نے یہی سمجھا کہ غالباً وہ شدت باقی نہیں رہی ـــــ والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

شبہ کی گنجائش نہیں رہے گی کہ "الجواہر البھیۃ" میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ و حافظ ابن القیم اور حافظ ابن کثیر اور اُن کے مکتبِ فکر کے بارے میں جن آراء کا اظہار کیا گیا ہے اور جس زبان میں کہا گیا ہے[1] وہ اکابر جماعتِ دیوبند کے مسلک و رویہ سے بالکل مختلف ہے۔ اور اس تحریر کا مقصد و مدعا بس اتنا ہی تھا کہ دار العلوم دیوبند کی طرف مصنف کے انتساب سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔

آخر میں اتنا عرض کر دینا اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی مخالفت اور حمایت میں گزشتہ ۵۔۶ صدیوں میں اُمت کی خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ اگر ان سب کا صرف ایک ایک نسخہ جمع کیا جائے تو ایک اچھا خاصا کتب خانہ ہو جائے گا۔ اس لیے اس موضوع پر لکھنے کی اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ تاہم اگر کوئی صاحب لکھنا چاہیں تو انھیں کم از کم آلوسی زادہ کی جلاء العینین کا مطالعہ ضرور کر لینا چاہیے۔

---

[1] الفرقان کے گزشتہ شمارہ میں اس مضمون کی پہلی قسط پڑھ کر بعض حضرات نے اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ دار العلوم دیوبند اور جماعتِ دیوبند سے انتساب رکھنے والے کسی عالم اور مصنف نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ و حافظ ابن القیم اور اسماعیل بن کثیر کی تکفیر کی ہے اور الخبیث اللعین اور الملحد الزندیق جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں —— درحقیقت یہ بات حیرت و استعجاب ہی کے لائق ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے —— الجواہر البھیۃ کے صفحہ ۲۸۴ پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بارے میں لکھا ہے —— وهذا الخبيث اللعين لا يعرج على ما فيه التنزيه وانما يتبع المتشابه (الى ان قال) فالمجسمة والمشبهة اهل زيغ وكفار فمن اشبه اوعطل فماواه النار وكان على هذا الاعتقاد الفاسد تلميذه ابن القيم الجوزية الزرعى واسماعيل بن كثير" —— پھر صفحہ ۲۹۴ پر حافظ ابن القیم کے بارے میں لکھا ہے۔ "ولا يستحي من الله ولا من الناس هذا الملحد والزنديق" پھر صفحہ ۲۹۶ پر حافظ ابن القیم ہی کے بارے میں لکھا ہے "هذا المتخلف النحس فهو الملحد والزنديق عليه لعنة الله واخزاه الله يوم الميعاد"
یہ عبارتیں دراصل نقل کرنے کے لائق نہیں تھیں۔ لیکن بعض خطوط ایسے آئے جن کی وجہ سے ان کا الفرقان میں نقل کر دینا ضروری معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اصلاح فرمائے اور غلطیوں کے تدارک کی توفیق دے۔

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار

حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم۔ اے

رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

مرورِ ایام سے آفتابِ نبوت کی کرنیں جتنی مدھم ہوتی جارہی ہیں اسی نسبت سے تاریکی کی تہوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ دین سے بے رغبتی بڑھ رہی ہے دُنیا کی محبت غالب آرہی ہے۔ ایمان و عمل اور اخلاق و آداب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کا احساس مٹ رہا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں ایسی گرہیں پڑتی جارہی ہیں کہ ناخنِ تدبیر انھیں کھولنے سے عاجز نظر آتا ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ پستی اور زوال کے اسباب و علل کی جستجو کوئی مشکل کام نہیں۔ اربابِ تذکرہ، تراجم اور رجال و تاریخ نے اسلام کے روزِ اول سے تا امروز ملتِ مسلمہ کی مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی حالت کی پوری تصویر پیش کردی ہے اور اس عہدِ تاباں کا ایک ایک نقش ہمارے سامنے اُجاگر کردیا ہے جب نفوسِ بشریہ تہذیب و اخلاق کے ذروۂ کمال تک پہونچ گئے تھے۔ ذرا اس آئینہ میں ہم اپنا عکس تو دیکھیں۔ آج ہمارے اعمال شاہدِ عدل ہیں کہ اقرارِ ایمان کے باوجود ہمیں خدا اور رسول کے وعدوں پر اعتبار نہیں رہا۔ صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین اور اصفیاء کے وہ نقوشِ قدم ہماری شہوتِ نفسانی کے غبار میں گم ہو کر رہ گئے جو فلاح و کامرانی کی راہ کے ضامن تھے۔

اس وقت سب سے اہم ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم گزشتہ عہدِ تاباں کے اس نگارخانے کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں جس میں ہر طرف اسلام اپنی پوری زندگی و تابانی کے ساتھ مجسم و متحرک

نظر آتا ہے۔ ذیل میں ناظرین کرام کو اسی گزری ہوئی فصل بہار کی ایک جھلک دکھانا مقصود ہے۔ مکمن ہے اس کے مطالعہ سے کسی ایک مرد مسلم کے نہاں خانۂ دل میں گرمی اور سوز پیدا ہو جائے۔

واضح رہے کہ ذیل میں جو کچھ پیش خدمت ہے بہت یہ راقم کی غیر مطبوعہ کتاب "تبع تابعین" حصہ دوم سے ماخوذ ہے (جو انشاء اللہ عنقریب دار المصنفین سے شائع ہوگی) اس لیے دوسرے طبقوں مثلاً صحابہ و تابعین کے فضائل اخلاق کا ذکر اس میں نہ ملے گا۔

عفان بن مسلم | امام عفان بن مسلم اپنے عہد میں حدیث کے قلعہ معلّی کا اہم ستون شمار ہوتے تھے۔ بغداد میں ان کی ذات علم کا شمع تھی۔ جہاں سے اقصائے عالم کے تشنگان علم نے سیرابی حاصل کی۔ ابن عماد حنبلی انھیں "احد ارکان الحدیث" اور حافظ ذہبی "محدث بغداد" لکھتے ہیں۔[1]

انھیں خلیفہ ہارون الرشید کی طرف سے پانچسو درہم ماہانہ وظیفہ ملتا تھا اور اسی پر ان کی معیشت کا زیادہ تر مدار تھا۔ لیکن جب معتزلہ کے اثر سے خلق قرآن کا فتنہ گرم ہوا تو مامون نے بغداد کے نائب حاکم اسحاق بن ابراہیم کے نام ایک فرمان بھیجا اور اس میں تمام مقامی فقہاء و محدثین سے عقیدہ خلق قرآن کا اقرار لینے کا حکم دیا۔ اس فرمان میں مامون نے عفان بن مسلم کے بارے میں خصوصیت کیساتھ یہ لکھا کہ

امتحن عفان وادعه إلى أن	(امام) عفان کی جانچ کرو اور ان کو عقیدۂ
يقول القرآن كذا وكذا فإن	خلق کا اقرار کرنے کی دعوت دو۔ اگر وہ اس
قال ذلك فأقره على أمره	کے قائل ہو جاتے ہیں تو ٹھیک لیکن اگر وہ
وان لم يجبك الى ما كتبت	تمہاری بات قبول نہ کریں تو پھر ان کا وظیفہ
به اليك فاقطع عنه الذى	بند کر دو۔
يجرى عليه	

خود امام عفان ہی کا بیان ہے کہ "اسحاق نے فرمان کی یہ سطریں مجھ کو سنائیں، تو میں نے

[1] شذرات الذہب ج ۲ ص ۴۷، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۴۸، میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۰۲

اس کے جواب میں سورۂ اخلاص پڑھی اور کہا یہ مخلوق ہے؟ اسحاق نے بڑے طیش سے کہا کہ جناب امیرالمومنین کا حکم ہے "اگر آپ قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہیں کرتے تو آپ کو ملنے والا پانچسو درہم ماہانہ کا وظیفہ بند کردیا جائے گا۔"

اس دھمکی کے جواب میں ابن مسلم نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ جو جواب دیا وہ زندہ رہنے والی چیز ہے، فرمایا۔

یقول اللہ عز وجل وفی السماء رزقکم وما توعدون	اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور آسمان میں ہے روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا ہے

اسحاق یہ جواب سن کر بالکل مبہوت رہ گیا۔ اور عفان مکان واپس آگئے اس کے بعد ابراہیم بن الحسین بیان کرتے ہیں کہ جب عفان کی مالی امداد منقطع کردی گئی اور وہ گھر واپس آئے تو اہل خانہ نے واقعہ سن کر ان کو سخت لعنت ملامت کی۔ اس وقت ان کے یہاں چالیس نفوس کھانے والے تھے۔ اسی اثناء میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دیکھا گیا کہ ایک عجیب و غریب شکل کا شخص کھڑا ہے، اس کے ہاتھ میں ایک ہزار درہم کی تھیلی تھی۔ اس نے امام عفان کو وہ تھیلی دیتے ہوئے کہا۔

ثبتک اللہ کما ثبت الدین وھذا فی کل شھر لہ	جس طرح تم نے دین کو مستحکم کیا خدا تمہیں بھی استقامت عطا فرمائے۔ تم کو ہر ماہ اسی طرح ایک ہزار کی تھیلی ملتی رہے گی۔

امام عفان نے حق کے معاملے میں کبھی نہ تو ارباب سطوت کے سامنے سر خم کیا اور نہ مال و زر کی حرص ان کے پایۂ استقامت کو متزلزل کرسکی جس کی ایک مثال اوپر گزر چکی ہے۔ اسی طرح بروایت صحیح منقول ہے کہ ایک بار ان کو دس ہزار دینار اس غرض سے دیے جا رہے تھے کہ فلاں شخص کی تعدیل کے بارے میں سکوت اختیار کرلیں۔ نہ اسے عدول کہیں اور نہ غیر عدول۔ لیکن ابن مسلم نے اس زر خطیر کو ٹھوکر مار کر فرمایا کہ

لا أبطل حقاً من الحقوق[2]	میں کسی شخص کے حق کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۷۷، میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۰۲

[2] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۳۲، شذرات الذہب ج ۲ ص ۴۸

اسی طرح حضرت فلاس سے مروی ہے کہ ایک شخص نے امام عفان کو دو ہزار دینار دیکر کہا کہ آپ فلاں آدمی کی عدالت پر مہر تصدیق ثبت فرما دیجئے۔ امام موصوف نے ایسا کرنے سے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ میں ایک غلط بات کو ہرگز صحیح نہیں کہہ سکتا۔[۱]

ابوداؤد الحفری | حافظ ابوداؤد عمر بن سعد الحفری علمی حیثیت سے نہایت باکمال ہونے کے ساتھ عبادت، انابت الی اللہ اور فقر و استغنا میں بھی نہایت بلند مقام رکھتے تھے۔ عجلی کا بیان ہے کہ تین ہزار ایسی حدیثیں ان کے خزانہ دماغ میں محفوظ تھیں جن کی حجیت اور استناد پر ماہرین فن کا اتفاق ہے۔[۲] دنیائے دل کی آبادی کا یہ عالم تھا کہ جس مقام پر وہ ہوتے وہاں کے لوگ اس جگہ کو ہر آفت اور بلا سے مامون تصور کرتے تھے۔ حافظ وکیع جیسے جلیل القدر تبع تابعی فرماتے ہیں کہ

ان کان یدفع البلاء باحد	اگر ہمارے زمانہ میں کسی کی برکت سے
فی زماننا فبابی داؤد الحفری[۳]	بلائیں دور ہوتی ہیں تو وہ ابوداؤد الحفری ہیں۔

بایں ہمہ تبحر علم و عمل ان کی زندگی قرن اولی کی سادگی، تواضع اور درویشی و قلندری کا مثالی نمونہ تھی۔ علامہ ابن سعد رقمطراز ہیں۔

کان زاھداً ناسکاً لہ فضل وتواضع[۴]	وہ زاھد، پرہیزگار، متواضع اور صاحب فضل تھے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔

"رأیت اباداؤد الحفری وعلیہ جبة مخرقة وقد خرج القطن منہا یصلی بین المغرب والعشاء وھو یترجج من الجوع[۵]	میں نے ابوداؤد الحفری کو اس عالم میں دیکھا کہ وہ پھٹا پرانا جبہ پہنے ہوئے تھے جس کی روئی نکلی پڑ رہی تھی وہ مغرب و عشا کے درمیان نماز پڑھ رہے تھے اور بھوک سے نڈھال تھے۔

[۱] میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۰۲ [۲] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۵۳ [۳] العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۴۰ [۴] [۵] صفوة الصفوة ج ۳ ص ۱۰۸

حسین بن علی الصدائی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں ابو داؤد الحفری کی قیام گاہ پر گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ انھوں نے اندر ہی سے دریافت کیا "کون ہے؟" میں نے عرض کیا "ایک حدیث کا طالب علم حاضر ہے۔ فرمایا "اچھا ذرا ٹھہرو"۔ راوی کا بیان ہے کہ اسی اثناء میں میں نے دروازے کے ایک سوراخ سے اندر جھانکا کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ ایک تہمد باندھے ادن کاٹ رہے ہیں، جس کو روزانہ بیچ کر رزق مہیا کرتے تھے۔ چنانچہ میری آواز پر ادن سمیٹ کر اٹھا کی اور اس پر ایک کپڑا ڈھا دیا پھر مجھے اندر بلایا اور حدیثیں املا کرانا شروع کیں، یہاں تک کہ کاغذ ختم ہو گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے ان کے علاوہ خالصۃً لوجہ اللہ روایت کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔

ابن عبد ربہ فرماتے ہیں کہ میں نے عباس الدوری کو اکثر یہ کہتے سنا کہ

حدثنا ابو داؤد الحفری ولو	ہم سے ابوداؤد الحفری نے حدیثیں روایت
رأیت اباداؤد الحفری لرأیت	کی ہیں اور اگر تم ان کو دیکھتے تو ایک ایسا شخص
رجلاً کانہ اطلع الی النار	پاتے جس نے گویا نار جہنم کے اندر جھانک کر
فرأی ما فیہا لہ	اس کی حقیقت دیکھ لیا ہو۔

یعنی خوف آخرت اور خشیت الٰہی سے ہر وقت لرزاں رہتے تھے۔ اسی فقر و استغنا اور دنیا سے کنارہ کشی کا نتیجہ تھا کہ انتقال کے وقت ان کے گھر میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ چنانچہ ابو حمدون جو شیخ کے جنازہ میں شریک تھے، کہتے ہیں کہ

لما دفناہ ترکت بابہ مفتوحاً	جب ہم نے ان کو دفن کر دیا تو ان کے گھر کے
ما خلف شیئاً ۲ہ	دروازہ کو کھلا چھوڑ دیا۔ کیونکہ انھوں نے
	اپنے پیچھے کچھ چھوڑا ہی نہ تھا۔

حماد بن سلمہ | جن اتباع تابعین نے علم و فضل کے چراغ روشن کرنے کے ساتھ قرطاس و قلم کے میدان میں بھی تمغۂ اولیت حاصل کیا ان میں حماد بن سلمہ بہت امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ حدیث کے تمام مجموعوں میں ان کی مرویات موجود ہیں۔ خصوصیت سے امام ابو داؤد الطیالسی نے جنھیں

لہ صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۱۰۹ ۲ہ ایضاً فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۴۰

ان سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا، اپنی مسند میں کئی سو روایتیں ان کے واسطے سے نقل کی ہیں۔

امام وقت ہونے کے باوجود وہ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے، مگر وہ بھی محض رزق کفاف کے لیے تھا۔ چنانچہ سوار بن عبداللہ اپنے والد کے واسطے سے بیان کرتے ہیں۔

کنت آتی حماد بن سلمۃ فی	میں بازار میں حماد بن سلمہ کی دکان پر برابر آیا
سوقہ فاذا ربح فی ثوب حبۃ	کرتا تھا جب کسی کپڑے میں ایک دو حبہ نافع
او حبتین شد جیوبہ وقام[1]	ہوگیا تو وہ فوراً دکان اٹھا دیتے تھے۔

یعنی جہاں سد رمق کا انتظام ہوا کاروبار بند کردیا۔

حماد بن سلمہ کی کتاب زندگی کا ہر ورق ہی نہایت تابناک ہے۔ زہد و عبادت، دنیا اور اہل دنیا سے استغنا اور امراء کی صحبت سے گریز زمرہ اتباع تابعین کی ایک عمومی و مشترک خصوصیت تھی، حماد بن سلمہ اس خصوصیت و امتیاز میں بھی نہ صرف ان کے شریک سہیم تھے بلکہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں محدث ابن جوزی نے ان کا ایک واقعہ بہت تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے ذیل میں اس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔

مقاتل بن صالح الخراسانی کا بیان ہے کہ میں ایک روز حماد بن سلمہ کے پاس گیا تو ان کے گھر میں ایک چٹائی کے سوا کچھ نہ پایا۔ اسی پر وہ بیٹھے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ ایک چمڑے کا توبڑا تھا جس میں ان کا سارا علم (یعنی روایات وغیرہ) بند تھا۔ ایک وضوء کا برتن تھا جس سے وضو کرتے تھے۔ ان ہی کا بیان ہے کہ ایک دن میری موجودگی میں کسی نے دروازے پر آواز دی۔ انھوں نے اپنی لونڈی سے کہا دیکھو بیٹی کون ہے؟ وہ واپس آکر بولی کہ محمد بن سلیمان کا قاصد ہے (غالباً وہ بصرہ کا امیر تھا) فرمایا کہ جاؤ کہدو کہ وہ تنہا میرے پاس آئے۔ وہ قاصد حاضر ہوا اور اس نے ایک خط پیش کیا جس کا مضمون یہ تھا۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ خط محمد بن سلیمان کی طرف سے حماد بن سلمہ کے نام۔ اما بعد خدا آپ کو اسی طرح سلامت رکھے جس طرح اس نے اپنے اولیاء اور اطاعت گزاروں کو

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۶۲

سلامت رکھے۔ ایک مسئلہ درپیش ہے اگر آپ تشریف لائیں تو اس کے بارے میں آپ سے استفادہ کا شرف حاصل کروں۔ والسلام۔"

خط پڑھ کر آپ نے لونڈی سے کہا کہ قلم دوات لاؤ اور اس کی پشت پر یہ جواب لکھ دو۔

"اما بعد! آپ کو بھی خدا اسی طرح سلامت رکھے جس طرح اپنے دوستوں اور فرمانبرداروں کو سلامتی عطا کرتا ہے۔ میں نے ایسے علماء کی صحبت اختیار کی ہے جو کسی کے پاس جایا نہیں کرتے تھے اس لیے میں بھی معذور ہوں۔ اگر آپ کو کوئی مسئلہ پوچھنا ہے تو آپ خود تشریف لے آئیں اور جو دریافت کرنا چاہیں دریافت کریں۔ اور ہاں اگر آنے کا ارادہ ہو تو تنہا تشریف لائیے گا۔ آپ کے ساتھ خدم و حشم نہ ہوں ورنہ میں آپ کے اور اپنے ساتھ خیر خواہی نہ کر سکوں گا۔ والسلام۔"

قاصد یہ جواب لے کر واپس چلا گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم ابھی بیٹھے ہی ہوئے تھے کہ کسی نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ لونڈی کو حکم دیا کہ دیکھو کون ہے۔ اس نے آکر کہا محمد بن سلیمان۔ فرمایا کہہ دو کہ آجائیں مگر تنہا آئیں۔ چنانچہ وہ خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد بولا کہ کیا وجہ ہے کہ جب کبھی میں آپ کے سامنے ہوتا ہوں میرے اوپر خوف و دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ حماد بن سلمہ نے ثابت البنانی کے واسطے سے حضرت انس کی یہ روایت بیان کی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب عالم علم دین کے ذریعہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس سے ہر چیز ڈرنے لگتی ہے اور جب وہ اس سے دنیا کے خزانے چاہتا ہے تو وہ خود ہر چیز سے خوف کھانے لگتا ہے۔

محمد بن سلیمان نے پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ یہ ساری باتیں سنیں اور پھر کہا کہ یہ چالیس ہزار درہم حاضر خدمت ہیں انھیں اپنی ضروریات میں صرف فرمائیں۔ ابن سلمہ نے کامل استغنا کے ساتھ فرمایا کہ انھیں لے جاؤ اور جن لوگوں پر ظلم کر کے انھیں حاصل کیا ہے ان کو دے ڈالو۔ وہ بولا کہ بخدا میں یہ اپنے خاندانی وراثت سے دے رہا ہوں۔ فرمایا مجھے اس کی ضرورت بالکل نہیں ہے۔ مجھے معاف کرو۔ خدا تعالیٰ تمہیں معاف کرے۔ تم اس رقم کو تقسیم کر دو۔ وہ بولا کہ میری تقسیم میں اگر کسی مستحق کو نہ ملا تو وہ ناانصافی کی شکایت کرے گا۔ آپ نے اس سے پھر یہی فرمایا کہ مجھے بہر حال معاف کرو۔[1]

---

[1] صفوۃ الصفوۃ لابن جوزی ج ۳ ص ۲۷۴

ابن ابی ذئب۔ محمد بن ابی ذئب نے اپنی بخت آوری سے وہ زمانہ پایا تھا جب صحابہ کرام کی فیض یافتہ ایک بڑی جماعت علم وفضل کی بساط بچھائے موجود تھی۔ اور ان کے پرتو فیض سے دنیا بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ حدیث میں مرتبہ بلند رکھتے تھے۔ اور فقہ میں خصوصی درک حاصل تھا۔ یہاں تک کہ "فقیہ اهل المدینه" ان کا لقب ہی پڑ گیا تھا۔ امام احمد کا قول ہے کہ نہ صرف اپنے ملک بلکہ دوسرے ممالک میں بھی ان کی نظیر مفقود تھی[1]۔ امام شافعی باایں ہمہ جلالت مرتبت اکثر بڑی حسرت سے فرمایا کرتے تھے۔

ما فاتنی احد فاسفت علیه	مجھے کسی اور امام سے مستفید نہ ہوسکنے کا اتنا
ما اسفت علی اللیث و ابن	افسوس نہیں جتنا اس بات کا رنج اور افسوس
ابی ذئب ۔[2]	ہے کہ مجھے لیث بن سعد اور ابن ابی ذئب
	سے کسب فیض کی سعادت نصیب نہ ہوسکی۔

ابن ابی ذئب نہایت حق گو اور بیباک واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے حق بات کہہ گزرنے سے کبھی بھی امراء اور اعیان سلطنت کے سامنے تملق اختیار نہیں کیا۔ اس معاملے میں وہ اتنے متشدد تھے کہ بسا اوقات ان کے عقیدتمندوں کو بڑی تشویش پیدا ہوجاتی تھی مگر انھوں نے اپنے اس "آئین جوانمرداں" میں تاعمر کوئی تزلزل نہ پیدا ہونے دیا۔ ان کی اس خصوصیت کا ذکر تمام ائمہ محققین نے کیا ہے۔ چنانچہ ابن حبان لکھتے ہیں۔

كان من أقول اهل زمانه	اپنے زمانہ میں وہ سب سے زیادہ حق گو
للحق۔	تھے۔

واقدی کا بیان ہے "كان رجال الناس صرامة و قولاً بالحق"[3]

امام احمد کا قول ہے

ابن ابی ذئب اقوم بالحق	ابن ابی ذئب سلاطین کے سامنے امام مالک
من مالك عند السلاطين[4]	سے کہیں زیادہ حق گو ثابت ہوتے تھے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۲

[2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۰۶۔ [3] خلاصہ تذھیب تہذیب الکمال

ان کی جرأت و بیباکی کے متعدد واقعات ملتے ہیں جن میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

محمد بن القاسم بن خلاد کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ زمانہ حج میں خلیفہ مہدی مسجد نبوی میں داخل ہوا تو تمام حاضرین نے دو رویہ کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ اتفاق سے ابن ابی ذئب بھی وہاں موجود تھے۔ مگر وہ حسب معمول بیٹھے رہے۔ مسیب بن زھیر نے جب ان سے کہا کہ "کھڑے ہو جائیے امیر المومنین تشریف لائے ہیں" تو بڑے پرسکون اور طمانیت بھرے لہجہ میں فرمایا

انما یقوم الناس لرب العالمین — صرف پروردگار عالم کے لیے لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔

شاہانہ تمکنت کے خلاف یہ جواب سن کر مقربین کی پیشانیاں شکن آلود ہو گئیں لیکن صورت حال کی نزاکت کا احساس کر کے فوراً ہی مہدی نے کہا "چھوڑ دو جانے دو"[1]

اسی طرح ایک دوسرا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ خلیفہ ابو جعفر منصور کے پاس جا کر بہت سخت الفاظ میں اس کو اس کے ظلم وجور پر متنبہ اور اس سے باز رہنے کی تلقین کرنے لگے منصور نے سب کچھ سن لینے کے بعد گردن جھکا لی اور پھر محمد بن ابراہیم سے کہا کہ:۔ "ھذا الشیخ خیر اھل الحجاز" ایک بار خلیفہ منصور نے ان سے پوچھا کہ میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ پہلے تو وہ کچھ کہنے سے انکار کرتے رہے پھر جب اس نے قسم دلا کر پوچھا تو فرمایا۔

اللھم لا اعلمک الا ظالماً جائراً — بخدا میں تجھے ظالم اور جابر خیال کرتا ہوں۔

ابن ابی ذئب نے پوری زندگی نہایت تنگدستی اور عسرت کے عالم میں گزار دی۔ یہ محض انکی دنیا زاہدانہ بے رغبتی اور استغنا کا نتیجہ تھا ورنہ اعیان سلطنت انھیں ہزاروں دینار دینا چاہتے تھے مگر وہ اسے قبول نہ کرتے۔ آخر میں میں بصد اصرار ایک ہزار دینار اس شرط پر لینا قبول کیا کہ انھیں اپنے استعمال میں نہ لائیں گے بلکہ مستحقین میں تقسیم کر دیں گے۔

یحییٰ بن سعید بیان کرتے ہیں کہ "کان ابن ابی ذئب عسراً" واقدی لکھتے ہیں کہ ابن ابی ذئب کی مالی حالت حد درجہ سقیم تھی۔ حتیٰ کہ روغن زیتون اور روٹی ان کی مستقل خوراک

---

[1] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۹۷ [2] مرآۃ الجنان ج ۱ ص ۳۴۰

تھی۔ ان کے پاس صرف ایک چادر اور ایک کرتا تھا، جاڑا اور گرمی دونوں میں اسی کو استعمال کرتے تھے۔[1]

وہ اپنے زمانے کے بہت عابد اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے، ہمہ وقت خشیت الٰہی سے لرزاں رہتے۔ عبادت و ریاضت کی انتہا یہ تھی کہ تمام رات نماز پڑھتے رہتے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ ابن ابی ذئب کی کثرت عبادت کا یہ عالم تھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کل قیامت ہوگی تو بھی ان سے مزید کسی عبادت کی گنجائش نہ ہوتی۔ لو قيل له أن القيامة تقوم غدا ما كان فيه مزيد من الاجتهاد[2] بغدادی نے ان کے بھائی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ابن ابی ذئب نے ایک زمانے تک صوم داؤدی کو معمول بنائے رکھا یعنی ایک روز صائم رہتے اور ایک روز مفطر، پھر آخر عمر میں صوم وصال شروع کر دیا تھا۔[3]

قاسم بن معن | قاضی قاسم بن معن مخزن علم کوفہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے جد امجد حضرت عبداللہ بن مسعود آسمان صحابیت کا کوکب تاباں تھے۔ قاضی قاسم نے قرآن و حدیث، فقہ و عربیت اور زبان و ادب میں مہارت ورثہ میں پائی تھی۔ امام ابو حاتم بیان کرتے ہیں۔

كان من أروى الناس للحديث والشعر وأعلمهم بالفقه والعربية[4]	وہ حدیث، فقہ اور عربیت کے لوگوں میں سب سے زیادہ واقف کار تھے۔

ابن ناصر الدین کہتے ہیں۔

كان إماما علامة ثقة قاضي الكوفة[5]	وہ امام، علامہ، ثقہ اور کوفہ کے قاضی تھے۔

علامہ ابن سعد رقمطراز ہیں۔

كان ثقة عالما بالحديث والفقه والشعر وايام الناس[6]	وہ ثقہ اور حدیث، فقہ اور شعر و تاریخ کے عالم تھے۔

فقہ و افتاء میں غیر معمولی مہارت کے باعث کوفہ کے عہدۂ قضا پر بھی ایک طویل عرصہ تک

---

[1] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۰۴ [2] مرآۃ الجنان ج ۱ ص ۳۴۰، شذرات الذہب [3] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۰۱ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۷ [5] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۰۲ [6] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۶۵

مامور رہے۔ قاضی شریک کی معزولی کے بعد انھوں نے اس فرض کو ایسی شان و شوکت، حزم و احتیاط اور انصاف کے ساتھ انجام دیا کہ ان کے جدِ امجد عبداللہ بن مسعود کے زمانہ کی یاد تازہ ہو گئی۔

ان کے استغنا اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ اپنے طویل زمانہ قضا میں کبھی مشاہرہ اور تنخواہ لینا پسند نہ فرمایا اور حین حیات تبرعاً یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ

ولی قضاء الکوفۃ ولم یرتزق	وہ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے اور زندگی بھر
علیہ حتی مات[1]	اس کا کوئی مشاہرہ نہیں لیا۔

جب ان کی خدمت میں تنخواہ پیش کی جاتی تو اس کو فوراً مستحقین میں تقسیم کر دیتے اور اس میں سے ایک حبہ بھی اپنے استعمال میں نہ لاتے تھے۔ یزید بن یحیٰ کہتے ہیں۔

کان القاسم یقسم أرزاقہ إذا	امام قاسم کے پاس جب تنخواہ آتی تو اس کو
جاءتہ ولا یستحل أن یأخذ	تقسیم کر دیتے تھے اور خود کچھ لینا جائز
رزقاً[2]	نہیں سمجھتے تھے۔

اس تبرع اور بے نیازی کے باوجود قضاءت کی منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں سرمو فرق اور کوتاہی نہ آنے دیتے۔ یہاں تک کہ شدید علالت و نقاہت کی حالت میں بھی مجلس عدالت منعقد کرتے اور پوری حاضر دماغی و دل جمعی کے ساتھ عدالتی فیصلے نافذ کرتے۔ ابن کناسہ بیان کرتے ہیں کہ قاسم سخت بیماری کے عالم میں بھی عدالت میں بیٹھتے تھے[3]۔

اسی زمانہ قضا کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے مکان کا چھجہ اتنا نیچا لگوایا کہ اس سے راہ گیروں کو دقت پیش آتی تھی۔ لوگوں نے اس معاملہ کو قاضی قاسم کی بارگاہ عدل و انصاف میں پیش کیا۔ قاضی صاحب نے اس کے انہدام کا فیصلہ صادر کیا۔ اس پر اس مالک مکان نے بغیر کسی رو رعایت کے قاضی موصوف سے کہا۔ "پھر آپ نے کیوں اپنے مکان میں سرِ راہ روزن کھلوا دیے ہیں۔" فرمایا "اس سے کسی راہ گیر کو مزاحمت نہیں ہوتی ہے" اس کے بعد فوراً اپنے بعض خدام کو حکم دیا کہ وہ پہلے جا کر ان کے مکان کے روزن بند کر دیں اور پھر بعد میں اس شخص کے چھجے کو منہدم کریں تاکہ پھر آئندہ کوئی شخص انھیں اس معاملہ میں شرمندہ نہ کر سکے[4]۔

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۶۷ [2] اخبار القضاۃ ج ۳ ص ۱۷۷ [3] ایضاً ج ۳ ص ۱۷۸ [4] ایضاً ج ۳ ص ۱۸۲

انشورنس اسلامی معیشت میں

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

عصر جدید میں معاشی اور مالی امور کی تنظیم کے جو نئے طریقے اختیار کیے گئے ہیں ان میں سے ایک انشورنس بھی ہے۔ موجودہ دور کی صنعتی ترقی اور بڑے پیمانے کی تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کی تنظیم میں اس طریقہ کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ انشورنس کئی لحاظ سے بنک کاری سے بھی زیادہ اہم ہے۔ قدرتی طور پر اسلامی طرز زندگی کے احیاء اور اس کے سلسلے میں معاشی اور مالی امور کی تنظیم نو پر غور کرتے وقت بنک کاری کی طرح انشورنس کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے۔ اس مقالے میں انشورنس کو اسی ضرورت سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ ہمارا موضوع یہ ہے کہ اگر زندگی کے تمام شعبوں کی تنظیم اسلام کے مطابق کی جا رہی ہو اور پورا معاشی اور مالی نظام اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالا جا رہا ہو تو انشورنس کے جدید طریقوں کے بارے میں ہمارا موقف کیا ہوگا۔ ہم اس کا جائزہ لیں گے کہ یہ طریقہ کن اصولوں پر مبنی ہے، کیا ان اصولوں کو اسلامی اصول زندگی کے ساتھ اختیار کر کے برتا جا سکتا ہے یا نہیں، اور ان کے اختیار کرنے اور برتنے سے کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہم اس پر بھی نظر ڈالیں گے کہ دور جدید میں ان اصولوں کو کس طرح برتا گیا اور ہم ان خرابیوں سے کس طرح بچ سکتے ہیں جو موجودہ نظام انشورنس سے وابستہ ہیں۔ آخر میں ہم اسلامی نظام میں انشورنس کی تنظیم کے سلسلے میں کچھ تجویزیں سامنے رکھیں گے۔ یہ پوری بحث محض اصولوں کی ... محدود ... زندگی اور نظام ... فنی تفصیلات ... ان ...

ماخوذ از کتاب "اسلام اور عصر جدید" نئی دہلی

ترجیحات سے جن کو تنظیم پانے والے معاشرے میں اساسی اہمیت حاصل ہو سکتی ہے؟

انشورنس کا طریقہ انسان کی ایک مفید علمی دریافت پر مبنی ہے، جس کی روشنی میں تھوڑی سی لاگت سے افراد ان حادثات کے مالی عواقب سے بے نیاز ہو سکتے ہیں جن کے وقوع کا حساب افراد کی کثیر تعداد کی نسبت سے تقریباً پوری صحت کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے۔ دوسری تمام علمی دریافتوں اور انکشافات کی طرح یہ اصول بھی اللہ کی ایک نعمت ہے جس سے استفادہ کرنا نہ صرف موزوں اور مناسب ہے بلکہ تمدنی ترقی کے لیے ناگزیر ہے اور اس میں اس "قمار" کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ اسلامی نظام میں انشورنس کی تنظیم اس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ ہر طرح کے ناجائز عناصر سے پاک اور سماج کے لیے خیر و برکت کا موجب ہو۔ جدید انشورنس میں سود سرایت کیے ہوئے ہے مگر یہ اس نظام کا لازمی جز نہیں ہے۔ سود کے بغیر بھی انشورنس کی تنظیم ممکن ہے۔ اس تنظیم کے سلسلے میں یہ سوال بہت اہم ہے کہ اسے نفع کمانے کے لیے نجی کاروبار کا میدان بنا دیا جائے یا اس کی تنظیم ایک بنیادی خدمت کے طور پر ریاست خود کرے۔ ہمارے نزدیک زندگی کے بیمے اور دوسرے اہم دائروں میں انشورنس کو ریاست کی تحویل میں ہونا چاہیے اور اسے کفالتِ عامہ اور سماجی تحفظ کے وسیع تر نظام سے مربوط کر کے منظم کرنا چاہیے۔ البتہ انشورنس کے کچھ مخصوص دائروں میں جو مقابلتاً کم اہمیت رکھتے ہیں نجی کاروبار اور تعاونی انجمنوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ انشورنس، سماجی تحفظ، کفالتِ عامہ اور مالیاتِ عامہ کے باہم مربوط نظام سے ایک ایسی فضا قائم ہونی چاہیے جو سماج میں حاجت روائی اور ہمواری و مساوات کے پہلو بہ پہلو معاشی کارکردگی کی بحالی، اس میں اضافے اور مجموعی طور پر معاشی تعمیر و ترقی کے لیے سازگار ہو۔

اس مقالہ کا بنیادی مقصد ایک اسلامی معاشرے کے سیاق میں انشورنس کے مسائل کی تنقیح و تحقیق ہے، اس لیے ان حضرات سے جو اسلام اور معاشیات دونوں پر نظر رکھتے ہیں، اس پر غور و بحث کی بھی درخواست ہے۔

خطر اور عدم تیقن انسانی زندگی میں

انسانی زندگی میں خطر RISK اور عدم تیقن INCERTAINTY

سے مفر نہیں۔ اکثر انسانی سرگرمیاں پُر خطر اور غیر یقینی حالات میں انجام پاتی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ ہم چھوٹے خطر اور معمولی بیم کے عادی ہو جاتے ہیں لیکن معاشی سرگرمیوں کا دائرہ ایسا ہے جہاں اس خطر اور عدم تیقن کے ساتھ مالی خسارے کا اندیشہ یا..... مالی نفع کی اُمید یا دونوں ہی وابستہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہم کو متعلقہ خطر یا عدم تیقن کا زیادہ احساس رہتا ہے۔

تمام انسانی سرگرمیاں زمانۂ حال میں انجام پاتی ہیں جب کہ ان کے نتائج مستقبل میں برآمد ہوتے ہیں۔ ان کا محرک بھی مستقبل میں کسی مفاد یا مصلحت کی تکمیل، کسی مرغوب چیز کو حاصل کرنا یا کسی ناگوار چیز سے بچنا ہوتا ہے۔ ماضی کا طویل تجربہ، موجودہ حالات کا جائزہ اور ان قوانین فطرت کا علم جو کائنات میں حکمراں ہیں، ہمارے اقدامات اور فیصلوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ان ہی کی بنیاد پر کسی قدر اعتماد کے ساتھ نتائج کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں..... بعض اعمال اور سرگرمیاں ایسی ہیں جن کے نتائج معلوم اور متعین ہوتے ہیں۔ دوسرے سرے پر وہ فیصلے اور اقدامات ہیں جن کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں اس لیے ان کے بارے میں نہ تو ماضی ہماری کوئی رہنمائی کر سکتا ہے اور نہ موجودہ حالات کا جائزہ مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ آئندہ حالات موجودہ حالات سے مختلف ہوں گے۔ بعض اوقات ہمارے فیصلوں اور اقدامات کا تعلق ایسے امور سے ہوتا ہے جن سے وابستہ قوانین فطرت کا ابھی تک ہمیں علم نہیں حاصل ہو سکا ہے۔ ایسی صورت میں بجز فیصلہ کرنے والے کی عام بصیرت، پیشین بینی یا اندازے کسی چیز کا سہارا لینا ممکن نہیں ہوتا اور نتائج غیر متعین اور غیر متیقن ہوتے ہیں۔ انسانی اعمال اور سرگرمیوں کا بڑا حصہ ان دونوں سروں کے درمیان واقع ہوتا ہے۔

معاشی زندگی میں مستقبل سے وابستہ توقعات کی تکمیل یا عدم تکمیل فرد کے مفادات و مصالح پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ اسی لیے انسان کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ علم و تجربہ ظن و تخمین، اتحاد و تعاون اور دوسری ممکن تدابیر سے کام لے کر عدم تیقن اور خطر کو کم سے کم کیا جائے تاکہ معاشی سرگرمیاں نسبتہً زیادہ اطمینان و اعتماد کے ساتھ انجام دی جا سکیں۔

کاروباری خطر یا عدم تیقن

اس مرحلے پر یہ مناسب ہوگا کہ ہم خطر اور عدم تیقن کی مختلف قسموں کے درمیان

اختیار کرنے کی کوشش کریں۔ خطر کی ایک قسم وہ ہے جس کی پیمائش کسی طرح ممکن نہیں۔ مزید براں خطر کی اس قسم سے ملحقہ نقصان کا اندیشہ اور نفع کی امید دونوں وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر ایک صناع آج جس سامان کی تیاری کا فیصلہ کرتا ہے وہ چند ماہ بعد تیار ہو کر بازار میں فروخت کے قابل ہوگا۔ تیار شدہ سامان سے اسے جو آمدنی ہوگی اس کی مقدار اس پر منحصر ہے کہ چند ماہ بعد بازار میں اس سامان کی قیمت فروخت کیا ہوگی۔ یہ قیمت فروخت آج تیقن اور قطعیت کے ساتھ نہیں معلوم کی جا سکتی۔ صرف اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ سامان انوکھا اور اچھوتا ہے جس کے مثل سامان اب تک نہیں تیار کیے گئے تھے تو یہ اندازہ بھی دشوار ہوگا۔ دوسری طرف سامان کی تیاری پر آنے والی لاگت بڑی حد تک معلوم اور متعین ہے اور آج ہی ادا کرنی ہے۔ ایسی صورت حال میں جو صناع سامان کی تیاری کا فیصلہ کر کے اس میں سرمایہ لگاتا ہے وہ اپنے اس اندازے کی بناء پر ایسا کرتا ہے کہ سامان کی قیمت فروخت اس کی لاگت سے زیادہ ہوگی۔ یہ اندازہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ اندازہ غلط ثابت ہوا تو اسے خسارہ ہوگا۔ صحیح ثابت ہوا تو اسے نفع ہوگا۔ اس نفع یا نقصان کی مقدار ناقابل پیمائش ہے یعنی سامان کی تیاری کا فیصلہ کرتے وقت نہیں معلوم کی جا سکتی۔ یہ خالص معاشی عدم تیقن کی مثال ہے جس پر جدید نظریۂ نفع کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

خطر محض

دوسری قسم ایسے خطرات کی ہے جن کے پیش آنے سے صرف نقصان کا اندیشہ وابستہ ہے، نفع کی امید کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ان خطرات کا وقوع قابل پیمائش بھی ہے۔ شیشے کے برتن بنانے والا کارخانہ دار جانتا ہے کہ کچھ برتن ٹوٹ جاتے ہیں۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ کسی ایک دن میں برتنوں کے ٹوٹنے سے کتنا نقصان ہوگا۔ البتہ اگر وہ سال بھر کا اوسط نکال لے تو اپنے روزانہ نقصان کا ایک ایسا تخمینہ قائم کر سکتا ہے جو عملی مقاصد کے لیے قابل اعتماد ہو۔ بحری سفر پر جانے والے جہازوں میں سے بعض ڈوب جاتے ہیں۔ کسی ایک جہاز کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ڈوبے گا یا نہیں۔ مگر ایک طویل عرصہ کا جائزہ لے کر یہ معلوم کیا جائے کہ ایسے ہی ہزاروں، لاکھوں جہازوں میں سے کتنے جہازوں کو بحری سفر میں ڈوبنے کا حادثہ پیش آیا تو ایک ایسا اوسط نکالا

جاسکتا ہے جو ڈوبنے کے امکان کی پیمائش کا کام دے۔ صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور کبھی کبھی مشینوں کی زد میں آکر مجروح ہو جاتے ہیں۔ کسی ایک مزدور کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوگا یا نہیں، مگر ایک طویل عرصہ میں بہت سے کارخانوں کے تجزیے کی روشنی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سال میں ایک لاکھ صنعتی مزدوروں میں کتنے مزدور حادثے کا شکار ہوں گے۔

خطرات کی یہی قسم ہے جس کا مقابلہ اجتماعی طور پر کرنے سے افراد کے لیے سہولت پیدا ہو جاتی ہے اور کارگاہِ حیات میں ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسا کرنے کا موقع اس اصول کی بنا پر حاصل ہوا جسے اب قانون اعداد کثیر LAW OF LARGE NUMBERS یا قانون اوسط LAW OF AVERAGES کہا جاتا ہے۔ اس کی تشریح ہم آئندہ کریں گے۔ انشورنس کا ہدف یہی قابل پیمائش خطر محض ہے۔

قمار

خطرات کی مذکورہ بالا دونوں قسمیں غیر اختیاری ہیں، یعنی وہ انسان کی بعض روزمرہ کی سرگرمیوں کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہیں۔ خطرات کی تیسری قسم ان خطرات پر مشتمل ہے جو روزمرہ کی سرگرمیوں سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ انھیں انسان خود پیدا کرتا ہے یا ان سے ارادی طور پر اپنا تعلق قائم کرتا ہے۔ ان خطرات کے مول لینے کے نتیجے میں جہاں نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے وہاں نفع کی بھی امید پائی جاتی ہے، اور یہی امید ان خطرات کے مول لینے کا محرک ہوتی ہے۔ جوا کھیلنے والا یا بازی لگانے والا ایسے ہی خطرات مول لیتا ہے اور ایسے خطرات مول لینے کو ہم قمار کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر زید اور عمر اپنے گھوڑے دوڑا رہے ہیں اور رام اور موہن بازی لگاتے ہیں کہ اگر زید کا گھوڑا آگے نکل گیا تو رام موہن کو ایک رقم ادا کرے گا۔ عمر کا گھوڑا آگے نکل گیا تو موہن رام کو ایک رقم ادا کرے گا۔ یا زید اور عمر آپس میں یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ جس کا گھوڑا آگے نکل جائے اسے دوسرا فرد ایک رقم ادا کرے گا۔ اسی طرح بہت سے افراد لاٹری کا ٹکٹ خریدتے ہیں اس شرط پر کہ قرعہ میں جس کا نام نکل آئے گا اسے ایک بڑی رقم ملے گی اور جس کا نام نہیں نکلے گا،

اس کی وہ رقم سونت ہو جائے گی جو اس نے ٹکٹ کی قیمت کے طور پر ادا کی ہے۔ اس طرح کی خطرجوئی کا نتیجہ بعض اوقات تفریح یا تقدیر آزمائی کرنا بھی ہوتا ہے۔ ایسی خطر بازی قمار GAMBLING کہلاتی ہے۔

پہلی قسم کی خطر جوئی کاروبار ENTERPRISE کا جوہر ہے۔ یہ ایک ناگزیر اور مفید سماجی عمل ہے جو پیداوار اور نتائج کا حامل ہے۔ اس سے کسی طرح مفر نہیں۔ زندگی گزارنے اور زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ایسے خطرات انگیز کرنے لازمی ہیں، اگرچہ علمی اور فنی ترقی، پیداواری عمل کی بڑے پیمانے پر تنظیم اور منصوبہ بندی ان خطرات کا دائرہ دن بدن محدود کرتی جارہی ہے۔ ایسی خطرجوئی میں کوئی اخلاقی خرابی نہیں پائی جاتی بلکہ خود اس عمل سے بعض اخلاقی خوبیوں کو پروان چڑھنے اور مستحکم ہونے کا موقع ملتا ہے، مثلاً ہمت و جرأت، صبر و استقلال، خود اعتمادی وغیرہ۔ ایسی خطرجوئی سے سماج کو مجموعی طور پر فائدہ ہوتا ہے۔ طلب کے مطابق رسد کا اہتمام، نئے مصنوعات کی فراہمی اور فی الجملہ معیشت میں توسیع اور تنوع بڑی حد تک ایسی خطرجوئی کا رہین منت رہا ہے۔ خطرجو افراد کو نفع بھی حاصل ہوتا ہے اور بعض اوقات خسارہ بھی برداشت کرنا ہوتا ہے، مگر یہ بات کہ سماج کو برابر ایسے خطرجو ملتے رہتے ہیں اس بات پر گواہ ہے کہ مجموعی طور پر نفع کا پلڑا نقصان پر بھاری رہتا ہے۔

دوسری قسم کے خطرات کے مقابلے کے لیے انشورنس کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ پہلی قسم کے برخلاف اس قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے کثیر تعداد میں افراد کی شرکت اور تعاون کی ضرورت ہے اس لیے واضح شکل میں اس کا ظہور نسبتہً دیر میں ہوا۔ اس سے متعلق اصول و قوانین کی دریافت چند سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔ البتہ اس بارے میں ہم اس طرح کے قبائلی رواج اور دستور کا حوالہ دے سکتے ہیں جس کے مطابق ان ذمہ داریوں کو جو کسی ناگہانی حادثے کی بنا پر ایک فرد یا چند افراد پر عائد ہوتی ہیں اجتماعی طور پر ادا کرنے کا اہتمام ہوتا ہے یہ دستور انسانی زندگی میں زمانۂ قدیم سے پایا جاتا ہے، اس کی ایک مثال قتل خطا کی دیت ہے جو قاتل کے رشتہ داروں کے ایک حلقہ پر ڈالی گئی ہے۔ قتل خطا بھی درحقیقت ایک حادثہ ہے جس کے مالی عواقب کی تلافی کے لیے ایک بڑے گروہ کو ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اس طرح ایک فرد کو (جس کے ہاتھوں یہ سانحہ واقع ہو) زبردست مالی صدمے سے بچایا گیا ہے اور اس گروہ

کے دوسرے افراد کو اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ اگر انھیں کبھی اس صدمے کا ہدف بننا پڑے تو ان کا بھی اسی طرح تحفظ کیا جائے گا۔ البتہ اس تحفظ کے بدلے ہر ایک کو کچھ 'لاگت' ادا کرنی ہوتی ہے یعنی دیت کا متناسب حصہ اپنی جیب سے ادا کرنا ہوتا ہے۔[1]

قانون اعداد کثیر

قانون اعداد کثیر کا واضح اور مکمل بیان نظریۂ اغلبیت — THEORY OF PROBABLITY کے متعدد اصولوں کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے یہاں ہم اس کے عام فہم بیان پر اکتفا کریں گے اس کا ماحصل یہ ہے کہ کسی تجربے کے مختلف ممکن نتائج میں سے ایک مخصوص نتیجے کے عملاً واقع ہونے کے امکان کا حساب اگرچہ ایک بار کے تجربے میں نہیں لگایا جا سکتا مگر بہت سے تجربوں میں اس مخصوص نتیجہ کی اضافی نسبت متعین کی جا سکتی ہے۔ یہی نسبت ایک تجربہ میں اس مخصوص نتیجہ کے برآمد ہونے کے امکان کی پیمائش ہے نیز یہ کہ ایک ہی جیسے افراد کے کثیر التعداد گروہ میں بعض افراد کی بعض مشترک خصوصیات کی اوسط مقدار ایک متعین سطح پر قائم رہتی ہے خواہ اس کثیر التعداد گروہ کے افراد میں کمی بیشی اور تبدیلی عمل میں آتی رہے۔ موخر الذکر اصول کو قانون اوسط کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

پہلے اصول کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک آدمی ایک فاصلہ پر ہدف پر نشانہ لگا کر بندوق سے گولی چلاتا ہے۔ ممکن ہے گولی ہدف پر لگے، ممکن ہے کہ نہ لگے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک بار گولی چلانے کا نتیجہ ان دونوں صورتوں میں سے کس صورت میں برآمد ہوگا۔ اگر وہی آدمی، اسی ہدف پر، اسی بندوق سے، ان ہی حالات میں بار بار گولی چلائے اور یہ تجربہ ہزارہا بار دوہرایا جائے تو معلوم کیا جا سکتا ہے کہ گولی کے ہدف پر لگنے کی اضافی نسبت کیا ہے۔ کثیر التعداد تجربات سے جو اضافی نسبت حاصل ہوگی وہی ایک بار گولی چلانے میں اس کے ہدف پر لگنے کے امکان کی پیمائش قرار پائے گی۔

دوسرے اصول کو سمجھنے کے لیے کسی متعین علاقہ میں بسنے والے لاکھوں افراد کے قد

---

[1] اس مسئلہ کی تفصیلات کے لیے فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

کی اونچائی کا اوسط نگاہ میں رکھیے۔ یہ اوسط ان افراد کی تعداد میں کمی بیشی، بعض افراد کے اس علاقے سے باہر چلے جانے اور بعض دوسرے افراد کے اس علاقہ میں آبسنے سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ تقریباً اسی سطح پر برقرار رہتا ہے۔ یہی حال ان افراد کے وزن، ان کی نبض کی رفتار، خون کے دباؤ وغیرہ کے اوسط کا ہے، بہ شرطیکہ متعلقہ بنیادی حالات تبدیل نہ ہو جائیں، مثلاً آب و ہوا، غذائی عادات وغیرہ۔

یہ دونوں اصول اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ بعض مقداریں جو افراد کے معاملے میں غیر متعین اور متغیر ہوتی ہیں، یعنی ہر فرد کے لیے مختلف ہوتی ہیں، ایک ہی جیسے افراد کی کثیر تعداد کے لیے متعین اور غیر متغیر ہوتی ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس اصول کے اطلاق کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔ اس سے وہی مقداریں خارج ہیں جن کی تعیین کرنے والے بنیادی حالات تیزی سے بدلتے رہتے ہیں، اور اس تبدیلی کی سمت اور رفتار بھی بدلتی رہتی ہے۔ خوش قسمتی سے زندگی کے اکثر دائروں میں بہت سی اہم مقداروں کا انحصار ایسے امور پر ہے جن میں زیادہ تغیر نہیں واقع ہوتا، اور جتنا ہوتا ہے اس کا اثر مختلف افراد پر یکساں نہیں پڑتا۔ بعض افراد پر جو اثر پڑتا ہے اس کے مقابلے میں دوسرے افراد پر مخالف اثر پڑتا ہے اور یہ اثرات ایک دوسرے کو کالعدم کر کے اوسط کو اعلیٰ حالہٖ قائم رہنے دیتے ہیں۔

انشورنس کی ماہیئت

اب ہم چند مثالوں کے ذریعے مذکورہ بالا اصول سے استفادہ کی ایسی صورتیں پیش کریں گے جو انشورنس کی ماہیئت پر روشنی ڈال سکیں۔ ایک بازار میں کبھی کبھی کسی دکان میں آگ لگ جاتی ہے۔ آگ لگنے کے بعض اسباب ہمیں معلوم ہیں۔ بعض اسباب ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو پوری طرح ہمارے علم میں نہیں آسکے ہیں۔ خاص طور پر اس معاملے میں ہمارا علم بہت ناقص ہے کہ کبھی کبھی یہ اسباب اس طرح سے کیوں جمع ہو جاتے ہیں کہ آگ لگنے کا حادثہ پیش آجائے۔ ایسے بازار بہت سے ہیں اور ان سب میں یہ حادثہ پیش آتا رہتا ہے۔ ایسا عرصہ دراز سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اگر بہت سے بازاروں میں آگ لگنے کے ایک طویل مدت کے واقعات کا جائزہ لے کر اوسط نکالا جائے تو معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ایک سال میں ایک لاکھ دکانوں میں سے کتنی دکانیں آگ لگنے

کے حادثے سے دوچار ہوتی ہیں۔ اگر اس حادثے سے محفوظ رہنے کے لیے کوئی غیر معمولی حفاظتی اور انسدادی تدابیر نہ اختیار کی جائیں تو آئندہ چند برسوں کا تجربہ بتا دے گا کہ یہ اوسط کس حد تک درست ثابت ہوا۔ اس طرح امکان اور واقعہ کی پیمائش کے درمیان فرق کی بھی تعیین کی جا سکتی ہے۔ سلسل تجربات کی روشنی میں اس کی پیمائش بھی ہو سکتی ہے کہ امکان اور واقعے کے درمیان فرق کس حد تک گھٹ یا بڑھ سکتا ہے۔ ان تمام حسابی اعمال کے نتیجے میں انسان کو جو رہنمائی حاصل ہوتی ہے اسے وہ آگ لگنے سے حادثہ کے مالی عواقب کی تلافی کے سلسلے میں استعمال کر سکتا ہے۔ چونکہ حفاظتی تدابیر اور بعض دوسرے حالات میں زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے لہٰذا رہنمائی حاصل کرنے سے قبل مذکورہ بالا حساب کے نتائج میں مزید ترمیم کی ضرورت پڑتی ہے اس اہتمام کے باوجود غلطی کے امکانات باقی رہتے ہیں جن کی رعایت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ نظریۂ اغلبیت نے اس غلطی کے امکانات کی پیمائش میں کافی مدد دی ہے جس سے بالآخر مذکورہ بالا رہنمائی زیادہ قابل اعتماد اور نتیجہ خیز بن جاتی ہے۔

کسی ایک آدمی کی موت کا وقت غیر متعین ہے۔ جو آدمی آج عمر کے اکیسویں سال میں داخل ہوا ہے وہ یہ سال پورا کر کے بائیسویں سال میں قدم رکھے گا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب یقین اور قطعیت کے ساتھ نہیں دیا جا سکتا مگر یہ بات تقریباً یقین کے ساتھ متعین کی جا سکتی ہے کہ اسی جیسے ایک لاکھ افراد جو عمر کے اکیسویں سال میں داخل ہوئے ہیں ان میں سے کتنے افراد عمر کے بائیسویں سال میں قدم رکھنے کے لیے زندہ رہیں گے۔ اس تعین کی بنیاد ماضی کا طویل تجربہ ہے۔ انسانوں کی بہت بڑی تعداد کے متعلقہ ریکارڈ کے مطالعے سے عمر کے اکیسویں سال میں وفات کے امکان کی، اور اس امکان میں غلطی کے امکان کی پیمائش کی جا چکی ہے مزید برآں اس پیمائش پر بعد کے تجربات کی روشنی میں نظر ثانی کی جاتی رہتی ہے۔ اس تعیین کی عملی اہمیت یہ ہے کہ عمر کے اکیسویں سال میں وفات کے مالی عواقب سے عہدہ برآ ہونا اس معلومات کی روشنی میں زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا پیمائش ایک طرح کی آب و ہوا میں رہنے والے تقریباً یکساں صحت اور غذائی عادات وغیرہ کے حامل افراد سے متعلق ہوگی تو زیادہ قابل اعتماد ہوگی، اور اس کا اطلاق بھی ایسے ہی افراد پر درست ہوگا۔

مذکورہ بالا پیمائش یہ ممکن بنا دیتی ہے کہ افراد گروہوں کی شکل میں چھوٹی چھوٹی رقمیں ادا کر کے مذکورہ بالا قسم کے قابلِ پیمائش خطرات کے زبردست مالی عواقب سے عہدہ برآ ہونے کا اہتمام کر سکیں۔ مثال کے طور پر اگر بحری سفر میں غرقابی کا اوسط ہر دس ہزار جہازوں میں سے ایک جہاز فی سال ہے، اور ایک بحری جہاز کی اوسط قیمت دس لاکھ ہے تو اگر ہر جہاز راں سو روپے سالانہ ادا کرے تو سارے جہاز راں مل کر سال بھر میں ایک جہاز کی قیمت جمع کر سکتے ہیں جو باہمی راضی نامے کے مطابق اُس جہاز راں کو دی جا سکتی ہے جس کا جہاز ڈوب جائے۔ یہ اہتمام پورے گروہ کے ہر فرد کو اس خطرے سے بے نیاز کر سکتا ہے کہ بحری سفر میں جہاز کے ڈوب جانے سے اُسے دس لاکھ کا نقصان اُٹھانا پڑ سکتا ہے۔ یہ بے نیازی کسی فرد کے لیے کسی انفرادی کوشش کے ذریعہ ممکن نہیں ہو سکتی۔ یہ بے نیازی دور رس اقتصادی اور سماجی اثرات کی حامل ہے جس پر آئندہ روشنی ڈالی جائے گی۔ انفرادی قابلِ پیمائش خطر کے اجتماعی مقابلے کے اس اہتمام کے نتائج پر ان انتظامی تفصیلات کا کوئی اثر نہیں پڑتا جو اس اہتمام کے سلسلے میں اختیار کی جائیں۔ یہ اہتمام مذکورہ بالا دس ہزار جہاز راں کسی اجتماع یا باہمی راضی نامے کے ذریعہ تعاونی طور پر کرنا طے کریں، یا کوئی ایک فرد انکو یہ پیش کش کرے کہ اگر ان میں سے ہر ایک اُسے سو روپے ادا کرے تو وہ ڈوبنے والے جہاز کی قیمت ادا کر دیا کرے گا، یا حکومت بحری سفر پر جانے والے جہاز رانوں کو انشورنس فیس کے طور پر سو روپے ادا کرنے کا پابند بنا کر ڈوبنے والے جہاز کی قیمت ادا کرنا اپنے ذمے لے لے، تینوں صورتوں میں یہ نتیجہ یکساں طور پر حاصل ہوگا کہ ہر جہاز راں جہاز ڈوبنے کے اندیشے اور اس سے وابستہ نقصان سے بے نیاز ہو کر جہاز رانی کر سکے گا۔ یہی طریقہ انشورنس کہلاتا ہے۔ مکان یا دکان میں آگ لگنے، سامان چوری چلا جانے، موٹر کے حادثے کا شکار ہو جانے وغیرہ دوسرے قابلِ پیمائش خطرات کے سلسلے میں بھی ایسی ہی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ یہ طریقہ انسانی زندگی کے ان تمام دائروں میں اختیار کیا جا سکتا ہے جن میں قانون اعداد کثیر قابلِ اعتماد حد تک عمل کرتا نظر آئے۔

واضح رہے کہ انشورنس کا تعلق دراصل اُس خطرِ محض کے مالی عواقب سے ہے جو قابلِ پیمائش ہو۔ مذکورہ بالا طریقہ ان خطرات کے انسداد یا ان سے بچاؤ کا طریقہ نہیں ہے۔ جوانی کی موت، آتش زدگی، غرقابی، ہوائی جہاز، موٹر کار یا ریل کے حادثے، مشینوں کی زد میں آ کر مجروح ہو جانا، بیوگی،

بے روزگاری..... ایسے حادثات ہیں جن کے وقوع کو روکنے کے لیے متعدد تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں اور کی جاتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں بہت سی انسدادی تدابیر کو ایسے اداروں نے جن کا اصل کام انشورنس کرنا ہے، اختیار بھی کیا ہے مگر یہ انشورنس کا اصل مقصد نہیں ہے۔ انشورنس کا مقصد یہ ہے کہ خطرہ واقع ہونے کی صورت میں ایک فرد کو جو مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے، اس کی تلافی کس طرح کی جائے۔ اس کا طریقہ مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں، یہ اختیار کیا گیا ہے کہ ایک بہت بڑے گروہ کے ہر فرد سے جسے یہ خطرہ لاحق ہو، ایک رقم وصول کی جائے اور پھر جس فرد کو ان حادثوں میں سے جن کا خطرہ تھا کوئی حادثہ پیش آئے اس کے مالی نقصان کی تلافی کی جائے۔

ہر خطرہ اپنے مالی عواقب، یعنی متعلقہ مالی نقصان کے ماسوا دوسرے نفسیاتی، جسمانی، اخلاقی سماجی، سیاسی.... عواقب بھی رکھتا ہے۔ انشورنس کا طریقہ ان دوسرے عواقب سے متعلق نہیں وہ صرف مالی نقصان کی تلافی کا طریقہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مالی نقصان کی تلافی سے کسی حد تک دوسرے نقصانات کا بار بھی ہلکا ہو جائے۔

دوسری وضاحت طلب بات یہ ہے کہ بعض خطرات سے وابستہ مالی نقصان کی پیمائش براہ راست اور متعین طور پر ممکن ہے جب کہ بعض خطرات کے مالی عواقب کا صرف بالواسطہ تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ جلنے والے مکان یا ڈوبنے والے جہاز کی مالیت آسانی کے ساتھ متعین کی جا سکتی ہے۔ مگر اس امر کی تعیین دشوار ہے کہ کسی خاندان میں ایک کمانے والا فرد جب جوانی کی موت کا شکار ہو جاتا ہے تو اس سانحے سے اس خاندان کو کتنا مالی نقصان ہوتا ہے۔ اس نقصان کا اندازہ اس طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ اس فرد کی سالانہ آمدنی کتنی تھی اور وہ عمر طبیعی تک زندہ رہتا تو اور کتنی مدت تک یہ آمدنی حاصل کرتا رہتا۔ کسی مزدور کی انگلی مشین کی زد میں آکر کٹ جانے سے اس مزدور کو مالی طور پر کتنا نقصان ہوگا، اس کا اندازہ اس طور سے لگایا جا سکتا ہے کہ کٹی ہوئی انگلی کے باوجود جو کام کر سکتا ہے اس سے ہونے والی آمدنی اور اس آمدنی میں کیا فرق ہے جو وہ انگلی کے سلامت ہونے کی صورت میں حاصل کرتا اور اس عضو کے ضائع ہونے سے اپنے روزگار کے علاوہ روزمرہ زندگی میں کیا نقصانات اٹھانے پڑ سکتے ہیں۔ ایسے تمام مسائل میں نقصان کی پیمائش میں جو نقص یا عدم تعیین رہ جاتا ہے اس انشورنس کے طریقے کا قصور نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی زندگی کا ایک ناگزیر لازمہ ہے۔ انسان انشورنس کا طریقہ

اختیار کرتے وقت صرف اس بات کا اہتمام کر سکتا ہے کہ نقصان کی پیمائش کا یہ نقص حتی الامکان دور کیا جائے اور پیمائش کو شخصی اندازوں کے بجائے معروضی بنیادوں پر قائم کی جائے۔

اس بحث سے صرف اتنا ثابت ہوا کہ قابل پیمائش خطر محض کے مالی نقصانات کی تلافی کے لیے انشورنس کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے یہ سوال ابھی محتاجِ بحث ہے کہ ایسے خطرات کا اثر اس طرح زائل کرنا یا ہلکا کرنا مطلوب بھی ہے یا نہیں۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ انشورنس کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرنے سے پہلے اس پر غور کیا جائے کہ دورِ جدید میں اس طریقے سے ازالۂ خطر اور تخفیفِ خطر کی اقتصادی اہمیت کیا ہے۔

ازالہ و تخفیف خطر کی اقتصادی اہمیت

خطرِ محض کا وجود اس کام کی جس کے ساتھ ایسا خطر وابستہ ہو، انجام دہی میں رکاوٹ ڈالتا ہے، اس کام کے جس سے ایک ایسا خطر وابستہ ہو جس کے واقع ہونے سے نقصان کا اندیشہ ہو، اور نفع کی امید نہ ہو، کرنے کی ہمت انسان کو مشکل سے ہوتی ہے۔ خواہ اس کام کے ساتھ نفع کی امید وابستہ ہو یا یقینی فوائد کا حصول متوقع ہو پھر بھی اس کے ساتھ ہر چند خطر لاحق ہونا افراد کو اس کام کی انجام دہی سے روک سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کا یہ تقاضا ہے کہ خسارے کی صورت میں وہ فرد اس خسارے سے نمٹنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، ایسی صلاحیت ہر ایک میں نہیں ہوتی خطرہ جتنا بڑا ہوگا اور اس کے واقع ہونے کی صورت میں نقصان کی مقدار جتنی زیادہ ہوگی، اس خطرے کو مول لینا اتنا ہی دشوار ہوگا اور اس کی ہمت کرنے والے کم ہوں گے۔ اب اگر کسی تدبیر سے خطرات سے وابستہ مالی نقصان کی مقدار کم کی جا سکے اور ان کا بار ہلکا کیا جا سکے تو ایسے کاموں کی انجام دہی آسان ہو جائے گی اور انھیں کرنے والے زیادہ میسر آئیں گے۔ مثال کے طور پر جہاز رانی ایک مفید سماجی عمل ہے جس سے بہت سے انفرادی اور اجتماعی مفادات وابستہ ہیں، مثلاً افراد کا بحری سفر کر کے ایک ملک سے دوسرے ملک جانا، تجارتِ خارجہ وغیرہ۔ اگر ہر جہاز ران کو ہر بحری سفر میں اس اندیشہ کا سامنا ہو کہ جہاز ڈوب سکتا ہے تو زبردست مالی نقصان کا یہ اندیشہ جہاز رانی کے عمل میں رکاوٹ بنے گا اور اس کا اثر بین الممالک سفر اور تجارت پر برا پڑے گا۔ ایسی صورت میں

اگر ہر جہاز راں ایک چھوٹی سی رقم ادا کر کے اس بات کا اطمینان حاصل کر سکے کہ جہاز کے ڈوب جانے کی صورت میں اسے جہاز کی قیمت مل جائے گی تو یہ رکاوٹ دور ہو جائے گی، آمد و رفت سہولت کے ساتھ جاری رہے گی، تجارت کو فروغ حاصل ہوگا اور ملک ترقی کرے گا۔ یہی بات آگ لگنے کا خطرہ مول لے کر دکان کھولنے، حادثے کا خطرہ مول لے کر موٹر چلانے، صنعتی حادثات کے خطرے کے باوجود صنعتی کارخانوں میں کام کرنے اور بیشتر دوسرے اقتصادی اعمال پر صادق آتی ہے۔ اگر اس مالی نقصان کا جو کسی حادثے کی صورت میں اٹھانا پڑے، سارا بار اسی فرد پر پڑنا ضروری ہو جس کی دکان، موٹر، ہوائی جہاز، بحری جہاز یا جسم و جان اس حادثے کا شکار ہوئے ہوں تو لوگ ایسے خطرات مول لے کر متعلقہ اعمال انجام دینے کی ہمت کم ہی کریں گے، سماج کو یہ اقتصادی خدمات کم میسر آئیں گے اور اس کے مفادات مجروح ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر انشورنس کا طریقہ اختیار کر کے ہر فرد کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ تھوڑی سی لاگت برداشت کر کے ان خطرات کے مالی عواقب کی تلافی کا اہتمام کر سکے تو ان کاموں کی انجام دہی کی ہمت بہت سے لوگ کریں گے اور سماج کے مفادات محفوظ رہیں گے۔

صنعتی دور میں اقتصادی نظام کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی نے پیداواری عمل اور تجارتی کاروبار میں تخفیف و ازالۂ خطر کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔ فنی ترقی اور مشینوں کے بیش از بیش استعمال کے ساتھ پیمانۂ پیداوار دن بہ دن بڑا ہوتا جاتا ہے۔ بڑے پیمانے پر صنعتی، زرعی اور تجارتی کاروبار کی تنظیم کثیر سرمایہ کی فراہمی چاہتی ہے جو کسی ایک فرد یا افراد کے لیے شاذ و نادر ہی ممکن ہوتی ہے۔ بڑے پیمانے پر کاروبار کے لیے ہزاروں لاکھوں افراد سے سرمایہ حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر کاروبار کو پیش آنے والے خطر محض کارخانوں میں آگ لگنے، سامان کے چوری چلے جانے، سیلاب یا ژالہ باری سے فصلوں کے تباہ ہو جانے، جہازوں کے ڈوب جانے، طیاروں کے فضائی حادثے میں برباد ہو جانے وغیرہ کے اندیشوں سے ہونے والے نقصانات کی تلافی کا انشورنس کے ذریعے اہتمام ممکن نہ ہو تو سرمایہ فراہم کرنے والوں کو سرمایہ لگانے کا فیصلہ کرتے وقت ان اندیشوں کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ کاروباری خطر اور عدم تیقن کے پہلو بہ پہلو خطر محض کا اضافہ ہونے سے سرمایہ کاروں کی ہمت شکنی ہوگی اور سرمایہ کی رسد کم ہوگی۔ اگر انشورنس کی ذریعے خطر محض سے وابستہ نقصان کی تلافی تھوڑی لاگت کے عوض ہو سکتی ہو تو صرف کاروباری خطر اور عدم تیقن باقی رہے گا۔ یہ وہ خطرات ہیں جو سرمایہ کاری کے عمل میں ناگزیر

ہیں۔ نفع ان ہی خطرات کو انگیز کرنے پر حاصل ہوتا ہے۔ بغرض خطر محض کا تھوڑی لاگت کے عوض ازالہ ہو جانے سے بڑے پیمانے پر سرمایہ کی رسد ممکن ہو جائے گی اور بڑے پیمانے پر کاروبار کی تنظیم کی جا سکے گی۔

جدید طریقۂ پیداوار کے تحت مصنوعات کی تیاری میں خاصا وقت لگتا ہے۔ پیدا کنندہ اپنی لاگت اور مصنوعات کی ۔۔۔ قیمت فروخت کے اندازوں کی بنیاد پر ان مصنوعات کی تیاری کا اہتمام کرتا ہے ۔ ۔۔۔ کے اندازے کو عدم تیقن سے آزاد کرنا ممکن نہیں۔ اگر خطر محض کو متعین لاگت کے عوض زائل کر دینے کا اہتمام نہ ہو تو کل لاگت کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ نا ممکن ہو جائیگا اور قیمت فروخت کے کسی اندازے کے باوجود مصنوعات کی تیاری کا فیصلہ کرنا از حد دشوار ہوگا۔ ہر کارخانہ دار کو اس بات کا اندیشہ لاحق ہوگا کہ اگر کسی حادثے کے نتیجے میں مالی نقصان ہوا تو مصنوعات کی واقعی لاگت میں نہ جانے کتنا اضافہ ہو۔ ایسی صورت میں قیمت فروخت کا کوئی بھی اندازہ یہ اطمینان نہیں دلا سکتا کہ قیمت فروخت اس کی لاگت سے زیادہ ہوگی اور اس طرح نفع حاصل ہوگا۔ اس کے برعکس حادثات سے انشورنس کی صورت میں اسے معلوم ہوتا ہے کہ انشورنس کے سبب اسکی لاگت میں کتنا اضافہ ہوا اور وہ متوقع قیمت فروخت کا مقابلہ مصنوعات کی مجموعی لاگت سے کرکے مذکورہ بالا اطمینان کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ان تمام پیداواری کاموں میں زبردست رکاوٹ پیش آجائے گی جو خاصا وقت لیتے ہیں اور جن کے مطابق اشیاء کی تیاری کے فیصلے اور ان اشیاء کی فروخت کے درمیان زمانی فصل طویل ہوتا ہے دور جدید کے اکثر پیداواری اعمال اسی نوعیت کے ہیں۔

فرض کیجئے کہ انشورنس کا طریقہ نہ اختیار کیا جائے اور کاروباری افراد مجبور ہوں کہ وہ خطر محض سے وابستہ مالی نقصانات کو ملحوظ رکھ کر لاگت کا حساب لگائیں تو مصنوعات کی لاگت میں اس سے زیادہ اضافہ ہوگا جتنا انشورنس کرانے کی صورت میں ہوتا ہے اور عام صارفین کو ان مصنوعات کے دام اس سے زیادہ ادا کرنے ہوں گے جتنے پہلی صورت میں ادا کرنے ہوتے ہیں ایک کاروباری فرد خطر محض کے مقابلے کے لیے انفرادی طور پر صرف ایک ہی طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔ وہ ایک ایسا ریزرو فنڈ قائم کر سکتا ہے جسمیں ہر ماہ یا ہر سال یا ہر عرصۂ پیداوار میں وہ اتنی رقم جمع کرتا رہے کہ عرصۂ طویل میں جب کبھی وہ خطرہ واقعتہً پیش آجائے جس کا اندیشہ تھا تو اس ریزرو فنڈ سے اس کے مالی نقصان کی تلافی

کی جا سکے۔ ایسی صورت میں ہر عرصۂ پیداوار میں لاگت میں اضافے کی مقدار اس رقم کے مساوی ہوگی جو ریزرو فنڈ میں جمع کی جائے۔ یہ رقم اس پریمیم سے بہت زیادہ ہوگی جو انشورنس کی صورت میں ادا کرنی ہوتی۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک سال میں ایک ہزار کارخانوں میں سے ایک کارخانہ کسی ایسے حادثے کا شکار ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ایک لاکھ کی مصنوعات یا مشینری ضائع ہو جاتی ہے۔ ہر کارخانہ دار سو روپے سالانہ پریمیم ادا کر کے اس بات کی ضمانت حاصل کر سکتا ہے کہ اگر یہ نقصان اس کے کارخانے میں واقع ہوا تو اس کو اس کی تلافی میں ایک لاکھ کی وہ رقم مل جائے گی جو نقصان کے مساوی ہے۔ اب اگر انشورنس کا طریقہ نہ اختیار کیا جائے تو ہر کارخانہ دار کو یہ فکر لاحق ہوگی کہ ایک لاکھ کے نقصان کے اندیشہ کے پیش نظر ایک لاکھ کا ریزرو فنڈ کس طرح جمع کرے۔ اگر وہ ہزار روپے سالانہ جمع کرے تو یہ فنڈ سو سال میں مہیا ہو سکے گا جبکہ نقصان کسی سال بھی واقع ہو سکتا ہے۔ ایک منفرد کاروباری سو سال کے لیے منصوبے نہیں بناتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال کا منصوبہ بنا سکتا ہے۔ مگر دس سال میں ایک لاکھ کا ریزرو فنڈ قائم کرنا ہو تو اسے ہر سال دس ہزار روپے اور پندرہ سال میں کرنا ہو تو ہر سال سات ہزار سے کچھ کم رقم ریزرو میں ڈالنی پڑے گی[1]۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے کاروبار پر اثر پڑے گا اور اس کاروباری ادارے کا پیمانہ کار اس سے چھوٹا ہوگا، جتنا اس بار کے بغیر ہوتا۔ ساتھ ہی اس بڑی رقم کو لاگت میں شمار کرنے کے سبب مصنوعات کی لاگت بھی بڑھ جائے گی، کیونکہ واضح رہے کہ یہی صورت حال تمام کارخانوں کو درپیش ہوگی۔ لاگت میں اضافے کے اس سبب کے پہلو بہ پہلو اگر اس کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ سرمایے کی رسد میں کمی کی وجہ سے پیمانہ کبیر پر کاروبار کی تنظیم نہ ہو سکے گی (جس کی وضاحت

---

[1] اس مثال سے ضمنی طور پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایک مالک کارخانوں یا دکانوں کی اتنی بڑی تعداد کا مالک ہو کہ ان املاک سے وابستہ خطرات کے مالی عواقب کی تلافی کے سلسلے میں قانون اعداد کثیر سے استفادہ ممکن ہو تو وہ بطور خود انشورنس کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ اس مالک کو کسی مخصوص اہتمام کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ اپنی لاگت کے حساب میں اس امر کی رعایت ملحوظ رکھنا ہوگی کہ لاگت کی ایک مستقل مد ان مالی نقصانات سے متعلق ہے جو خطر محض سے وابستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی نظام معیشت کے ایک بڑے دائرے میں انشورنس کا رسمی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں باقی رہتی جیسا کہ آئندہ واضح کیا جائے گا۔

اوپر کی جا چکی ہے) تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انشورنس کا طریقہ نہ اختیار کرنے کی صورت میں اشیاء کی لاگت اس سے بہت زیادہ ہوگی جو اس طریقہ کو اختیار کرنے کی صورت میں ہوتی۔

انشورنس کے دوسرے فوائد سے قطع نظر مذکورہ بالا چار اہم امور یعنی کاروباری جدوجہد اور اقتصادی عمل کی اطمینان بخش رسد، بڑے پیمانے پر سرمایہ کی فراہمی، طویل مدت پیداوار رکھنے والی مصنوعات کی تیاری اور مصنوعات کی لاگت کم رکھنے کی مجموعی اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پیداوار دولت کے موجودہ نظام اور تمدنی ترقی کی موجودہ سطح کا انشورنس کا طریقہ اختیار کیے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ طریقہ نہ اختیار کیا جائے تو پیداوار دولت میں کمی اور تمدن کا زوال یقینی ہے۔ پیداوار دولت میں اضافہ اور تمدن کی ترقی مطلوب ہو تو پھر انشورنس کا طریقہ نہ اختیار کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کیا انشورنس کے طریقہ میں ایسی خرابیاں مضمر ہیں جن کی بنا پر اسلام کی ہدایت کے مطابق اسے ترک کرنا لازم آتا ہے؟ آئندہ صفحات میں ہم اسی امر کا جائزہ لیں گے۔ (باقی)



نئی مطبوعات

صدر یار جنگؒ

تصنیف شمس تبریز خاں۔ صفحات ۴۰۰۔ سائز ۲۰×۲۶ قیمت دس روپے
ناشر مکتبۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

یہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی سوانح حیات ہے۔ نواب صاحب مرحوم ہندوستان کی نادر شخصیتوں میں ہوئے ہیں۔ بیاسی سال کی عمر پاکر ۱۹۵۰ء میں وفات پائی۔ علمی، ادبی اور دینی و دنیوی فضائل و کمالات کے جامع تھے۔ ہماری نسل میں وہ زیادہ تر مولانا آزاد کی "غبار خاطر" اور "کاروانِ خیال" کے ذریعے اُن کے ایک عزیز دوست کی حیثیت سے جانے گئے لیکن ان کی اصل حیثیت اور اُن کا اصل مقام اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اُن کا علمی ذوق، ادبی مذاق، دینی مزاج، سلامت طبع، اور اعتدال و وقار، قوم کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ہر اچھی تحریک میں فکری دلچسپی، یہ سب ایسے عنوانات ہیں جن میں سے ہر ایک کے ماتحت اُن کی شخصیت [illegible] اصلاحی اور تعلیمی تحریک سے بھی نواب صاحب مرحوم کو گویا عشق تھا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء [illegible] مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [illegible] کے ماتحت نواب صاحب پر یہ کتاب [illegible] مرتب کرائی ہے۔ مصنف گو اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کی نواب صاحب [illegible] مولانا آزاد کی غبار خاطر سے کھلتا ہے پھر بھی انھوں نے اپنی محنت سے مدد لی [illegible] اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اللآلی المنثورہ

مرتبہ مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی مرحوم۔ صفحات ۱۹۰۔ سائز ۲۰×۲۶/۸
غیر مجلد قیمت [illegible]۔ ناشر: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی ۶

یہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کی ترمذی اور ابوداؤد شریف کی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ اصل فائدہ حدیث کے طلبہ ہی اٹھا سکتے ہیں۔ اُن کے لیے [illegible] ہے۔ لیکن یہ مسئلہ

وضاحت طلب ہے کہ ان تقریروں کے مرتب کون مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی ہیں۔ جو مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی "معروف ہیں (صاحب مصباح اللغات وغیرہ) اور وہ راقم کے استاد بھی ہیں ان کے متعلق معلوم ہے کہ حضرت شیخ الہند کے شاگردوں میں نہیں تھے۔

کالے مسلمان

از ڈاکٹر مشیر الحق۔ صفحات ۱۰۴۔ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ قیمت دو روپے۔
ناشر:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

امریکہ کے کالے مسلمان اب دنیا بھر میں شہرت پا چکے ہیں۔ اُن سے متعلق معلومات بھی اخبارات و رسائل میں آتی رہتی ہیں۔ لیکن اتنی تفصیلی اور مرتب معلومات اُردو میں شاید اب تک نہیں آئی تھیں جتنی اس کتابچہ کے ذریعہ پیش کی گئی ہیں۔ یہ معلومات پانچ بابوں میں تقسیم ہیں۔

۱۔ کالی قومیت۔ ۲۔ کالا ایمان۔ ۳۔ کالا اسلام۔ ۴۔ کالے لوگ۔ ۵۔ کالا دیس۔ ہر باب بہت دلچسپ اور عجیب و غریب معلومات کا حامل۔ ہماری رائے میں ہر پڑھے لکھے مسلمان کو اس کتابچہ کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔



پکوان کے
عمدہ تیلوں میں
آپ کی خاص پسند۔

پوسٹ مین برانڈ
صاف کیا ہوا مونگ پھلی کا تیل
۱، ۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو

عمدہ وناسپتی
۱، ۲، ۴ اور ۵، ۱۶ کیلو

تلولا، تِل کا تیل
۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو

ا د برانڈ خالص ناریل کا تیل
۲، ۴ اور ۱۶ کیلو

کوکو جار
صاف کیا ہوا ناریل کا تیل
۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو

امی سلاڈ تیل
۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو

احمد ملز، بمبئی ۸

RECEIVED
20 DEC 1972

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصولڈاک کا اضافہ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
بنگلہ دیش سے ۸/-
ضخامت ۶۵ صفحات
قیمت
فی کاپی ...... ۷۵ پیسے

Islam & The Modern Age Society
Telephone 32465

جلد ۴۰ | بابت ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۲ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۷۲ء | شمارہ (۹)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۵ دسمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔ جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ــــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی

اس دفعہ یہ شمارہ پھر بہت لیٹ جا رہا ہے۔ ناظرین معاف فرما دیں تو یہ ان کا ایک بار پھر کرم ہوگا۔

اس شمارہ میں مضامین بھی گنتی کے تین ہی ہیں۔ مگر جس مضمون کی طوالت کی بنا پر تنوع میں یہ کمی رہی ہے اُس کے مطالعہ کے بعد امید ہے کہ اس کمی کا کوئی خاص احساس نہیں رہے گا۔ یہ مضمون مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی کا ہے جو خاص طور پر "مسلم پرسنل لا" کے مسئلہ پر ہونے والے اس کنونشن کے پیش نظر لکھا گیا ہے جو دار العلوم دیوبند کی تحریک پر تازہ تر اعلان کے مطابق ان شاء اللہ آخر دسمبر میں بمبئی میں ہونا طے ہے۔ ارادہ یہ تھا کہ پورا مضمون ایک ہی دفعہ میں دے دیا جائے مگر صفحات اندازے سے اتنے بڑھ گئے کہ کچھ حصہ آئندہ کے لیے روک لینا پڑا تاکہ سلسلے کے جو دو مضمون چل رہے ہیں اُن کے لیے جگہ رہ سکے ــــــ مولانا برہان صاحب کے مضمون کی وجہ سے خاص طور پر کوشش کی جائے گی کہ آئندہ شمارہ جلد نکل جائے۔

والد ماجد (مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ) رابطہ عالم اسلامی کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے ۲۷ نومبر کو مکہ معظمہ کے سفر پر جا چکے ہیں۔ واپسی آخر دسمبر سے قبل بظاہر نہ ہوگی۔ اس لیے اُن سے خط و کتابت فرمانے والے حضرات اس کو ملحوظ رکھیں۔ اسی ضرورت کے لیے یہ اطلاع دی جا رہی ہے۔

اسلام کا عائلی نظام

غلط فہمیاں اور ان کی حقیقت؟

(از مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)

اسلام کے خلاف معرکہ آرائی اور ہرزہ سرائی کا سلسلہ یوں تو روز اول سے ہی جاری ہے، مگر ادھر کچھ مدت سے اس کے عقائد و عبادات سے خاص تعرض کیے بغیر کہ اس میں شاید مطلب برآری کے امکانات کم نظر آئے۔ "معاشرتی احکام" کو خاص طور پر تنقید و تعریض کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے، اس مہم کے آغاز میں "اسلامی تعزیرات و حدود" کے خلاف پروپیگنڈے کا بازار گرم کرکے اس طرح کے تمام قوانین کو سراسر "ظالمانہ" اور "وحشت و بربریت" کا مظہر باور کرایا گیا اور جب دنیا کے بیشتر مسلمان اکثریت والے ملکوں کے بھی "دستوروں" سے شرعی تعزیرات و حدود کو یکسر خارج کرایا جا چکا، تو اس غیر معمولی کامیابی کے ساتھ مہم کا اختتام کرنے کے بعد اب اسی مہم جویانہ سرگرمی کے ساتھ "اسلام کے عائلی قوانین" کو ہدف بنایا جانے لگا ہے، اور اس کے خلاف معرکہ آرائی میں بھی وہی "تکنک" اختیار کی جا رہی ہے، کہ ان قوانین کو "ظالمانہ" ثابت کرکے، انھیں چھوڑ دینے اور ان کے بجائے "انصاف کے تقاضے پورے کرنے والے قوانین کو اختیار کرنے کا مشورہ" دیا جانے لگا ہے۔

اسے سادہ لوحی کہیے یا ستم ظریفی! کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر —— اس مہم میں کچھ "اپنے"

بھی —— غیروں کے آلۂ کار بن گئے، جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اثر سے ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا جو — کسی بدنیتی یا لالچ سے نہیں — بلکہ صحیح اسلامی تعلیم و تربیت نہ ملنے، شرعی احکام کی تفصیلات سے بے خبری، اور مغربی تہذیب سے مرعوبیت کی بنا پر، اسلامی نظام بالخصوص اس کے عائلی حصہ — کے بارے میں مختلف قسم کے شبہات میں مبتلا اور طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا۔

زیرِ نظر مضمون، دراصل اسی طبقہ کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی قوانین اپنی "اصل شکل" میں سامنے آئیں کہ ان کا فطری حسن، خود ہی شبہات دور کرنے اور غلط فہمیاں رفع کرنے کا — توفیقِ ایزدی — ہمیشہ سبب بنا ہو۔ وما التوفیق الا باللہ۔

ویسے تو اسلام کے تمام عائلی قوانین پر اعتراضات کیے جاتے ہیں، مگر ان میں یہ تین — طلاق — تعدد ازدواج — نظامِ وراثت — خاص طور سے — آج کل نشانہ بنے ہوئے ہیں، اس لیے یہاں سردست ان ہی تین کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے، خداوند کارساز سے دعا ہے کہ وہ یہ حقیر کوشش قبول فرما کر بار آور کرے، اور اسے غلط فہمیاں دور کرنے کا سبب بنائے۔

وھو الموفق للسداد وعلیہ التکلان۔

طلاق کی مشروعیت

آج کل مسلمانوں کے عائلی قوانین میں سے جن پر خاص نظر ہے اور آئے دن تنقید و تعریض کا نشانہ بنایا جا رہا ہے ان میں "قانونِ طلاق" بھی ہے، اور اس کا یہ پہلو خاص طور پر زیرِ بحث لایا جاتا ہے کہ اسلام نے "مرد کو طلاق کی مطلق آزادی" دے رکھی ہے۔ یہ مسئلہ زیادہ [illegible] ہونے کی وجہ سے غالباً سب سے زیادہ زبانوں پر آتا ہے، اس بارے میں — اصلی و فرضی — ہر طرح کے واقعات و حادثات کا سہارا لے کر عورت کی "مظلومیت" اور مرد کو اسلام کی طرف سے "بے جا رعایت" مل جانے کا شور کر کے، دلائل سے زیادہ جذباتی نعروں کے بل پر میدان سر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور بسا اوقات سنجیدگی کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔

حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ دُنیا کے کسی بھی مفید ترین قانون کے غلط استعمال سے بعض مرتبہ اندوہناک صورت حال کا پیدا ہو جانا، نہ مستبعد ہے، نہ محال، بلکہ کبھی اس کا ناخوشگوار تجربہ بھی ہوا کرتا ہے، لیکن اس طرح کے ایک آدھ واقعہ کی بنا پر کسی مفید اور اصولی دمجموعی طور پر اصلاحی قانون کی عدم افادیت یا ظالمیت کا فیصلہ نہیں کیا جاتا، اور نہ اس کے خلاف ایسا پروپیگنڈا ہوتا ہے۔

بس سمجھنا چاہیئے کہ ہر قانون کی طرح طلاق کے قانون کو بھی، تمام تفصیلات اور اسلامی معین میں عائد کردہ۔ تمام پابندیوں اور اس کی شرطوں کے ساتھ اسے دیکھا اور اسے استعمال کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی "خرابی" نظر نہیں آئے بلکہ اس کی افادیت اور ضرورت روز روشن کی طرح سامنے آجائے، اور پروپیگنڈے کے ذریعہ پھیلائے گئے عام احساس کے برخلاف۔ اسلام کے تمام قوانین کی طرح اس کا بھی حسن نمایاں ہو۔

معاشرہ میں ہمہ گیر پیمانے پر پھیلے ہوئے بگاڑ کا یہ بھی اثر ہے کہ، شریعت کے عطا کردہ حق طلاق کو مرد، اس بے جا طریقہ سے استعمال کرنے لگے ہیں کہ ان کی شخصی غلطی اور حماقت کے نتیجہ میں۔ ظالمانہ طور پر طلاق دینے والے کے بجائے۔ نفس دین و شریعت پر طعن کیا جانے، اور قانون طلاق ہی کو نامناسب قرار دیا جانے لگا۔

حالانکہ بالکل لاینحل قسم کی مجبوریوں اور شدید ضرورتوں کے وقت آخری چارۂ کار کے طور پر، صورت حال کا حقیقت پسندانہ مقابلہ کرنے کے لیے۔ طلاق کا استعمال جائز قرار دیا گیا ہے۔

.... اور اس کا اختیار مرد ہی کو دینے کے بہت سے مصالح اور حکمتیں ہیں منجملہ ان کے یہ ہو کہ وہ عورت کے مقابلہ میں فطرۃً زیادہ حقیقت پسند، ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کر کے قدم اٹھانے والا، طبعاً تدبر اور حلم کا ثبوت دینے والا اور قوت فیصلہ زیادہ رکھنے والا ہوتا ہے، اس کے برخلاف، ہر شخص جانتا ہے کہ عورت فطرۃً زود رنج، ذکی الحس، جذباتی اور معمولی باتوں سے متاثر اور برانگیختہ ہو جانے والی، اور ذرا سی ناگوار چیز پیش آجانے پر ایک دم طیش میں آکر غلط قدم اٹھانے والی ہوتی ہے۔ اس بنا پر اسے حبالۂ عقد کے اتار پھینکنے کا اختیار نہیں دیا گیا، ورنہ یہ مقدس رشتہ آئے دن ٹوٹتا، اور بچوں کا کھیل بن کر رہ جاتا۔ آج کل تو کوئی اس پر

بے بنیاد قیاس آرائی اور سخن پروری کی پھبتی بھی چست نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اب تو اس نظریاتی صداقت کا عملی ثبوت اور اس کے لیے مضبوط دلیل، مغربی ملکوں میں ہوتے رہنے والے تماشے آئے دن ملا کرتی ہے، وہاں عورت کو طلاق حاصل کرنے میں آسانی، گویا فی الجملہ اس کو اختیار دے دیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ ہے کہ ستر فیصدی شادیاں طلاق پر منتج ہوتی ہیں، اور ایسی ایسی مضحکہ خیز باتوں پر طلاق کا مطالبہ کردیا جاتا ہے کہ یقین آنا مشکل، مثلاً ایک مرتبہ اخبارات میں ایسے ہی واقعہ کا چرچا ہوا، کہ ایک خاتون نے محض اس وجہ سے طلاق حاصل کرنے کی عدالت سے درخواست کی کہ اس کا شوہر اس کے "پیارے کتے" کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے باوجود یہ گویا فیشن سا ہوگیا ہے کہ اکثر سارا الزام مرد ہی کو دے دیا جاتا ہے۔ اور عورت کی زیادتی اور بدمزاجی کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے، حالانکہ اگر طلاق کے واقعات کا "سروے" کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے کہ اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم نصف طلاقیں عورت کی زیادتی اور بداخلاقی کے سبب سے دی جاتی ہیں۔

عورت کے سریع الغضب ہونے اور ذرا سی بات خلاف طبیعت پیش آجانے سے ایکدم سارے احسانات فراموش کرڈالنے کی بابت تو شارع فطرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہی یہ فرما دیا ہے۔ لو احسنت الی احدٰھن الدھر ثم رأت منك شيئاً قالت ما رأيت منك خيراً قط۔[1] (یعنی چاہے تم عورت کے ساتھ عمر بھر احسانات کا برتاؤ کرتے رہے ہو، پھر بھی اتفاقاً اس نے معمولی سی کوئی بات اپنی مرضی کے خلاف تم سے سرزد ہوتی دیکھ لی تو بس فوراً کہہ اٹھے گی کہ ۔۔۔ میں نے تو آج تک تجھ سے کوئی بھلائی پائی ہی نہیں، یا جیسے تو تیرے یہاں کبھی کوئی اچھائی نظر ہی نہیں آئی)

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ طلاق کا اختیار مرد کو دیے جانے کا معاملہ، قیاسی اجتہادی یا مختلف فیہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ قطعی و منصوص اور اتفاقی مسئلہ ہے۔ قرآن مجید کے اندر طلاق کے متعلق [illegible] کو قرار دیا گیا ہے (حالانکہ نکاح کے بارے میں عورت مرد دونوں کی طرف فعل کی نسبت کی گئی ہے) اور سورہ بقرہ کی آیت "الذی بیدہ عقدۃ النکاح"

---

[1] بخاری شریف، کتاب الایمان ... و فتح الباری ... [2] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۰-

میں تو یہ بات بالکل ہی صاف کہہ دی گئی ہے کہ نکاح کا سررشتہ پورے طور پر مرد ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تعصب اور جنبہ داری کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو عقلِ سلیم کا بھی یہی تقاضہ نظر آئے۔

مرد کو طلاق کا اختیار دیے جانے کی بعض مصلحتوں کا ذکر مشہور حنفی فقیہ محقق ابن ہمامؒ نے بھی فتح القدیر میں کیا ہے، فرماتے ہیں:

جعله بيد الرجال دون النساء لاختصاصهن بنقصان العقل وغلبة الهواء و عن ذلك ساء اختيارهن وسرع اغترارهن ونقصان الدين وعنه كان اكثر شغلهن بالدنيا وترتيب المكائد وافشاء سر الازواج وغير ذلك [۱]

طلاق کا اختیار صرف مرد کے ہاتھ میں دینے کے وجوہ یہ ہیں کہ وہ عورتیں ناسمجھ اور جذباتی ہونے کی وجہ سے اختیارات کا غلط طور پر استعمال کرنے لگتی ہیں اور جلد فریب کا شکار ہو جاتی ہیں اور دینی حیثیت سے کمزور ہونے کی وجہ سے دنیا کے کاموں (بناؤ سنگھار فیشن) میں زیادہ منہمک رہتی ہیں (اور دوسروں کے بہکانے سے، سازشوں کا شکار ہونے کے ساتھ وہ خود بھی مطلب برآری کے لیے) (طرح طرح کی نامناسب) تدبیریں کرنے لگتی ہیں، اور شوہروں کے رازوں کو بھی (سہیلیوں میں) بیان کر دیتی ہیں۔　　(فتح القدیر)

اس کے علاوہ بھی بہت سے مصالح ومنافع ہیں جن کے ادراک سے عقل انسانی قاصر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کاموں کی تمام حکمتیں اور سب مصلحتیں، انسان کی عقل نارسا میں کہاں سما سکتی ہیں! یہاں یہ حقیقت بھی ضرور پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ مرد کو یہ اختیار — اس کی بردباری اور سوجھ بوجھ کی زیادہ صلاحیت کی بنا پر — دے تو دیا گیا ہے مگر اس کو استعمال کرنے کے لیے بہت سی پابندیاں لگا دی گئی ہیں، اور حتی الامکان اس اقدام سے باز رکھنے ہی کی کوشش کی گئی ہے۔

---

[۱] فتح القدیر صفحہ ۱۳۶ جلد ۳ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ

شارع علیہ السلام نے فرمایا:۔ "أبغض الحلال إلى الله الطلاق"[1] یعنی جن چیزوں کی۔ شدید ضرورت کے موقعوں پر ——— اجازت دی گئی ہے۔ ان میں طلاق سب سے زیادہ ناپسندیدہ شے ہے۔ اس لیے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ بے وجہ طلاق کا استعمال سخت گناہ ہے۔ مشہور متقی عالم امام عبدالوہاب شعرانیؒ رقمطراز ہیں:۔

إتفقوا على أن الطلاق مكروه في حالة استقامة الزوجين بل قال ابوحنيفةؒ بتحريمه[2]

تمام علمائے شریعت اس بات پر متفق ہیں کہ بے وجہ طلاق دینا (نہایت) ناپسندیدہ ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو اسے حرام فرماتے ہیں۔ (المیزان)

اسی طرح محقق ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:۔

لا يخفى أن كلامهم فيما سيأتي من التعاليل يصرح بأنه محظور لما فيه من كفران نعمة النكاح[3]

فقہاء کے کلام سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ (بے وجہ) طلاق دینا ممنوع ہے، اس لیے کہ اس میں نعمت نکاح کی ناقدری اور (خدا کے اس عظیم احسان کی) ناشکری پائی جاتی ہے۔

تقریباً یہی بات درمختار میں ہے:۔ الأصح حظره (اى الطلاق بلا ضرورة)۔
(اور صحیح یہی ہے کہ بلا ضرورت طلاق منع ہے)

اور درمختار کے مشہور شارح، علامہ ابن عابدینؒ شامی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔[4]

مشہور حنبلی عالم ابن قدامہؒ نے امام احمدؒ سے بھی ایک روایت، بے ضرورت طلاق دینا ان کے نزدیک بھی "حرام" ہونے کی نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

الطلاق: وهو على خمسة اضرب...... ومكروه وهو الطلاق من غير حاجة

---

[1] ابوداؤد صفحہ ۲۹۶ ج ۱ [2] المیزان للشعرانی صفحہ ۱۳۵ ج ۲ [3] فتح القدیر صفحہ ۲۱ ج ۳ [4] تفصیل کے لیے دیکھئے درمختار مع رد المحتار صفحہ ۲۶۱ ج ۲ مکتبہ نعمانیہ دیوبند۔

لما روی ..... أبغض الحلال ..... وعنه انه محرم لانه يضر بنفسه وزوجته وقد قال عليه السلام لا ضرر ولا ضرار۔[1]

جن حالتوں میں طلاق دینے کی اجازت دی گئی ہے مثلاً زوجین میں توافق طبع نہ ہو یا بیوی کمناشزہ ماننا ہو اور حق زوجیت صحیح طریقہ پر ادا نہ کرتی ہو، یا شوہر سخت مزاج ہو، ان کے پائے جانے کی صورت میں بھی فوراً طلاق دینے سے روکا گیا ہے۔ بلکہ پہلے بتدریج اصلاح حال کی پوری کوشش کر لینے کا حکم دیا گیا ہے، قرآن مجید میں خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا[2]

تمہیں اپنی جن بیویوں کی بد مزاجی سے تکلیف پہونچنے اور ان کی گستاخی سے دوچار ہونے کا قوی اندیشہ ہو، انھیں (پہلے زبانی) سمجھاؤ اور (اس سے نہ مانیں تو ان کو یہ سزا دو) کہ اُن سے ہم بستری چھوڑ دو (اور کچھ مدت کے لیے ترک تعلق کر لو، اُن پر اس کا بھی اثر نہ ہو تو ہلکی سی) ان کو مار بھی لگا سکتے ہو پھر اگر وہ (راہِ راست پر آجائیں اور) اطاعت شعار بن جائیں تو اب ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا، یقیناً اللہ تعالیٰ برتر اور بڑا ہے (کہ انھیں بلا وجہ ستاؤ گے تو تمہیں سزا دے گا)

اس طریقہ سے بھی صورت حال میں سدھار نہ ہو تو پھر شوہر اور بیوی دونوں کے ہمدرد رشتہ داروں کو بیچ میں ڈال کر مصالحت کرانے کے لیے ہر امکانی کوشش کرنے کا حکم ہے، طلاق سے اس وقت بھی روکا گیا ہے ۔ چنانچہ اگلی آیت میں ہے :۔

---

[1] الکافی لابن قدامہ ج۳ ص۲۳۲ ۔ [2] سورۃ النساء آیت ۳۴

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا	اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے
فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ	ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف مرد والوں میں سے
وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا	اور ایک منصف عورت والوں میں سے اگر
إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا	یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرا دیں تو اللہ موافقت
إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا[۱]	کردے گا ان دونوں میں۔ بیشک اللہ سب
	کچھ جاننے والا خبردار ہے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

غور فرمائیے! کتنے حکیمانہ اسلوب سے قبل از طلاق بیوی کو راہ راست پر لانے کی تدابیر بتائی گئی ہیں، کہ پہلا مرحلہ سمجھانے بجھانے کا ہے۔ عورت میں کجی زیادہ نہیں ہے اور سمجھدار ہے تو زبانی تنبیہ یا افہام و تفہیم ہی سے کام چل جائے گا۔ اس طریقے سے کام نہ چلے تو پھر ایسی سزا دے جس سے اس پر نفسیاتی اثر پڑے یعنی عارضی قطع تعلق اور بول چال بند رکھنا وغیرہ۔ یہ تدبیر ایسی ہے کہ اس عورت کو۔۔۔ اس میں ذرا بھی خیر ہے اور وہ نباہ کرنا چاہتی ہے تو ضرور سیدھا کرے گا۔ لیکن اگر یہ ترکیب بھی غیر مفید ثابت ہو اور تنگ مزاجی، اس سے زیادہ سخت تنبیہ کا تقاضا کرے تو پھر ہلکی سی عملی سرزنش بھی کر دیجئے (واضربوھن) کیونکہ بعض طبیعتیں اسی زبان کو سمجھتی ہیں۔۔۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز ان پر اثر انداز ہی نہیں ہوتی۔ مگر بدرجہ مجبوری اس پر عمل کرتے وقت بھی شوہر کو ہدایات دی گئی ہیں کہ "اتق الوجہ" چہرہ پر نہ مارنا اور سخت چوٹ نہ لگانا (فاضربوھن ضربا غیر مبرح)[۲]

ان سب تدبیروں کے بے اثر ہو جانے کے بعد بھی فوراً طلاق دینے کی اجازت نہیں دی گئی ہے بلکہ دوسرے مخلصین اور اقرباء جن کا اثر قبول کیا جاتا ہے، ان کو درمیان میں ڈال کر صلح و صفائی کرانے، غلط فہمیاں دور کرنے اور سمجھانے بجھانے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔

اب بتلائیے! ان سب کوششوں کے بعد بھی نباہ نہیں ہوتا تو پھر زندگی بھر تلخی، ناخوشگواری، بدمزگی اور کوفت کے ساتھ دونوں کو۔۔۔ ان کے مزاجی اختلاف اور طبیعت کے اصلی رجحان کو نظر انداز کرتے ہوئے۔۔۔ ایک ساتھ رہنے پر مجبور کرنا ان دونوں، یا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی انصاف

---

[۱] سورۃ النساء آیت ۳۵　　[۲] احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۱۸۸

کہلائے گا یا ظلم؟ ظاہر ہے کہ ایسی بے کیف بلکہ تلخ زندگی دونوں کی صحت ان کی صلاحیت کار نیز ان کے قوائے عمل پر برا اثر ضرور ڈالے گی! اس صورت میں ان کے درمیان تفریق ہو جانا ہی نہ صرف ان کے بلکہ سب کے حق میں رحمت اور زندگیاں سنوارنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اب مستقبل کے اندیشہائے دور و دراز کا خیال کیے بغیر الگ ہو جانا ہی ان کے بلکہ پورے خاندان کے حق میں بہتر ہے۔ لہٰذا ان حالات میں خدا تعالےٰ کا یہی حکم ہے اور اسی کی تعمیل ان کے حق میں بہتر ہوگی کہ یہ الگ ہو جائیں۔ " لاتدری لعل اللّٰہ یحدث بعد ذالک أمراً [1] میں شاید اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

مگر ایسے وقت بھی بلا قید طلاق دینے، اور ایسی شدید ضرورت کے مواقع پر بھی دفعۃً تمام طلاقیں دے ڈالنے اور مستقبل میں اتحاد و اتفاق اور ایک ساتھ رہنے کے تمام امکانات یکسر ختم کر دینے سے روکا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا سب سے زیادہ صحیح طریقہ یہ بتایا گیا ہے۔

فالأحسن أن یطلق الرجل امرأتہ تطلیقۃ واحدۃ فی طھر لم یجامعھا ویترکھا حتی ینقضی عدتھا لأن الصحابۃ رض کانوا یستحبون أن لا یزیدوا فی الطلاق علی واحدۃ حتی تنقضی العدۃ [2]	طلاق کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایک طلاق دی جائے وہ بھی اس وقت جبکہ عورت طاہر ہو (ایام سے نہ ہو) اور اس سے "ایام" گزرنے کے بعد ابھی تک صحبت نہ کی ہو پھر ایک طلاق دیکر یوں ہی چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے اور یہ (طریقہ اس لیے بہتر ہے) کہ صحابہؓ اسی کو پسند کرتے تھے۔

غور فرمائیے! ایک طلاق دینے کا حکم ہے وہ بھی اس وقت جبکہ عورت کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کی عام طور پر بھرپور خواہش، مرد کے دل میں موجود ہوا کرتی ہے۔ یہاں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ایسی حالت میں مرد، طلاق کا حق، جذبات کی رو میں بہہ کر نہیں،

[1] سورۃ الطلاق آیت ۱ [2] ہدایہ اولین ص ۳۳۴

بلکہ جذبات کے برخلاف صرف سوچی سمجھی اسکیم اور حقیقی ضرورت ہی کے لیے استعمال کرے گا۔ اسی بنا پر عورت کو "مخصوص دنوں" میں یا اس وقت جبکہ مرد "سیری" حاصل کر چکا ہو، طلاق دینا، ناپسندیدہ قرار دیا گیا، کیونکہ ایسے وقت طلاق دینے میں عقل سے زیادہ وقتی غصہ یا کسی فوری داعیہ کی کارفرمائی کا بھی امکان ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ ترغیبی اسلوب پر ہی بس نہیں کیا گیا، بلکہ اس کی سخت ممانعت کر دی گئی ہے کہ کوئی شخص عورت کے "مخصوص عذر" کے زمانہ میں طلاق دے، یا یک وقت تین[2] طلاقیں دے، اس پر مستزاد یہ ہے کہ ایسی حالت میں دی گئی طلاق کے بعد مراجعت ضروری قرار دی گئی (بشرطیکہ تین طلاقیں نہ ہو گئی ہوں) — حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنی زوجہ کو حالت حیض میں طلاق دیدی۔ ان کے والد حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اطلاع دی تو آپؐ سخت برہم ہوئے اور حضرت عمرؓ سے کہا کہ انھیں مراجعت کا حکم دو

"فتغیظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا"[1]

اسی طرح بیک وقت تین طلاقیں دینا بھی سخت گناہ کا کام بتایا گیا ہے اور اس پر اکثر ائمہ متفق ہیں جیسا کہ محی الدین نوویؒ فرماتے ہیں: "قال مالک والاوزاعی و ابوحنیفۃ ھو بدعۃ"[2] لیکن اس کے باوجود ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کے نزدیک تین ہی واقع ہو جاتی ہیں۔ مگر تین طلاقیں دینے والا گنہگار ہوتا ہے۔[عـه] مشہور وسیع النظر حنفی عالم علامہ بدرالدین عینیؒ نقل فرماتے ہیں۔

ومذھب جماھیر العلماء من التابعین ومن بعدھم منھم الاوزاعی والنخعی والثوری و ابوحنیفۃ واصحابہ ومالک واصحابہ والشافعی واصحابہ واحمد واصحابہ واسحٰق وابو ثور وابو عبید وآخرون کثیرون علی أن من طلق إمرأتہ ثلاثا وقعن ولکنہ یأثم[3]

---

[1] ابوداؤد ص ۲۹۷ ج ۱　[2] شرح مسلم للنووی ص ۴۷۸ ج ۱　[3] عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ص ۵۳۷ ج ۹

عـه اس مسئلہ کی مزید تفصیل و تحقیق احقر کے مضمون "فیضی صاحب کے مقالہ کا جائزہ" شائع شدہ الفرقان لکھنؤ، اشاعت مارچ ۷۲ء میں پیش کی جا چکی ہے۔

غالباً انہی وجوہ کی بناء پر محقق ابن ہمامؒ اور ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:۔

لاحاجة إلى الإشتغال بالأدلة على رد قول من أنكر وقوع الثلاث جملة لأنه مخالف للإجماع كما حكاه فی المعراج ولذا قالوا لو حكم حاكم بأن الثلاث بفم واحد، واحدة لم ينفذ حكمه لأنه لا يسوغ فيه الإجتهاد لأنه خلاف لا اختلاف [1]

یعنی اگر کوئی قاضی یا حاکم ایسی تین طلاقوں کے ایک طلاق ہونے کا فیصلہ کر بھی دے تب بھی وہ نافذ نہیں ہوگا کیونکہ یہاں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اگرچہ بیک وقت تین طلاق دینا سخت ناپسندیدہ ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ فلاں شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالیں۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غصہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ کھلواڑ کی جاتی ہے اور وہ بھی میری موجودگی میں!

(أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أخبر عن رجل طلق امرأته ثلاث تطليقات جميعاً فقام غضباناً ثم قال أيلعب بكتاب الله وانا بين أظهركم واسناده على شرط مسلم" [2])

اب بتائیے کہ ان احتیاطوں کے ساتھ طلاق کی مشروعیت عقلِ سلیم کے نزدیک نامناسب چیز قرار پائے گی یا ضروری اور ناگزیر؟ کیا اس کو طلاق کی "مطلق آزادی" دینا کہا جا سکتا ہے

یہاں یہ ذکر کردینا بھی شاید نامناسب نہ ہوگا کہ طلاق کے بے جا استعمال ہونے کی کثرت اور معاشرہ کی بگاڑ کی صورت میں علماء کے مشورے سے اسے ایک قابلِ تعزیر جرم بھی قرار دیا جا سکتا ہے، بغیر غلط موقع، اور بے ضرورت دی گئی طلاق پر سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اوپر گزر چکا ہے کہ یہ معصیت ہے اور ہر معصیت پر شرعاً سزا دی جا سکتی ہے [3] اور یہ بات تمام ائمہ کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ امام شعرانیؒ نقل فرماتے ہیں:۔

---

[1] بحر الرائق ص ۲۵۷ ج ۳ و فتح القدیر ص ۱۴۹ ج ۳ [2] زاد المعاد ص ۵۱ ج ۴

[3] علاوہ ازیں یہ کہ ہر وہ قول یا فعل جس سے دوسرے کو تکلیف پہونچائی جائے، موجب تعزیر بن سکتا ہے۔ جیسا کہ فقیہ ابن نجیم مصری نے "الاشباہ" میں ذکر کیا ہے من اذی غیرہ بقول او فعل یعزر۔ (التحاف الابصار والبصائر بترتیب الاشباہ والنظائر ص ۱۷۴)

"إتفق الأئمة على أن التعزير مشروع فی كل معصية لاحد فيها ولا كفارة"[۱]

اور فیصلہ کرنے والی "الحکام" کے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس قسم کی سزا بھی مناسب سمجھے دے، جو زبانی زجر و توبیخ بھی ہو سکتی ہے، قید و بند بھی، کوڑے لگانا بھی ہو سکتی ہے اور مالی جرمانہ بھی، غرضیکہ افراد و اشخاص، حالات و زمانہ اور ارتکاب جرم کے تعدد یا توحد کے اعتبار سے نرم بھی ہو سکتی ہے اور سخت بھی۔

اس کی تفصیل محقق ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں اور علامہ عینیؒ نے بنایہ[۲] شرح ہدایہ میں قلمبند فرمائی ہے۔ یہاں فتح القدیر کے کچھ حصے پیش کیے جاتے ہیں۔

عن السرخسی انه ليس فيه شئ مقدر بل هو مفوض إلى رأى القاضى لأن المقصود منه الزجر، احوال الناس مختلفة فيه فمنهم من ينزجر بالنصيحة ومنهم من يحتاج إلى اللطمة وإلى الضرب ومنهم من يحتاج إلى الحبس.... .... وفى الشافى....... يعزر الأشراف وهم العلوية والعلماء بالإعلام وهو أن يقول له القاضى بلغنى أنك تفعل كذا فينزجر به.. .... وعن أبى يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال ...... ومن جملته ذلك رجل لا يحضر الجماعة يجوز تعزيره بأخذ المال[۲]

محقق ابن ہمامؒ نے فقیہ تمرتاشی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

يجوز التعزير الذى حقا لله تعالى لكل احد بعلة النيابة عن الله تعالى .... وهذا لأنه من باب إزالة المنكر باليد والشارع ولّى كل أحد ذلك حيث قال من رأى منكم منكرا الخ[۳]

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تعزیر بالمال کا جواز صرف امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے وہ بھی بروایت ضعیف، لیکن جمہور علماء کے نزدیک وہ بھی منسوخ ہو گئی ہے اس لیے اب علماء نے

---

[۱] المیزان صفحہ ۱۴۲ [۲] فتح القدیر صفحہ ۲۱۳-۲۱۲ ج ۲ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ [۳] فتح القدیر صفحہ ۲۱۴ ج ۲
[۴] بنایہ شرح ہدایہ باب التعزیر

کا فتویٰ نہیں دیتے بلکہ دینا بھی نہیں چاہیے۔ بعض علماء نے تعزیر بالمال کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ مجرم سے مال لے کر محفوظ رکھ لیا جائے، اور وہ جب راہ راست پر آجائے، اسے واپس کر دیا جائے ورنہ بیت المال میں داخل کر دیا جائے (یہ تمام تفصیل علامہ ابن عابدین شامیؒ نے رد المحتار میں ذکر فرمائی ہے)[1]

اس تمام تفصیل کے پیش نظر آجانے اور طلاق کے مواقع استعمال، نیز غلط استعمال کی صورت میں تنبیہ بلکہ سزا و توبیخ کے عائد کرنے کی گنجائش موجود ہونے پر بھلا کون عقلمند طلاق کے حکم کو خلاف مصلحت بتانے کی جرأت یا مرد کو اسلام کی طرف سے بے جا رعایت دینے کا الزام دے سکے گا۔ بلکہ عناد و دشمنی کے جذبہ سے بلند ہو کر جو بھی غور کرے گا اسے اس میں سراسر خیر ہی نظر آئے گا۔ خاص طور پر اس پہلو کے سامنے آجانے کے بعد کہ طلاق دینے کے بعد بھی شرعی قانون کی رو سے مطلقہ عورت کے تمام اخراجات کی ذمہ داری عدت کے زمانہ میں یعنی اس مدت تک جب تک یہ عورت دوسرے کسی شخص سے شرعاً نکاح کے لائق نہیں رہتی، طلاق دینے والے شوہر پر ہی ہے۔ اور یہ حکم تقریباً تمام صورتوں میں ہے۔

ان تمام پہلوؤں کے سامنے آجانے کے بعد بجز اس شخص کے کہ جس پر راہ حق پوری طرح مسدود ہو گئی ہو، اور کون ہوگا جو اسلام کے فطری مذہب ہونے کا انکار بلکہ اس پر شبہ بھی کر سکے!

ربنا لاتزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا
وهب لنا من لدنك رحمة

تعدادِ ازدواج کی اجازت
تنقیدوں کا جائزہ

چند زوجیت کے قانون پر تنقید کا اصل محرک شریعت کے قانونِ طلاق کی طرح بعض اعتبار سے اس کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی تنقید و تنقیص بلکہ ظالمیت تک کے الزام کا

---

[1] دیکھئے رد المحتار ص۲۶۰ ج۱

"چند بیویاں رکھنے کی اجازت" والے قانون کو بھی ہدف بنایا جا رہا ہے۔ اس مسئلہ میں بھی اکثر تو جذباتی نعروں اور فرضی افسانوں کا سہارا لے کر اعتراضات کیے جاتے ہیں اور بسا اوقات اس قانون کی گنجائش سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے "اسلام کے نام لیوا" افراد کی شخصی غلطی بھی نفس قانون پر اعتراض کرنے اور اغیار کو طعنہ زنی کا موقع فراہم کر دیتی ہے۔ حالانکہ ہر بہتر سے بہتر قانون پر غلط طریقے سے عملدرآمد کے بعد جزوی طور پر نامناسب اثرات کا ظاہر ہو جانا گویا ایک پیش آمدہ حقیقت ہے لیکن اس سے قانون کی خرابی کا فیصلہ اور اس کے ختم کرنے کی کوشش کا جواز نہیں پیدا ہو جاتا، اور نہ قانون کی افادیت ہی مشتبہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب مقصد "تنقید برائے تنقید" ہی ہو، یا پورے قانون کا بنظرِ غائر مطالعہ نہ کیا گیا ہو، اور صرف "کمزور پہلو ہی نظر کے سامنے ہوں، تو رائی کا پہاڑ بن جانا اور ہر خوبی کا نظر سے اوجھل ہونا کچھ مستبعد نہیں، بدقسمتی سے زیر بحث "قانون" کے بارے میں یہی صورتِ حال پیدا کر دی گئی ہے اور یہی تنقید کا اصل محرک ہے۔

جن لوگوں کی نظریں صرف خامیاں تلاش کرنے اور برائیاں ڈھونڈھنے ہی کے لیے وقف ہو چکی ہے، ان سے تو کچھ کہنا لاحاصل ہے، ہاں! وہ لوگ جو اس مسئلے کے تمام گوشوں سے ناواقف ہونے اور اسے پورے طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، یا کر دیے گئے ہیں، ان کے لیے آئندہ سطریں شاید مفید ہوں اور اصل قانون کو جان لینے اور صحیح طور پر سمجھ لینے کا ذریعہ بن جائیں ——— واللہ الموفق للسداد۔

چند بیویاں رکھنے کے لیے شرعی پابندیاں

عام طور پر "ناواقف حلقوں میں یہ سمجھا جاتا ہے یا ایسا تاثر دیا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس غلط فہمی کا باعث کسی "ناخدا ترس مسلمان یا چند مسلمانوں کا طرزِ عمل ہی ہو ——— کہ شریعت نے ہر ایک کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت "بغیر کوئی خاص پابندی لگائے" دے رکھی ہے۔ حالانکہ اسلامی قانون کا معمولی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ جس آیت سے چند بیویاں رکھنے کا جواز۔ فرضیت یا وجوب نہیں نکلتا ہے اس میں ساتھ ہی یہ ہدایت بھی موجود ہے کہ ——— فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم ذلک ادنیٰ ان لا تعولوا۔ [1] ——— (پس اگر تم کو (غالب) احتمال ہو

---

[1] سورۂ نساء آیت ۳

ہو کر (کتنی بیبیاں کرکے) عدل نہ رکھو گے (بلکہ کسی بی بی کے حقوق واجبہ ضائع ہوں گے) تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو... [1]

چنانچہ علمائے امت نے ہر نکاح کے وقت (خواہ وہ کوئی سا بھی ہو، پہلا ہو یا دوسرا، بیوی کی موجودگی میں ہو، یا بغیر) ــ بالخصوص پہلی بیوی موجود ہونے کی صورت میں دوسرا نکاح کرنے کے موقع پر، حقوق زوجیت ــ جتنی بیویاں ہوں، ان سب کے، ایک ہی ہے تو اسی ایک کے حقوق ادا کرنے کی اہلیت کو ضروری قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کے بغیر نکاح کرنا، گناہ کی بات اور عنداللہ قابل مواخذہ فعل ہوگا ــ ظاہر ہے کہ عقیدۂ آخرت پر ایمان لانے والے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی رکاوٹ کسی برے فعل سے روکنے والی نہیں ہو سکتی ــ اور اس عقیدہ کے بغیر دوسری کوئی چیز حتیٰ کہ دنیا کا کوئی بھی قانونِ تعزیر، باز نہیں رکھ سکتا، اور آج کل دنیاوی قوانین کی بے اثری تو ایسی حقیقت بن گئی ہے کہ اس کا انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس بارے میں علماء کے اقوال کا احاطہ، نہ تو ممکن ہی ہے، نہ ضروری، اس لیے صرف ایک شہرۂ آفاق عالم قاضی ابوبکر ابن العربی کے چند جملے نقل کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے

قال علماءنا معناه (فان خفتم الا تعدلوا)

في القسم بين الزوجات والتسوية	علماء نے کہا ہے کہ آیت تعدد کا مطلب
في حقوق النكاح وهو فرض.....	ہے اگر تمہیں چند بیویوں کے حقوق ادا
واخذ الخلق باعتبار الظاهر	کرنے اور سب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ نہ کر
ليتيسر على العاقل فاذا	سکنے کا پورا خطرہ ہو تو چند بیویاں نہ رکھو
قدر الرجل من ماله و	بلکہ صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو کیونکہ
بنيته على نكاح اربع فليفعل	سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنا فرض ہے
واذا لم يحتمل ماله ولا	اور یہ اصول بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ
بنيته في الباءة فليقتصر	شرعی احکام، ظاہری حالات کے اعتبار سے

[1] بیان القرآن ۲/۹۳

علیٰ ما یعتقد ما علیہ [1]

سے متعلق ہوتے ہیں کیونکہ یہ ہر ذی ہوش کے لیے (اسی کو معیار بنانا) آسان ہے۔ اس اصل کا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی شخص بظاہر جسمانی قوت اور مالی وسعت اتنی رکھتا ہو کہ چار بیویوں کے حقوق ادا کر سکے، تو چند بیویاں رکھنے کی صرف اسی کو اجازت ہے لہٰذا وہ ایسا کر سکتا ہے اور اگر وہ جسمانی قوت اور مالی اعتبار سے اس کا تحمل نہیں کر سکتا تو اسے صرف اس تعداد پر اکتفا کرنا چاہیے جس کا وہ تحمل کر سکتا ہے۔

تعدد کے مخالفین کی طرف سے مزید پابندیوں کا مطالبہ

یہاں، تعدد ازدواج کو بہت محدود صورتوں میں "درست" سمجھنے والوں یا بالفاظِ صحیح تعدد کے مخالفین کی طرف سے کیے جانے والے اس مطالبہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ "جہاں عدل بین الزوجات میں کوتاہی کا "خطرہ" ہو، وہاں دوسرا نکاح کرنے پر پہلے ہی سے پابندی لگا دی جائے" اس گروہ کے بعض افراد تو یہاں تک کہہ گزرتے ہیں "اس نکاح کو سرے سے منعقد ہی نہ مانا جائے"۔ اس طرح کے مطالبہ کرنے والوں سے یہ سوال کرنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ بتایا جائے!

ایسا کون سا پیمانہ، یا آلہ ہے، جو اس "خطرہ"۔۔۔ اس بے وجہ کے پیشگی بڑھے ہوئے احساس کو اگر خطرہ کہنا درست ہوگا تو۔۔۔ قبل از وقت صحیح پتہ چلا کر بتا دے کہ یہ شخص دوسری بیوی کے آتے ہی یکسر ظالم بن جائے گا، لیکن وہی پیمانہ۔۔۔ یا آلہ۔۔۔ عقدِ اول کے وقت کسی شخص کے اپنی منکوحہ پر آئندہ ظلم کرنے کا پیشگی اندازہ بھی نہ کر سکے۔۔۔ ظاہر ہے کہ نکاح سے پہلے دونوں ہی صورتوں میں یہ احتمال ہے کہ یہ، اپنی ہونے والی منکوحہ کے ساتھ اچھا سلوک اور "امساک بالمعروف" کے تقاضے پورے کرے گا یا نہیں؟ اس منطق کی رو سے تو پہلی شادی بھی اس طرح کے خطرہ کی موجودگی میں قانوناً رکوا دی جانی چاہیے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ یہ ایک نامعقول بات ہوگی اس لیے پہلے نکاح کے وقت یہ مطالبہ کسی حلقہ کی طرف سے نہیں کیا جاتا۔ تو پھر کوئی

---

[2] احکام القرآن لابن العربی ۱/ ۳۱۰۔

وجہ نہیں کہ مرشانی کے وقت ہی اس کا ہوا کھڑا کیا جائے۔

ظلم کا پیشگی خطرہ ہو تو نکاح کرنا گناہ

بس یہی بات وہی ہے جو شریعت کے رمز شناسوں نے بتادی ہے کہ جس شخص کو اپنے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ نکاح کے بعد ــ خواہ پہلا یا دوسرا ــ شکوحہ کے حقوق ادا نہ کر سکے گا اور اس سے ظلم سرزد ہو جائے گا، اس کے لیے نکاح کرنا ممنوع اور گناہ کی بات ہے متعدد فقہاء کے یہاں یہ تصریح ملتی ہے مثلاً مشہور حنفی محقق ابن ہمامؒ فرماتے ہیں

فان عارضه (خوف الجور) كره ..... والذى يخاف الجور يأثم له[1]

اسی طرح حنفی فقہ کی شہرہ آفاق کتاب درمختار اور اس کی شرح ردالمحتار میں بیان کیا گیا ہے۔

(ومكروه) اى تحريما (لخوف الجور فان تيقنه حرم ذالك) اى تيقن الجور حرم لان النكاح انما شرع لمصلحة تحصين النفس وتحصيل الثواب وبالجور يأثم ويرتكب المحرمات فتنعدم المصالح لرجحان هذه المفاسد[2]	جسے نکاح کے بعد ظلم کرنے کا گمان ہو اس کے لیے نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے اور ظلم کا یقین ہو تو حرام ہے یعنی ظلم سرزد ہونے کا یقین ہو تو نکاح حرام ہے کیونکہ نکاح، نفس کی (حرام کاری سے) حفاظت کے لیے مشروع ہوا ہے اور ثواب کی غرض سے لیکن ظلم کر کے گناہ اور حرام کا مرتکب بنے گا (بجائے ثواب پانے اور حرام سے بچنے کے) اس طرح نکاح کے (دونوں) مقصد فوت ہو گئے ان برائیوں کے غالب آجانے کی وجہ سے (لہٰذا نکاح کرنا ممنوع ہوگا)

نکاح کی صحت کے لیے حقوق ادا کر سکنے کا پیشگی اطمینان لازمی شرط نہیں

چونکہ ہر شخص اپنے حالات اور مزاج نیز افتادِ طبع کو خود جتنا جان سکتا ہے کوئی دوسرا اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا، اس لیے شریعت نے ہر ایک کو عنداللہ مسئول ہونے کا شعور دے کر اسی پر ذمہ داری ڈال دی ہے کہ وہ خود اپنے حالات کا جائزہ

---

[1] فتح القدیر ۲/۳۴۳ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ [2] درمختار مع ردالمحتار ص ۲۹۱/۲۶۰

لیکر نکاح کرنے نہ کرنے کا فیصلہ کرے، اور اپنی طرف سے ایسی کوئی قانونی پابندی نہیں عائد کی اس لیے شریعت کے ماہرین نے نکاح ثانی سے قبل عدل بین الزوجات کے پیشگی اطمینان کو ایسی شرط نہیں قرار دیا کہ اس کے حاصل کیے بغیر نکاح ہی صحیح نہ ہو، بلکہ اس اطمینان کے حاصل ہوئے بغیر بھی نکاح بالکل صحیح ہو جاتا ہے، جیسا کہ ابن العربیؒ رقمطراز ہیں:-

دلیل خطاب ھذہ الآیة ساقط بالاجماع فان کل من علم انه یقسط للیتیمة جازله ان یتزوج سواها کما یجوزله اذا خاف ان لا یقسط [1]

عدل نہ کرنے کی وجہ سے علیحدگی کا اختیار

ہاں! نکاح کر لینے کے بعد کسی بیوی۔ خواہ پہلی ہو یا دوسری۔ کے ضرور حقوق ادا نہیں کیے اور ظلم کیا، یا بیویوں کے درمیان واجب مساوات نہیں برتی، اس شکل میں مظلوم بیوی کو یہ حق ہوگا کہ وہ شوہر سے گلوخلاصی کر لے، اور شریعت نے اس عورت کو حق دیا ہے کہ وہ عدالت سے، جبکہ وہ ضروری اطمینان حاصل کر لے، اور اس بارے میں لگائی گئی مخصوص شرطیں پائی جا رہی ہیں، اس کا ثبوت مل جائے تب، نکاح فسخ کرا لے۔ اگر خلع کی کوشش، نیز مرد سے براہ راست طلاق حاصل کرنے میں ناکامی ہو چکی ہو۔[2] اس کے علاوہ بھی اور بعض شرطیں ہیں جن کی تفصیل کا نہ یہ مضمون متحمل ہو سکتا ہے، اور نہ اس کی ضرورت، ان سب کو حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الحیلة الناجزة" میں تفصیل سے بیان فرما دیا ہے)

یہاں علماء کے تفصیلی اقوال اور دلائل پیش کرنے کے بجائے صرف ایک بالغ نظر مالکی عالم کی مختصر عبارت کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:- اذا کانت الاساءة من قبل الزوج فرق بینهما [3] (یعنی اگر شوہر کی طرف سے بدسلوکی کا مظاہرہ ہو تو تفریق کر دی جائے)

ان امور کے سامنے آ جانے کے بعد بعض حلقوں کی طرف سے کیے جانے والا یہ مطالبہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے کہ نکاح ثانی کر لینے سے ہی نکاح فسخ کرانے کا، پہلی بیوی کو اختیار دے دیا جائے۔

---

[1] احکام القرآن لابن العربی ۱/۳۱۹ [2] یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ایسی صورت میں طلاق حاصل کرنے کا عورت کو اختیار، فقہ حنفی کی رو سے تو نہیں ہے لیکن مالکی فقہ میں اس کی گنجائش ہے، چنانچہ احناف کے لیے بھی مالکی مذہب کے مطابق مظلوم بیوی کو فسخ نکاح کرانے کا) تمام بالغ نظر حنفی علماء نے فتویٰ دے دیا ہے مگر اس کے لیے بہت سی شرطیں اور پابندیاں ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں اس لیے، دیکھیے حضرت تھانویؒ کی کتاب "الحیلة الناجزة"

[3] احکام القرآن لابن العربی ۱/۱۷۰

محض اس وہم کی بنیاد پر کہ یہ شخص کہ جس نے دوسرا نکاح کر لیا ہے، لازماً عدل نہیں کرے گا۔ حالانکہ قطعی طور پر ایسا سمجھ لینا، مضحکہ خیز، بالکل نامناسب اور بے دانشی کی بات ہے، اس لیے شریعت، محض نکاح ثانی کر لینے سے یعنی بیوی پر ظلم کرنے سے پہلے مجرم قرار نہیں دیتی پھر ظاہر ہے جرم سے پہلے سزا دینا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

تعدد ازدواج کی اباحت کے بارے میں ناقدین کیا کہتے ہیں!

چند بیویاں رکھنا جو لوگ درست نہیں سمجھتے، ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کو اپنے بارے میں اسلامی قوانین جاننے نیز قرآن و حدیث سے واقفیت کا گمان بھی ہے اس طبقہ کے لیے قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبوی کی وہ صراحتیں جن میں تعدد کا جواز کھلے طور پر موجود ہے، پریشانی کا موجب ہوئیں تو یہ عجیب عجیب قسم کی تاویلات کا سہارا لینے لگا۔ مثلاً کسی نے یہ کہہ کر تاویل کی، "تشریع محمدی کا رخ یک زوجگی سے آگے بڑھ کر چند زوجگی کی اباحت کا نہیں، بلکہ مروّج اباحت مطلقہ کو محدود کرنے کا ہے" لیکن ہر واقف جانتا ہے کہ نصوص کے ظاہری معنی کے خلاف یہ محض دعویٰ ہے، جو دلیل کا محتاج ہے، اور شاید یہ کہنا مبالغہ سے خالی ہو کہ ٹھیک اس دعوے پر شریعت کے مسلّمہ ماخذ سے کوئی صحیح دلیل قائم کرنا مشکل ہے، کیونکہ اس دعوے کی تائید نہ قرآن کی آیات اور اس کے سیاق و سباق سے ہوتی ہے، نہ احادیث رسول سے ؏ اور اساطین امت نیز حاملان علوم نبوت کے اقوال سے بھی اس پر دلیل قائم کرنا دشوار ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کے برخلاف۔ قرآن مجید کی آیت "فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث وربٰع" [1] میں جس انداز سے، تعدد کا حکم مذکور ہوا ہے، اس سے وسعت اور تعدد کی اباحت کے رجحان ہی کا پتہ چلتا ہے، نہ کہ اس میں تنگی اور "محدودیت" کا۔

اور یہ بات عصر اول تا آخر غرضیکہ ہر دور کے علماء نے آیت سے سمجھی ہے۔ مثلاً عصر قریب کے مشہور، بالغ نظر مفسر علامہ محمود آلوسی اپنا احساس یہی تحریر فرماتے ہیں۔

؏ اس بارے میں، سنن ابو داؤد و دار قطنی میں تخریج کردہ، غیلان ثقفی کی روایت، اور اسی کے واقعہ سے استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس سے، زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع ہے، سو جمہور علماء پہلے ہی سے یہ بات کہہ رہے ہیں۔ [1] سورۂ نساء آیۃ ۳

..... ما یشعر به السیاق من التوسعۃ ..... وجہ اشعارہ بذلک انہ اطلق قولہ سبحانہ (ماطاب لکم من النساء) ثم جاء (مثنیٰ وثلاث ورباع) کانہ بیان لما وقع اطلاقہ علیٰ نوع من التقیید ... لوکان المراد التضییق لکان التقیید من الاول اوقع فیہ وامس بہ۔[1]

یہاں اس واقعہ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ موجودہ مغرب زدگی کے دور سے قبل جمہورِ علماء اور فقہائے مجتہدین کے اس مسلک سے الگ راہ پر چلنے والے بعض "عالموں" اور "فقیہوں" نے ازواج کی تعداد کو چار ہی میں منحصر ہونے کے خلاف تو آیت سے استدلال کیا ہے، لیکن ہماری معلومات کی حد تک کسی نے اس سے کم تعداد پر آیت سے استدلال نہیں کیا، چنانچہ کسی نے ۹، کسی نے ۱۸، اور کسی نے بلا قید ہر تعداد کی اباحت کو آیت سے مستنبط کیا ہے کیونکہ اس حقیقت کا انکار مشکل ہے کہ زیرِ بحث آیت سے ۔فی الجملہ وسعت کا رجحان ہی مفہوم ہوتا ہے، اور یہ بات عربی زبان کی مہارت رکھنے والوں پر مخفی نہیں ہے اور شاید بعض حلقوں کے لیے یہ حقیقت "انکشاف" کا درجہ رکھتی ہو کہ جمہور علماء اور فقہائے مجتہدین نے اپنے مسلک (چار میں انحصار) کے اثبات کے لیے "اجماع" پر زیادہ بھروسہ کیا ہے، اور اس بارے میں سب سے قوی دلیل یہی اجماع مانی گئی ہے۔ علامہ آلوسی نے اس مبحث کو خاصی تفصیل سے، کئی صفحہ میں (از ص ۱۹۱ تا ص ۱۹۳ ج ۴) میں بیان کیا ہے اور اپنا یعنی جمہور علماء کا مسلک ثابت کرتے ہوئے آخر میں فرمایا ہے :- اقوی الامرین المعتمد علیہما فی الحصر الاجماع فانہ قد وقع وانقضی عصر المجمعین قبل ظہور الاختلاف۔[2]

علاوہ ازیں یہ کہ بر سبیلِ تنزل، اگر بلا دلیل، بلکہ خلافِ دلیل۔ یہ بات مان بھی لی جائے کہ نزولِ آیت کا سبب یا "شریعت محمدی" کا منشا "عرفِ اباحتِ مطلقہ" کو محدود کرنا ہے، تب بھی یک زوجگی پر مجبور کرنے، اور تعدد پر قانونی پابندی عائد کرنے کا علمی انداز میں، آیت سے جواز نکالنا دشوار ہے کیونکہ یہ اصول مسلّمات کا درجہ رکھتا ہے، کہ مشروعیتِ حکم کے وقت، کسی خاص سبب کے موجود ہونے کا، یہ اثر لازمی نہیں ہوتا ہے کہ وہ حکم صرف اسی خاص سبب تک محدود رہے۔ (العبرۃ لعموم المعانی لا لخصوص الموارد)[3]

---

[1] روح المعانی مع حاشیہ ۴/۱۹۵ مطبوعہ دیوبند [2] ایضاً ص ۱۹۳ [3] نور الانوار لملا احمد جیون)

تقریباً یہی بات شیخ ابوبکر الجصاصؒ الرازی نے ـــ ایک موقعہ پر ارشاد فرمائی ہے:- [۵]

لو نزلت علی سبب خاص لم یوجب ذلک تخصیص عموم اللفظ بل الحکم للعموم دون السبب عندنا فنزولها علی سبب ونزولها مبتدأة من غیر سبب سواء۔

خلاصہ یہ کہ موجودہ متجددین مغربی تہذیب سے مرعوب افراد اور گزشتہ دور کے بعض علماء (جمہور سے اختلاف کرنے والے) یہ دونوں گروہ۔ اس بارے میں ـــ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں معتدل اور صحیح راہ وہی ہے جو جمہور کی اختیار کردہ ہے۔

اوپر کی سطروں میں آیت اباحت کی جس تاویل کا ذکر آیا اسی پر تعدد کے مخالفین بات ختم نہیں کر دیتے بلکہ بعض نے متذکرۂ بالا تاویل سے بھی زیادہ مضحکہ خیز، عجیب تر اور قرآن کے مفہوم سے بعید تر، آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے:- "آیت میں صرف یتیم بچیوں کے ساتھ نکاح میں تعدد کی اباحت و اجازت ہے، اور یہ ان کی سرپرستی کا ایک حل ہے، نہ کہ یتیم بچیوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے تعدد کا جواز۔"

حالانکہ خود صاحب وحی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جن پر قرآن مجید نازل ہوا اور جن کا اصل منصب (قرآن کی صراحت کے مطابق) قرآن مجید کی آیات کی تشریح و تفسیر کرنا ہے (لتبین للناس ما نزل الیھم [۶]) ان سے براہ راست مستفید ہونے والے، اور خلوت و جلوت کی باتوں کو محفوظ رکھنے والے آیت کا مطلب یہ بتاتے ہیں (جو ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ سے سنا ہی ہوگا، اور وہ صحیح سندوں کے ساتھ معتبر ترین کتابوں میں منقول و موجود ہے) کہ:- اس آیت کے نازل ہونے کا سبب یہ ہوا کہ یتیم بچیوں کے ساتھ نکاح کر کے ہی ان پر ظلم کیا جاتا تھا، اور نکاح ان کا مال ہڑپ کر جانے اور جائداد پر قبضہ کر لینے کا بہانہ ہوتا تھا۔ ورنہ ان لوگوں کا مقصد نہ انھیں بیویاں بنا کر رکھنا ہوتا تھا اور نہ ان کے حقوق زوجیت ادا کرنا ان کے پیش نظر ہوتا تھا۔ نیز یہ کہ ایسی بے یار و مددگار "بیویوں" کی طرف سے حقوق طلبی کے دعوے کا خطرہ بھی کسی جانب سے نہ ہوتا تھا۔

اس لیے ایسی خود غرضانہ شادیوں ـــ کہ جن میں یتیم۔ مگر مالدار بچیاں کنگال بنا کر چھوڑ دی جائیں

---

[۵] احکام القرآن للجصاص ص ۲/۲۶۰ [۶] سورۃ النحل آیۃ ۴۴

اس سے روکا گیا، اور کہدیا گیا کہ تم ان بچیوں کے علاوہ، سارے جہان کی عورتوں سے، اپنی پسند کے مطابق نکاح کر سکتے ہو، ایک چھوڑ چار سے یہ رشتہ جوڑ سکتے ہو، مگر ان بچیوں کو نہ ستاؤ اور ان کی زندگیاں خراب نہ کرو۔ طوالت سے بچنے کے لیے یہاں اس مضمون کی صرف ایک حدیث، سب سے زیادہ صحیح اور مقبول کتاب بخاری سے نقل کی جاتی ہے:-

.... عن ابن شهاب قال اخبرني عروة ابن الزبير انه سأل عائشة عن قول الله تعالىٰ "وان خفتم ان لا تقسطوا في اليتمىٰ" فقالت يا ابن اختي هذه اليتيمة تكون في حجر وليها تشركه في ماله ويعجبه مالها وجمالها فيريد وليها ان يتزوجها بغير ان يقسط في صداقها فيعطيها مثل ما يعطيها غيره فنهوا عن ان ينكحوهن الا ان يقسطوا لهن ويبلغوا لهن على سنتهن في الصداق فامروا ان ينكحوا ما طاب لهم من النساء سواهن [1]

اور یہ بات (تفصیل اور اجمال کے فرق کے ساتھ) تقریباً تمام ہی معتبر تفسیروں میں ملتی ہے۔[2] یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ آیت کی مذکورہ تفسیر جس کا کتب حدیث میں ذکر ہے قرآن حکیم کی آیت کے سیاق سے بھی نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور مطلب لینا تکلف سے خالی نہیں ہوگا۔ کیونکہ زیر بحث آیت سے قبل والی آیت میں یتیموں کے اموال کے سلسلہ کی ہدایات ہیں کہ تم لوگ (ان کا مال ہرگز اپنے اوپر استعمال نہ کرنا، بلکہ) ان ہی کے حوالے کر دو۔ جب وہ اس کے اہل ہو جائیں (وآتوا اليتمىٰ اموالهم الخ) اس کے بعد اس فریب کاری سے بھی روکا گیا کہ ظاہر تو یہ کر رکھا ہے کہ اپنا مال کھا رہے ہیں ورنہ حقیقۃً یتیم کا مال ہی استعمال کر رہے ہیں۔ اس طرح پر کہ ان کا مال اور اپنا مال دونوں گڈمڈ کر رکھے ہیں۔ چنانچہ صاف کہدیا گیا ہے کہ ان کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر بھی نہ استعمال کرو (ولا تأكلوا اموالهم الى اموالكم انه كان حوبا كبيرا) اور اسے بہت بڑا گناہ بتایا گیا۔ اس کے بعد پھر زیر بحث آیت ہے یعنی یہی کہ جس میں تعدد ازواج کی اباحت مذکور ہے۔

---

[1] بخاری ۲/۷۵۸ مکتبہ رحیمیہ دیوبند [2] دیکھئے تفسیر ابن کثیر ۱/۴۵۰، ۴۹۹۔ درمنثور ۱/۱۱۸-۱۱۹۔ تفسیر مظہری ۲/۲۶۵، تفسیر کبیر ۳/۱۳۶ تا ۱۳۹۔ احکام القرآن للجصاص ۲/۵۰ تا ۵۰۔ احکام القرآن لابن العربی ۱/۱۲۹۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کلامِ اللہ کا مفہوم اگر وہی ہوتا جو اس تجدد پسند طبقہ نے بیان کیا ہے تو آیت کے اندر "فانکحوا ما طاب لکم" کے بعد (عربی زبان کا تقاضا یہ ہے کہ) "من النساء" کے بجائے "منھن" یا اس جیسا اور کوئی کلمہ ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ اس کے بعد والی آیت میں ہے جو یتیموں کو ان کے اموال دینے کے سلسلہ میں ہے (یعنی پہلے اسم ظاہر پھر اسم ضمیر) "وابتلوا الیتمٰی حتی اذا بلغوا النکاح" اس کے بعد ہے۔ "فان آنستم منھم رشدا"۔ اگر یہاں بھی وہی یتیم بچیاں مراد ہوتیں جن کے بارے میں شروع آیت میں ان کے ساتھ انصاف نہ کرنے کے خطرہ کا ذکر ہے، تو وہ اسلوب یقیناً نہ ہوتا جو اس وقت ہے، بلکہ اس سے مختلف ہوتا، اسی بنیاد پر متعدد مفسرین و مترجمین نے آیت کا ترجمہ و تفسیر کرتے ہوئے یہ بات بصراحت کہی ہے کہ "ان یتیم بچیوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح کرو"۔[1]

تعدد کی حکمتیں | اس تفصیل کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کی کچھ حکمتیں اور بعض مصلحتیں بھی ذکر کردی جائیں، تاکہ شریعت کو شر دیکھنے والی آنکھ کے سامنے اس کا خیر والا پہلو بھی آجائے — ویسے اصل بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تمام مصلحتوں اور حکمتوں کا ادراک انسان کی دسترس سے باہر ہے، اسی وجہ سے وہ اس بات کا مکلف نہیں کیا گیا کہ حکمتیں تلاش کرکے عمل کیا کرے۔ اور یہ بالکل ضروری نہیں کہ جس حکم کی جو مصلحت انسانی عقل میں آئی ہے وہی اس کی مشروعیت کا سبب بھی ہو، اس کے باوجود احکام کے مصالح بیان کرنے کا معمول سلف سے بھی منقول ہے، اس لیے یہاں ذکر کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا لیکن اس جگہ صرف تعدد ازدواج کی وہ مصلحتیں اور حکمتیں پیش کی جارہی ہیں جو معمولی غور و فکر سے ہی سامنے آجاتی ہیں، ان میں سے بعض عارضی اور وقتی نوعیت

---

[1] حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن صاحبؒ کہ جن کا ترجمہ علمی رعایتوں کے اعتبار سے سب تراجم میں ممتاز ہے، انھوں نے آیت کے ترجمہ کے الفاظ ہی میں اس مفہوم کی رعایت ملحوظ رکھی ہے، فرماتے ہیں "اور اگر ڈرو کہ انصاف نہ کرسکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کرلو جو اور عورتیں تم کو خوش آئیں دو دو تین تین چار چار۔" اسی طرح حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے تشریحی نوٹ میں اس کو خوب واضح کردیا ہے۔ اور حدیث مذکور میں تو "سواھن" موجود ہی ہے۔

کی ہیں اور بعض مستقل اور ابدی حیثیت کی حامل

ا۔ مردوں سے عورتوں کا تناسب بڑھ جانے کی صورت کا مناسب حل یہی ہے ورنہ اخلاقی خرابیاں پھیلنا یقینی ہے۔ (قیامت کے قریب، عورتوں کی اکثریت ہو جانے کی، احادیث میں پیشین گوئی بھی کی گئی ہے، اور اب حالات دیکھنے نیز مختلف ممالک کے اندر مرد و زن کی تعداد کے تناسب سے یہ پیشنگوئی جلد ہی صادق ہوتی نظر آرہی ہے

۲۔ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی بآسانی شادی ہو جانے کی امید، کیونکہ عقد ثانی کے وقت عموماً وہ شرطیں نہیں لگائی جاتیں جو عقد اول کے وقت مرد لگایا کرتے ہیں، اور اس وقت ان کی پسند کا معیار بھی نسبتہً پست ہو جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اچانک طلاق ہو جانے کی وجہ سے بسا اوقات جو مہیب تشکیل وجود میں آجاتی ہیں کہ عورت دیکھتے دیکھتے قطعاً بے یار و مددگار بن جاتی ہے۔ اس دشواری کا بھی ایک حد تک حل اسی قانونِ اباحتِ تعدد میں ملتا نظر آتا ہے۔

۳۔ بدصورت، نادار، اور اسی طرح وہ عورتیں کہ جن کا عقد موجودہ زمانہ میں ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ ان کی شادی ایسے مردوں سے ہو جانا نسبتہً آسان ہے جن کے یہاں پہلے سے بیوی موجود ہے اور کسی ضرورت سے وہ عقد ثانی کے خواہش مند ہیں۔ اس طور پر ایک اور اہم مشکل کا حل بھی نکل آتا ہے

۴۔ جنگ یا ایسے ہی کسی دوسرے ہنگامی زمانہ میں بیوہ، یا بے سہارا ہو جانے والی شریف عورتوں کو بے راہ روی سے بچانے اور ان کی کفالت کا سامان۔

۵۔ خوش حال، تندرست اور خوش خوراک مردوں کی جنسی خواہش کی تکمیل عموماً ایک بیوی سے ہو جانا ضروری نہیں۔ اس لیے ایسے لوگ بے راہ روی کا شکار ہو جاتے یا ہو سکتے ہیں۔ ان کے لیے نکاح ثانی گویا ان کی ضرورت کا سامان اور صحیح راستہ۔

۶۔ مستقل بیمار، یا عقیم عورتوں کے شوہروں کی کی جائز بلکہ ضروری اور فطری خواہشات کے لیے صحیح راہ اور شدید ضرورت، جس کا لحاظ نہ کرنا، ان پر ظلم ہے اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سی مصلحتیں ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے۔

بایں ہمہ اس بات کے امکان کا انکار نہیں کہ اس اباحت کے کچھ مضر پہلو بھی عمل کے وقت سامنے آئیں، مگر یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیئے کہ دنیا کے ہر قانون بلکہ ہر چیز کی طرح، شریعت میں بھی عموماً خیر غالب کا اختیار

کے لیے) اور شرِ غالب کا (اجتناب کے لیے) اعتبار کیا گیا ہے، جیسا کہ امام شاطبی نے فرمایا

فالمصلحة اذا كانت هى الغالبة
عند مناظرتها مع المفسدة فى
حكم الاعتياد فهى المقصودة شرعاً
ولتحصيلها وقع الطلب على العباد
..... وكذالك المفسدة اذا كانت
هى الغالبة بالنظر الى المصلحة
فى حكم الاعتياد فرفعها هو المقصود
شرعاً ولاجله وقع النهى [۱]

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قانون کے مضر پہلو سامنے آجانے کے بعد بھی اسے نظر انداز کر دیا جائے اور اس کا تدارک نہ کیا جائے، نہیں! اس کا تدارک کیا جانا چاہیے، چنانچہ شریعت میں اس کی پوری رعایت موجود ہے، مثلاً (جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا) شوہر کے عدل نہ کرنے کے بجائے شکایت پر عورت کو فسخِ نکاح کا اختیار دیا گیا، علاوہ ازیں پیش بندی کے طور پر بھی نکاحِ ثانی سے قبل ہی بعض ایسی تدبیریں کی جا سکتی ہیں کہ ظلم کا امکان کم سے کم رہ جائے۔ اگرچہ چند بیویاں رکھنے والے شوہروں کے ظلم کی داستانوں اور اس کا پروپیگنڈہ کرنے والوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے لیکن تحقیق اور تفحصِ احوال کے بعد اس ڈھول کا پول کھل جاتا ہے کہ اول تو مسلمان، بالخصوص مسلمانانِ ہند میں، چند زوجیت کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے، پچھلے دنوں اخبارات میں ایک سروے رپورٹ شائع ہوئی، اس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں میں دوسری شادی کا رواج فی ہزار ۱۴، ۱۵ کے اوسط سے ہے۔ ہندوؤں سے بھی کم۔ ظاہر ہے کہ اس میں صد فی صد واقعات ظلم کرنے اور عدل نہ کرنے کے نہیں ہو سکتے، مان لیجیے کہ چند بیویاں رکھنے والے شوہر نصف کی تعداد میں ظلم کرتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہزار شادی شدہ مردوں میں صرف

[۱] الموافقات للشاطبی، ۲/۲۶، ۱

ساتھ واقعات ظلم کے ہوئے یعنی ایک فیصدی سے بھی بہت کم۔

غور فرمائیے کہ ایسے مسئلہ پر مرکھپانا اور اس کے اس حق پر ٹوٹ پڑنا کہ دنیا کے دوسرے ضروری مسائل پس پشت ڈال دیے جائیں کیا عقلمندی اور دانشمندی کی بات ہوگی۔ کیا ایسے ہی موقع کے لیے "کوہ کندن و کاہ برآوردن" نہیں کہا گیا ہے؟؟

تاہم جرم کا تناسب کتنا ہی کم کیوں نہ ہو بہرحال اس کے سدباب کے سلسلہ میں ضرور کچھ کرنا چاہیے، یہاں اس بارے میں مختصراً چند شکلیں بطور تجویز ذکر کی جاتی ہیں۔ شرفاء میں دوسری شادی کرنے کی جرأت عموماً وہی کرتے ہیں بلکہ کر سکتے ہیں جو دوسری صلاحیتوں کے ساتھ خوشحال اور ذی حیثیت ہوتے ہیں، اس امر واقعہ کو سامنے رکھ کر دوسری بیوی کے آنے کے امکان کی صورت میں[1] عقد نکاح کے وقت خود زوجہ یا اس کے اولیاء کے مطالبہ پر مرد سے (اگر جائداد والا ہے) اس کی جائداد کا معتد بہ حصہ یا (وہ ملازم ہے) تنخواہ کی معتد بہ مقدار بذریعہ رجسٹری بیوی کے نام کرالی جائے، اور پھر شوہر کے حقوق زوجیت ادا نہ کرنے کی صورت میں اس سے واپس لیا جائے[2]۔ یا نکاح ہی کے وقت عدل نہ کرنے کی صورت میں علیحدگی کا اختیار دے دیا جائے[3]۔ یا عقد اول کے وقت شرط کر لی جائے کہ شوہر دوسرا نکاح اس کی موجودگی میں نہیں کرے گا بصورت خلاف ورزی عورت کو فسخ کا اختیار (امام احمد کے مسلک کے مطابق) دے دیا جائے۔ حافظ ابن قیم حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں:-

واختلف في شرط ... أن لا يتسرى عليها ولا يتزوج عليها فأوجب أحمد وغيره الوفاء به ومتى لم يف فلها الفسخ عند أحمد[1]

[1] مگر کسی دوسرے امام کے مسلک کو اختیار کرنے کا باشورہ علماء ضرورت شرعیہ کے وقت ہی فیصلہ کیا جائے معمولی صورتوں میں نہیں۔

[3] پہلے گزر چکا ہے کہ عدل نہ کرنے اور حقوق زوجیت پورے نہ ادا کرنے کی صورت میں بھی فسخ کا موقع حاصل ہو جائے گا۔

---

[1] زاد المعاد ۴/۶۔

مرد و زن کی مساوات کا نعرہ

بعض گوشوں سے تعدد ازدواج کے خلاف "دلائل" کی فہرست میں اضافہ کے طور پر "اقوام متحدہ کے چارٹر" کہ جسمیں مرد و زن کی مساوات تسلیم کی گئی ہے ___ کی دہائی بھی سنائی دیتی ہے، لیکن ذرا ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ مساوات کے کیا یہی معنیٰ ہیں کہ بلا استثنا ہر موقعہ پر ان کے صنفی اور جنسی فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ مرد و زن کے درمیان یکساں معاملہ کیا جائے؟ اگر جواب اثبات میں ملے تو دوسرا سوال یہ ہو کہ بتاؤ! تم نے ایسی مساوات کہاں برتی؟ اور اعداد و شمار کی روشنی میں جواب طلب کیا جائے کہ تمہارے یہاں (یعنی یورپ میں) اب تک اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے والوں میں مردوں اور عورتوں کا کیا تناسب ہے؟ کتنی عورتیں اب تک وزیر اعظم بنائی گئیں؟ کتنی فوج کی اعلیٰ عہدہ دار؟ کتنی کمانڈر انچیف؟ کتنی پائلٹ؟۔ جانے دیجئے (صرف یہی) بتا دیا جائے کہ فوج کے اندر بڑے عہدوں پر نہیں، معمولی ہی عہدوں پر عورتیں کتنی فائز کی گئیں؟ ___ یقین رکھنا چاہیئے! جواب دیا تو یہی ہوگا کہ ___ ایک بھی نہیں!!! ___

اس بنا پر بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مرد و عورت کے خلقی تفاوت، صنفی فرق اور بہت سے امور میں مکمل اختلاف کو سامنے رکھتے ہوئے بھی دونوں کے درمیان ہمہ جہتی مساوات کا نعرہ لگانا بے دانشی کے سوا کچھ نہیں!۔

اس موقعہ پر حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کی نہایت جچی تلی اور پُر مغز بات یاد آتی ہے۔ جو موصوف نے ایک دن سبق کے درمیان "اسلام میں مساوات" کا مطلب بتاتے ہوئے بیان فرمائی ___ کہ:۔

اسلام میں "مساوات" کے معنیٰ

"مساوات کے معنیٰ، نفسِ قانون میں مساوات نہیں ہیں، بلکہ نفاذِ قانون میں مساوات برتنا ہیں۔"

علامہ موصوف کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے فطری فرق اور ناگزیر جنسی اختلاف کے پیش نظر یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ہر قانون دونوں کے لیے یکساں ہو، بلکہ واقعی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض قوانین میں اختلاف ناگزیر ہے، لیکن نفاذ کے وقت کسی کو کسی جنسی فرق کی بنیاد پر اولیت و تقدم حاصل نہ ہوگا۔ اور نہ ان میں سے کسی کو صرف اس بنا پر نظر انداز ہی کیا جائے گا ___

اس بصیرت افروز قول کی روشنی میں بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اقوام متحدہ کے چارٹر — اگر وہ عقلاء عن نے بنایا ہے، میں جس جنسی فرق کی بنیاد پر مرد و زن میں اختلاف نہ کرنے پر زور دیا گیا ہے اور دونوں کے درمیان مساوات تسلیم کی گئی ہے، تو اس کا مطلب بھی۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔ ایسا، یا یہی ہونا چاہیے وہ نہیں ہو سکتا یا نہ ہونا چاہیے جو "ترقی پسند" عام طور پر کہتے اور ذہنوں میں بیٹھانا چاہتے ہیں، کیونکہ وہ نہ عقلِ صحیح کا تقاضہ ہے نہ واقعات ہی کے مطابق ہے۔ مثلاً دنیا کے قابلِ ذکر ممالک میں یہ قانون موجود و معمول ہے کہ بیوی کا نفقہ، شوہر کے ذمہ ہے مگر ایسا کہیں نہیں ہے کہ شوہر کا نفقہ بیوی کے ذمہ ہو (بعض استثنائی اور مجبوری کی حالتوں کو چھوڑ کر) ظاہر ہے کہ یہ فرق اصلاً جنسی اختلاف ہی کی بنا پر ہے۔ کسی اور وجہ سے نہیں ہے۔ تو کیا یہ ممالک اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی کے مرتکب ٹھہرائے گئے، یا جائیں گے؟

مرد و زن کے درمیان مساوات میں اسلام کا نقطۂ نظر

ان امور کی روشنی میں ہم اس بات کے اظہار میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نہ جھجکتے ہیں کہ اسلام نے واضح طور پر عورت و مرد کے درمیان بعض امور میں فرق ملحوظ رکھا ہے، اور اس کا اظہار قرآن مجید کی آیات میں بھی کیا گیا ہے اور احادیث نبوی میں بھی، اور ان ہی بنیادوں پر تمام علمائے امت کے اقوال میں بھی اس کا برملا اعتراف موجود ہے۔ جس کی تفصیل موجب طوالت ہو گی۔ یہاں صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

قرآن و حدیث کا بیان

قرآن مجید کی آیات سے دونوں کے فرقِ مراتب کا ثبوت:۔

"للرجال علیھن درجۃ"[1] "الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم"[2]

احادیثِ رسول سے صنفین میں خلقی و طبعی تفاوت کا ذکر۔

"ما رأیت من ناقصات عقل ودین اذھب للب الرجل الحازم"[3] "استوصوا بالنساء خیرا فان المرأۃ خلقت من ضلع[4] وان اعوج شیئ فی الضلع اعلاہ فان

---

[1] سورہ بقرآیت ۲۲۸ [2] سورہ نساء آیت ۳۴ [3] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ج ۱
[4] بخاری جلد اول ص ۴۶۹۔

ذهبت تقيمه كسرته، وان تركته لم يزل اعوج۔

علمائے امت کے اقوال | علمائے امت کے اقوال کا احاطہ بہت مشکل ہے، یہاں صرف دو ممتاز عالموں کے فرمودات نقل کیے جاتے ہیں۔

مولانا قاضی ثناء اللہ صاحبؒ پانی پتی فرماتے ہیں (آیت الرجال قوامون علی النساء کی تفسیر کرتے ہوئے)

"القوام ابلغ وهو القائم بالمصالح والتدبير والتاديب وعلل ذلك بامرين وهبي وكسبي بما فضل الله ... على النساء في اصل الخلقة بكمال العقل وحسن التدبير وبسطة في العلم والجسم ومزيد القوة في الاعمال وعلو الاستعداد ولذلك خصوا بالنبوة .... وزيادة السهم في الارث ومالكية النكاح وتعدد المنكوحات و الاستبداد بالطلاق ..... وهذا امر وهبي ..... وبما انفقوا من اموالهم في نكاحهن من المهور والنفقات الراتبة وهذا امر كسبي"[1]

حافظ ابن قیم جوزیؒ رقمطراز ہیں:

"وهو سبحانه امر باشهاد امرأتين لتوكيد الحفظ لان عقل المرأتين وحفظهما يقوم مقام عقل رجل وحفظه ولذا جعلت على النصف من الرجل في الميراث والدية والعقيقة والعتق، فعتق امرأتين يقوم مقام عتق رجل كما صح عن النبي صلى الله عليه وسلم"[2]

ان امور پر ٹھنڈے دل سے غور کر لینے کے بعد ازدواج کا مسئلہ (ان شاء اللہ) سمجھنا آسان ہو جائے گا اور اس کی "بھیانک صورت" کے بجائے متوازن حیثیت سامنے آئے گی۔ (باقی)

---

[1] تفسیر مظہری ۲/۵۴، [2] اعلام الموقعین ۱/۱۱۱

Bombay Andhra Transport Co.

(TRANSPORT CONTRACTORS)

113, Bhandari Street (CHAKLA),

Bombay-3.

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے صحیح راہِ عمل جاننے کے لیے

[illegible]

ماہنامہ "زندگی" رامپور جو ۲۶ سال سے برابر پابندی سے شائع ہو رہا ہے

کا مطالعہ کیجیے۔

- جس کے بین الاقوامی، ملکی، ملی اور دینی خدمت کے اشارات
- دماغوں کو روشن اور دلوں کو جذبہ عطا کرنے والے دعوتی اور علمی مضامین
- حالاتِ حاضرہ پر تبصرے • سوالوں کے جوابات • کتابوں پر تنقید و تبصرے

آپ کو اور آپ کے متعلقین کو [illegible] بھی بہم پہنچائیں گے اور آپ کے دلوں میں دین کی خدمت کا جذبہ بیدار کریں گے۔

آج ہی سالانہ چندہ ۱۵/= بھیجکر سال بھر گھر بیٹھے حاصل کیجیے یا قریبی ایجنسی سے طلب فرمائیے

منیجر ماہنامہ "زندگی" رامپور۔ یوپی



جرح و تعدیل

(۳)

مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی استاد شعبۂ دینیات
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۴۔ گواہی کی طرح جرح و تعدیل میں بھی دو کی شرط ہے یا نہیں؟

"الغیۃ الحدیث" کے شارحوں میں عراقی وغیرہ نے لکھا ہے کہ "گواہی اور روایت کے سلسلے میں گواہ اور راوی کی تعدیل اور جرح (یعنی اس کو معتبر یا نامعتبر قرار دینے) کا حق آیا ایک ہی سے ادا ہوجاتا ہے یا ایک سے زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بارے میں کئی رائیں ہیں۔

(الف) :۔ قاضی ابوبکر باقلانی اور مدینہ کے اکثر فقہاء سے منقول ہے کہ گواہ ہو یا راوی، دونوں کی تعدیل اور صفائی میں دو آدمی جب تک نہ ہوں، اس وقت تک اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

ب :۔ گواہ اور راوی دونوں کے بارے میں ایک ہی کی تعدیل اور صفائی پیش کرنا کافی ہے، قاضی ابوبکر باقلانی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اس لیے کہ تعدیل بمنزلہ خبر کے ہے (اور ایک آدمی کی خبر کو مان لیا جاتا ہے)

ج :۔ راوی کے بارے میں تو ایک آدمی کی تعدیل پیش کرنا ہی کافی ہے مگر گواہ کے بارے میں ایک کی تعدیل کافی نہیں ہے۔ اسی رائے کی طرف امام فخرالدین (رازی) اور آمدی کا رجحان ہے، اور اکثر حضرات سے بھی یہی منقول ہے۔ علامہ ابن حاجب نے اپنی کتاب مختصر الاصول میں اکثر

حضرات سے اس حدیث کو نقل کیا ہے' علامہ ابن صلاح نے (اپنے مقدمہ ابن صلاح" میں) کہا ہے کہ صحیح مسلک وہی ہے جو خطیب بغدادی نے (اپنی کتاب" الکفایہ فی علوم الروایہ" میں) اور بعض دوسرے علماء نے اختیار کیا ہے کہ روایت کا معتبر ہونا صرف ایک شخص کی تعدیل سے ثابت ہو جاتا ہے اس لیے کہ خبر کے قبول کرنے میں خبر دینے والوں کی تعداد کی شرط کسی نے نہیں لگائی ہے (اور تعدیل بھی مثل خبر کے ہے) تو ویسے ہی تعدیل اور اسی طرح جرح میں بھی تعداد کی شرط نہیں لگائی جا سکتی' برخلاف گواہی کے معاملہ کے (۱)

---

(۱) ایک ہی آدمی کی صفائی سے یا جرح سے راوی کے اعتبار اور عدم اعتبار کا قضیہ طے ہو جاتا ہے اس کی بھی قید نہیں ہے کہ وہ "ایک" مرد ہے یا عورت یا غلام" علامہ سیوطی نے (تدریب الراوی میں) لکھا ہے کہ "جرح و تعدیل کے فن سے واقف غلام اور عورت کی پیش کردہ صفائی بھی مقبول ہے اس لیے کہ ان دونوں کی بیان کردہ خبر مقبول ہوتی ہے' اسی نقطۂ نظر کو خطیب بغدادی' امام رازی اور قاضی باقلانی نے بھی مستند مانا ہے اگرچہ ان حضرات نے اس اختلاف کا بھی ذکر کر دیا ہے کہ اہل مدینہ کے اکثر فقہاء اور دوسرے بعض حضرات عورتوں کی پیش کردہ تعدیل و صفائی کو نہ روایت میں قبول کرتے ہیں نہ گواہی میں' خطیب بغدادی نے صفائی میں عورت کی بات کو قبول کر لینے کی رائے کی تائید اس حدیث سے کی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ "افک" کے موقع پر حضرت بی بی عائشہؓ کے بارے میں بی بی بریرہؓ سے استفسار فرمایا تھا (اگر عورت کی پیش کردہ صفائی مقبول نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت سے اس معاملے کے بارے میں استفسار کیوں فرماتے) ہاں البلوغ کے قریب پہنچ جانے والے لڑکے کا قول سب کے نزدیک مقبول نہیں ہے۔"

خطیب بغدادی نے اپنی کتاب میں یہ بحث اٹھاتے ہوئے کہ عورت' یا غلام یا لڑکے کی پیش کردہ صفائی قبول کرنے کے بارے میں حدیثوں میں کہاں کہاں کیا کیا آیا ہے' لکھا ہے کہ اس بحث میں اصل حدیث یہی حضرت بریرہؓ والی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے واقعہ "افک" کے موقع پر حضرت بی بی عائشہؓ کے بارے میں دریافت فرمایا تھا کہ "تیرے علم میں ایسی ویسی کوئی بات ہے جو عائشہ کے بارے میں بدظنی پیدا کرنے والی ہو؟ یا تجھے ایسی نظر آتی ہو" بریرہؓ نے کہا "میری آنکھیں پھوٹ جائیں' بہری ہو جاؤں (اگر ایسی ویسی کوئی بھی بات دیکھی سنی ہو) عائشہ تو کھرے سونے سے بھی بڑھ کر کھری دسیرت کی عورت ہیں۔" اس کے آگے خطیب بغدادی نے قاضی ابو بکر باقلانی کا یہ قول نقل کیا ہے جس کو محمد بن عبید اللہ مالکی نے خود خطیب سے بیان کیا کہ جو مانی و رسی

(قول فیصل) ہر معتبر اور ثقہ کی خواہ وہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، تعدیل (صفائی) بھی معتبر ہے اور جرح بھی جیسا کہ الفیۃ الحدیث کے شارح علامہ عراقی نے بہ صراحت لکھا ہے۔

۵۔ ایک ہی راوی: کوئی معتبر کہے اور کوئی غیر معتبر؟

ایک ہی راوی کے بارے میں اگر جرح و تعدیل کو اجائیں یعنی کچھ ماہرین فن کہیں کہ وہ معتبر ہے اور دوسرے ماہرین فن کہیں کہ ناقابل اعتبار ہے تو ایسی صورت حال میں تین طرح کی رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ (۱)

(گذشتہ صفحہ سے آگے) ... میں قاضی باقلانی نے کہا "اگر کوئی پوچھے کہ کیا کسی عورت کی جرح و تعدیل میں آپ امین گے جو ان شرطوں سے واقف ہو جن سے راوی معتبر یا غیر معتبر قرار دیا جاتا ہے؟ تو کہا جائے گا بے شک ... کی کوئی دلیل نہیں ہے نہ اجماع اس کا مانع ہے اور نہ کوئی اور امر، اگر ایسا ہوتا تو ضرور ہم قیاس کو ترک کر کے اس کو مان لیتے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اہل مدینہ کے اکثر فقہاء اور بعض دوسرے حضرات نہ عورتوں کی پیش کردہ صفائی کو قبول کرتے ہیں نہ دو مردوں سے کم کا اعتبار کرتے ہیں" ۱۲ عبد الفتاح ابو غدہ

(مذکورہ حدیث بریرہ کے سلسلے میں محدثین نے بعض الفاظ حدیث کے اضطراب پر بھی بحث کی ہے اور یہ بھی بحث کی ہے کہ حضرت بی بی عائشہؓ کے بارے میں مذکورہ صفائی حضرت بریرہؓ نے دی ہے یا حضرت ام المؤمنین بی بی زینبؓ نے۔ ابو غدہ نے حاشیہ میں تفصیل بھی بیان کی ہے جو یہاں غیر ضروری سمجھ کر نقل نہیں کی گئی ۱۲)

(۱) جرح و تعدیل کے سلسلے کی صحیح صورت جیسا کہ امین الوزیر الصنعانی نے اپنی کتاب "تنقیح الانظار" میں لکھا ہے یہ ہے کہ تفصیلات میں جانے کے باوجود بھی کوئی ایسی بات ہاتھ نہ آئے جس سے دونوں مخالف و متعارض راویوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دی جا سکے اگر ترجیح دی جا سکتی ہے تو پھر تضاد ہی باقی نہیں رہتا مثلاً کسی ایک راوی کو اس لیے مجروح قرار دیا گیا کہ وہ علانیہ گناہ میں مبتلا تھا بعد میں پتہ چلا کہ اس نے توبہ کر لی تھی اور نیکوکار ہو گیا تھا جرح کرنے والے نے اس وقت جرح کی تھی جب وہ معصیت میں مبتلا تھا ظاہر ہے کہ توبہ کے بعد اس کا فسق و فجور ختم ہو گیا اور وجہ جرح معلوم ہو گئی لہٰذا توبہ سے قبل اس کو مجروح قرار دینا اور توبہ کے بعد اس کی توثیق کرنے میں کوئی تعارض نہیں رہا ہے یا مثلاً ایک راوی ہے جو بہت سے شیوخ سے روایت حدیث کرتا ہے بعض شیوخ سے روایت کرنے میں بھول چوک (سوء حفظ) کا شکار ہو گیا اور دوسرے شیوخ سے روایت میں متقن اور ثقہ ثابت ہوا یا مثلاً کوئی راوی حدیث بڑھاپے میں حافظہ کی کمزوری

(یہ رائیں اس صورت سے متعلق ہیں جب کوئی معتبر کہے اور کوئی غیر معتبر، اگر ایک ہی ماہر فن کسی راوی کو ایک وقت ثقہ قرار دے اور دوسرے موقع پر غیر ثقہ، جیسا کہ ماہرین فن یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل اور ابن حبان کے ایسے حضرات سے ایک ہی راوی کے بارے میں بعینہ یہی شکل وقوع پذیر بھی ہوئی ہے تو ایسے وقت کیا یہ جائے گا کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مجروح اور ثقہ بتانے میں آخری قول کون سا ہے تو آخری قول ہی کا اعتبار کیا جائے گا اور اگر یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ آخری قول کون سا ہے تو پھر ایسے راوی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دیا جائے گا بلکہ توقف سے کام لیا جائے گا، جیسا کہ علامہ زرکشی نے "علوم الحدیث" پر اپنے حواشی میں اسی نقطۂ نظر کی صراحت کی ہے ۱۲۔ ابو غدہ)

الف۔ جرح بہرحال مقدم اور مرجح ہوگی، خواہ صفائی پیش کرنے والے تعداد میں زیادہ ہوں خطیب بغدادی نے اس رائے کو جمہور علماء سے منقول بتایا ہے، ابن صلاح، امام رازی، آمدی وغیرہ ماہرین اصول حدیث نے اسی رائے کو درست قرار دیا ہے، وجہ یہ ہے کہ صفائی پیش کرنے والوں نے اپنے علم کی بنیاد پر جو کچھ کہا ہے، جرح کرنے والا ان معلومات سے آگے بڑھ کر بات کہہ رہا ہے (جارح اپنی ان معلومات کی بنیاد پر جرح کر رہا ہے جن کا علم صفائی پیش کرنے والوں کو نہیں ہے) کیوں کہ صفائی پیش کرنے والوں نے راوی کے ظاہری حالات کی بنا پر جو صفائی پیش کی ہے، جارح ان کا

(گزشتہ سے پیوستہ) یا سمجھ میں فتور آ جانے کی وجہ سے بھول چوک کا شکار ہو گیا (تو ایسے معاملوں میں قطعی جرح اور تعدیل کا ٹکراؤ نہیں مانا جائے گا یعنی یہ حقیقی ٹکراؤ نہیں ہے) لوگوں کے حالات یکساں نہیں رہا کرتے، کتنے راویان حدیث ہیں جو عمر کے ایک خاص دور میں ثقہ ہیں اور دوسرے دور میں ان کا وہ حال نہیں رہا، اب اگر ایسے راویوں کے حالات اور ان کی روایت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ سراغ مل جائے کہ کب اور کس عمر میں وہ درجۂ اعتبار میں نہیں رہتے تھے تو کیا کہنا، بات صاف اور ظاہری تعارض سے چھٹکارا مل گیا (یعنی اس عمر تک پہونچنے سے پہلے جب وہ بہکنا شروع ہوئے معتبر اور ثقہ تھے) صحیح بخاری تک کے متعدد راوی ایسے ہیں جن پر کبرسنی میں سوء حفظ (بیان روایت میں بہکنے) کی بنا پر جرح کی گئی ہے مگر بخاری نے اُن سے جب حدیث روایت کی تھی تو بہکنے کی عمر تک نہیں پہونچے تھے لہٰذا ثقہ تھے) ابو غدہ

انکار نہیں کرتا ہے بلکہ وہ راوی کے اندرونی حالات کی جن کا علم صفائی پیش کرنے والوں کو نہیں ہوسکا، اطلاع دیتا ہے۔

ب۔ اگر تعدیل وصفائی پیش کرنے والوں کی تعداد جارحین کے مقابلے میں زیادہ ہو تو جرح پر تعدیل کو مقدم کیا جائے گا" اس رائے کو خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "کفایہ" میں اور امام رازی نے اپنی کتاب "المحصول" میں بیان کیا ہے۔ اس رائے کے رکھنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ صفائی پیش کرنے والوں کی تعداد کی کثرت سے صفائی کا پہلو قوی ہو جاتا ہے، اور جارحین کی تعداد کی کمی ان کی بیان کردہ اطلاع کو کمزور کر دیتی ہے۔ اس دلیل کے بارے میں خطیب بغدادی کا کہنا ہے کہ "یہ غلط ہے اس لیے کہ صفائی پیش کرنے والے خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو، جرح کرنے والوں کی بیان کردہ اطلاع و خبر کی نفی نہیں کرتے ہیں اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں (کہ جارحوں کی پیش کردہ اطلاع کی نفی کرتے ہیں) تو یہ نفی (عدم اطلاع) پر گواہی دینا ہوا اور ایسی گواہی باطل ہوتی ہے۔

ج۔ جب کبھی جرح اور تعدیل میں ٹکراؤ ہو تو بغیر کسی سبب ترجیح کے، نہ جرح کو ترجیح دینا چاہیے نہ تعدیل کو۔ اسی رائے کو ابن حاجب نے (جیسا کہ عراقی نے شرح الفیہ میں اور سیوطی نے "تدریب" میں اور دوسرے مصنفین نے اپنی کتابوں میں حوالہ دیا ہے) اپنی کتاب "مختصر الاصول" میں بیان کیا ہے۔

ازالۂ غلط فہمی

میں (مصنف مولانا عبدالحیٔ) کہتا ہوں کہ "محققین علمائے اصول کی اس تحقیقی رائے کے سمجھنے میں کہ "تعدیل پر جرح مقدم ہوتی ہے" ہمارے زمانہ کے علماء کی اکثریت سے اس بنا پر لغزشیں ہوئی ہیں کہ وہ اس کی تفصیل اور شرطوں سے غافل ہیں، وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ مطلقاً جرح مقدم ہے، خواہ کیسی ہی جرح ہو، خواہ کیسا ہی جارح ہو اور خواہ کیسے ہی راوی کے بارے میں جرح کی ہو، وہ بہرحال تعدیل پر مقدم ہے۔ خواہ تعدیل کی نوعیت کیا بھی ہو۔ خواہ تعدیل کرنے والا کوئی بھی ہو اور خواہ کیسے ہی راوی کی تعدیل کی گئی ہو۔ صورت حال وہ نہیں ہے جو یہ علمائے عصر سمجھ بیٹھے ہیں، بلکہ معاملہ یعنی جرح کا تعدیل پر مقدم ہونا مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ جرح مفسر ہو۔ جرح مبہم تو صحیح مسلک کے مطابق مقبول ہی نہیں

ہو تو کیسے ہو سکتا ہے کہ جرح مبہم جو مقبول ہی نہیں ہے تعدیل کے مقابل ہو جائے، اگرچہ تعدیل مبہم ہی کیوں نہ ہو۔

میرے اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ یہ ہے کہ علمائے اصول، جرح مبہم کی بحث اٹھا کر یہ توضیحی نقطہ نظر بیان کر دیتے ہیں کہ جرح مبہم غیر مقبول ہے۔ اس کے بعد ہی یا اس سے کچھ پہلے جرح اور تعدیل میں تعارض کی بحث کرتے ہیں اور تعدیل پر جرح کو مقدم قرار دیتے ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جرح و تعدیل میں تعارض کی بحث میں ان کا مطلب جرح مفسر ہوتا ہے جو تعدیل پر مقدم مانی جاتی ہے۔ (جرح مبہم تو مقبول ہی نہیں ہے جب مقبول ہی نہیں ہے) تو مقبول اور غیر مقبول میں ٹکراؤ کہاں ہوا؟ (دوسرے سے ٹکراؤ ہے ہی نہیں) ثبوت میں علامہ سیوطی کا "تدریب الراوی" میں یہ قول دیکھیے، جب کسی ایک راوی کے بارے میں جرح مفسر اور تعدیل کا اجتماع ہو جائے تو جرح مقدم ہوگی اگرچہ تعدیل کرنے والوں کی تعداد مقابلتاً زیادہ ہو یہی فقہا اور اصول کے ماہروں کے نزدیک صحیح مسلک ہے۔"

اسی طرح علامہ ابن حجر کا "نخبۃ الفکر" اور اس کی شرح "نزھۃ النظر" میں صاف صاف کہنا ہے کہ "تعدیل پر جرح مقدم ہوتی ہے، ایک گروہ نے اس کو مطلقاً مان رکھا ہے حالانکہ یہ مقام تفصیل چاہتا ہے، وہ یہ ہے کہ جرح وہ مقدم ہوگی جو مفسر اور مبیّن ہو اور اسباب جرح کے ماہر کی طرف سے ہو، اگر جرح غیر مفسر ہوگی تو اس راوی کے حق میں جس کا ثقہ ہونا ثابت ہو چکا ہے، اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا، اسی طرح اگر ایسے جارح کی جانب سے ہو جو وجوہ جرح ہی سے ناواقف ہے، تب بھی اس راوی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا جس کا ثقہ ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ ہاں اگر کوئی راوی ایسا ہے کہ اس کی کسی نے بھی تعدیل نہیں کی ہے تو اس کے حق میں غیر مفسر جرح [illegible] قبول کی جائے گی ...."

[illegible] "نزھۃ النظر" کی شرح [illegible] مسند کہتے ہیں "یہاں دو مسئلے ہیں۔ پہلا یہ کہ [illegible] جرح اور تعدیل میں تعارض ہو تو جرح کو مقدم کیا جائے گا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر تعدیل کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہو تو تعدیل کو مقدم کیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جرح اور تعدیل میں [illegible] کسی ایک کو بھی ترجیح نہیں دی جائے گی، دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اکثر محدثین وجہ تعدیل کے ذکر کے بغیر بھی تعدیل کو قبول کرتے ہیں اور جرح کو بغیر وجہ جرح [illegible] نامقبول قرار دیتے ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ معاملہ برعکس ہے (یعنی تعدیل بلا ذکر وجہ نامقبول ہے [illegible] جرح بھی مقبول ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جرح اور تعدیل دونوں

اسی وقت مقبول ہوں گی جب وجہ بھی بیان کر دی گئی ہو۔ مصنف نے (علامہ حافظ ابن حجر نے) دونوں مسئلوں میں اولین اقوال کو مستند قرار دیا ہے (یعنی جرح تعدیل پر مقدم مانی جائے گی اور تعدیل بلا ذکر وجہ مقبول ہوگی) اور دونوں مسئلوں کو اس ترکیب سے ذکر کیا ہے کہ یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ جرح کو اس قید و شرط کے ساتھ تعدیل پر مقدم مانا جائے گا کہ وہ مفسر (وجہ جرح کے بیان کے ساتھ) ہو۔ اور مصنف (علامہ ابن حجر) کی تحریر سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ اگر جرح مفسر ہو تو تعدیل پر مقدم مانی جائے گی۔

سخاوی نے "شرح الفیہ" میں لکھا ہے "تعدیل پر جرح کے مقدم مانے جانے کے حکم کو مشروط اور مقید ہونا چاہیے کہ جرح کی وجہ مفسر ہوں لیکن اگر جرح غیر مفسر اور تعدیل غیر مفسر میں تعارض ہو تو پھر تعدیل کو مقدم مانا جائے گا یہی مزی نے بھی کہا ہے۔

علامہ نووی نے "شرح صحیح مسلم" میں لکھا ہے "عیب جوئی کرنے والوں نے امام مسلم پر نکتہ چینی کی ہے کہ انھوں نے صحیح مسلم میں ضعیف راویوں کی خاصی تعداد سے روایت حدیث کی ہے" امام مسلم پر یہ نکتہ چینی صحیح نہیں ہے۔ کیوں؟ اس کے کئی جواب علامہ ابن صلاح نے دیے ہیں۔ ان میں سے ایک جواب یہ ہے کہ یہ نکتہ چینی ایسے راویوں سے متعلق ہے جو دوسروں کے نزدیک ضعیف ہو سکتے ہیں مگر امام مسلم کے نزدیک وہ ثقہ ہیں یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے۔ اس لیے کہ جرح کا مقدم ہونا اسی وقت ہے جب وہ سبب جرح کی وضاحت اور اس کے ثبوت کے ساتھ ہو ورنہ ایسی جرح قبول ہی نہیں کی جائے گی جو اس کے برعکس ہو۔"

حافظ ابن حجر نے "لسان المیزان" کے دیباچہ میں لکھا ہے "کسی ایک راوی کی جرح اور تعدیل میں علمائے فن کا اگر اختلاف ہے تو حق یہ ہے کہ صورت حال تفصیل کی محتاج ہے یعنی یہ کہ اگر جرح مفسر ہے تو قبول کی جائے گی ورنہ تعدیل کو ترجیح دیا جانا چاہیے۔ یا وہ راوی جس کا حال مجہول ہو اور اس کے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہے کہ کسی امام فن نے اسے ضعیف اور متروک قرار دیا ہے تو ایسی صورت میں امام فن کا قول ہی قول فیصل ہے اور ہم اس امام فن سے وضاحت کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ تو معلوم ہوا کہ ائمہ فن جرح و تعدیل کے اس کہنے کا کہ "جرح اگر مفسر نہیں ہے تو مقبول نہیں ہے" یہی مطلب ہے کہ [illegible] جرح غیر مفسر مقبول نہیں ہے جس کی جرح اور توثیق (تعدیل) [illegible] علمائے فن کی [illegible]

حاصل کلام یہ ہے کہ مستند علمائے فن اور معتبر علما [illegible]

سے یہ ثابت ہو گیا کہ

(۱) کسی راوی کے بارے میں اگر جرح بھی مبہم آئی ہے اور تعدیل بھی مبہم آئی ہے تو تعدیل مقدم مانی جائے گی۔

(۲) اسی طرح اگر جرح مبہم آئی ہے اور تعدیل مفسّر (ذکر کے سبب کے ساتھ) آئی ہے تب بھی تعدیل مقدم مانی جائے گی۔

(۳) جرح کے تعدیل پر مقدم ہونے کی شرط یہ ہے کہ جرح مفسّر ہو، خواہ اس کے مقابلہ میں تعدیل مبہم ہو یا مفسّر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس خلاصۂ بحث کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہیے، لغزش و خطا نیز شرمندگی اور مجادلہ سے یہی تفصیل بچا سکے گی!

ضروری وضاحت

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جرح مفسّر پر بھی تعدیل کو ترجیح دینا پڑتا ہے اس کے وجوہ اور ہوتے ہیں جن کی وضاحت آگے ان شاء اللہ آئے گی۔ اور ان ہی وجوہ کی بناء پر بعض ان لوگوں کی اس جرح مفسّر کو قبول نہیں کیا گیا ہے جو انھوں نے امام ابوحنیفہؒ ان کے استاد حماد بن سلیمان اور ان کے دونوں مشہور شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد کے بارے میں یا اور بعض دوسرے اہل کوفہ کے بارے میں کی ہے کہ وہ لوگ (امام ابوحنیفہ وغیرہ) مُرجئہ تھے۔

اور ان ہی وجوہ کی بنا پر امام ابوحنیفہ کے بارے میں امام نسائی (محدث) کی اس جرح کو قبول نہیں کیا گیا ہے جو "میزان الاعتدال" میں مذکور ہے کہ "نسائی نے امام ابوحنیفہ کو حدیث کے یاد نہ رکھنے کے رخ سے ضعیف ٹھہرایا ہے"۔ امام نسائی ان لوگوں میں ہیں جن میں راویوں کو مجروح ٹھہرانے میں سخت گیری اور سرکشی کا انداز پایا جاتا ہے۔

اور ان ہی وجوہ کی بنا پر امام ابوحنیفہ اور ان کے متبعین کے بارے میں خطیب بغدادی کی جرح بھی علامہ ابن عبدالبر کی سند پر مبنی اس قول کے بعد جسے ابن حجر مکی نے "الخیرات الحسان" میں نقل کیا ہے، قبول نہیں کی گئی ہے۔ اور علامہ ابن عبدالبر جرح و تعدیل کے سرگروہ ہیں (علامہ کا وہ قول یہ ہے) — امام ابوحنیفہ سے جن لوگوں نے روایت حدیث کی ہے اور ان

کو ثقہ قرار دیا ہے اور ان کی مدح و ثنا کی ہے ان کی تعداد ان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے جنہوں نے امام ابو حنیفہ کے بارے میں کلام کیا ہے [illegible] اعتراض کیا ہے ان کا [illegible] تھے ——

اور [illegible] اعتراض نہیں ہے۔ امام علی بن المدینی کا قول ہے کہ ابو حنیفہ سے سفیان ثوری نے، عبد اللہ بن مبارک نے، حماد بن زید نے، ہشام نے، وکیع نے، عباد بن العوام نے اور جعفر بن عون نے حدیثیں روایت کی ہیں، ابو حنیفہ ثقہ ہیں اور ان سے روایت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شعبہ ان کے بارے میں (امام ابو حنیفہ کے بارے میں) اچھی رائے رکھتے تھے اور یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ ہمارے ساتھی (یعنی اصحاب حدیث) ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب (شاگردوں) کے بارے میں (جرح کے سلسلے میں) حد افراط تک پہونچ گئے ہیں" یحییٰ بن معین سے کسی نے پوچھا "کیا ابو حنیفہ [illegible] (کذب سے) کام لیتے تھے؟" یحییٰ نے جواب دیا "نہیں" (۱) [illegible]

[illegible] امام ابو حنیفہ پر اعتراض [illegible] اپنی تصنیف "مقدمہ [illegible]" [illegible] نظر سے دیکھ کر [illegible] نظر سے [illegible]

---

(۱) مولانا عبد الحی [illegible] مطبع مصطفائی (لکھنؤ) میں پہلی بار [illegible] اشاعت [illegible] ہی میں ہوئی [illegible] اشاعت کے لیے ہمیں سہولتیں عطا فرمائے [illegible] محرومی ہے۔ (۲) ابو [illegible] ایک تحقیق [illegible] مولانا عبد الحی نے جو یہ لکھا ہے کہ "امام [illegible] اس حوالے کے سلسلے میں [illegible]

(باقی حاشیہ [illegible] صفحہ پر)

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) ۔۔۔ "میزان الاعتدال" کے بعض نسخوں میں یہ لکھا ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے "میزان [illegible] کے [illegible] امام ابو حنیفہ کا ذکر بعض نسخوں میں پایا جاتا ہے اور ان ہی الفاظ میں جو حوالے میں مذکور ہوئے ہیں لیکن [illegible] نسخوں میں امام ابو حنیفہ کے حالات سرے سے ہیں ہی نہیں، حالات نہ ہونے کی تائید عراقی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ ذہبی نے (میزان الاعتدال میں) کسی ایک بھی ایسے امام کا ذکر نہیں کیا ہے جن کے مذاہب کی تقلید کی جاتی ہے۔"

عبد الفتاح ابو غدہ [illegible] کرتا ہے کہ مصنف (مولانا عبد الحی لکھنوی) نے اپنی تصنیف "غیث الغمام علیٰ حواشی امام الکلام" میں بہت زیادہ [illegible] اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ "میزان الاعتدال" کے بعض نسخوں میں امام ابو حنیفہ کے حالات جعلی طور پر داخل کیے گئے ہیں، اصل کتاب میں حالات نہ ہونے کی تائید میں انھوں نے بہت سے دلائل بیان کیے ہیں [illegible] صرف پہلی وجہ کو یہاں نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، پوری تفصیل طوالت کے خیال سے نقل نہ کرنے پر پڑھنے والوں سے معذرت چاہتا ہوں، مولانا عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ (غیث الغمام علیٰ حواشی امام الکلام میں) فرماتے ہیں "اس عبارت کا (امام نسائی کا امام ابو حنیفہ کو حدیث میں ضعیف ٹھہرانے والی عبارت کا) [illegible] الاعتدال کے بعض ان معتبر مخطوطوں میں جنھیں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کوئی وجود نہیں پایا جاتا [illegible] موجود نہ ہونے کی تائید شرح نخبہ میں عراقی کے اس قول سے ہوتی ہے کہ

• لیکن ابن عدی نے اپنی کتاب [illegible] کا ذکر کیا ہے جن کے بارے میں کچھ بھی جرح کی گئی ہے خواہ وہ راوی ثقہ ہی کیوں نہ ہو [illegible] "میزان الاعتدال" میں ابن عدی ہی کی پیروی کی ہے البتہ ذہبی نے [illegible] پیروی [illegible] اپنی کتاب میں کوئی ذکر نہیں کیا ہے"

اسی طرح شرح الفیہ میں [illegible] قول سے بھی تائید ہوتی ہے [illegible] ذہبی نے اپنی کتاب میزان الاعتدال میں ابن عدی کی پیروی [illegible] کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب میں کیا ہے خواہ وہ ثقہ ہی کیوں نہ ہو البتہ ذہبی نے [illegible] صحابی کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے نہ کسی امام کا جس کی [illegible] کی جاتی ہے۔"

اور سیوطی [illegible] کے اس قول سے بھی [illegible] تائید ہوتی ہے جو ان کی تصنیف "تدریب الراوی شرح تقریب النواوی" میں درج ہے [illegible] کہ حافظ ذہبی نے (میزان الاعتدال میں) نہ کسی صحابی کا ذکر کیا ہے نہ کسی امام کا جس کی پیروی کی جاتی ہے؟　　(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تو ایسے مستند علماء کے، جن کی نظروں سے میزان الاعتدال کے صحیح مخطوطے بار بار گزر چکے ہیں، یہ مذکورہ اقتباسات بآواز بلند اعلان کر رہے ہیں کہ میزان الاعتدال کے حرف "نون" میں ابوحنیفہ النعمان کے حالات کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میزان الاعتدال کے بعض نقل کرنے والوں کی طرف سے بعض مخطوطوں میں یہ حالات بڑھا دیئے گئے ہوں۔" (غیث الغمام کا اقتباس ختم)

عبدالفتاح ابو غدہ عرض کرتا ہے: "بلکہ خود ذہبی نے میزان الاعتدال کے مقدمے میں لکھ دیا ہے کہ "اور اسی طرح میں اپنی کتاب (میزان الاعتدال میں) ان ائمہ کا ذکر بھی نہیں کروں گا جن کے پیرو فروعی مسائل میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اسلام میں ان کی جلالت مانی ہوئی ہے اور دلوں میں ان کی عظمت راسخ ہو چکی ہے، جیسے ابوحنیفہ ہیں، شافعی ہیں، بخاری ہیں، اگر ایسے ائمہ میں سے کسی کا ذکر کروں گا بھی تو وہ ذکر ایسا منصفانہ ہوگا کہ نہ اللہ تعالیٰ کے یہاں عذر کا اندیشہ ہوگا نہ لوگوں کے نزدیک۔" اب میزان الاعتدال جو چھپ گئی ہے اس میں ابوحنیفہ کا حال دو سطروں میں پایا جاتا ہے جس میں کہیں بھی ابوحنیفہ کی طرف سے کوئی جواب دہی نہیں کی گئی ہے صرف ان کی جرح اور ان کو ضعیف قرار دینے تک حال محدود رہا ہے۔ ذہبی نے مقدمے میں جو خود دعویٰ کیا ہے اس طرح امام ابوحنیفہ کا ذکر اس کے خلاف ہے اور اس کی نفی کرتا ہے اس لیے کہ یہ ذکر انصاف پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف جرح ہی جرح ہے۔

میں نے کتب خانہ ظاہریہ (دمشق) میں میزان الاعتدال کی تیسری جلد کا مخطوطہ دیکھا جس کا کتب حدیث میں نمبر ۳۶۵ ہے وہ بہت بہترین مخطوطہ ہے پورا کا پورا حافظ شرف الدین عبداللہ بن محمود الوانی دمشقی کے قلم کا لکھا ہوا جن کی وفات ۷۴۹ھ میں ہوئی اور جو مؤلف میزان الاعتدال علامہ ذہبی کے شاگرد تھے (اللہ تعالیٰ دونوں پر اپنا فضل فرمائے) شاگرد دمشقی نے اس نسخے کو اپنے استاذ مصنف سے تین بار پڑھا اور مصنف علامہ ذہبی) کے اصل مسودہ سے مقابلہ بھی کر لیا گیا ہے، انھوں نے مخطوطے کے ورق ۱۱۱ کی پشت پر اور ورق ۲۰۲ کی پشت پر اس کی صراحت کی ہے۔ ان دونوں مقاموں کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی مخطوطے کے مصنف سے پڑھنے اور اصل مسودے سے مقابلہ کرنے کی متعدد تصریحیں انھوں نے کی ہیں تو اس معتبر اور مستند مخطوطے میں بھی مجھے امام ابوحنیفہ النعمان کا ذکر نہ حرف نون میں ملا نہ کنیت کے باب میں ملا، اسی طرح حلب میں کتب خانہ احمدیہ میں میزان الاعتدال کا جو مخطوطہ محفوظ ہے اور جس کا نمبر ۳۲۳ ہے اس میں بھی امام ابوحنیفہ کا ذکر نہیں ہے، یہ مخطوطہ بھی لکھا ہوا ہے ۷۱۹ھ میں لکھا گیا، کاتب علی بن محمد ہیں جو ابن شمشان کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ ایک ہی ضخیم جلد میں ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) [illegible] نہیں لکھی گئی ہیں)۔

رمضان [illegible] کا اتفاق ہوا شہر پیاط بھی گیا وہاں میں نے

بلک لائبریری [illegible] میزان الاعتدال کا ایک مخطوطہ جو ایک ہی جلد میں تھا دیکھا، اس کا ۱۲۱ ورق ہے

نقص الاول ہے [illegible] سے اس مخطوطے کی ابتدا ہوئی ہے جو مصر

یا بھی میزان الاعتدال کی [illegible] مطبوعہ کتاب کی جلد ۴ کا صفحہ ۱۹ شروع

ہوتا ہے وہاں سے [illegible] کا یہ ناقص مخطوطہ شروع ہوتا ہے) پھر آخر کتاب تک یہ مخطوطہ مکمل ہے....

[illegible] تحریروں کی [illegible] مخطوطہ کے آخر میں یا حاشیے پر ہیں شیخ عبد الفتاح ابو غدہ

لکھتے ہیں) اور یہ مخطوطہ [illegible] میزان الاعتدال [illegible] ہو گیا [illegible] میں چہار شنبہ

ار رمضان المبارک کو [illegible] قعدہ [illegible] میں ہوئی جیسا کہ

الدرر الکامنہ میں ہے [illegible] نظیر مخطوطات کی دنیا میں نہیں ملتی ابھی کہا

ن میں بھی امام ابو حنیفہ کا ذکر [illegible] ہے کہ میزان الاعتدال کے بعض

خوں میں جو امام ابو حنیفہ کا ذکر [illegible] امام صاحب کے بعض

مخالفین نے اپنے قلم سے [illegible] دو سطروں میں ہے جو ہرگز امام

بو حنیفہ کے شایان شان [illegible] امام صاحب [illegible] ائمہ پر ہونے والی جسرح کو

[illegible] میں جو طریقہ اپنی اس کتاب [illegible] اس سے بھی امام صاحب کے اس دو سطری ذکر کو کوئی مناسبت

نہیں ہے۔ ان کم مرتبہ ائمہ کے ذکر کو علامہ ذہبی نے بہت [illegible] سے کیا ہے اور ان کے مرتبہ اور امامت کی پوری

طرح وضاحت کی ہے۔

علامہ ذہبی [illegible] جو اپنے مخالفوں سے

انتقام لینے کے لیے [illegible] مقامات پر علامہ ذہبی کے سوا کسی دوسرے

[illegible] سامنے پڑھے گئے ہیں

[illegible] کام لیا ہو کہ ایک طرف امام

ابو حنیفہ کے مرتبہ کی وضاحت [illegible] کی بات ہو جائے تیسرے یہ کہ متعدد

مخطوطوں کا تعارف ہو جائے [illegible] حاشیہ [illegible] کا فی عرصے کے

بعد میں نے اپنے دوست شیخ محمد عبد [illegible] میں بالکل

انشورنس اسلامی معیشت میں

(۲)

(ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی)

انشورنس اور قمار

انشورنس کے بنیادی اصول کا جو تعارف گزشتہ صفحات میں کرایا گیا ہے اس کی روشنی میں اس طریقہ میں کوئی اخلاقی خرابی یا سماجی مضرت نہیں نظر آتی بلکہ یہ مشترک انسانی مسائل کو باہمی تعاون سے اجتماعی بنیاد پر حل کرنے کا ایک طریقہ ہے جسے اختیار کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس طریقے کا کوئی بدل بھی نہیں میسر ہے۔ لیکن چونکہ بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انشورنس قمار کی ایک صورت ہے اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے اس شبہ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ ہم انشورنس کی کسی مخصوص شکل کو جسے دور جدید میں انشورنس کمپنیوں نے عملاً اختیار کر رکھا ہو سامنے رکھ کر گفتگو نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارے پیش نظر وہ بنیادی اصول اور اس پر مبنی طریقہ انشورنس کی سادہ شکل ہے جس کا تعارف اوپر کرایا گیا ہے۔ حقیقی اہمیت اسی کی ہے کیونکہ اگر خود یہ طریقہ دراصل قمار سے پاک ہے تو اس کی مروجہ شکلوں میں جو قمار ہے تو وہ جزئی ہوگی جو معاملات کی ترمیم سے نکل سکتی ہے اور نہ ہو سکے تو اسے ترک کیا جا سکتا ہے۔

قمار میں جو خرابی ہے وہ یہ ہے کہ جوا کھیلنے والا بازی لگا کر یا شرط بد کر اپنے لیے ایک

ایسا خطرہ مول لیتا ہے جو پہلے سے موجود نہیں تھا، اگر یہ جوا نہ ہوتا تو خود اس کی ذات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ [illegible] کے مقابلے میں یا تاش، شطرنج وغیرہ کے کھیلوں میں ہار جیت پر بازی لگانا اس کی تمام مثالیں ہیں۔ قمار کی تمام شکلوں اور اس کی تمام مروجہ قسموں میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ شخص جو بازی لگا رہا ہے رقم ہار جانے کا خطرہ مول لیتا ہے اگر چاہتا تو بازی نہ لگاتا اور اگر وہ بازی نہ لگاتا یا شرط نہ بدتا تو اس کو اس رقم کے نقصان کا خطرہ نہ پیش آتا۔

انشورنس کا معاملہ اس سے بنیادی طور پر مختلف ہے، جس خطرے کے پیش نظر انشورنس کرانے والا انشورنس کراتا ہے اس کا وجود [illegible] اس کا تعلق اس کے انشورنس کرانے یا نہ کرانے پر [illegible] یہ خطرہ زندگی کی [illegible] سرگرمی، اقتصادی عمل، پیشہ یا [illegible] جس کا مکمل ازالہ انشورنس کے سوا کوئی اور تدبیر اختیار [illegible] مالی نقصان بھی وابستہ ہوتا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال [illegible] زندگی کے ساتھ لگا ہوا ہے وہ جس سے [illegible] نہیں [illegible] اکثر بالخصوص اگر وہ [illegible] مالی نقصان بھی ہوتا ہے آدمی اس نقصان کی تلافی کے لیے انشورنس کرائے یا نہ کرائے اس نقصان کا اندیشہ ہر حال میں موجود رہتا ہے کیونکہ اس کا تعلق موت سے ہے جو تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود کسی وقت بھی واقع ہو سکتی ہے اور کبھی نہ کبھی ضرور واقع ہو کر رہتی ہے [illegible] سواریوں کے مالکوں کو بھی حادثے کے نتیجے میں ان سواریوں [illegible] کا اندیشہ [illegible] یہ اندیشہ ان کے استعمال کے ساتھ لازمی طور پر [illegible] حادثے کی [illegible] نقصان [illegible] ہے۔ اسی طرح ہر مسافر کو جو ان سواریوں کے ذریعہ سفر کرتا ہے یہ خطرہ مول لینا پڑتا ہے کہ سواری کو حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس کی جان چلی جائے یا وہ زخمی ہو جائے، جس سے اکثر حالات میں مالی نقصان وابستہ ہوتا ہے۔ مکان، دوکان، سامان تجارت، کھیت، کارخانہ اور دوسرے املاک کے [illegible] آتش زدگی وغیرہ جیسے حادثات کے نتیجے میں [illegible] بربادی کا اندیشہ وابستہ ہے۔ برخلاف [illegible] اور اس سے وابستہ

مالی نقصان کا خطرہ جان پر [illegible] لیتے سفر [illegible] استعمال کرنا مکان،
دوکان، کارخانہ، کھیت، سامان تجارت وغیرہ تمام چیزیں [illegible] کاروباری
زندگی کے ساتھ [illegible] دست بردار [illegible]
نقل و حرکت کے لیے [illegible] نہیں [illegible] آتش گیر [illegible]
بھی استعمال کیے جاتے ہیں [illegible] ساتھ یہ خطرہ
بھی لگا ہوا ہے کہ [illegible] اچانک [illegible]
مدت العمر مالی نقصان [illegible] تمام [illegible] مالی
صورت کا احتمال ہر حال موجود ہے [illegible] انشورنس کرایا [illegible] جائے۔

[illegible] انشورنس کے [illegible]
پارٹی کا [illegible] مالی منفعت [illegible] انشورنس
کرانے کا [illegible] صورت میں ہوگا۔ جس حادثے
کے اندیشے سے انشورنس [illegible] اگر وہ حادثہ پیش آجائے تو [illegible] انشورنس
[illegible] نقصان کی
تلافی کرتی [illegible] واقع ہو [illegible]
کوئی [illegible]
کے [illegible]
کرتی ہے [illegible] حیثیت [illegible] نفع [illegible] انشورنس کرانے
والے [illegible] دوسرے کی [illegible]
نقصان کی تلافی [illegible] لاکھ روپے
کا انعام [illegible] ڈوب جانے کی
صورت میں انشورنس [illegible] جہاز کی قیمت [illegible] لاکھ روپے
ملتے ہیں۔ جہاز کے مالک کی مالی حیثیت اب بھی [illegible] جہاز ڈوب چکا ہے اور انشورنس کی رقم
ملنے سے پہلے تھی وہ انشورنس [illegible] نتیجہ [illegible] زیادہ دولت مند نہیں ہو

گیا ہے۔ اس کے برعکس لاٹری میں انعام پانے والا اب پہلے سے زیادہ دولتمند ہے۔ اس کی دولت میں دس لاکھ کا اضافہ ہو گیا ہے۔

اب معاملے کی دوسری [illegible] جو بازی ہار جاتا ہے تو اسے مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ لاٹری کے ٹکٹ کی رقم ضائع ہو جاتی ہے یا شرط کے مطابق بازی جیتنے والا اس سے ایک رقم وصول کرتا ہے اس رقم کی ادائیگی ایک خالص نقصان ہے۔ اس کے بالمقابل جو بازی ہار [illegible] کچھ بھی حاصل نہیں [illegible] کے مقابلہ میں صرف اس امید کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ جوئے میں جیت بھی ہو سکتی تھی اور ایک رقم ہاتھ آسکتی تھی مگر یہ امید معروضی طور پر ہارنے اور خسارہ برداشت کرنے سے وابستہ نہیں ہے اس سے الگ موجود رہتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جوئے باز عرصے تک بازی ہارے مسلسل جیتتا چلا جائے۔ انشورنس کرانے والا معاہدے کے مطابق ایک پریمیم ادا کرتا ہے اس ادائیگی کے عوض اسے اس بات کی ضمانت حاصل ہوتی ہے کہ اگر متعلقہ حادثہ پیش آگیا تو اس کے نتیجے میں واقع ہونے والے مالی نقصان کی تلافی کر دی جائے گی یہ تحفظ اسے معاہدہ کراتے ہی حاصل ہو جاتا ہے خواہ حادثہ واقع ہو یا نہ ہو۔ پریمیم اسی تحفظ کی قیمت ہے یہ تحفظ دور جدید اقتصاد کا اہمیت کا حامل ہے [illegible] کا اثر نہیں پڑتا۔ حادثہ واقع ہوتا ہے تو اسے نقصان ہوتا ہے اور اس نقصان کی تلافی [illegible] رقم ملتی ہے یا حادثہ [illegible] اس نکتے کی وضاحت آئندہ کی جائے گی۔ اقتصادی سرگرمیوں کی انجام دہی [illegible] خطرات سے تحفظ کی اہمیت پریمیم ادا کرنے کی [illegible] زیادہ ہے۔ پریمیم گھاٹا نہیں [illegible] اس کے برعکس جوئے میں ہاری ہوئی رقم سراسر گھاٹا ہے۔ پریمیم ادا کرنا ایک مجبوری کے تحت [illegible] یہ ہے کہ جن خطرات سے نقصان کا اندیشہ وابستہ ہے [illegible] نقصان سے تحفظ کی واحد صورت یہ ہے کہ پریمیم ادا کیا جائے [illegible] یا بازی لگانے کی صورت میں طے شدہ رقم ادا کرنے کے ساتھ [illegible] جوئے باز اپنے اختیار سے یہ گھاٹا مول لیتا ہے۔

انشورنس کرانے والا اگر انشورنس نہ کرائے تو [illegible] خطرہ تھا [illegible] کی صورت میں [illegible] بہرحال اثر انداز ہو گا خواہ آئندہ وہ خطرہ [illegible] کا وقت پہلے آتا ہے: بحری جہاز

کا مالک اپنے جہاز کو بحری سفر پر بھیجے یا نہ بھیجے اس فیصلہ پر اس اندیشہ کا گہرا اثر پڑے گا کہ جہاز ڈوب سکتا ہے اور اس حادثے کے نتیجے میں دس لاکھ روپے کا نقصان ہو سکتا ہے۔ یہ بات کہ اس سفر میں جہاز ڈوبا یا نہیں ڈوبا، بعد میں معلوم ہو گی یہی حال ان تمام اقتصادی اعمال اور عام سرگرمیوں کا ہے، جن کے ساتھ خطر محض وابستہ ہو۔ ان تمام صورتوں میں مالی نقصان کی تلافی کی ضمانت حاصل ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ پر گہرا اثر پڑنا لازمی ہے اور یہ اثر اس سے بے نیاز ہے کہ عملاً یہ نقصان واقع ہوتا ہے یا نہیں۔

اس حقیقت کی روشنی میں اس پر غور کیجئے کہ کیا جوے کی ہاری ہوئی بازی سے وابستہ مالی خسارہ اور حادثہ واقع نہ ہونے کی صورت میں ادا کیا جانے والا پریمیم ایک ہی نوعیت کے حامل ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر انشورنس کرانے والے کو عملاً وہ حادثہ نہ پیش آیا جس کا اندیشہ تھا، نہ کوئی مالی نقصان ہوا اور نہ اس کی تلافی میں کوئی رقم ملی تو اُس نے جتنا پریمیم ادا کیا وہ اس کے لیے سراسر گھاٹا ہے۔ اگر وہ انشورنس نہ کراتا تو پریمیم نہ ادا کرنا پڑتا اور یہ گھاٹا نہ ہوتا۔ جس طرح جوے باز اگر بازی نہ لگاتا تو نہ ہارتا اور اسے گھاٹا نہ ہوتا۔ اوپر ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ معاہدہ انشورنس سے یہ ضمانت حاصل ہوتی ہے کہ اگر نقصان ہوا تو اس کی تلافی کی جائے گی اور خود یہ ضمانت اقتصادی اعمال اور ان تمام سرگرمیوں کے لیے جن سے خطر محض وابستہ ہے ایک قدر و قیمت رکھتی ہے۔ لاٹری کے ٹکٹ کی قیمت یا جوے میں ہاری ہوئی رقم کے ساتھ اس طرح کی کوئی قابلِ قدر چیز وابستہ نہیں ہے۔ انعام پانے یا بازی جیتنے کی جو اُمید اس سے وابستہ ہے وہ کسی اقتصادی فیصلہ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ دراصل اس کا کوئی تعلق کسی اقتصادی عمل یا سرگرمی سے ہے ہی نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بازی جیتنے کے بعد ملنے والی رقم سے جوے باز کوئی مفید کاروبار کرنے کا خواہش مند ہو سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خواہش کے باوجود وہ صرف امید کی بنیاد پر متعلقہ کاروباری فیصلے بازی لگاتے وقت نہیں کر سکتا۔ انشورنس کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ یہاں فیصلہ کا موقع پہلے آتا ہے، انشورنس کا سوال بعد میں آتا ہے، انشورنس کرانے یا نہ کرانے کا اس فیصلے پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ جُوے میں بازی لگانے یا نہ لگانے کا اُس کاروباری فیصلے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے جس کی مالی بنیاد

بھی فراہم بھی نہیں ہوسکی ہے، نہ اس کی فراہمی یقینی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بازی جیتنے کی امید صرف بازی لگالے کے فیصلے پر اثر انداز ہوسکتی ہے اور اسی کا محرک بن سکتی ہے۔ یہ امید کسی دوسرے فیصلے کو نہ کوئی تعلق رکھتی ہے نہ اس پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔

انشورنس کو قمار قرار دینے والوں کی غلط فہمی کا سبب بعض ایسی باتیں ہیں جو بظاہر دونوں معاملوں میں مشترک نظر آتی ہیں۔ جوے باز اور انشورنس کرانے والے دونوں کو بعض اوقات ایک بڑی رقم ملتی ہے جس کے مساوی کوئی معاوضہ ان کی طرف سے نہیں ادا کیا گیا ہے۔ بعض انشورنس کرانے والے مسلسل پریمیم ادا کرتے ہیں مگر ان کو اس کے عوض کوئی بڑی رقم نہیں ملتی، جس طرح کہ بعض جوے باز بازی ہارتے ہی چلے جاتے ہیں' یا ایک شخص لاٹری کے متعدد ٹکٹ مسلسل خریدتا ہے مگر انعام نہیں پاتا۔ اوپر کی بحث سے یہ غلط فہمی دور ہوجانی چاہیے۔ مزید اطمینان کے لیے ہم ان دونوں بظاہر یکساں امور کے سیاق میں انشورنس اور قمار کا جامع موازنہ بھی کریں گے۔ پہلے اس بڑی رقم کو لیجیے جو انشورنس کرانے والے کو پریمیم کے طور پر تھوڑی رقم ادا کرنے پر بھی مل جاتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ رقم واقع شدہ نقصان کی تلافی کرتی ہے۔ اس طرح نقصانات کی تلافی کا طریقہ اختیار کرنے سے سماج میں اقتصادی اعمال کی انجام دہی کے لیے ایک محفوظ و مامون فضا برقرار رکھی جاتی ہے۔ خطرِ محض، بعض ایسے حوادث کا اندیشہ جن سے نقصان ہی نقصان وابستہ ہے' اقتصادی سرگرمیوں کے لیے از حد ہمت شکن ہوتا ہے۔ اس کا اقتصادی کردار اس کاروباری خطرے سے یکسر مختلف ہے جن کے ساتھ نقصان کا اندیشہ اور نفع کی امید دونوں وابستہ ہیں۔ سماج اپنے کارکنوں کو انشورنس کے ذریعے خطرِ محض کے مالی صدمات سے محفوظ کر کے ان خطرات کے سماج دشمن اور ہمت شکن اقتصادی اثرات سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

خطرِ محض سے وابستہ مالی نقصانات سماج میں دولت اور آمدنی کی عادلانہ تقسیم کے دشمن ہیں اور اس میں خلل انداز ہوتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق غیر اختیاری اور بخت و اتفاق پر مبنی امور سے ہے جبکہ دولت اور آمدنی کی نارمل تقسیم محنت، صلاحیت و استعداد اور اختیاری اعمال پر مبنی ہوتی ہے۔ انشورنس کے ذریعہ خطرِ محض سے وابستہ مالی نقصانات کی تلافی کا طریقہ اختیار کر کے سماج، دولت اور آمدنی کی تقسیم میں اس خلل اندازی کا مقابلہ کرتا ہے اور تقریباً ....

.... اسی تقسیم کو بحال کر دیتا ہے

جو ان کے بغیر پائی جاتی۔

ان ہی دونوں باتوں کے نتیجے میں یہ ممکن ہو جاتا ہے وہ اقتصادی اعمال اور سماجی خدمات جن میں بخت و اتفاق کے دخل سے کارکنوں کو زبردست مالی صدمات سے دوچار ہونے کا احتمال ہے، تسلسل، استقلال اور اندیشۂ صدمہ سے بے نیاز ہو کر اطمینان کے ساتھ انجام پا سکیں۔

اس کے برعکس وہ بڑی رقم جو بازی جیتنے والے جوے باز کو ملتی ہے نہ صرف یہ کہ کسی واقع شدہ نقصان کی تلافی نہیں کرتی بلکہ کوئی بھی مفید سماجی یا اقتصادی عمل نہیں انجام دیتی۔ اس طرح بازی جیتنے پر رقم دینے کا طریقہ اختیار کرنے سے سماج میں محنت و منفعت اور خدمت و اجرت کا وہ عادلانہ نظام درہم برہم ہو جاتا ہے جو اقتصادی اعمال کی متوازن انجام دہی کے لیے ضروری ہے۔ اس طریقے کے عام ہونے کی صورت میں سماج کے کارکنوں کی توجہ دولت حاصل کرنے کے لیے پیدا آور خدمات انجام دینے کی بجائے بازی لگانے اور بخت و اتفاق کا سہارا لینے کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ اس طریقے کا رواج سماج کو اور اس کے نظام پیداوار دولت کو بہت سے لائق، باصلاحیت اور مالدار افراد کی خدمات سے محروم کر دیتا ہے۔ انسانی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ محنت و صلاحیت کے سہارے کمائی ہوئی دولت کے برعکس جو دولت محض بخت و اتفاق کے طفیل ملی ہو وہ مفید پیدا آور کاموں میں لگنے کے بجائے سٹہ بازی، عیش کوشی اور اسراف و تبذیر کی نذر ہوتی ہے۔

اب اس بات پر غور کیجیے کہ ان رقموں کا مصرف کیا ہوتا ہے جو انشورنس کرانے والے پریمیم کے طور پر ادا کرتے ہیں مگر اس کے عوض انھیں کچھ نہیں ملتا۔ پھر اس کا مقابلہ ان رقموں کے مصرف سے کیجیے جو جوے میں ہاری جاتی ہیں۔ مثلاً وہ رقمیں جو لاٹری کے ٹکٹ کی قیمت کے طور پر ایسے افراد ادا کرتے ہیں جنھیں کوئی انعام نہیں ملتا۔ انفرادی سطح پر موازنے سے یہ سطحی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دونوں صورتوں میں رقم ادا کرنے والوں کو سراسر گھاٹا ہوتا ہے (کیونکہ ادائیگی کے بالمقابل انھیں خود کوئی رقم نہیں ملتی)، مگر ان ادائیگیوں کے سماجی مصرف پر غور کرنے سے ایک دوسرا ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ لاٹری کا ٹکٹ خریدنے والے لاکھوں افراد کی

اداکردہ رقوم، یا جوے کی دوسری شکلوں میں ہارنے والوں کی اداکردہ رقمیں، ان چند افراد کو منتقل ہو جاتی ہیں جن کے نام قرعہ نکل آتا ہے یا جو بازی جیت جاتے ہیں۔ ان افراد نے سماج کی کوئی خدمت نہیں انجام دی ہے جس کے صلہ میں وہ اس خطیر معاوضے کے مستحق سمجھے جائیں، نہ رقم کے ملنے کے نتیجے میں ان کے اقتصادی اعمال پر کوئی ایسا اثر پڑنے کی توقع ہے جو اس عطیے کی وجہ جواز بن سکے یہ اصلاً دولت کا ایک ایسا انتقال یا سماجی دولت کی ایسی تقسیم نو ہے جس کی بنیاد محنت، صلاحیت، خدمت یا استحقاق بربنائے حاجت نہیں ہے بلکہ محض بخت و اتفاق ہے چونکہ اس طرح کی تقسیم نو سے پہلے سماج میں دولت کی نارمل تقسیم بیشتر مذکورۂ بالا معقول بنیادوں پر مبنی ہوتی ہے لہٰذا بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ دولت کا اس طرح انتقال اور اس کی یہ نئی تقسیم جو جوے میں ہار جیت کے نتیجے میں عمل میں آتی ہے، عدل و انصاف کے منافی ایک اندھی تقسیم ہے۔

انشورنس کرانے والے جن افراد کو پریمیم ادا کرنے کے عوض کوئی رقم اس لیے نہیں ملی کہ ان کے ساتھ متعلقہ حادثہ عملاً نہیں پیش آیا، ان کی ادا کی ہوئی رقمیں ان انشورنس کرانے والوں کو منتقل ہو گئیں جن کے ساتھ حادثہ پیش آیا اور جنھیں مالی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ سماج کو نہ ان حادثات سے مفر تھا نہ ان کے نتیجے میں واقع ہونے والے مالی نقصانات سے۔ پورے سماج کو مجموعی طور پر وہ مالی نقصانات بہرحال برداشت کرنے تھے جو تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود آتش زدگی، غرقابی، صنعتی حادثات، موٹر گاڑیوں کو پیش آنے والے حادثات اور عمر طبعی سے پہلے موت کے نتیجے میں واقع ہوتے ہیں۔ سوال صرف یہ تھا کہ ان نقصانات کا بار تمام تر صرف ان ہی افراد پر ڈالا جائے جو عملاً ان حادثات کا شکار ہوں یا ان کو برداشت کرنے میں وہ تمام لوگ شریک ہوں جن کے ساتھ ایسے حادثات پیش آ سکتے تھے اور پیش آ سکتے ہیں۔ دوسری راہ اختیار کرنے کے حق میں متعدد اخلاقی اور اقتصادی فوائد کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ وسیع پیمانے پر پریمیم جمع کر کے حادثات کا شکار ہونے والوں کے نقصان کی تلافی کر دینے کے جن فوائد پر اوپر روشنی ڈالی جا چکی ہے ان کے سوا یہاں ہمارا مرکز توجہ اس کا وہ پہلو ہے جو سماجی عدل اور سماج میں دولت کی تقسیم سے متعلق ہے۔ حادثات کا شکار نہ ہونے والوں سے حادثات کا شکار ہونے والوں کی طرف جو دولت منتقل ہوتی ہے اس کے نتیجے میں دولت کی کوئی نئی تقسیم نہیں عمل میں آتی بلکہ تقریباً وہ تقسیم

بحال کی جاتی ہے جو حادثات رونما ہونے سے پہلے پائی جاتی تھی۔ جن افراد کی دولت کا ایک حصہ ان کی کسی نالائقی، کوتاہی، خطا یا جرم کے بغیر اتفاقاً ضائع ہو گیا۔ نقصان کی یہ کمی پوری کر دی جاتی ہے۔ انشورنس کے نتیجے میں کسی بھی فرد کو بغیر استحقاق مزید دولت نہیں حاصل ہوتی بلکہ جو دولت اسے کسی استحقاق کی بنا پر ملی تھی، مگر حادثہ کے نتیجہ میں ضائع ہو گئی تھی، وہی اسے مل جاتی ہے۔

قمار اور انشورنس کی نوعیت، ان کے محرکات، ان کے وہ اثرات جو اقتصادی سرگرمیوں اور سماج میں دولت کی تقسیم پر پڑتے ہیں نیز دونوں کے نفسیاتی پس منظر اور اثرات کا جامع موازنہ اس شبہ کے ازالے کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ دونوں یکساں ہیں یا انشورنس قمار کو مستلزم ہے یا ان کے بعض پہلو ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں اعمال کے درمیان نہ کوئی اشتراک ہے نہ مماثلت اور اپنے سماجی اور اقتصادی کردار کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔

اب ہم اختصار کے ساتھ یہ واضح کریں گے کہ شریعت نے جس قمار کو حرام قرار دیا ہے اس کی نوعیت وہی ہے جو اوپر واضح کی گئی، اور انشورنس اس سے پاک ہے۔

قمار کی حرمت

جوئے کی حرمت قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے (سورہ مائدہ، آیت ۹۰، ۹۱) قرآن حکیم میں جوئے کے لیے میسر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مفسرین اور مترجمین نے عرب جاہلیت میں میسر کی جو کیفیت بیان کی ہے اس پر قمار کی وہ تعریف پوری طرح منطبق ہوتی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے یعنی ایسا خطر Risk مول لینا جس سے نقصان کا اندیشہ اور نفع کی امید دونوں وابستہ ہوں اور جو زندگی کی کسی اصل سرگرمی سے لازمی طور پر وابستہ نہ ہو۔ مفسرین نے لفظ میسر کے بارے میں یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ یہ یُسر (یعنی سہولت، آسانی) سے نکلا ہے یعنی جوا کھیلنے والا بغیر محنت کے آسانی کے ساتھ دولت حاصل کرنا چاہتا ہے، اسی لیے جوئے کو میسر کا نام دیا گیا ہے۔[1] میسر کا جوہر قمار بتایا جاتا ہے جس کے معنی کی تحقیق میں اہل لغت دھوکہ اور چالبازی کے عنصر پر زور دیتے ہیں۔[2]

۱۔ فخر الدین رازی: تفسیر کبیر، جلد ۲، صفحہ ۲۲ (تفسیر سورہ مائدہ، آیت ۹۰)
۲۔ ابن منظور، لسان العرب، مادہ ق م ر اور ی س ر

عرب جاہلیت میں جوے کی جو شکلیں رائج تھیں وہ ہماری موجودہ اصطلاح کے مطابق بخت و اتفاق پر مبنی ہار جیت کے کھیلوں Games of Chance کی تعریف میں آتی ہیں۔

قمار کی ان صریح شکلوں کو ممنوع قرار دینے کے ساتھ اسلام نے ان کاروباری معاملات کو بھی ممنوع قرار دیا ہے جن میں قمار کی نوعیت پائی جاتی ہے۔ عرب جاہلیت میں ایسے متعدد معاملات کا رواج تھا جن کی ممانعت کا ذکر حدیثوں میں ملتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے ایسے معاملات کی فہرست میں مزابنہ، محاقلہ، اندازے سے (بغیر ناپ تول کے) فروخت، ملامسہ، منابذہ، بیع الحصاۃ، بیعانہ دینے کے رواج اور خشک[1] چھوروں کو تر و تازہ کھجوروں کے عوض خریدنے کو شامل کیا ہے۔[1] ان معاملات کی تفصیلی کیفیت سمجھنے کے لیے حدیث کی کتابوں اور ان کی شرحوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ نیز فقہاء کرام نے بھی ان پر بحث کی ہے۔ ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ قیمت اور خریدی جانے والی چیز کی وسعت اور مقدار کے لحاظ سے واضح تعیین کے ساتھ معاملہ کرنے کے بجائے ان کو غیر معین رکھکر فریقین ایسا خطرہ مول لیتے ہیں جس کا مول لینا ان کے لیے چنداں ضروری نہ تھا۔ اس خطرہ کو مول لینے کے نتیجے میں نفع کی امید بھی ہوتی ہے اور نقصان کا اندیشہ بھی۔ ممکن ہے کہ خریدار کو بازار میں نرخ سے کم دام دے کر چیز مل جائے یا ممکن ہے جو چیز ملے وہ بازار کے معیار سے ان داموں سے کم کی قرار پائے جو ادا کیے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ فروخت کنندہ کو بازار کے نرخ سے زیادہ دام مل جائیں اور ممکن ہے کہ اس سے کم ہی ملیں۔ مذکورہ بالا معاملات میں سے ایک معاملہ، بیع الحصاۃ کا جائزہ لینے سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ کپڑوں کا تاجر مختلف قسم کے کپڑے سامنے لگا دیتا ہے اور خریدار سے کہتا ہے کہ تم کنکری پھینکو، جس کپڑے پر کنکری گرے اسے تم فلاں قیمت کے عوض لے لو۔

جیسا کہ شاہ صاحب نے لکھا ہے، قمار سے کوئی تمدنی فوائد نہیں وابستہ ہیں، نہ اسے اس طرح کا تعاون قرار دیا جا سکتا ہے جو عام تجارتی لین دین میں پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اس طریقے

---

[1] شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۸ قاہرہ ۱۳۵۲ھ

[2] ملاحظہ ہو ڈاکٹر جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام جلد ۸ صفحات ۱۸۱-۱۷۶ مطبع المجمع العلمی العراقی ۱۹۵۰ء

کے رواج پانے سے اس تعاون اور ان سرگرمیوں کا ترک لازم آتا ہے جو تمدن کے لیے ناگزیر ہیں جیسا کہ ہماری بحث سے ظاہر ہے۔ یہ بات بجائے خود قمار اور اس سے آگے بڑھ کر ربٰو دونوں کی حرمت کو رد کرنے کی ایک بنیاد ہے۔ اسی طرح یہ بات کہ انشورنس کا طریقہ باہمی تعاون پر مبنی ہے اور اس سے اہم تمدنی فوائد وابستہ ہیں نیز اس سے ان سرگرمیوں میں مدد ملتی ہے جو تمدن کے لیے ناگزیر ہیں، انشورنس کے قمار سے پاک اور پسندیدہ طریقہ ہونے کی دلیل ہے۔ شریعت نے جس چیز کو حرام کیا ہے اس کا کوئی شائبہ انشورنس میں نہیں پایا جاتا۔ البتہ انشورنس کے نام سے جوئے بازی کا امکان ہے لیکن مناسب قوانین وضوابط کے ذریعے اس امکان کا ازالہ کرنا ممکن ہے، جیسا کہ آئندہ واضح کیا جائے گا۔ (باقی)

ا۔ شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صفحہ ۱۰۶

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ کی تازہ ترین پیشکش

مولانا محمد منظور نعمانی کی گیارہ

منتخب تقریریں

بہت جلد منظر عام پر آ رہی ہے۔

مختلف مقامات و مواقع پر کی گئیں مولانا موصوف کی گیارہ بیش قیمت اور جامع تقاریر کا مجموعہ وقت کے اہم تقاضے کا جواب

۲۰۰ صفحات   سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ بہترین گلیز کاغذ

قیمت مجلد مع گرد پوش۔ پانچ روپے صرف

مختلف موضوعات پر چند نئی و اہم کتابیں

فتاویٰ رحیمیہ اُردو

از حضرت مولانا مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاجپوری یہ فتاویٰ ابتک گجراتی زبان میں شائع ہوتا رہا۔ اب اس کو اُردو اور انگریزی زبان میں منتقل کیا جارہا ہے نہایت مستند اور جامع فتاویٰ ہے۔ قیمت جلد اول مجلد انگریزی ۱۲/- جلد دوم ۱۵/- انگریزی ایڈیشن جلد اول ۲۲/-

صحبتے با اولیاء

حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کے مجلسی ارشادات اور ملفوظات زندگی کی اصلاح اور کیفیت احسان پیدا کرنے کا پورا سامان، مرتبہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری
قیمت مجلد ۔۔ ۔۔ ۵/-

جواہر تصوف یا انفاس عیسیٰ

حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے ملفوظات کا مجموعہ، سائز ۲۰×۲۶ صفحات تقریباً ۷۰۰، قیمت مجلد ۱۸/-

"ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں"

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کا مذہبی تمدنی اور معاشرتی تعارف نیز ان کی ملی خصوصیات کا بیان ایک غیر جانبدارانہ جائزہ۔ قیمت ۳/۵۰

اسلام مکمل دین مستقل تہذیب

اُردو ایڈیشن ۔ ۶۵/- پیسے انگریزی اڈیشن ۷۵/- پیسے
انسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق
اُردو ۔ ۵۰/- پیسے انگریزی ۷۵/- پیسے
عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب" ۲۵ پیسے

تقریر بخاری اُردو

از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب
حضرت اقدس کے درس بخاری کی تقاریر کا دل آویز مجموعہ جو متفرق سالوں کے درسی افادات کو سامنے رکھکر مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۸/-

تاریخ مظاہر

از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مظاہر العلوم سہارنپور کے پچاس سالہ حالات کی دینی علمی اور غیرفانی خدمات کا جائزہ۔ قیمت مجلد ۵/۵۰

مسلم پرسنل لا

از مولانا نعمت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار
اس رسالہ میں مسلم پرسنل لا کا مفہوم اس کی تاریخ اور دینی حیثیت واضح کی گئی ہے۔ قیمت صرف ۱/۲۵

نقوش اقبال

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
جدید ایڈیشن ترمیم اور اضافہ کے ساتھ نیز پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بیش قیمت مقدمہ کے ساتھ
قیمت ۔ ۔ ۵/۵۰

ایک بہترین ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے

اردو قیمت ۷۵/- پیسے انگریزی ۱/۲۵

دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں

قیمت ... ۵۰ پیسے

"خواص"

ملت میں اُن کا مقام اور ان کی ذمہ داری۔
قیمت ... ۴۰ پیسے

ملنے کا پتہ :- کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

مولانا نعمانی کی تالیفات

جو قرآن و حدیث کی تعلیمات کی ترجمان اور دینی اصلاح کا مکمل نصاب ہیں

اسلام کیا ہے؟ نہایت آسان زبان اور سیدھے دلنشین انداز میں اسلامی تعلیمات کا مکمل خلاصہ۔ جو دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ کافی ہے۔ ۲/۵۰

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اس کتاب میں سیکڑوں عنوانات کے تحت قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، جو پڑھنے والے کو قرآنی دعوت اور تعلیم کے ساتھ اس کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔ غیر مسلموں کے لیے خاص تحفہ۔ قیمت مجلد ۵/۵۰ انگریزی ایڈیشن -/۱۲

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس رح جن لوگوں نے حضرت مولانا محمد الیاس رح کو نہیں پایا وہ اس کتاب کے مطالعہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو پوری طرح جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لیے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ مجلد ۲/۵۰ غیر مجلد -/۲

تذکرہ مجدد الف ثانی رح اس کتاب میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رح کی سوانح حیات آپ کی عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم کارنامے کی تفصیل بیان کی گئی ہے جس نے سلطنت مغلیہ کا رخ الحاد سے اسلام کی طرف موڑ دیا۔ قیمت -/۴

مکتوبات خواجہ محمد معصوم رح یہ کتاب حضرت خواجہ رح کے ارشاد و ہدایت کے پورے کام کا آئینہ ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم رح حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ اور خلیفہ ہیں۔ آپ ہی کی تربیت نے اورنگ زیب عالمگیر کو ایک مثالی حکمران بنا دیا تھا قیمت مجلد ۵/۵۰

کلمہ طیبہ کی حقیقت توحید اور رسالت کی شہادت کا کیا مطلب ہے اور اس کے کیا تقاضے اور کیا مطالبے ہیں۔ -/۵

نماز کی حقیقت اپنی نماز کو حقیقی نماز بنانے اور اس میں روح پیدا کرنے کے لیے اس کا مطالعہ ضرور کیجیے۔ شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی اور دیگر اکابر کے افادات کا نچوڑ ہے۔ قیمت ۱/۲۰

برکات رمضان اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ -/۱

دین و شریعت اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت، اور احسان و تصوف پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت -/۴

معارف الحدیث احادیث نبوی کا ایک جامع انتخاب، اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ۔ اس کتاب میں صرف وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن میں امت کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے اور جن کا انسانوں کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے۔
جلد اول ۶/۲۵ جلد دوم ۵/۲۵ جلد سوم -/۹ جلد چہارم ۶/۵۰ جلد پنجم ۸/۵۰ (مجلد کے لیے ۲/۲۵ فی جلد مزید)

صحبتے با اہل دل (مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی) حضرت شاہ محمد یعقوب بھوپالی (پیر نھے میاں) آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ہم آج بھی ان کی اصلاحی مجالس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے ارشادات سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب اُن کی عرفانی و اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان کے ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ہے۔
قیمت مجلد -/۶

انسانیت زندہ ہے یہ مولانا نعمانی کے چار چھوٹے چھوٹے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں کے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پر تاثیر واقعہ اور تجربہ نہایت سادہ انداز میں بیان کیا ہے قیمت -/۵۰

شاہ اسمٰعیل شہید حضرت شاہ اسمٰعیل شہید پر لگائے گئے معاندین اہل بدعت کے الزامات کا مدلل اور مسکت جواب قیمت -/۱

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مستند تفاسیر و علومِ قرآنی

تفسیر ماجدی (از مولانا عبدالماجد دریابادی) قرآن مجید کی یہ تفسیر متعدد حیثیتوں سے منفرد و ممتاز اور بیحد قابل قدر ہے۔ عربی کی تمام مستند تفاسیر اور معروف انگریزی لغوی تحقیقات کا عطر کشید کر دیا گیا ہے۔ ایک عام آدمی کامل اعتماد کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔

قیمت مجلد اول -/۱۵، دوم مجلد -/۱۴

تفسیر ابن کثیر محشّٰی (اردو) علامہ ابن کثیرؒ کی عظیم الشان تفسیر جس کو جدید و مفید حاشیہ اور مسائل کی وضاحت کے ساتھ چھاپا گیا ہے نہایت ہی جامع و مفید کتاب ہے۔ چار جلدوں میں مکمل غیر مجلد -/۴۰ مجلد -/۴۵

تفسیر بیان القرآن حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مشہور زمانہ تفسیر۔ تین جلدوں میں مکمل سٹ مجلد -/۶۳۔ مکمل سٹ کی خریداری پر رعایتی قیمت -/۹۶

تفسیر حقانی مکمل (مولانا عبدالحق حقانی دہلوی کی شہرۂ آفاق تفسیر الگ الگ پاروں میں ۳۴ قسطوں میں مکمل ہوئی ہے جس میں مقدمہ بھی شامل ہے۔ مجلد پانچ جلدوں میں مکمل ہے۔ قیمت کامل مجلد -/۷۰

تفسیر موضح القرآن شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کی مشہور و معقول تفسیر جو تفاسیر میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے بڑے سائز کی ایک ہی جلد میں مکمل ہدیہ مجلد -/۳۰

کشف الرحمٰن مع تیسیر القرآن و تسہیل القرآن (از مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ) قرآن شریف کا ترجمہ اور تیسیر القرآن و تسہیل القرآن کی ترتیب و تالیف، مولانا موصوف کی ۲۰ سالہ محنت اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ قیمت مکمل -/۳۰

تفسیر مظہری حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی یہ تفسیر اب تک عربی زبان میں چھپتی رہی۔ اب اسے اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ نہایت معتبر اور مشہور و مقبول تفسیر ہے۔ ۱۲ پاروں کی تفسیر چھپ کر آ چکی ہے۔

قیمت ....-/۱۰۶

قصص القرآن (از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم) جس میں انبیاء اور امم سابقہ کے سلسلے میں قرآن کے بیانات پر تاریخ و حدیث اور علوم عمرانی کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ان واقعات کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔

قیمت جلد اول -/۱۰ جلد دوم -/۵ جلد سوم -/۷ چہارم -/۷ (مجلد کے لیے -/۲ فی جلد مزید)

ارض القرآن یعنی قرآن مجید کی تاریخی آیات کی تفسیر، سرزمین قرآن (عرب) کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا تذکرہ ہے ان کی تاریخی اور اثری تحقیق مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے قیمت مکمل غیر مجلد -/۱۰

قرآن اور تعمیر سیرت (از ڈاکٹر میر ولی الدین) اس کتاب میں سیرت و کردار سازی کے جامع نقطۂ نظر سے قرآن کی بعض اہم تعلیمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب متعدد مقالات پر مشتمل ہے۔ قیمت صرف -/۶

قرآن اور تصوف (یہ بھی ڈاکٹر میر ولی الدین کی تصنیف ہے ڈاکٹر صاحب اپنی جدید تعلیم کے باوجود تصوف کے حامل اور داعی ہیں۔ اس کے مطالعہ سے تصوف کے بارے میں بہت سے شکوک رفع ہو جاتے ہیں۔ قیمت -/۳

قاموس القرآن (نیا ایڈیشن) تالیف مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ اس میں الحمد سے لے کر والناس تک بہ ترتیب حروف تہجی تمام الفاظ قرآنی کے معانی اور ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح درج کر دی گئی ہے۔ طباعت و کاغذ اعلیٰ، صفحات آٹھ سو، قیمت مجلد -/۱۱

لغات القرآن قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب حل کرنے اور سمجھنے کے لیے اردو زبان میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ ایک عام آدمی اسکے پڑھنے سے قرآن کا ترجمہ اچھی طرح سے کر سکتا ہے۔

قیمت کامل غیر مجلد -/۴۳، مجلد -/۵۰

فہم قرآن قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنا کن علوم و شرائط پر موقوف ہے؟ قیمت -/۲

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

علم حدیث اور فقہ پر اہم اور مستند کتابیں

کتاب الزهد والرقائق

امت کے جلیل القدر امام عبد اللہ بن مبارک کی مقبول و مشہور تالیف جو عرصہ سے نایاب تھی اس کو ہمارے ملک کے مایۂ ناز محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ایڈیٹ کر کے نہایت مفید اور ایمان افروز مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا ہے کوئی کتب خانہ اور لائبریری اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں۔ قیمت مجلد صرف -/۳۰

ترجمان السنہ مکمل

(تالیف: مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی) اردو زبان میں ضروری تشریح و مباحث کے ساتھ ارشادات نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ ہے۔ حدیث کے مستند لٹریچر میں یہ کتاب بلاشبہ عدیم النظیر ہے۔ قیمت جلد اول - جلد دوم -/۱۰ جلد سوم -/۱۲ جلد چہارم -/۱۲ (مجلد کے لیے فی جلد -/۳)

نصرۃ الحدیث

کیا حدیث بھی قرآن کی طرح واجب العمل ہے؟ ہمارے وقت کے مشہور صاحب نظر فاضل اور محقق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اپنی اس کتاب میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور حدیث کی حجیت کے مسئلہ کو بے غبار کر دیا ہے۔ قیمت ۲/۵۰

محدثین عظام اور انکے علمی کارنامے

مؤلفہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری

اس کتاب میں ائمہ اربعہ اور ارباب صحاح ستہ اور امام طحاوی کا تحقیقی تذکرہ اور تاریخ تدوین حدیث اور محدثین عظام کی کوششوں کا ذکر ہے نیز محدثین عظام کے علمی کارناموں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے قیمت -/۵۰

فن اسماء الرجال

یعنی تاریخ رجال حدیث کی تدوین و تحقیق کتب اسماء الرجال سے استفادہ کا طریقہ اہم مشہور کتب رجال پر تبصرہ و تعارف۔ مؤلفہ مولانا تقی الدین ندوی قیمت ۱/۲۵

مظاہر حق (اردو مع متن عربی)

حدیث کی مشہور و مقبول ترین کتاب "مشکوٰۃ شریف" کی اردو زبان میں شرح۔ پانچ جلدوں میں مکمل۔ قیمت غیر مجلد کامل -/۶۵

انضاح البخاری

احادیث کی سب سے مستند کتاب (بخاری شریف) کی اردو شرح۔ افادات حضرت مولانا فخر الدین صاحب (شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند) ۱۲ حصے طبع ہو چکے ہیں۔ قیمت فی حصہ ۲۵/۱

زاد سفر

"ریاض الصالحین" کا اردو ترجمہ۔ از امۃ اللہ تسنیم۔ یہ کتاب بہترین مصلح و مرشد کا کام کرتی ہے۔ عنوان کے نیچے پہلے قرآن مجید کی آیات مع ترجمہ پھر احادیث ہیں۔ قیمت جلد اول ۵۰/۶

شمائل ترمذی خصائل نبوی (اردو)

شمائل ترمذی کی عالمانہ و فاضلانہ شرح جس میں احادیث کی روشنی میں حضور کی سیرت و صورت، عادات، خصلتیں، معمولات و لباس وغیرہ کی تفصیل ہے۔ قیمت -/۶

فتاویٰ دار العلوم دیوبند

افادات حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ۔ دار العلوم دیوبند سے پوچھے گئے ہزارہا فقہی سوالات اور ان کے جوابات کا یہ بے نظیر مجموعہ جو اب تک بطون اوراق میں محبوس تھا مولانا ظفیر الدین صاحب نے ۸ جلدوں میں مرتب کیا ہے قیمت کامل سٹ -/۵۶

فتاویٰ رشیدیہ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی شخصیت علمی حلقہ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کو تمام علوم اسلامیہ میں منصب امامت حاصل تھا مگر خصوصی مناسبت آپ کو فقہ و حدیث میں تھی۔ زندگی کے تمام ضروری مسائل کے بارے میں آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ -/۸

فتاویٰ مولانا عبد الحی فرنگی محلی (اردو)

مولانا عبد الحی لکھنوی کا مجموعہ فتاویٰ جو فقہی اور اعتقادی مسائل کا ایک نادر ذخیرہ ہے۔ اردو فتاویٰ کے ساتھ عربی و فارسی فتاویٰ کا نہایت سہل و سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ تینوں حصے یکجا، قیمت مکمل مجلد -/۱۸

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

سیرت نبوی پر منتخب کتابیں

سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندوی کی مشہور و مقبول تالیف۔ یہ رسول اکرمؐ کے حالات، غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشادات کا ذخیرہ ہے سیرت کے موضوع پر ایک عظیم شاہکار ہے۔ چھ جلدوں میں مکمل قیمت مکمل غیر مجلد ۸۰/۱

رحمۃ للعالمین از علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصورپوری یہ کتاب جامعیت و کاملیت اور تاریخیت میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ حوالجات مستندہ دلائل مضبوط انداز بیان شگفتہ اور عشق نبوی میں سرشار کر دینے والا ہے۔ تین ضخیم جلدوں میں مکمل حسین و رنگین گرد پوش ساتھ مزین۔ قیمت کامل سیٹ ۲۶/-

سیرت طیبہ از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی سیرت نبوی کے موضوع پر ایک عظیم شاہکار۔ حدیث کی مستند کتابوں کی بنیاد پر جدید انداز تعبیر کے ساتھ۔ ۵۰ ۴ صفحات قیمت صرف ۵/-

رحمت عالم علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت کے موضوع پر یہ کتاب خاص طور سے مدارس کے طلباء کے لیے لکھی ہے قیمت صرف ۲/-

محسن انسانیت اس میں سیرت رسول ایک نئے اور دلآویز انداز میں بیان کی گئی ہے۔ آپ کے عہد کی ایک مکمل تاریخ ہے ایک مفید ترین کتاب۔ قیمت ... ۱۰/-

خطبات مدراس حیات نبوی کے مختلف پہلوؤں پر علامہ سید سلیمان ندوی کے خطبات جو مرحوم کے علم و تحقیق کا نچوڑ ہیں۔ قیمت ۳/-

مقالات سیرت سیرت نبوی پر آٹھ گرانقدر مقالات کا مجموعہ۔ از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ قیمت ۵/-

تقریر سیرت سیرت پاک پر مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی دو معرکۃ الآرا تقریریں۔ پہلی تقریر سیرت ۱/۷۵ دوسری تقریر سیرت ۲/۷۵

نبی عربیؐ اس کتاب میں متوسط استعداد کے بچوں کیلئے سیرت نبوی کے تمام واقعات کو اختصار کیا تھ سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد .. ۱/۷۵ مجلد .. ۲/-

ہمارے حضورؐ سیرت نبوی کے صحیح اور مستند واقعات پر مبنی یہ کتاب خاص طور پر کم سن طالب علموں کے لیے نہایت شیریں و آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ قیمت ... ۱/۸۰

سیرت صحابہ و تابعین

حیاۃ الصحابہ حضرت جی (حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ) کی "حیاۃ الصحابہ" کا اردو ترجمہ صحابہ کرامؓ کی دعوت اسلام کے لیے محنت و جدوجہد ان کے سرفروشانہ مجاہدات مخصوص صفات و کمالات پاکیزہ حالات، فقر و صبر، زہد و قناعت اور ایمان و یقین سے متعلق احادیث و قصص کا دلکش مجموعہ ہے۔ تین جلدوں میں مکمل قیمت مکمل سیٹ ۳۳/-

سیرت خلفاء راشدین سیرت خلفاء راشدین پر مولانا عبدالشکور لکھنویؒ کی عظیم تصنیف جس میں اس دور کے اہم تاریخی واقعات بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ قیمت مجلد ۲/۵۰

صدیق اکبرؓ اس کتاب میں حضرت ابوبکر صدیق کے مفصل سوانح حیات اور ان کے عہد کے تمام حالات کا محققانہ اور فاضلانہ تذکرہ ہے اس کتاب نے ایک بڑے خلاء کو پر کر دیا ہے۔ از مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ قیمت مجلد ۱۲/-

الفاروق علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے اس کتاب میں حضرت عمر فاروقؓ کے مفصل سوانح حیات عادات و خصائل، علمی کمالات ان کے عہد کے تمام ملکی اور فوجی انتظامات اور ان کے مجاہدانہ کارناموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قیمت مجلد ۶/-

سیرت عائشہ از علامہ سید سلیمان ندوی۔ اس کتاب میں حضرت عائشہؓ کے واقعات زندگی اور اخلاق و عادات کی تفصیل اور ان کے علوم و مجتہدات پر بحث کی گئی ہے۔ قیمت صرف .. ۷/-

خلفاء راشدین از مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی اس کتاب میں خلفاء راشدین کے سوانح حیات اور انکے سیاسی انتظامی، مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کا تفصیلی تذکرہ ہے قیمت ۵/۵۰

مہاجرین اس میں بقیہ حضرات عشرہ مبشرہ و اکابر بنی ہاشم اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے اکثر صحابہ کرام کے حالات مجاہدات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں قیمت اول ۶/- دوم ۶/-

سیر الانصار اس کتاب کے پہلے حصے میں پچاس انصار کرامؓ اور دوسرے حصہ میں ۴۶ انصار کرامؓ کے سوانح حیات اور ان کے فضائل و کمالات کا تذکرہ ہے۔ قیمت اول ۶/- دوم ۵/-

نوٹ:- تفصیلات کے لیے کتب خانہ کی مکمل فہرست مفت طلب کیجئے

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ


4301
ماءُ اللحم مُصطفائی
طاقت اور خون پیدا کرنیوالا
مشہور و معروف ٹانک
مقوی دل و دماغ و جگر و معدہ و باہ۔ مغلظ منی۔ ہاضم طعام
مقوی بصر دافع ضعف رحم و دمہ و درد گردہ و درد حیض و درد
بعد ولادت امراض سینہ نمونیہ و ام الصبیان و سوکھا
نشان۔ کمزور بوڑھوں اور بچوں کے لئے یکساں
مفید اور ہر موسم میں قابل استعمال۔
دارُالشفاء مُصطفائی میرٹھ (رجسٹرڈ)
MUSTAFAI
MAUL LAHM
ماءُ اللحم مُصطفائی
دارالشفاء مُصطفائی میرٹھ
رجسٹرڈ


گھر بھر کے لیے
سِنکارا
طاقت و تغذیہ
اور
چستی و توانائی کا سرچشمہ
قدرتی جڑی بوٹیوں اور وٹامنوں وغیرہ کا
یہ مرکب کمزوری کو دُور کرتا ہے۔ صحت و
قوت بڑھاتا ہے اور ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے یکساں مفید ہے۔
ہمدرد
cinkara
cinkara

Regd No L-353

Monthly 'ALFURQAN' Kachehri Road Lucknow

VOL 40 NO NOV.

ROAMER

اُفقِ تاباں

پکوان کے
عُمدہ تیلوں میں
آپ کی خاص پسند۔

پوسٹ مین برانڈ

صاف کیا ہوا مونگ پھلی کا تیل

۱، ۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو

عُمدہ وناسپتی

۱، ۲، ۴ اور ۵، ۱۶ کیلو

تِلولا، تِل کا تیل

۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو

ا د برانڈ خالص ناریل کا تیل

۲، ۴ اور ۱۶ کیلو

کوکو جار

صاف کیا ہوا ناریل کا تیل

۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو

امی سلاڈ تیل

۲، ۴ اور ۵، ۱۵ کیلو

احمد ملز، ممبئی ۸

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
بنگلادیش سے ۸/-
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی ...... ۷۵ پیسے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۴۰ | بابت ماہ شوال المکرم ۱۳۹۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۲ء | شمارہ ۱۰

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۵ جنوری ۷۳ء تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: ــ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: ــ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہماری خواہش اور کوشش اس شمارے کو جسقدر جلد شائع کرنے کی تھی وہ تو اگرچہ ہمارے کاتب صاحب کے علیل ہو جانے سے کامیاب نہیں ہو سکی، پھر بھی جتنی کامیابی ہو گئی وہ غنیمت ہے۔ انشاءاللہ دسمبر کے اندر ہی یہ شمارہ ناظرین کے ہاتھوں میں پہونچ جائے گا۔ اب رسالے کی اشاعت کو پوری طرح وقت پر لانے کے لیے یہ طے کیا گیا ہے کہ جنوری کی اشاعت ناغہ کر دی جائے اور فروری میں ٹھیک وقت پر جنوری اور فروری ۷۳ء (دونوں مہینوں) کا مشترک رسالہ شائع ہو۔ اس لیے ناظرین کرام جنوری میں الفرقان کا انتظار نہ فرمائیں۔

بمبئی میں ہونے والے "تحفظ مسلم پرسنل لا کنونشن" کے داعیوں کی فہرست کو دیکھ کر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس پیمانے کی اجتماعیت کے ساتھ مسلمانوں کی کوئی کانفرنس شاید ہی اس سے پہلے ہندوستان میں بلائی گئی ہو۔ اللہ کرے یہ جس مقصد سے بلائی گئی ہو اس میں کامیابی کے لحاظ سے بھی اتنی ہی خوش کن ثابت ہو۔ اور اس ملک میں اپنے دین اور دینداری کی حفاظت کے لیے ملی اجتماعیت کا ایک نیا باب بھی اس سے کھلے۔

والد ماجد کے سفر حجاز کا ذکر گزشتہ اشاعت میں آ چکا ہو۔ اس اشاعت میں اگلے ہی صفحہ سے ان کا ایک تفصیلی مکتوب دیا جا رہا ہے۔ یہی دراصل اس ماہ کی "نگاہ اوّلیں" ہے۔

نامۂ حرم

(حضرت مولانا محمد منظور نعمانی)

فندق شبرا۔ مکۃ المکرمہ ۱۸ شوال المکرم ۱۳۹۲ھ
۲۳ نومبر ۱۹۷۲ء (پنجشنبہ)

عزیزان من! السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ۔ دعاءکم۔ سلام مسنون

۱۳ نومبر (دوشنبہ) کی صبح تم لوگوں سے رخصت ہوکر بڑی عافیت و راحت کے ساتھ ہم تینوں (مولانا علی میاں، مولوی محمد رابع اور یہ عاجز) اگلے دن ۱۲ ½ بجے بمبئی پہونچ گئے تھے۔ احباب و مخلصین اسٹیشن پر آگئے تھے۔ آندھرا بمبئی ٹرانسپورٹ والے محمد بھائی بھی تھے ان ہی کے ہاں قیام کا فیصلہ ہوا سب سے بڑا مسئلہ پی فارم کا تھا، ۱۶ نومبر کے سعودی طیارہ میں سیٹیں بھی بک کرائی تھیں۔ دوستوں نے ہمارے پہونچتے ہی ہم سے پاسپورٹ اور ضروری کاغذات لیکر کوششیں شروع کردیں۔ اور ۲۔۳ دن کی مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد سارے کام کرالیے، اگرچہ ایک سرٹی فکیٹ جس کے بغیر ہم سفر نہیں کرسکتے تھے، آخری دن اس وقت حاصل ہوسکا جب ہم قیامگاہ سے سنتا کرز ہوائی اڈے کے لیے روانہ ہوچکے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے بہت عظیم احسانات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے بہت سے مخلص احباب دیے ہیں اور خاص کر بمبئی کے احباب کا مخلصانہ تعلق تو بہت ہی بڑی نعمت ہے۔ —— ہمارے حضرت رائپوری قدس سرہ نے ۵۰ھ میں حج کا سفر فرمایا۔ اس سفر میں رفیق محترم مولانا علی میاں بھی حضرت کے ساتھ تھے —— حضرت نے واپسی پر فرمایا کہ اخلاص اور خدمت کا مخلصانہ

جذبہ ہم نے جاتے ہوئے بس بمبئی کے دوستوں میں دیکھا تھا اور واپسی میں بھی بس وہیں کے دوستوں میں دیکھا ___ واقعہ یہ ہے کہ جب کبھی بمبئی جانا ہوتا ہے وہاں کے دوستوں کے اخلاص سے طبیعت بہت متاثر ہوتی ہے اور بہت بڑی بات یہ ہے کہ یہ احباب جو کچھ کرتے ہیں، جہاں تک اندازہ ہے بس اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اور اجر آخرت کی امید پر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے مخلصانہ تعلق اور خدمات کو قبول فرمائے۔ اِن سے راضی ہو اور دنیا اور آخرت میں بہتر جزا عطا فرمائے۔

جہاز کی پرواز کا وقت شام کو سوا چھ بجے تھا اور ۶ بجے کے قریب آفتاب غروب ہوتا تھا ___ ہم لوگوں نے ہوائی اڈہ ہی پر بہت عجلت سے مغرب کی نماز جماعت سے ادا کی اور جہاز پر پہونچ گئے۔ جہاز نے پرواز شروع کی اور قریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد کراچی کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ چند ہی دن پہلے لندن کے ایک دوست مولانا علی میاں سے ملکر کراچی گئے تھے اُن کے ذریعہ کراچی کے بعض احباب کو مولانا علی میاں اور ہم سب کے اس سفر کا پروگرام معلوم ہو گیا تھا، جیسے ہی ہم لوگ جہاز سے اترے، دیکھا کہ قاری رشید الحسن صاحب موجود ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب اور سید جمیل صاحب اور دوسرے بہت سے حضرات باہر منتظر ہیں۔ الحمد للہ سب سے بڑے اطمینان سے ملاقات کا موقع ملا۔ وہیں وضو وغیرہ کرکے عشاء کی نماز جماعت سے ادا کی۔

میں یہ ذکر کرنا بھول گیا کہ جیسا کہ معلوم ہو چکا تھا، ہمارے محمد یونس سلیم صاحب بھی معہ اپنی اہلیہ محترمہ کے اس جہاز پر تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کی اہلیہ محترمہ کی والدہ، جدہ اور بہن بھائی وغیرہ کراچی میں ہیں۔ وہ سب بھی ہوائی اڈے پر آگئے تھے، یہاں جہاز ۴۵ منٹ ٹھہرتا ہے۔ جب وقت ختم ہونے کے قریب آیا تو ہم سب جہاز پر سوار ہو گئے، کراچی سے رابطہ کے ارکان میں سے جناب ظفر احمد انصاری صاحب اور انعام اللہ خاں صاحب بھی سوار ہوئے ___ کراچی سے پرواز کرکے جہاز ظہران اترتا تھا ہم لوگوں نے طے کیا تھا کہ وہیں سے احرام باندھیں گے، وہاں مسافروں کے پاسپورٹ اور کاغذات کی جانچ ہوتی ہے اور سامان بھی دیکھا بھالا جاتا ہے، جس کی وجہ سے جہاز وہاں بہت دیر ٹھہرتا ہے ہم نے سوچا کہ پہلے قانونی مرحلوں سے گزر جائیں اس کے بعد وضو کرکے احرام کی دو رکعتیں پڑھکر محرم ہو جائیں۔ لیکن یہاں کے عملہ نے مسافروں کے کاغذات کی دیکھ بھال اور فضول موشگافیوں میں اتنی دیر کر دی کہ جہاز کی پرواز کا وقت آگیا اور ہم لوگ بمشکل وضو کر سکے اور احرام کی رکعتیں

جہاز پہ سوار ہوکے پڑھیں۔ جہاز وہاں سے پرواز کرکے تقریباً دو گھنٹے میں جدہ کے مطار پر اترا۔

بمبئی میں پی فارم وغیرہ قانونی مراحل کی تکمیل سے پہلے ہم نے اپنے سفر کے پروگرام کے متعلق جدہ یا مکہ مکرمہ تار دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ان قانونی مراحل کی تکمیل کے بارے میں ایک گونہ اطمینان ۱۶ نومبر (جمعرات کے دن) ہو سکا تھا اس دن رابطہ کے دفتر کو تار دیا جا سکا تھا کہ "ہم لوگ انشاء اللہ کل ۱۷ نومبر جمعہ کے دن سعودی طیارہ سے روانہ ہوکر رات میں جدہ کے مطار پر اتریں گے" ہمیشہ کے تجربہ کی بنا پر امید تھی کہ تار پہونچ گیا ہوگا، لیکن تار نہیں پہونچا بلکہ (ہمارے پہونچنے کے ۲ دن کے بعد پہنچا) البتہ میں نے رمضان مبارک میں مولانا عبداللہ عباس ندوی کو جو خط لکھا تھا اس میں اس کا ذکر دیا تھا کہ اگر کوئی خاص رکاوٹ پیش نہ آئی تو ہم لوگ ۱۷ نومبر جمعہ کے دن سعودی طیارہ سے جدہ پہونچیں گے" وہ خط ان کو مل گیا تھا اور ان کے ذریعہ رابطہ کے دفتر کو اور کچھ اور دوستوں کو بھی اس کی اطلاع ہو گئی تھی، اور جدہ کے احباب مخلصین حاجی محمد نور (حاجی محمد عبداللہ دلی) اور ان کے صاحبزادگان اور مولانا عبدالحفیظ صاحب مکی وغیرہ اس اندازہ کی بنا پر کہ رابطہ کا جلسہ شروع ہو چکا ہے ہم غالباً اسی طیارہ سے اتریں گے، ہوائی اڈہ پر آگئے تھے، رابطہ کی طرف سے بھی ایک صاحب آگئے تھے۔ ہمارے پاسپورٹ وغیرہ انھوں نے لے لیے اور کسٹم وغیرہ کی ضابطہ کی کارروائیوں سے وہ خود ہی نمٹ لیے اور ہم لوگ ہمیشہ کے معمول کے مطابق جدہ کی اپنی قیامگاہ بیت نور والی آگئے جس کو ہم لوگ "بیت الاولیاء" کہا کرتے ہیں — رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہوگی، سب سے پہلے وضو کرکے عشا کی نماز ادا کی — کھانا جہاز میں بمبئی سے جدہ تک تین دفعہ دیا گیا تھا اور ہر دفعہ کچھ نہ کچھ چکھا تھا اس لیے کھانے کا مسئلہ نہ تھا، نماز پڑھ کے بس سو گئے اور صبح کے لیے پروگرام یہ طے ہو گیا تھا کہ فجر کی نماز کے بعد — چائے پی کے سویرے ہی مکہ معظمہ روانہ ہو جائیں گے۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی اپنی اہلیہ کی طبیعت کے اچانک ناساز ہو جانے کی وجہ سے ہوائی اڈہ پر نہیں آسکے تھے وہ آخر شب میں مکہ معظمہ سے روانہ ہوکر فجر کے وقت جدہ آگئے پھر صبح چائے وغیرہ سے فارغ ہوکر ان کے ساتھ ہی مکہ معظمہ کو روانگی ہوئی تقریباً سوا گھنٹے میں پہونچ گئے، مسجد حرام حاضر ہوکر پہلے عمرہ کا طواف کیا، مقام ابراہیم پر رکعتین طواف ادا کرنے کے بعد ملتزم پر حاضر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ [illegible] کو بھی [illegible] نصیب فرمائے [illegible] اپنے [illegible]

یا احسان یا محبت وتعلق کے خاص حقوق ہیں اور جنھوں نے دعا کے لیے کہا تھا اُن سب کے لیے بھی دعا کی۔ بندہ بس مانگ ہی سکتا ہے اور مانگنے کی توفیق دینا بھی رب کریم کا کرم ہی ہے۔

ملتزم پر دعا کے بعد سعی کرنی تھی کہ مولانا عبداللہ عباس ندوی رابطہ کے امین عام شیخ صالح قزاز کا یہ پیام لائے کہ رابطہ کا اجلاس جو پرسوں پنجشنبہ کو شروع ہونے والا تھا اور کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے آج کے لیے ملتوی کر دینا پڑا تھا، اب وہ شروع ہونے والا ہے، اسمیں اسوقت آپ حضرات کی شرکت کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے اور انتظار ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ پہلے اجلاس میں شرکت کرلیں، سعی اس کے بعد کرلیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اجلاس ظہر کی اذان کے قریب تک جاری رہا، ہم لوگوں نے حرم شریف میں آکر ظہر کی نماز ادا کی، اس کے بعد سعی کی تینوں نے دہیں مردہ پر حلق کرایا اور عمرہ سے فارغ ہوئے۔

اُس دن سے رابطہ کے اجلاس برابر ہو رہے ہیں آج چھٹا دن ہے۔ کل جمعہ ہے جمعہ کو اجلاس نہیں ہوگا۔ اس دفعہ اجلاس میں ارکان کی حاضری زیادہ ہے۔ ۳۰ موجود ہیں۔ چند ہی ایں جو کسی معذوری اور مجبوری کی وجہ سے نہیں آسکے ہیں۔

شیخ محمد سرور الصبان مرحوم جو رابطہ عالم اسلامی کے گویا بانی اور روح رواں تھے اور وہی "امین عام" یعنی جنرل سکریٹری تھے اس سال ان کا انتقال ہوگیا، اُن کی جگہ نئے "امین عام" کا انتخاب اس اجلاس کا ایک اہم مسئلہ تھا، بالآخر شیخ صالح قزاز کا انتخاب ہوگیا جو نائب امین عام تھے اور شیخ محمد سرور الصبان کے انتقال کے بعد سے اُن کے قائم مقام کی حیثیت سے کام کر رہے تھے یہ اسم بامسمی بڑے صالح اور باخدا بزرگ ہیں۔ رابطہ کے صدر شروع سے مملکت سعودیہ عربیہ کے سابق مفتی اکبر شیخ محمد ابن ابراہیم تھے۔ وہ شیخ محمد سرور الصبان مرحوم سے بھی پہلے انتقال فرما چکے، اسی اجلاس میں اُن کی جگہ صدر کا انتخاب بھی ہونا ہے۔ شیخ ابن باز جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر ہیں اور جو مملکت کے علماء میں غالباً سب سے مؤقر شخصیت ہیں۔ انھوں نے انتخاب تک کے لیے عارضی صدارت قبول فرمائی تھی، پھر مجلس کی استدعا پر اس دورہ کی صدارت بھی قبول فرمائی وہی اجلاسوں کی صدارت فرما رہے ہیں۔ لیکن ان کا اصرار ہے کہ صدارت کے لیے کسی دوسرے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو زیادہ توجہ اور زیادہ وقت دے سکے۔ انھوں

خود ہی اس سلسلہ میں ایک تجویز بھی اجلاس میں پیش فرمائی ہے۔

چونکہ سفر رابطہ ہی کے سلسلہ سے ہوا ہے اور روزانہ اجلاسوں میں شرکت ہوتی ہے اس لیے اس کے اہم معاملات اور مسائل کا ذکر مناسب معلوم ہوا ۔ ورنہ یہاں کی خاص قابل ذکر چیز تو ہر طرف سے حجاج کرام کی آمد اور حرم شریف کا منظر ہے۔

پہلی دفعہ یہاں کی حاضری اب سے ۲۴ سال پہلے ۶۸ھ (۴۹ء) میں نصیب ہوئی تھی، اس وقت دوسرے ممالک سے آنے والے حجاج آخر وقت تک جتنے آتے تھے، میرا اندازہ ہے کہ اتنے یا اُس سے بھی زیادہ اب تک آچکے ہیں حالانکہ ابھی شوال کے دو عشرے بھی پورے نہیں ہوئے ہیں۔ مغرب اور عشا اور اسی طرح فجر کی نماز میں ترکوں کا بنایا ہوا قدیم حرم پورا بھر جاتا ہے اور غالباً اتنے ہی لوگ نئے حرم کے دالانوں میں نماز پڑھتے ہوں گے ۔ اور لوگوں نے بتایا کہ ابھی سے روزانہ ہزاروں کے اوسط سے باہر سے آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان سے ۱۵ ہزار کے قریب پہونچ چکے ہیں اور معلوم ہوا کہ ایک لاکھ کے قریب تک آنے کی توقع ہے۔ مصر سے بھی اس سال بہت بڑی تعداد میں آنے کی خبر ہے۔ ایک ترکی دوست بتاتے تھے کہ ہمارے ہاں سے ۶۰۔۶۵ ہزار کی آمد متوقع ہے۔ اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، انھیں نے بتایا کہ ترکوں کے قافلے کے قافلے ایران کے راستہ سے غیر قانونی طور پر بھی آرہے ہیں ۔۔۔ قدیم ترکی حرم میں جتنے لوگوں کی گنجائش تھی کہا جاتا ہے کہ جدید سعودی اضافہ کے بعد اُس سے آٹھ گنے زیادہ کی گنجائش ہوگئی ہے۔ لیکن اندازہ کیا جا رہا ہے کہ اس سال آنے والے حجاج کی تعداد اس گنجائش سے بھی بہت آگے بڑھ جائے گی۔

یہ دیکھ کر بڑا دکھ اور قلق ہوتا ہے کہ پورے عالم اسلامی سے آنے والے اس عظیم مجمع کی اصلاح و تربیت اور اس اجتماع سے خالص دینی فائدہ اٹھانے کا بھی کوئی خاص انتظام اور بند و بست نہیں ہے۔ جو لوگ یہ کام کر سکتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں میں فکر پیدا فرمائے اور توفیق دے۔

حرم شریف کی جو تعمیر شاہ سعود مرحوم کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی بلکہ ایک خاصی حد تک ہو چکی تھی الحمد للہ اب قریب قریب تکمیل کو پہونچ چکی ہے۔ اگرچہ اتنی وسیع وعظیم عمارت ہے کہ تعمیری کام کا کچھ نہ کچھ سلسلہ برابر جاری رہے گا اور اس کے لیے ایک مستقل عملہ بھی رہے گا لیکن بنیادی منصوبہ کے مطابق عمارت کی تکمیل ہو گئی ہے اور گزشتہ دو سالوں میں بہت بڑا کام یہ بھی ہوا ہے کہ قدیم ترکی حرم کو بڑی فنکاری کے ساتھ اس سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جب جدید حرم کی تعمیر شروع ہوئی تھی تو منصوبہ یہ تھا کہ اس کی تکمیل کے بعد ترکی حرم کو ختم کر دیا جائے گا لیکن بعد میں ماہر انجینیروں نے اس کی غیر معمولی مضبوطی کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی کہ اسے بحالہ باقی رکھا جائے۔

اب اس کو جس طرح جدید حرم سے جوڑا گیا ہے بلا شبہ فن کا کمال ہے۔ جن لوگوں نے مغرب ومشرق کی دنیا دیکھی ہے ان کا کہنا ہے کہ دنیا کی کسی قوم و امت کے پاس ایسی حسین وجمیل اور عظیم الشان عبادت گاہ نہیں ہے۔

فقہا کا اس مسئلہ میں اختلاف مشہور ہے کہ کوئی غیر مسلم حدود حرم میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ مغرب وعشا اور فجر کی جماعتوں کا جو منظر حرم شریف میں ہوتا ہے اس کو دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ سلیم الطبع غیر مسلموں کو بھی اس نظارہ کا موقع ملتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر قلب و روح بالکل مسخ نہ ہو چکے ہوں تو حرم شریف کی نمازوں کا منظر خاص کر موسم حج میں اس کے لیے کافی ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی کا دل مسلمان ہو جائے بلکہ اللہ والا بن جائے۔

حرم شریف کی خاص بلکہ خاص الخاص عبادت خانۂ کعبہ کا طواف ہے اس کا منظر بھی بڑا عجیب وغریب اور دلکش ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں جو کیف رکھا ہے اس کے بیان سے الفاظ کی دنیا عاجز ہے۔

اگرچہ اب سے ۶ مہینے پہلے بھی یہاں حاضری نصیب ہوئی تھی اور تقریباً دو ہفتے قیام رہا تھا لیکن وہ پورا وقت اس طرح گزرا کہ اپنی قیام گاہ مدرسہ صولتیہ اور قاری محمد سلیمان صاحب کے خلوہ سے بس حرم شریف آتا تھا اور وہیں واپس چلا جاتا تھا، اس لیے شہری ترقیوں کو دیکھنے کا گویا بالکل موقع نہیں ملا، اس دفعہ رابطہ کے اجلاس کی شرکت اور بعض دوسری ضرورتوں سے شہر کے بازاروں اور سڑکوں سے خوب گزرنا ہوا، دیکھا کہ دنیا کے بڑے ترقی یافتہ شہروں

کی طرح ہر طرف جدید طرز کی پانچ پانچ سات سات منزلہ عمارتیں کھڑی ہیں، اندازہ یہ ہے کہ شاید سال دو سال کے بعد پرانے طرز کی کوئی عمارت تلاش کرنے پر بھی نہیں دیکھی جا سکے گی۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس ترقی میں کتنا خیر ہے اور کتنا شر!

سڑکوں کی صفائی بلا شبہ بہت ہی قابل تحسین ہے خاص کر حرم شریف کے ارد گرد صفائی کا بڑا اہتمام ہے بعض اوقات دور تک نگاہ ڈالنے سے کاغذ کا کوئی پرزہ بھی سڑک پر نظر نہیں آتا۔

آج کل ہم لوگوں کا لگا بندھا پروگرام یہ ہے۔ رات کو یہاں کے ٹائم سے قریباً نو بجے یعنی صبح صادق سے دو ڈھائی گھنٹہ پہلے اٹھ جاتے ہیں کچھ نوافل قیام گاہ پر پڑھ کر حرم شریف حاضری ہو جاتی ہے۔ اذان سے پہلے پہلے کچھ طواف میسر ہو جاتے ہیں، والدین مرحومین کے علاوہ دوسرے مرحوم اقارب اور بعض جو اب بھی ہماری اس دنیا میں موجود ہیں اور ان کے خاص حقوق ہیں اسی طرح اپنے خاص محسنین و مخلصین کی طرف سے بھی طواف کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔

فجر کی نماز کے بعد میں اکثر قیام گاہ پر آجاتا ہوں۔ مولانا علی میاں زیادہ تر اشراق تک حرم شریف میں رہتے ہیں اس کے بعد قیام گاہ پر تشریف لاتے ہیں۔ ناشتہ اکثر مولانا عبداللہ عباس ندوی کے یہاں ہوتا ہے کبھی ہم لوگ وقت کی تنگی سے مجبور ہوتے ہیں تو ہوٹل ہی میں ناشتہ کر لیتے ہیں۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم لوگ رابطہ کے اجلاس کی شرکت کے لیے چلے جاتے ہیں وہاں سے واپسی ایسے وقت ہوتی ہے کہ حرم شریف میں ظہر کی نماز تیار ہوتی ہے۔ نماز ظہر سے فارغ ہو کر ہم لوگ قیام گاہ پر آجاتے ہیں۔ فندق شبرہ جس میں ہم لوگوں کا قیام ہے حرم شریف کے بالکل قریب ہے۔ یہاں کھانے کا معمول عام طور سے ظہر کے بعد ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر قیلولہ کرتے ہیں۔ یہاں چونکہ عصر کی نماز مثل ثانی کے بالکل شروع میں ہوتی ہے۔ اس لیے قیلولہ بس بقدر ضرورت ہی ہوتا ہے۔ عصر کے بعد رابطہ کی مختلف کمیٹیوں کے جلسے ہوتے ہیں۔ عصر کی نماز حرم شریف میں ادا کر کے وہاں چلا جانا ہوتا ہے وہاں سے واپسی کبھی مغرب کے وقت ہوتی ہے کسی دن عشاء کے وقت۔ عشاء کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر میں

ے گھر کے معمول کے مطابق جلدی سو جانے کی کوشش کرتا ہوں. اور مولانا علی میاں کے کثر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ ملنے والے آجاتے ہیں ان کی وجہ سے مولانا کو دیر تک جاگنا پڑتا ہے لوگ آدھی رات بلکہ اس کے بعد تک مجلسیں گرم رکھنے کے عادی ہیں اور پھر فجر کی نماز کے تین گھنٹے سو کر حساب پورا کرتے ہیں۔

یہاں موسم خلاف توقع ہے وہ ہے جو ہمارے ہاں اپریل میں ہوتا ہے. دن میں گرمی رہتی ہے نا خوشگوار بالکل نہیں۔ رات میں گرمی نہیں ہوتی لیکن سردی بھی نہیں ہوتی، رات کو کمرہ صرف بنیان پہن کے سونا ہوتا ہے۔ آج رات بھی پنکھا پلٹ پھر چلتا رہا، بہت ہی خوشگوار معتدل موسم ہے۔

یہاں کا خاص الخاص تحفہ دعا ہے۔ الحمد للہ اپنے تمام اہل تعلق کے لیے اس کا اہتمام ہے ہوتا ہے اللہ تعالےٰ قبولیت سے نوازے۔

"گزر چکی ہے یہ فصل بہار"

(صفحہ ۵۵ کا بقیہ)

ی زندگیوں کے بعض ایسے پہلو نظر کے سامنے آجاتے ہیں جس کی تاثیر سے بلاشبہ اپنے اندر بھی عمل ربہ ابھرتا ہے۔ ان کے یقین کے، توکل، آخرت کی کامیابی کی آرزو، خدا سے محبت کے واقعات پڑھ کی محبت اور آخرت کا یقین پیدا ہوتا ہے. ان کی جرأت، حق گوئی، اور احیائے سنت کے جذبہ کا مطالعہ کر کے مایوس کن حالات میں بھی اپنے میں کچھ کرنے کا شوق اور دلولہ پیدا ہوتا ہے۔ ان بادت و تقویٰ کے قصہ پڑھ کر دل میں عبادت و تقویٰ کا جوش موجزن ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ اس کی عملی زندگیوں میں جذب و انجذاب دونوں کیفیتیں ہیں۔ آج اس بات کی شدید ضرورت ہے ہ بگاہ دینی رسائل و مجلات بزرگان کرام کی عملی زندگیوں کے "قصہ پارینہ" کی بازخوانی کرتے ے تاکہ مایوس کن حالات میں بھی "یقین محکم" اور "عمل پیہم" کی شمع برابر روشن رہے۔

ف

اسلام کا عائلی نظام

غلط فہمیاں اور اُن کی حقیقت

(از مولانا برہان الدین سنبھلی)

(۲)

اسلام کا نظامِ وراثت

وراثت کے بنیادی اصول

دنیا کے بیشتر متمدن ملکوں کے دستوروں میں کچھ اصول ایسے غیر متبدل اور اٹل ہیں، کہ حالات میں کیسی ہی تبدیلی رونما ہو، مگر ان میں تغیر نہیں کیا جاتا، اور نہ کسی وقتی اور عارضی مصلحت سے انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہندوستان ہی کو لیجئے۔ یہاں کے موجودہ دستور میں "بنیادی حقوق" کی آزادی بطور ایک غیر متبدل اصول کے مان لی گئی ہے، اسلئے جب بھی کوئی قانون بنے گا، اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ وہ اس اصل سے متعارض نہ ہونے پائے (الا یہ کہ ترمیم کے ذریعہ اسی اصولی دفعہ کو ہی ختم کر دیا جائے) اور اگر کسی قانون سے یہ اصل متاثر ہوتی نظر آئے گی تو حق ہوگا کہ سپریم کورٹ سے اس قانون کو ہی منسوخ کروا دیا جائے (جیسا کہ ماضی قریب میں "پریوی پرس" کے بارے میں ہو بھی چکا ہے) بس سمجھنا چاہیئے بالکل اسی طرح — بلکہ اس سے بھی زیادہ مؤکد طریقہ پر۔ (کیونکہ شریعت کے کسی بھی جزو میں ترمیم و تنسیخ کا قطعی اختیار نہیں) شریعت کے قوانین میں بھی کچھ چیزیں "بنیادی اصول" کی حیثیت رکھتی ہیں، ان ہی میں نظامِ وراثت کا۔ ترکہ کے استحقاق میں۔ "اقربیت" والا اصول بھی ہے، جو بلا اختلاف تمام مکاتب

فقہ میں مسلّم ہے، یعنی مرنے والے کا ترکہ اصولاً اُس شخص (یا اُن اشخاص) کو ملے گا جو نسباً میت سے قریب تر ہو۔ اور یہ اصول براہِ راست، قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ماخوذ ہے۔ قرآن مجید میں ہے "للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منه او کثر"[1] اسی طرح حدیث صحیح میں ہے[2] "الحقوا الفرائض باهلها فما بقی فهو لاولی رجل ذکر"

شارع علیہ السلام نے صرف اس اصول کے بتا دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کی تفصیلات بھی بیان فرما دیں جو بالکل فطرتِ انسانی کے مطابق ہیں، یعنی اقرب و ابعد ہونے کا فیصلہ عموماً اس معیار پر کیا جو طبعی ہے، چنانچہ جو میت سے نسبی طور پر قریب ہے اُسے قریب قرار دیا، اور جو بعید ہے اُسے بعید! اور جن مواقع پر عقلِ انسانی قرب و بعد کا فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کرتی وہاں صراحت کر دی گئی کہ ان میں کون قریب ہے اور کون بعید، مثلاً متوفی کا باپ اور بیٹا کہ دونوں ہی نسبی طور پر بظاہر یکساں قرب رکھتے ہیں اس لیے عام انسان کے لیے فیصلہ کرنا دشوار ہوتا۔ (تفصیل کے لیے اس موضوع پر لکھی گئی کتابیں ملاحظہ کی جائیں)

اصول نمائندگی اسلام کی نظر میں: اس تفصیل کے سامنے آجانے کے بعد، "اصول نمائندگی" جسے اختیار کر لینے کے لیے آج کل بہت زور دیا جا رہا ہے تسلیم کر کے اور اسی کی روشنی میں ترکہ کی تقسیم کا قانون بنا دینے سے، مثلاً صلبی یعنی براہ راست اولاد کی موجودگی میں مرحوم بیٹوں کی اولاد کو بقدر حصہ پدر ترکہ ملنے کا قانون بن جانے سے، اسلام کے نظامِ وراثت کی مذکورہ بنیادی اصل قطعاً منہدم ہو جائے گی جو کسی طرح قابلِ تحمل اور گوارہ نہیں ہو سکتی کسی بھی اسلام دوست کے لیے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج تک اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہوا، دیکھیے مشہور محقق حنفی عالم ابوبکر الجصاص یوں نقل فرماتے ہیں:

ولم یختلف اهل العلم فی ان المراد بقوله تعالی (یوصیکم الله فی اولادکم) اولاد الصلب وان ولد الولد غیر داخل مع ولد الصلب وانه اذا لم یکن ولد الصلب فالمراد اولاد البنین دون اولاد البنات[3]

---

[1] سورۂ نساء آیت ۷۔ [2] بخاری ۲/۱۰۰۱، مسلم ۲/۳۴ [3] احکام القرآن للجصاص ۲/۸۰

علاوہ ازیں یہ کہ عقلاً بھی نمائندگی والا اصول صحیح نہیں ثابت کیا جا سکتا، کیونکہ بہرحال یہ امر سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ — وراثت کی بنیاد محض احتیاج و افلاس، یا اس جیسی کوئی اور وقتی و عارضی چیز نہیں ہے، ورنہ ہر ضرورتمند، یا کم سے کم ہر ضرورتمند رشتہ دار، اور پڑوسی زیادہ حقدار سمجھا جاتا، اقرب ترین خوشحال رشتہ داروں کے مقابلہ میں بھی۔ مگر سب جانتے ہیں کہ ایسا کوئی بھی درست نہیں سمجھتا، اس سے معلوم ہوا کہ وراثت میں رشتہ ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے نہ کہ کوئی دوسری چیز — اور یہ بات بھی عقلِ عام سے تعلق رکھنے والی ہے کہ مختلف مراتب کے اقرب و ابعد رشتہ داروں کی موجودگی میں ترجیح قریب تر ہی کو دی جائے۔ ورنہ تو حقیقی بیٹے کی موجودگی میں بھی بھائی کے لڑکے کو برابر ترکہ دینا بھی ضروری ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اسے کوئی ضروری نہیں کہتا، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حقیقی و صلبی بلا واسطہ اولاد کی موجودگی میں اس سے ابعد یعنی ایک واسطہ حائل ہونے کے بعد وجود میں آنے والی اولاد کو ترکہ میں برابر کا درجہ دیے جانے پر اصرار کیے جانا عقلمندی کی کون سی قسم ہے؟ رہا یہ کہنا کہ ایسی صورتوں میں عام طور پر یہ محروم الارث پوتا ضرورتمند اور مالی اعانت کا سب سے زیادہ مستحق بلکہ محتاج ہوتا ہے لہٰذا "انسانیت" اور "اخلاق" کا تقاضہ یہ ہونا چاہیے کہ اسے بھی ترکہ میں شریک کیا جائے۔ سو اس کا جواب اوپر کی سطروں میں گزر چکا ہے کہ ضرورت و افلاس پر ترکہ کی بنیاد نہیں ہے، ورنہ پھر اتنے ہی کیوں تمام ضرورتمندوں بالخصوص ایسے تمام رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو بھی دلوانا چاہیے، اس کے نتیجہ میں چاہے ترکہ کا مال پھیل کر ہر ایک کے حصے میں اتنی حقیر رقم ہی کیوں نہ آئے کہ ایک دن کی ضرورت کے لیے بھی وہ کسی کی کفایت نہ کر سکے!

محروم الارث پوتے پوتی کے نفقہ کی ذمہ داری کس پر؟

ترکہ سے محروم ہو جانے والے رشتہ داروں بالخصوص یتیم پوتے کو وراثت کا حصہ دار قرار نہ دینے سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قانون شریعت میں ان بچے کو یوں ہی بے یار و مددگار — ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجانے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ نہیں! ان کی

عه بنیادی طور پر وراثت کا استحقاق سبب و نسب سے ثابت ہوتا ہے جیسا کہ امام غزالیؒ نے بیان کیا ہے۔ التوارث اما بالسبب او نسب والسبب اما عام کجهة الاسلام فی صرف المیراث الی بیت المال واما خاص کالاعتاق ولا یورث به الا بالعصوبة او کالنکاح ولا یورث به الا بالفرضیة واما النسب فالقرابة الخ (الوجیز صفحہ ۲۶۰ ج ۱)

کفالت اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے لیے شریعت کے "باب نفقہ" میں بہت تفصیل کے ساتھ قانونی ہدایات موجود ہیں اور مختلف احوال میں حسبِ موقع (اگر بچہ مالدار نہیں ہے تو) مختلف افراد پر اس کے نفقہ کی ذمہ داری صرف اخلاقاً نہیں، بلکہ قانوناً ڈالی گئی ہے۔ مثلاً اکثر احوال میں ایسے نادار بچے کی کفالت اوّلاً دادا کے ذمہ (مقررہ اصول کی روشنی میں ہوتی) ہے[1]

مسلکِ احناف میں تو، اختلافِ دین کے باوجود یتیم پوتے کا نفقہ، دادا کے ذمہ ہے[2] بچے کی خوش حال والدہ موجود ہو اور دادا بھی تو اس کا نفقہ دونوں پر ہوگا۔ مگر دادا پر دو حصے والدہ پر ایک حصہ۔ جیسا کہ بدائع میں ہے:۔ ولو كان له ام وجد كانت النفقة عليهما اثلاثا، الثلث على الام والثلثان على الجد[3]

ماں اور دادا کے بعد چچا، اور دوسرے ان رشتہ داروں پر ذمہ داری (ترکہ کی نسبت کے بقدر) عائد ہوتی ہے، جو اس بچے کے شرعاً وارث ہیں[4]۔ یہاں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ محض اخلاقی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ قانوناً ان لوگوں پر نفقہ واجب ہے چنانچہ بصورتِ خلاف ورزی جبراً وصول کیا جا سکتا ہے۔ ہدایہ میں ہے:۔ ويجب ذلك على مقدار الميراث ويجبر عليه[5]۔ اور علمائے احناف نے تمام ورثہ پر (بقدرِ حصص) یتیم بچہ کے نفقہ کا وجوب براہ راست قرآن مجید (" وعلى الوارث مثل ذلك"[6]) سے اخذ کیا ہے، یہ تفسیر حضرات صحابہ و تابعین میں سے حضرت عمرؓ، زیدؓ بن ثابت، حسنؒ، ذویبؒ، عطاءؒ، قتادہؒ (رحمہم اللہ) سے مروی ہے، اور حبر الامۃ، مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آیت کی تفسیر میں منقول انما على الوارث لا يضارها) کا بھی امام ابوبکر الجصاص الحنفی نے یہ مطلب نکالا ہے کہ ابن عباسؓ کے نزدیک بھی نفقہ وارث کے ذمہ ہے۔[7]

اس بچہ کا اگر کوئی رشتہ دار نہ ہو یا ایسا کوئی نہیں کہ (جو بوجہ اپنے افلاس کے) اس یتیم کا بوجھ اٹھا سکے تو پھر حکومت پر ذمہ داری ڈالی جا سکتی ہے کہ وہ اس کا خرچ برداشت کرے، کیونکہ بعض شکلوں

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: فتح القدیر ۳/۲۰۱، زاد المعاد ۴/۱۴۴، المیزان للشعرانی ۲/۱۵۷، و دیگر کتب فقہ مثلاً شامی وغیرہ کا باب النفقات ص ۶۶۱/۲۲ [2] ہدایہ اولین ۴۲۶ [3] بدائع الصنائع ۴/۲۳ [4] ایضاً۔ [5] ہدایہ اولین ۴۲۷ [6] سورۂ بقرہ آیت ۲۳۳ [7] احکام القرآن للجصاص ۱/۴۰۶

میں باپ کی موجودگی میں بھی حکومت ذمہ دار ٹھہرائی جا سکتی ہے۔ اس وقت بطریق اولیٰ ذمہ دار بنائی جا سکے گی۔ مشہور فقیہ محقق ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:- ان یکونوا (ای الاولاد) فقراء وھم صغار او کبار عاجزون والاب ایضاً عاجز عن الکسب ... قیل نفقتھم فی بیت المال لان الاب اذا کان بھذہ الصفۃ فنفقتہ فی بیت المال[1] اس قاعدہ کی تائید ان صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے، جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (بحیثیت اسلامی ریاست کے سب سے بڑے ذمہ دار ہونے کے) فرمایا:- "من ترک مالا فلورثتہ و من ترک کلاً (ای العیال) وفی روایۃ فالینا۔ وفی روایۃ۔ فایکم ما ترک دینا او ضیاعا فانا مولاہ"[2]

یتیموں کی کفالت سے متعلق ان خاص احکام کے علاوہ عمومی نوعیت کی ہدایات الگ ہیں جن میں تمام مسلمانوں پر بحیثیت مجموعی ان کی دیکھ بھال کا فریضہ عائد کیا گیا ہے، اس قدر قوت کے ساتھ اس طرف توجہ دلائی گئی کہ اگر اسلام کا نام لینے والوں میں دینی شعور تھوڑا سا بھی ہو تو یتیموں کی طرف سے غفلت نہیں برت سکتے، اور ان کی کوئی ضرورت پوری ہونے سے نہیں رہ سکتی۔ اس بارے میں قرآن مجید کے اندر کوئی دس سے زیادہ آیتیں ہیں اور ایسی احادیث کا تو شمار ہی مشکل ہے۔ یقیناً اسی کا ثمرہ ہے کہ مسلمانوں کی قابلِ لحاظ آبادی والا شاید ہی کوئی اہم شہر یا قصبہ ایسا نکلے کہ جس میں یتیموں کی تربیت اور ان کی ضروریات کے لیے کوئی ادارہ یا وقف نہ ہو۔

مزید برآں یہ کہ مالِ غنیمت اور مالِ فَی دونوں میں ان کا بھی حصہ رکھا گیا ہے اور اہمیت جتانے کیلیے دیگر تمام عمومی مصارف سے پہلے ان کے حصہ کو ذکر کیا گیا ہے[3]

خلاصۂ کلام یہ کہ شریعت نے قانوناً اس بچّہ کی پرورش کی ذمہ داری بہرحال کسی نہ کسی پر ڈالی ہے، اور اسے یونہی بے مہار نہیں چھوڑ دیا ہے لیکن جن لوگوں کی نظر اسلام کے وسیع ترین اور ہر شعبۂ زندگی کو حاوی قوانین پر نہیں ہو بلکہ وہ اسے صرف چند عبادات بلکہ "رسومات" اور جاگیردارانہ قوانین کا مجموعہ سمجھتے ہیں، وہ "محجوب الارث پوتے" کے معاملہ کو اچھال کر شریعت پر زبانِ طعن دراز کرنے لگتے ہیں مگر اپنی کوتاہ نظری کا ماتم نہیں کرتے۔ یا للعجب!

غیر وارث پوتوں کے لیے وصیت کی راہ | ان امور کے علاوہ ایسے بچوں کو "مالی منفعت" پہونچانے کی ایک اور شاہراہ کھلی ہوئی ہے وہ ہے "وصیت کی مشروعیت" — جو ترکہ پانے والوں کے لیے بند

---

[1] فتح ۲/۳۱۰۔ [2] صحیح مسلم ۲/۳۴، ۳۶ [3] سورہ انفال آیت ۴۱ و سورہ حشر آیت ۷

ہے، اس طرح بسا اوقات وصیت کے ذریعہ غیر وارث کو ترکہ کی مقدار سے بھی زیادہ مال دیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ ترکہ کے نظام کی مشروعیت کے بعد وصیت ضروری تو نہیں رہی مگر غیر وارث رشتہ داروں کے لیے باتفاق علماء و فقہاء۔ اس کا استحباب اب بھی باقی ہے۔ امام شعرانیؒ فرماتے ہیں:۔ اجمعوا علی ان الوصیۃ مستحبۃ"[1] بلکہ متعدد علماء کے نزدیک جن میں بعض صحابہ بھی ہیں۔ (غیر وارث کے لیے) وصیت کرنا اب بھی واجب ہے۔ ان علماء کے نزدیک آیتِ وصیت (کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ الخ[2]) ایک اعتبار سے (یعنی ورثہ کے لیے) منسوخ ہے اور ایک حیثیت سے (یعنی غیر وارث کے لیے) غیر منسوخ، علامہ بدرالدین عینیؒ شارح بخاری تحریر فرماتے ہیں:۔

"ومنھم من قال انھا منسوخۃ فیمن یرث، ثابتۃ فیمن لا یرث وھو مذھب ابن عباس، وحسن، ومسروق، والضحاک، ومسلم بن یسار، والعلاء بن زیاد، قال ابن کثیر وبہ قال ایضاً سعید بن جبیر والربیع بن انس ومقاتل بن حیان[3]"

بدرجۂ مجبوری۔ یعنی یتیم بچے کی پرورش اور کفالت کا جب دوسرا کوئی بندوبست نہ ہو، اس وقت ــــ ان علماء کا قول بمشورۂ علماء اختیار کرتے ہوئے، دادا پر وصیت کرنا ضروری قرار دیا جاسکتا ہے، اور اس حالت میں اگر دادا وصیت کیے بغیر مرجائے تو اس کے ترکہ سے بقدر وصیت، مال دلوایا جاسکتا ہے (ظاہریہ کے مسلک کے مطابق) اصحاب ظواہر کے امام ابن حزمؒ کے یہاں چونکہ وصیت واجب ہے، اس لیے ان کے نزدیک وصیت کیے بغیر وفات پا جانے کی حالت میں بھی میت کے مال سے اتنی مقدار ــــ جس کا تعین اب ورثہ یا وصی کے مشورہ سے ہوگا ــــ محجوب الارث قریب کو دلوائی جائے گی۔ جیسا کہ معجم فقہ ابن حزم الظاہری (جسے لجنۃ موسوعۃ الفقہ الاسلامی" دمشق نے ترتیب دیا ہے) میں "المحلیٰ" کے حوالے سے ــــ محجوب الارث، قرابت دار کے لیے وصیت کرنے نہ کرنے کی صورت کا حکم بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:۔

---

[1] المیزان، ۲/۱۱۹، مزید تفصیل متعلقہ کتابوں میں موجود ہے مثلاً دیکھئے:۔ درمنثور ص ۱۲۳/ج ۲، تفسیر مظہری ص ۱۷۶/ج ۲، احکام القرآن للجصاص ص ۲۰۳/ج ۱، ۲۷۱۔ [2] سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۸۰، [3] عمدۃ القاری، ۲/۶، ۴

فرض علی کل مسلمٍ ان یوصی لقرابتہ الذین لایرثون، إما الرق وإما الکفر، واما لان ھنالک من یحجبھم عن المیراث، أو لانھم لایرثون، فیوصی لھم بما طابت بہ نفسہ، فان لم یفعل اعطوا ولابد ما رأہ الورثۃ او الوصی۔ فان کان والداہ اواحدھما علی الکفر او مملوکاً ففرض علیہ ان یوصی لھما او لاحدھما ان لم یکن الآخر کذالکؐ فان لم یفعل، اعطی او اعطیا من المال ولابد۔[۱]

عورت اور مرد کے حصہ میں فرق اور اس کا سبب!

شرعی ترکہ کے اصول میں جس طرح "اقربیت" اہم اصل ہے اسی طرح مرد کو عورت سے دوگنا حصہ ملنا بھی بنیادی اصول ہے، اور پہلے کی طرح یہ بھی قیاس سے ثابت شدہ یا اختلافی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید میں منصوص ہے۔ "للذکر مثل حظ الانثیین"[۲]

آج کل چونکہ عورت و مرد کے درمیان مساوات کا نعرہ بہت زور سے لگایا جا رہا ہے، اس لیے ان نعرہ بازوں کو اس حکم میں بھی عدم مساوات نظر آئی، بس پھر کیا تھا، کہنا شروع کردیا کہ "یہ قانونِ وراثت سراسر "ظلم" پر مبنی ہے، لہٰذا اسے تبدیل کرنا چاہیے۔

اس سے قبل ___ تعدد ازدواج کی بحث میں ___ اس "نعرہ" کی حقیقت اور "ظلم" کے الزام کو بے نقاب کیا جا چکا ہے اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، صرف اتنا اضافہ شاید بے محل نہ ہو کہ اس اعتراض کا بھی اصل سبب وہی ہے جو وہاں بیان ہوا یعنی اسلامی قوانین کے تمام پہلو ان لوگوں کے سامنے نہیں، ورنہ انھیں معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ عورت کو ترکہ کی جو مقدار بھی مل رہی ہے وہ کبھی کبھی ہنگامی ضرورتوں میں کام آجاتی ہے ورنہ اس وقت دلجوئی کے لیے ہے اور اکثر اس کے "بینک بیلنس" بڑھانے ہی کا سبب بنتی ہے، کیونکہ عورت کے سامنے بعض استثنائی و مجبوری کی حالتوں کو چھوڑ کر ___ عموماً کوئی بھی مرحلہ ایسا نہیں آتا کہ اس پر کسی نفقہ کی[۳] حتیٰ کہ خود اس کے اپنے نفقہ کی بھی ___ ذمہ داری شرعاً عائد ہو جاتی ہو۔ کیونکہ

---

[۱] معجم فقہ ابن حزم الظاہری، ۲/۱۰۸۲ [۲] سورہ نساء آیت ۱۱ [۳] عورت کو نصف ترکہ ملنے کی حکمتوں کا تفصیلی بیان، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے دیکھئے حجۃ اللہ البالغہ جزو ثانی (مکتبہ رشیدیہ دہلی)

ادی سے قبل والد پر، شادی کے بعد شوہر پر، طلاق یا شوہر کی وفات کے بعد، باپ یا دوسرے
رعی رشتہ داروں پر۔ اس کا نفقہ ہوتا ہے، اور یہ امر مستزاد ہے کہ وہ نکاح کرے تو شوہر سے مہر
ی لینے کی حقدار ہے اور مہر شوہر کے ذمہ لازم، یہ ہی اپنی جہالت یا رعایت سے نہ لے تو اور بات ہو،
نہ کوئی نکاح بغیر مہر کے رہ ہی نہیں سکتا۔ مزید یہ کہ وہ شوہر کی وفات پر اس کا ترکہ پانے کی بھی
تحق ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف مرد کی حالت یہ ہے کہ وہ بلوغ اور کسب معاش کی قدرت آنے
ے ساتھ ہی، صرف اپنی ہی نہیں، دوسروں (مثلاً اولاد، بیوی، بعض صورتوں میں والدین،
ر دیگر اقارب) کی حوائج کا پورا کرنا بھی اس کے ذمہ ہو جاتا ہے، اور شادی کر لینے کے بعد، نہ صرف
لہ بیوی کے تمام اخراجات ہی اس کے ذمہ۔ بلا شرکت غیرے۔ ہوتے ہیں بلکہ مہر کی رقم کا۔ جو
ز خطیر ہوتی ہے۔ دینا بھی اس پر ضروری (قانون شرعی کے اصل تقاضہ کے مطابق) ہوتا ہے،
ن پہلوؤں کے سامنے آجانے کے بعد، عورت کو اگر چوتھائی حصہ بھی ملا کرتا، تب بھی شاید ظلم کا
للاق درست نہ ہوتا۔ ع۱

یہاں شیخ علی الصابونی کی بیان کردہ تمثیل کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، کہ "مثلاً ایک
شخص نے وفات کے بعد صرف، ایک لڑکا، اور ایک لڑکی وارث چھوڑے، اور تین ہزار کا ترکہ۔
شرعاً لڑکے کو دو ہزار، اور لڑکی کو ایک ہزار ترکہ سے ملے۔ لڑکے نے ع۲ شادی کی اور بیوی کا مہر
دو ہزار مقرر کیا، موجودہ حالات میں یہ مقدار زیادہ نہیں ہے جو اسے دینا پڑا، اس کے برخلاف
لڑکی نے شادی کی، اس کا بھی مہر دو ہزار ہی مقرر ہوا، اور وہ اسے ملا، اس طرح لڑکی کے پاس
ترکہ اور مہر کی رقم ملا کر) تین ہزار ہو گئے، اور لڑکے کے پاس جو کچھ تھا وہ مہر میں چلا گیا، اور یہ خالی
ہاتھ رہ گیا"۔ اب سوچئے کہ نتیجہ میں کس کے پاس رقم زیادہ رہی۔

ع۱ دورِ جاہلیت میں عرب اسی منطق کی رو سے عورتوں کو بالکل ترکہ نہیں دیتے تھے۔ اور اس "ترقی یافتہ زمانہ" میں
بھی بہت سی قوموں اور ملکوں، مثلاً ہندوؤں اور انگریزوں میں عورتوں کو جائداد کا ترکہ نہیں دیا جاتا۔

ع۲ یہاں یہ بات ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اسلامی قانون کی رو سے شادی کے وقت لڑکی کا کوئی خرچ ضروری
ہے ہی نہیں، نہ جہیز، نہ تلک، نہ اور کسی طرح کا بار۔ اسے بدقسمتی کہیے یا کچھ اور کہ ہم نے خود کو غیر شرعی رسوم کا پابند
کرکے اور دوسروں کی نقل کرکے مصیبت میں مبتلا کر لیا ہے۔ خود کردہ را علاجے نیست۔

یہاں یہ سوال پیدا کرنا بڑی حماقت ہوگی کہ اس مثال سے تو لڑکے پر ظلم ثابت ہوتا ہے۔ (اور ظلم خواہ کسی پر ہو، لڑکی یا لڑکے پر، اسے ختم ہونا چاہیے)۔ کیونکہ مرد کو اللہ تعالیٰ نے کسبِ معاش کی صلاحیت عطا فرمائی ہے، اور اصلاً کسب کی استعداد اسی میں رکھی ہے اس لیے یہ صلاحیت و استعداد ہی حقیقۃً تمام اخراجات اور مالی ذمہ داریوں کا بدل، بلکہ نعم البدل ہے، کہ اس کے سامنے بڑی سے بڑی رقم، اور صرف ہوجانے والے مال کی ہر مقدار حقیر ہے۔ اس کے برخلاف، عورت کو اللہ تعالیٰ نے گھر کی منتظم اور زینت بنایا ہے، جو بازاروں اور کارخانوں میں قوت آزمائی کرنے اور اکتسابی مشقت کے میدانوں میں دوڑ لگانے کی استعداد سے پیدائشی طور پر خالی رکھی گئی ہے۔ مگر تہذیبِ نو نے اس پر یہ ظلم ڈھایا کہ اسے "برابری" کا پُرفریب تخیل دے کر، قدرتی صلاحیتوں کو نظر انداز کرکے میدانِ عمل میں مصیبتیں جھیلنے کے لیے لا کھڑا کیا، پھر بھی اسے ظلم نہیں بلکہ "ترقی" کہا جا رہا ہے ——— بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔

فہرست مآخذ

۱۔ قرآن مجید

۲۔ الجامع الصحیح (بخاری شریف) امام ابوعبداللہ محمد ابن اسمٰعیل البخاری

۳۔ صحیح مسلم۔ حافظ مسلم بن الحجاج القشیری

۴۔ سنن ابوداؤد۔ ابوداؤد سلیمان ابن الاشعث السجستانی

۵۔ سنن دارقطنی۔ ابوالحسن علی بن عمر الدارقطنی

۶۔ مشکوٰۃ المصابیح۔ محی السنۃ ابومحمد ابن مسعود البغوی و شیخ ولی الدین محمد خطیب

۷۔ زاد المعاد۔ حافظ شمس الدین ابن القیم الجوزی

۸۔ فتح الباری۔ حافظ ابن حجر عسقلانی

۹۔ عمدۃ القاری۔ علامہ بدرالدین عینی

۱۰۔ اعلام الموقعین حافظ شمس الدین ابن القیم الجوزی

۱۱۔ شرح مسلم۔ محی الدین نووی

۱۲۔ احکام القرآن۔ ابوبکر الجصاص الرازی

۱۳۔ احکام القرآن۔ قاضی محمد ابوبکر ابن العربی

۱۴۔ تفسیر کبیر امام فخرالدین رازی

۱۵۔ تفسیر قرآن العظیم۔ حافظ عمادالدین ابن کثیر

۱۶۔ درمنثور۔ حافظ جلال الدین سیوطی

۱۷۔ روح المعانی علامہ محمود آلوسی

۱۸۔ تفسیر مظہری۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی

۱۹۔ بیان القرآن۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

۲۰۔ فوائد قرآن۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

۲۱۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

۲۲۔ ہدایہ۔ برہان الدین علی بن ابی بکر مرغینانی

۲۳۔ المیزان الکبریٰ۔ امام عبدالوہاب شعرانی

۲۴۔ الوجیز۔ امام ابو حامد الغزالی

۲۵۔ الکافی۔ ابن قدامۃ الحنبلی

۲۶۔ فتح القدیر۔ کمال الدین ابن الہمام

۲۷۔ بدائع الصنائع۔ علاء الدین کاسانی

۲۸۔ بنایہ۔ علامہ بدرالدین عینی

۲۹۔ بحرالرائق۔ ابن نجیم مصری

۳۰۔ الاتحاف بترتیب الاشباہ والنظائر۔ ابن نجیم مصری (یعنی اشباہ کے مولف، نہ "اتحاف" کے)

۳۱۔ الموافقات۔ امام شاطبی

۳۲۔ درمختار۔ علاء الدین حصکفی

۳۳۔ ردالمحتار۔ علامہ ابن عابدین شامی

۳۴۔ نورالانوار۔ ملا احمد جیون امیٹھوی

۳۵۔ معجم فقہ ابن حزم الظاہری۔ لجنۃ موسوعۃ الفقہ الاسلامی

۳۶۔ المواریث فی الشریعۃ الاسلامیہ۔ محمد علی الصابونی

۳۷۔ حیلہ ناجزہ۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ



جرح وتعدیل

(۴)

(مولانا مفتی محمد رضا انصاری)
استاد شعبۂ سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جرح اور تعدیل کن کن الفاظ سے کی جاتی ہے اور ان الفاظ کی درجہ بندی

علامہ ذہبی نے "میزان الاعتدال" کے دیباچے میں لکھا ہے۔ "میں نے اس کتاب میں ان راویوں کا ذکر نہیں کیا ہے جن کے بارے میں اس قسم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:۔

(۱) محلہ الصدق (اس راوی کا مقام سچائی ہے)، (۲) "لا بأس به" (اس راوی میں کوئی کھٹکے کی بات نہیں ہے)، (۳) صالح الحدیث (یہ راوی ٹھیک حدیث والا ہے)، (۴) یُکتب حدیثہ (اس راوی کی حدیث لکھ لی جاتی ہے)، (۵) ھو شیخ (یہ راوی سن رسیدہ ہے)۔ کیوں کہ یہ سب الفاظ اور اس سے ملتے جلتے الفاظ راوی میں عام طور پر کمزوری نہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

مقبول اور معتبر راویوں کے حق میں تعدیل کے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں اُن میں سب سے اعلیٰ درجے کے الفاظ یہ ہیں:۔ (۱) ثبتٌ حجۃٌ (پکا مستند)، (۲) ثبتٌ حافظٌ (پکا حافظے والا) (۳) ثقۃٌ مُتقِنٌ (معتبر با فہم وشعور) (۴) ثقۃٌ ثم ثقۃٌ (معتبر پھر معتبر)

(ب) حسب ذیل الفاظ کا درجہ ان کے بعد ہے:۔ (۱) صدوقٌ (سچا)، (۲) لا بأس به

(اس سے کوئی کھٹکا نہیں) (۳) ولیس بہ بأس (کوئی اندیشہ کی بات نہیں)

(ج) ان الفاظ کا درجہ تیسرا ہے :- (۱) محلّہ الصدق (اس کا مقام سچائی ہے) (۲) جید الحدیث (اچھی حدیث والا) (۳) صالح الحدیث (ٹھیک حدیث والا) (۴) شیخٌ وَسَطٌ (درمیانی قسم کا بزرگ) (۵) شیخ حَسَنُ الحدیث (ٹھیک حدیث روایت کرنے والا) (۶) صدوق ان شاء اللہ (انشاء اللہ سچا ہی ہے) (۷) صُوَیلح (ٹھیک ہی ٹھاک ہے) وغیرہ۔

تشریحات از شیخ عبدالفتاح۔ (الف) "سخاوی نے شرح الفیہ میں لکھا ہے "ثَبْتٌ (حرف با ساکن) کے معنی قلب، زبان اور تحریر کا مضبوط آدمی، حجت (سند) کے ہم معنی ہوتا ہے، ثَبَتٌ (حرف با مفتوح) کے معنی ہیں کہ محدث اپنی سنی ہوئی حدیثوں کو جب کتاب میں ثبت کرتا ہے اور ان حضرات کے نام بھی لکھ دیتا ہے جو سماعتِ حدیث میں اس کے ساتھی تھے تو گویا وہ دوسرے کے لیے حجت (سند) ہو جاتا ہے، خود اپنی سنی ہوئی حدیثوں کے سلسلے میں بھی اور دوسرے مشارکین فی السماع کی حدیثوں کی روایت میں بھی۔"

(ب) متروک (ترک کیا ہوا) اور متروک الحدیث (جس کی روایت کردہ حدیث قبول نہ کی گئی ہو) مرادف ہیں۔ ابن المہدی کا کہنا ہے کہ "شعبہ سے پوچھا گیا وہ کون لوگ ہیں جن کی بیان کردہ حدیثیں قبول نہیں کی جاتیں؟ انھوں نے جواب دیا "جس پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا گیا ہے اور جو بکثرت غلطیاں کرتا ہے۔ اور جو ایسی حدیث میں غلطی کرتا ہے جس حدیث پر سب کا اتفاق ہے، پھر اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا ہے اور اسی غلطی پر قائم رہتا ہے۔ اور وہ راوی جو جانے بوجھے (معروف) راویوں سے ایسی روایتیں کرتا ہے جن سے واقف کار لوگ ناواقف ہیں۔" احمد بن صالح کا کہنا ہے "راوی اس وقت تک متروک نہیں قرار دیا جاتا جب تک اُس کے ترک پر سب کا (علمائے فن کا) اتفاق نہ ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ علمائے فن کے اس کہنے میں کہ "فلاں راوی کمزور ہے" اور اس کہنے میں کہ "فلاں راوی متروک ہے"۔ فرق ہے۔ (از شرح الفیہ للسخاوی)

(ج) سکتوا عنہ (اس راوی کے بارے میں سب چپ سادھے ہوئے ہیں) اور فیہ نظر (اس کے بارے میں کچھ شک ہے) یہاں (میزان الاعتدال میں) جرح کے تیسرے درجے کے الفاظ ہیں۔ علامہ عراقی نے ان دونوں الفاظ کو اپنی تقسیم میں (جس کی تفصیل آگے متن میں آئے گی) دوسرے درجے کے الفاظ جرح میں شمار کیا ہے۔ میزان الاعتدال کے مصنف علامہ ذہبی نیز علامہ عراقی دونوں نے مذکورہ دونوں الفاظ کو .... (باقی اگلے صفحہ پر)

جرح کے سلسلے میں بدترین الفاظ اس طرح استعمال کیے جاتے ہیں :- (۱) دجّالٌ (مکار) (۲) کذّابٌ (بڑا جھوٹا) (۳) وضّاعٌ (اپنے دل سے گڑھنے والا) (۴) یضع الحدیث (حدیث گڑھا کرتا ہے) (یہ درجۂ اول ہوا)

(ب) پھران الفاظ کا درجہ ہے :- (۱) متّھمٌ بالکذب (جھوٹ بولنے کا الزام لگ چکا ہے) (۲) متفقٌ ترکہ (اس سے روایت نہ کرنے پر سب ایک رائے ہیں) (یہ درجۂ دوم ہوا)

(بقیہ تشریح صفحۂ گزشتہ) درجۂ سوم یا درجۂ دوم میں جگہ دینے میں صرف امام بخاری کی اصطلاح کی پیروی کی ہے، علامہ سخاوی نے شرح الفیہ میں لکھا ہے۔ "عموماً امام بخاری ان دونوں لفظوں کا استعمال ان لوگوں کے لیے کرتے تھے جن سے لوگوں نے روایت کرنا ترک کر دیا ہے، ابن کثیر کا تو یہ تک کہنا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک یہ دونوں الفاظ جرح کے بدترین الفاظ ہیں میں (یعنی سخاوی) کہتا ہوں۔" امام بخاری اپنی انتہائی پرہیزگاری کے پیش نظر بہت کم کسی راوی کے بارے میں کذاب یا وضاع کے الفاظ (جو جرح کے بدترین الفاظ ہیں) استعمال کرتے تھے۔ ہاں! کبھی کبھی یہ کہہ جاتے تھے کہ "فلاں نے اس کو جھوٹا قرار دیا ہے" یا "فلاں نے اس راوی پر کذب کا الزام لگایا ہے"۔ تو ان دونوں لفظوں کو درجۂ سوم یا دوم میں داخل کرنا صرف امام بخاری کے اعتبار سے ہے، دوسرے بھی ایسا کر سکتے ہیں ورنہ اصل یہ ہے کہ ان دونوں لفظوں کا درجہ بعد میں آتا ہے"۔ یعنی امام بخاری کے نزدیک یہ دونوں الفاظ بدترین الفاظ جرح ہیں۔ مگر دوسروں کے نزدیک ان دونوں کا درجہ چھٹا ہے۔ جیسا کہ علامہ سخاوی نے شرح الفیہ میں صراحت کی ہے۔ اور مولانا عبدالحیؒ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ ۱۲

(۵) جرح کا جملہ تَعرِفُ وَتُنکِر (کبھی ایسی کبھی ویسی کہنے والا راوی) دوسری طرح سے بھی کتابوں میں ملتا ہے یعنی یُعرَفُ ویُنکَرُ۔ اس کے معنی ایک ہی طرح سے کیے گئے ہیں "کبھی جانی پہچانی حدیثیں بیان کرتا ہے اور کبھی نئی نرالی"۔ تو ایسے راوی کی حدیثوں کو کسوٹی پر کسنے اور واقف کاروں سے ان کے بارے میں پوچھنے کی حاجت پڑتی ہے۔

"یُعرف ویُنکر" مولانا عبدالحیؒ نے یہاں بھی استعمال کیا ہے اور عراقی کی تقسیم کا، نیز سخاوی اور سندھی کی تقسیم کا جہاں یہاں ذکر کیا ہے وہاں بھی اسی طرح استعمال کیا ہے۔ اور اسی طرح علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال کے دیباچے میں، علامہ ابن حجر نے "لسان المیزان" میں، صنعانی نے توضیح الافکار میں۔۔۔۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

(ج) ان کے بعد یہ الفاظ ہیں :- (۱) متروك (ترک کیا ہوا) (۲) لیس بثقة (اعتبار کے قابل نہیں ہے) (۳) سکتوا عنه (اس کے بارے میں سب چپ سادھے ہیں) (۴) ذاهب الحديث (حدیث میں گیا گزرا) (۵) فیه نظر (اس کے بارے میں شک ہے) (۶) هالكٌ (لے ڈوبنے والا)۔ (۷) ساقطٌ (خارج از بحث) (یہ درجہ سوم ہوا)

(د) پھر ان الفاظ کا درجہ ہے :- (۱) واهٍ بمرةٍ (ایک طرح کا فضول گو) (۲) لیس بشئ (کسی لائق نہیں) (۳) ضعیفٌ جداً (بہت زیادہ کمزور) (۴) ضعّفوه (لوگوں نے اسے کمزور ٹھرایا ہے) (۵) ضعیفٌ واهٍ (کمزور، فضول گو) وغیرہ (یہ درجہ چہارم ہوا)

(س) اس کے بعد درجہ ہے ان الفاظ کا :- (۱) یضعّف (کمزور مانا جاتا ہے) (۲) فیه ضعف

(بقیہ تشریحات صفحہ گزشتہ) ملا علی قاری نے شرح نخبۃ الفکر میں اور عبداللہ عدوی نے شرح نخبۃ الفکر پر اپنے حاشیہ میں یعرف و ینکر استعمال کیا ہے۔

تعرف و تنکر کا جملہ الفیۂ عراقی کے متن اور اس کی شرح مطبوعۂ مصر نیز مطبوعۂ فاس، اور قاضی زکریا کی شرح الفیہ مطبوعۂ فاس میں، مقدمۂ ابن صلاح پر حاشیۂ عراقی میں، سخاوی کی شرح الفیہ میں علامۂ ذہبی سے منقول اقتباس میں اور علامہ سیوطی کی تدریب الراوی کے دونوں ایڈیشنوں (مکتبۂ خیریہ و مکتبۂ علمیہ) میں ہے۔

تعرف و تنکر کے جملے کو ترجیح اور فضیلت جن وجوہ کی بنا پر حاصل ہوتی ہے ان میں سے خاص وجہ یہ ہے کہ بعینہ یہی جملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوا ہے حضرت حذیفہؓ سے امام بخاری نے اپنی صحیح میں ... (باب علامات النبوۃ و کتاب الفتن) اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں (کتاب الامارۃ) جو حدیث روایت کی ہے اسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "قوم يستنون بغير سنتي ويهدون بغير هديي تعرف منهم وتنكر" اور امام مسلم نے اپنی کتاب صحیح مسلم میں (کتاب الامارہ) ابو داؤد نے اپنی کتاب سنن ابی داؤد میں (کتاب السنۃ) اور ترمذی نے اپنی کتاب جامع ترمذی میں (کتاب الفتن) حضرت بی بی ام سلمہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے "انه يستعمل عليكم امراء فتعرفون و تنكرون" شارحین حدیث نے اس جملے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ ان امراء کے بعض اعمال کو شریعت کے مطابق ہونے کی بنا پر تم لوگ اچھا سمجھو گے اور بعض اعمال کو برا سمجھو گے اس لیے کہ وہ مخالف شرع ہوں گے' بالکل یہی مفہوم محدثین کا ہوتا ہے جب وہ کسی کے بارے میں تعرف و تنکر کا جملہ استعمال کرتے ہیں' ۱۲ (شیخ ابو غدہ کی تشریحات کا سلسلہ ختم)

(اس میں کمزوری ہے)، (۳) لیس بالقوی (مضبوط راوی نہیں ہے)، (۴) لیس بحجۃ (قابل سند نہیں ہے (۵) لیس بذاك (اس فن کے لائق راوی نہیں ہے)، (۶) و یعرف و ینکر (کبھی ایسی کبھی ویسی کہنے والا)، (۷) فیہ مقال (اس کے بارے میں کچھ کہنے کی گنجائش ہے)، (۸) تُکلّم فیہ (اس کے بارے کہا گیا ہے)، (۹) لیّنٌ (ڈھیلا ڈھالا)، (۱۰) سیّئ الحفظ (یادداشت میں خراب)، (۱۱) لا یحتج بہ (اس کو سند میں پیش نہیں کیا جاتا)، (۱۲) اختلف فیہ (اس کے بارے میں مختلف رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔)

(۱۳) صدوق لکنہ مبتدع (سچا مگر بدعت کا مرتکب)۔ (یہ درجہ پنجم ہوا)

اسی طرح کے وہ تمام دوسرے الفاظ جو راوی کی براہ راست دروغ گوئی پر یا اس کے ضعف پر یا اس کے بارے میں اظہار رائے میں توقف پر یا اس کی بیان کردہ حدیث سے سند نہ لینے پر اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے دلالت کرتے ہیں۔ (میزان الاعتدال کا اقتباس ختم)

علامہ عراقی نے شرح الفیہ میں لکھا ہے "تعدیل کے مراتب چار یا پانچ ہیں" جو حسب ذیل ہیں۔

پہلا مرتبہ:۔ (جو تعدیل کا اعلیٰ ترین درجہ ہے اس اعلیٰ ترین مرتبہ کا ذکر نہ ابن ابی حاتم نے کیا ہے اور نہ ابن صلاح نے)، جب توثیق کے الفاظ کو مکرر کہا جائے خواہ توثیق کے الفاظ مختلف ہوں جیسے ثبتٌ حجۃٌ یا ثبتٌ حافظٌ، یا ثبتٌ متقنٌ، یا ثقۃٌ ثبتٌ وغیرہ۔ خواہ ایک ہی لفظ کو مکرر کہا گیا ہو جیسے ثقۃٌ ثقۃٌ وغیرہ

دوسرا مرتبہ:۔ (جسے ابن ابی حاتم اور ابن صلاح نے "پہلا مرتبہ" قرار دیا ہے) ابن ابی حاتم کا کہنا ہے "جرح اور تعدیل کے الفاظ مختلف درجے کے میں نے پائے ہیں، تو اگر کسی کے بارے میں کہا جائے کہ وہ ثقہ ہے یا متقن ہے تو وہ ایسا راوی ہوگا جس کی روایت کو سند مانا جائے گا۔"

ابن صلاح کا کہنا ہے "اسی طرح کسی راوی کی تعدیل میں اگر کہا جائے کہ وہ ضابط یا حافظ ہے (تو اس کی روایت کو بھی معتبر اور قابل حجت مانا جائے گا)، خطیب کا کہنا ہے" تعدیل کی بلند ترین عبارت یہ ہے کہ کسی راوی کے بارے میں کہا جائے کہ وہ حجت ہے یا ثقہ ہے۔

تیسرا مرتبہ:۔ ماہرین فن کا کسی راوی کے بارے میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا۔

(۱) لیس بہ بأسٌ۔ یا (۲) لا بأس بہ۔ یا (۳) صدوقٌ۔ یا (۴) مامونٌ۔ ابن ابی حاتم اور ابن صلاح نے مذکورہ الفاظ کو "دوسرا مرتبہ" دیا ہے اور ان ہی میں "محلہ الصدق

کو بھی داخل کیا ہے۔

چوتھا مرتبہ: (۱) محلہ الصدق یا (۲) رووا عنہ (اس راوی کا سے لوگوں نے روایت کی ہے) یا (۳) الی الصدق ما ھو (سچائی سے دور نہیں ہے) یا (۴) شیخٌ وسطٌ یا (۵) وسطٌ یا (۶) شیخٌ یا (۷) صالح الحدیث یا (۸) مقارب الحدیث (ایسا راوی جس کی روایت ثقہ راوی سے قریب ہے)

(مقارب کا لفظ 'ر' کے زیر کے ساتھ بھی صحیح ہے اور زبر کے ساتھ بھی، دونوں طرح سے معناً ایک ہی ہے یعنی اس راوی کی حدیث نہ ساقط ہے نہ اعلیٰ درجے کی ہے۔ درمیانی قسم کی ہے۔ یہ لفظ ایک طرح کی تعریف ہے۔ ابن رشید کا کہنا ہے کہ اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ راوی نہ انوکھی (شاذ) روایت کرتا ہے نہ غیر پسندیدہ (منکر) شیخ ابوغدہ منقول از سخاوی)

یا (۹) جید الحدیث۔ یا (۱۰) حسن الحدیث۔ یا (۱۱) صویلحٌ۔ یا (۱۲) صدوق ان شاء اللہ۔ یا (۱۳) ارجو انہ لیس بہ بأسٌ (میں توقع کرتا ہوں کہ اس راوی میں کوئی کھٹکے کی بات نہیں ہے)

ابن ابی حاتم نے "تیسرے مرتبے" میں صرف ایک ہی لفظ یعنی شیخ کے ذکر پر قناعت کر لی ہے اور کہا ہے کہ یہ لفظ اس سے پہلے والے مرتبے کے الفاظ یکتب حدیثہ اور ینظر فیہ کے مانند ہے مگر مرتبے میں اس سے کچھ کم ہے۔ چوتھے درجے میں ابن ابی حاتم نے صرف صالح الحدیث کے لفظ پر قناعت کر لی ہے۔

ابن صلاح نے الفاظ تعدیل کو دوسری ترتیب سے ذکر کیا ہے۔ ماہرین فن جرح وتعدیل کے الفاظِ تعدیل (۱) فلانٌ روی عنہ الناس (۲) فلان وسط (۳) فلان مقارب الحدیث (۴) فلان ما اعلم بہ بأساً، کو ذکر کرنے کے بعد ابن صلاح نے لکھا ہے کہ مذکورہ الفاظ لا بأس بہ سے رتبے میں کچھ کم ہیں (عراقی کا اقتباس ختم ہوا)

علامہ عراقی نے جرح کے مراتب کا بھی اپنی شرح الفیہ میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ جرح کے الفاظ کے مراتب پانچ ہیں۔ ابن ابی حاتم نے اور ان کی پیروی میں ابن صلاح نے بھی الفاظ جرح کے چار ہی مرتبے قرار دیے ہیں[1]۔

---

(۱) سخاوی نے اپنی شرح الفیہ میں لکھا ہے کہ علامہ ذہبی کے نزدیک الفاظ جرح (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پہلا مرتبہ: (جو بدترین ہے) کسی راوی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ (۱) کذّابٌ (بڑا جھوٹا ہے) یا (۲) یکذِبُ (جھوٹ بولتا ہے) یا (۳) یضع الحدیث (حدیثیں گڑھتا ہے)... یا (۴) وضّاعٌ (گڑھنے والا ہے) یا (۵) وضع حدیثاً (اس نے حدیث گڑھی ہے) یا (۶) دجّالٌ

ابن ابی حاتم اور خطیب نے دوسرے مرتبے کے بعض الفاظ جرح کو پہلے مرتبے میں ہی شمار کیا ہے۔ ابن ابی حاتم کا کہنا ہے کہ جب ماہرین فنِ جرح کسی راوی کے بارے میں کہیں کہ (۱) متروک الحدیث یا (۲) ذاهب الحدیث یا (۳) کذّابٌ تو ایسا راوی بالکل ساقط ہے اس سے کوئی حدیث نقل نہیں کی جائے گی۔

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ)

کے مراتب چھ ہیں جو حسب ذیل ہیں

(الف)۔ (۱) دجّالٌ (۲) وضّاعٌ (۳) کذّابٌ (یہ بدترین الفاظ جرح ہیں)

(ب)۔ (۱) متّهمٌ (۲) لیس بثقة ولا مامون (۳) مُجمَعٌ علیٰ ترکه (۴) لایحل کتابة حدیثه وغیرہ

(ج)۔ (۱) هالك (۲) ساقط (۳) مطروح الحدیث (۴) متروك الحدیث (۵) ذاهب الحدیث

(د)۔ (۱) مُجمَعٌ علی ضعفه (۲) ضعیفٌ جدّاً (۳) ضعّفوه (۴) تالِفٌ (۵) لیس بشئ۔

(ر)۔ (۱) ضعیفٌ (۲) ضعیف الحدیث (۳) مضطرب الحدیث (۴) منکر الحدیث وغیرہ

(س)۔ (۱) له مناکیر (۲) له ماینکر (۳) فیه ضعفٌ (۴) لیس بالقوی (۵) لیس بعمدة (۶) لیس بالمتین (۷) لیس بحجة (۸) لیس بذاك (۹) غیرہ اوثق منه (۱۰) تعرف وتنکر (۱۱) فیه جهالة (۱۲) لیّن (۱۳) یکتب حدیثه (۱۴) یعتبر به کی قسم کی وہ تمام عبارتیں جو راوی کے کبھی قابل اعتبار ہونے ..... یا اس کے بارے میں مذہب پہنچنے یا اسکی روایت کے درجۂ صحیح تک نہ پہنچنے کے ساتھ اچھی ہونے پر صادق آئیں" سخاوی نے اگرچہ ذہبی کی طرف جرح کے چھ مراتب منسوب کیے ہیں مگر یہ حوالہ نہیں دیا ہے کہ ذہبی نے اپنی کس تصنیف میں یہ مراتب ذکر کیے ہیں۔ مؤلف (مولانا عبد الحیؒ) نے میزان الاعتدال کے دیباچے سے ذہبی کا جو اقتباس نقل کیا ہے اس کے مطابق ذہبی کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دوسرا مرتبہ: (۱) مُتَّهَمٌ بالكذب (۲) متهم بالوضع (۳) ساقط (۴) هالكٌ (۵) ذاهبٌ (۶) متروكٌ (۷) متروك الحديث (۸) تركوه (۹) فيه نظر (۱۰) سكتوا عنه[1] (۱۱) لا يعتبر به (۱۲) لا يعتبر بحديثه (۱۳) ليس بثقة (۱۴) ليس بثقة ولا مأمون وغیرہ

تیسرا مرتبہ: (۱) رُدَّ حديثه (۲) ردوا حديثه (۳) مردود الحديث (۴) ضعيفٌ جداً (۵) واهٍ بمرة (۶) طرحوا حديثه (۷) مُطَّرَح (۸) مُطَّرَح الحديث (۹) ارم به (۱۰) ليس بشيء (۱۱) لا شيء (۱۲) لا يساوي شيئاً وغیرہ

ان تینوں مرتبوں میں سے کچھ بھی کسی راوی کے بارے میں اگر کہا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نہ اس کو قابل حجت مانا جائے گا نہ اس کو سند میں پیش کیا جائے اور نہ اس کا اعتبار کیا جائے گا۔

چوتھا مرتبہ: (۱) ضعيفٌ (۲) منكر الحديث (۳) حديثه منكرٌ (۴) مضطرب الحديث (۵) واهٍ (۶) ضعفوه (۷) لا يحتج به۔

پانچواں مرتبہ: (۱) فيه مقالٌ (۲) ضعيف یا فيه ضعفٌ یا في حديثه ضعف (۳) يعرف وينكر (۴) ليس بذاك یا بذاك القوي (۵) ليس بالمتين (۶) ليس بالقوي (۷) ليس بحجة (۸) ليس بعمدة (۹) ليس بالمرضي (۱۰) للضعف ما هو[2] (۱۱) فيه خُلف (۱۲) طعنوا فيه (۱۳) مطعونٌ (۱۴) سيء الحفظ (۱۵) ليّن یا ليّن الحديث یا فيه لِينٌ (۱۶) تكلموا فيه۔

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا بقیہ)۔ نزدیک مراتب جرح پانچ ہیں، سخاوی نے جو لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہبی کے نزدیک چھ مراتب ہیں، عراقی نے بھی جرح کے پانچ ہی مراتب قرار دیے ہیں۔ سخاوی اور سندھی نے (جیسا کہ آگے متن میں آرہا ہے) جرح کے چھ مراتب مانے ہیں۔ ۱۲ شیخ ابو غدہ

(۱) "فيه نظر" اور "سكتوا عنه" صرف امام بخاری کی اصطلاح میں دوسرے مرتبے میں داخل ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ امام بخاری کے علاوہ دوسرے ائمہ فن کے نزدیک ان دونوں لفظوں کا مرتبہ چھٹا ہے جیسا کہ سخاوی نے شرح الفیہ میں لکھا ہے اور جیسا کہ مؤلف (مولانا عبد الحئی) آگے چل کر خود ذکر کریں گے۔ ۱۲ شیخ ابو غدہ۔ (۲) سخاوی نے شرح الفیہ میں لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ راوی ضعف سے دور نہیں ہے ۱۲ شیخ ابو غدہ

لایساوی شیئاً ۔ (جو تیسرے مرتبے کا آخری جملہ ہے) کے بعد (یعنی چوتھے اور پانچویں مرتبے کے الفاظ میں سے) کوئی لفظ بھی جس راوی کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس راوی کی حدیث کو درج کیا جائے گا برائے اعتبار" (عراقی کا اقتباس ختم ہوا)

سخاوی نے شرح الفیہ میں اور سندھی نے شرح نخبہ میں اس بحث کو عمدہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور جرح اور تعدیل دونوں کے چھ مرتبے قائم کیے ہیں، دونوں نے پسندیدہ انداز میں ان مراتب کو بیان کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے :۔

"محدثین کے نزدیک تعدیل کے بلند ترین الفاظ وہ ہیں جو درح میں مبالغے کا پہلو لیے ہوں یا اسم تفضیل کے وزن پر (اَفْعَلُ کے وزن پر) ہوں جیسے (۱) اوثق الناس اور اضبط الناس (۲) الیہ المنتھیٰ فی التثبت اسی سے ملتا جلتا جملہ ہو (۳) لااعرف لہ نظیراً فی الدنیا (یہ پہلا مرتبہ ہوا ہے)

دوسرا مرتبہ :۔ فلانٌ لایسأل عنہ (اس راوی کے بارے میں کیا پوچھنا)

تیسرا مرتبہ :۔ ثقہ ہونے پر دلالت کرنے والے الفاظ میں سے کسی لفظ کو تاکید (تکرار) کے ساتھ لانا جیسے (۱) ثقۃٌ ثقۃٌ (۲) ثبتٌ ثبتٌ۔

ابن عُیَینہؒ کے یہاں یہ تکرار نو دفعہ تک پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا "ہم سے حدیث بیان کی عمرو بن دینار نے اور وہ ثقہ ثقہ ثقہ .... (نو مرتبہ) تھے اور اسی طرح سے ابن سعد کا شعبہ کے بارے میں کہنا " ثقۃٌ مامون ثبتٌ حجۃٌ صاحبُ حدیث"

چوتھا مرتبہ :۔ توثیق پر دلالت کرنے والے الفاظ میں سے کسی ایک لفظ کا ایک بار استعمال کرنا جیسے (۱) ثقۃٌ (۲) ثبتٌ (۳) کأنہ مصحفٌ[1] (راوی گویا صحیفہ ہے) (۴) حجۃٌ یا امامٌ

---

(۱) علامہ ابن حجر کی کتاب "تہذیب التہذیب" میں مسعر بن کدام کوفی کے تذکرے میں ہے، جو بڑے محدثین میں سے ایک تھے اور جن کا ۱۵۳ھ میں انتقال ہوا: "شعبہ کا کہنا تھا کہ ہم مسعر کو مصحف (صحیفہ) کے نام سے یاد کرتے تھے۔ عبد اللہ بن داؤد کا کہنا تھا کہ مسعر کو مصحف کے نام سے اس لیے یاد کیا جاتا تھا کہ ان کا حافظہ بہت قوی تھا اور غلطی بہت ہی کم کرتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ "میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ جب مسعر سے ثوری کا اختلاف ہو (روایت حدیث میں) تو مسعر کے بارے میں کیا حکم ہے؟" انھوں نے جواب دیا "مسعر کے حق پر ہونے کا حکم کیا جائے گا اسلیے کہ وہ مصحف (صحیفہ) ہیں ۱۲ شیخ ابو غدہ۔

یا ضابطٌ یا حافظٌ۔ حجۃٌ کا لفظ ثقہ کے مقابلے میں زیادہ قوت رکھتا ہے۔

پانچواں مرتبہ :۔ (۱) لیس بہ بأس یا لا بأس بہ (ابن معین کے سوا دوسرے ائمہ فن کے نزدیک ابن معین کے نزدیک اس اصطلاح کا مفہوم مختلف ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔) (۲) صدوقٌ یا مامونٌ یا خیار الخلق۔

چھٹا مرتبہ :۔ وہ تمام الفاظ جو جرح سے قریب ہونے کا احساس دلاتے ہوں، اور یہ تعدیل کا کم ترین درجہ ہے جیسے (۱) لیس ببعید من الصواب (۲) شیخٌ (۳) یروی حدیثہ (۴) یعتبر بہ (۵) شیخ وسط (۶) روی الناس عنہ (۷) صالح الحدیث (۸) یکتب حدیثہ (۹) مقارب الحدیث (۱۰) صُویلحٌ (۱۱) صدوق ان شاء اللہ (۱۲) ارجو ان لا بأس بہ، اور اس طرح کے دوسرے الفاظ ——— یہ ہوئے تعدیل کے مراتب اور درجے۔

(سخاوی نے شرح الفیہ میں لکھا ہے تعدیل کے ان مراتب کا حکم یہ ہے کہ اول کے چار مراتب کے راویوں کی روایتوں سے سند لی جاتی ہے اور آخر کے دونوں مراتب کے راویوں کو سند نہیں مانا جاتا۔ اس لیے ان دونوں آخری مراتب کے الفاظ راوی کی یادداشت کی شرط پورا ہونے کا شعور پیدا نہیں کرتے ہیں، ان آخری مراتب کے راویوں کی حدیث لکھ لی جائے گی پھر ان کو پرکھا جائے گا، جہاں تک چھٹے مرتبے کا تعلق ہے اس کا حکم پانچویں مرتبے کے حکم سے بھی پست تر ہے اس مرتبے کے بعض راویوں کی حدیث بس بطور اعتبار کے لکھ لی جائے گی، جانچی نہیں جائے گی کیونکہ ان کا حال تو کھلا ہوا ہے)

الفاظِ جرح کے مراتب چھ ہیں :۔

پہلا مرتبہ :۔ وہ الفاظ جن میں مبالغہ کا پہلو ہو جیسے اکذب الناس (اول نمبر کا جھوٹا) یا الیہ المنتھیٰ فی الکذب (جھوٹ اس راوی پر ختم ہے) ھو رکن الکذب (جھوٹ کا جزو اعظم ہے) منبع الکذب (جھوٹ کا سرچشمہ) یا معدن الکذب (جھوٹ کی کان) وغیرہ۔

دوسرا مرتبہ :۔ وہ الفاظ جو مذکورہ الفاظ سے قدرے ہلکے ہیں جیسے دجالٌ، کذابٌ وضاع اگرچہ ان الفاظ میں بھی مبالغے کی شان پائی جاتی ہے مگر یہ پہلے مرتبے کے الفاظ

کے مقابلے میں ہلکے ہیں، اسی طرح یضعُ (گڑھتا ہے) یا یکذب (جھوٹ بولتا ہے) کے الفاظ بھی دوسرے مرتبے میں شامل ہیں۔

تیسرا مرتبہ: یسرق الحدیثَ[1] (حدیث کا سرقہ کرتا ہے) مُتَّھَمٌ بالکذب۔ مُتَّھَمٌ بالوضع، ساقطٌ، متروکٌ، ھالکٌ، ذاھب الحدیث، ترکوہ، لا یعتبر بہ، لا یعتبر بحدیثہ، لیس بثقۃ، غیر ثقۃٍ۔[2]

---

(۱) "حدیث کا سرقہ کرتا ہے" اس کا مطلب سخاوی نے شرح الفیہ میں یہ بتایا ہے کہ "ایک محدث کسی حدیث کی روایت میں منفرد ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں ہے اب یہ چور آتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے بھی اس محدث کے استاد (شیخ) سے یہی حدیث سنی ہے" اسی طرح وہ بھی 'حدیث چور' کہلائے گا، جو کسی حدیث کو جو ایک راوی سے مروی ہے دوسرے راوی کی طرف (جو پہلے راوی کے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے) منسوب کر دے، علامہ ذہبی کا کہنا ہے "یہ حدیث چوری اس قسم کی نہیں ہے جیسے کوئی شخص کتب حدیث یا اجزائے حدیث چرالیتا ہے، کتب و اجزائے حدیث کی چوری راویوں میں چوری کرنے سے بدرجہا منحوس ہے۔" ــــ شیخ ابوغدہ۔

(۲) اس دوسرے مرتبے کے الفاظ جرح میں جیسا کہ عراقی کی الفیہ اور سخاوی کی شرح الفیہ میں ہے، یہ الفاظ بھی ہیں (۱) مجمع علیٰ ترکہ (۲) مودٍ (ھالکٌ) (۳) و ھو علیٰ یَدَیْ عدلٍ
اس آخری عبارت جرح کا ایک تاریخی پس منظر ہے جس کی بنا پر اس عبارت کو ان الفاظ جرح میں شمار کیا گیا ہے جو راوی میں شدید کمزوری پر دلالت کرتے ہیں۔ سخاوی نے شرح الفیہ میں لکھا ہے کہ "ہمارے استاد علامہ ابن حجر نے بیان کیا کہ ابوحاتم کے ان الفاظ 'ھو علیٰ یدی عدل' کو ان کے استاد (حافظ عراقی) الفاظ تعدیل میں شمار کرتے تھے اور ان کو ھُوَ یَدِیْ عَدلٌ پڑھتے تھے، ہمارے شیخ (استاد) علامہ ابن حجر نے فرمایا "میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ یہ تعدیل کے الفاظ ہیں، بعد مجھ پر منکشف ہوا کہ ابوحاتم کے نزدیک یہ تعدیل کے نہیں بلکہ جرح کے الفاظ ہیں، یہ کیسے منکشف ہوا؟ اس طرح کہ ابوحاتم کے بیٹے نے جبارہ بن المغلس کے احوال میں لکھا ہے "میں نے اپنے والد کو جبارہ کے بارے میں کہتے سنا ہے کہ وہ ضعیف الحدیث ہے میں نے والد سے خود جبارہ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا "ھو علیٰ یدی عدل" اس کے بعد ابن ابی حاتم نے جبارہ کے بارے میں دوسرے ائمہ فن کے اقوال نقل کیے جو جبارہ کی کمزوری پر دلالت (باقی اگلے صفحہ پر)

چوتھا مرتبہ: رُدّ حديثه یا مردود الحديث یا ضعيفٌ جدًا یا واہٍ بمرة یا طرحوه یا مطروح الحديث یا مطروح یا لایکتب حديثه یا لا تحل كتابة حديثه یا لا تحل الرواية عنه لیس بشئ یا لاشئ (۱)۔ (ابنِ معین کے نزدیک لاشئ کا مفہوم دوسرا ہے' اس کی تفصیل آگے آئے گی)

پانچواں مرتبہ: لا يُحتجّ به، ضعفوه، مضطرب الحديث، له ما يُنكر، له مناكير، منكرُ الحديث (۲)، ضعيفٌ۔

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) کرتے تھے' کسی ایک امام کا بھی کوئی ایسا قول جبارہ کے بارے میں انھوں نے نہیں نقل کیا جس سے اس کی تعدیل ہوتی ہے۔" علامہ ابن حجر نے مزید فرمایا کہ "اس کے باوجود ، هو على يدى عدل کے معنی میری سمجھ میں نہیں آپائے اور میں ان کی تحقیق نہ کرسکا' اس کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ یہ الفاظ هالكٌ کا کنایہ ہیں جس کے معنی ہیں کہ راوی میں شدید ضعف پایا جاتا ہے' یہ اس طرح سمجھ میں آیا کہ یعقوب ابن السکیت کی کتاب "اصلاح المنطق" میں ہے کہ تُبَّع (بادشاہ) کا ایک فوجی سردار تھا جس کا نام العدل تھا' جب تبع کسی کے قتل کا فیصلہ یا قصد کرتا تھا تو کہتا تھا "وُضع على يدى عدل (عدل کے ہاتھوں پر اسے رکھ دیا گیا ہے) مطلب یہ ہے کہ یہ شخص اب ہلاک ہونیوالا ہے۔ سخاوی کہتے ہیں کہ ان الفاظ کا یہی مطلب ابن قتیبہ نے ادب الکاتب کی شرح میں بیان کیا ہے اور مزید لکھا ہے کہ ہر اس چیز کے بارے میں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں جس سے بالکل مایوسی ہو چکی ہو۔" شیخ ابو غدہ

(۱) اس چوتھے مرتبے میں یہ لفظ بھی شامل ہو "یارم به" ابن صلاح نے اس لفظ کو تیسرے مرتبے میں رکھا ہو۔ علامہ سخاوی نے شرح الفیہ میں لکھا ہو "جرح کے ان چاروں مراتب کا حکم یہ ہو کہ ان میں سے کسی راوی کی حدیث کو نہ سند مانا جائے گا نہ اس کو بطور گواہی کے پیش کیا جائیگا اور نہ کسی اعتبار کے لائق اُسے سمجھا جائے گا۔" شیخ ابو غدہ

(۲) سخاوی اور سندھی نے منکر الحدیث کو یہاں پانچویں مرتبے میں رکھا ہو' یہ بخاری کی اصطلاح کے مخالف ہو' اسی طرح عراقی نے اس لفظ کو جرح کے چوتھے مرتبے میں شمار کیا ہو' جہاں تک بخاری کی اصطلاح کا تعلق ہو ان کا کہنا ہو "جس راوی کے بارے میں کہتا ہوں کہ وہ منکر الحدیث ہو تو اس کا مطلب ہو کہ اس سے روایت کا کرنا جائز نہیں ہو (لا تحل الرواية عنه)" اس طرح بخاری کی اصطلاح میں منکر الحدیث کا لفظ جرح کا زیادہ سخت لفظ ہوا یعنی عراقی کی تقسیم کے اعتبار سے اس کا مرتبہ تیسرا اور سخاوی و سندھی کی تقسیم کے اعتبار سے اس کا مرتبہ چوتھا ہوا' ... لفظ کا حکم یہی ہو کہ جس راوی کو منکر الحدیث قرار دیا جائے اس کی حدیث کو نہ گواہی میں پیش کیا جائے گا ... بھی ... کے لائق مانی جائے گی۔ شیخ ابو غدہ۔

چھٹا مرتبہ: یہ جرح کے سب سے معمولی اور سہل الفاظ پر مشتمل ہے یعنی فیہ مقالٌ، فیہ ادنیٰ مقالٍ، فیہ ضعف، ینکر مرۃً ویعرف اخری[1]، لیس بذاک، لیس بالقوی، لیس بمتین، لیس بحجۃ، لیس بعمدۃ، لیس بمأمونٍ، لیس بثقۃٍ، لیس بالمرضیّ، لیس یحمدونہ، لیس بحافظ، غیرہ اوثق منہ، فیہ شیئٌ، فیہ جہالۃٌ، لاادری ماھو، ضعفوہ، فیہ ضعفٌ، سیّئُ الحفظ، لیّنُ الحدیث، فیہ لِیْنٌ۔

(دارقطنی کے نزدیک اس کا مطلب دوسرا ہے، ان کا کہنا ہے کہ جب میں کسی کے بارے میں کہتا ہوں کہ وہ لیّن ہے تو وہ بالکل ساقط الاعتبار نہیں ہوتا بلکہ اس میں قدرے جرح کی گنجائش ہوتی ہے ایسی گنجائش جو راوی کو تعدیل کے درجے سے نہیں گراتی ہے)

تکلموا فیہ یا سکتوا عنہ یا فیہ نظر، کے الفاظ بخاری کے سوا دوسرے ائمہ فن کے نزدیک اسی مرتبے میں ہیں یعنی چھٹے مرتبے میں (۲)

---

(۱) شرح الفیہ (سخاوی) میں ہے "تنکر مرۃ وتعرف اخری" اس سلسلے میں میں اوپر تفصیلی نوٹ دے چکا ہوں۔ ۱۲ شیخ ابوغدہ۔

(۲) سخاوی نے لکھا ہے "وہ تمام راوی جو جرح کے پانچویں یا چھٹے مرتبے میں لکھے گئے ہیں ان کی حدیثیں برائے اعتبار لکھی جائیں گی اور ان کا اعتبار کیا جائے گا اس لیے کہ پانچویں اور چھٹے مرتبے کے تمام الفاظ ایسے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ان الفاظ سے متصف ہونے والا صلاحیت رکھتا ہے۔ ۱۲ شیخ ابوغدہ

BOMBAY ANDHRA TRANSPORT Co.

TRANSPORT CONTRACTORS

113, Bhandari Street

BOMBAY — 3

انشورنس اسلامی معیشت میں

(۳)

(از ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی)

انشورنس اور سود

انشورنس کرانے والے جو پریمیم ادا کرتے ہیں اُن سے انشورنس کمپنیوں کے پاس ایک کثیر سرمایہ جمع ہو جاتا ہے۔ یہ سرمایہ کسی متعین وقت پر اس رقم سے زیادہ ہوتا ہے جو انشورنس کرانے والوں کو نقصانات کی تلافی کے لیے کمپنی ادا کرتی ہے، اس کے خاص سبب تین ہیں۔ ایک سبب برابر نئے افراد کا انشورنس کراتے رہنا ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ انشورنس کا پریمیم احتیاطاً اس کم سے کم رقم سے زیادہ رکھا جاتا ہے جو انشورنس کرانے والے افراد کے پورے گروہ کو پہونچنے والے نقصانات کی تلافی کے لیے درکار ہوتی ہے، ایک تیسرا سبب یہ بھی ہے کہ پریمیم کی رقمیں ایک معلوم و متعین حساب کے مطابق ہر سہ ماہی پر آتی رہتی ہیں جبکہ ادا کی جانے والی رقموں کے بارے میں اوقات کی زیادہ پابندی نہیں ہوتی۔ انشورنس کمپنیاں اپنا فاضل سرمایہ اس طرح مشغول رکھنا چاہتی ہیں کہ نقصان کا اندیشہ کم سے کم ہو اور اصل سرمایہ کے تحفظ کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہے۔ مروجہ نظام میں اس کی عملی شکل سودی تمسکات (Securities) کی خریداری ہے۔ انشورنس کمپنیاں عام تجارتی حصص کی خریداری میں کم ہی ہاتھ ڈالتی ہیں۔

چونکہ پریمیم سے حاصل ہونے والے سرمایے میں اس طرح اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لیے انشورنس کرانے والوں کے لیے واجب الادا پریمیم کا حساب لگانے میں بھی اس اضافہ کی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ پریمیم کی مقدار اس سے کم رکھی جاتی ہے جو پریمیم کے ذریعے حاصل ہونے والے سرمایے کو مشغول کر کے اس میں اضافہ نہ کرنے بلکہ بیکار جمع رکھنے کی صورت میں رکھنی پڑتی۔ اس طرح پریمیم کا حساب لگانے میں بھی سود اور اس کی مروجہ شرحوں کا دخل ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر پریمیم سے حاصل ہونے والے سرمایے کو مشغول کر کے اس میں اضافہ کرنے کی کوئی ایسی صورت ممکن ہو جو سود سے پاک ہو تو انشورنس کا نظام سود سے پاک کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک خود طریقۂ انشورنس کا تعلق ہے اسے اس طرح بھی اختیار کیا جا سکتا ہو کہ پریمیم سے حاصل ہونے والے سرمایے کو صرف جمع رکھا جائے، مشغول نہ کیا جائے۔ مگر اس طرح انشورنس کرانے والوں کو زیادہ مقدار میں پریمیم ادا کرنا ہوگا اور انشورنس کی لاگت بڑھ جائے گی۔ سرمایے کی ایک کثیر مقدار کو بیکار جمع رکھنا قومی وسائل کے ضیاع کا ہم معنی ہوگا۔ مختلف انفرادی اور اجتماعی مصالح کا تقاضا ہے کہ اس سرمایہ کو مزید سرمایہ کاری کے لیے استعمال کیا جائے تاکہ قومی دولت میں اضافہ ہو اور انشورنس کی لاگت بھی کم کی جا سکے۔ اس لیے انشورنس پریمیم سے حاصل ہونے والے فاضل سرمایے کو مشغول کر کے اس میں اضافہ کرنا چاہیئے۔

اصل سوال یہ ہے کہ ایک غیر سودی نظام میں انشورنس کے سرمایہ کا نفع آور استعمال کس طرح عمل میں آئے کہ متعلقہ فوائد حاصل کیے جا سکیں۔ اس سوال کے جواب پر غور کرتے وقت اس اہم حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیئے کہ یہ سوال جس صورت میں انشورنس کے نجی کاروباری اداروں کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اس صورت میں ریاست کے زیر اہتمام انشورنس میں نہیں پیدا ہوتا۔ ریاست کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اس سرمایہ کو ایسے کاموں میں استعمال کرے جن کی پیداآوری یقینی ہے اور سرمایے کے ڈوبنے یا اس میں نقصان اٹھانے کا سوال نہیں پیدا ہوتا جیسا کہ آئندہ واضح کیا جائے گا۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ اسلامی نظام

میں معیشت کے ایک وسیع دائرہ میں انشورنس کی تنظیم پوری طرح ریاست کے ہاتھوں میں ہو۔ اس دائرہ کی حد تک اس سوال کا جواب آسانی کے ساتھ ممکن ہے۔

جس چھوٹے سے دائرہ میں نجی کاروبار کے طور پر انشورنس کی اجازت دی جائیگی۔ اس کی حد تک فاضل سرمایہ کے نفع بخش استعمال کی نسبتہً محفوظ راہیں ایک غیر سودی معیشت میں کافی میسر آسکیں گی۔ ان راہوں کی نشاندہی ہم اپنی کتاب "غیر سودی بنک کاری" میں کر چکے ہیں۔[1]

غیر سودی معیشت میں انشورنس کے نجی کاروباری اداروں کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ اپنا فاضل سرمایہ حکومتی حصص شرکت یا اونچی ساکھ کے نجی کاروباری اداروں کے حصص خریدنے میں صرف کریں۔ بنکوں کے مضاربت کھاتہ میں رقم جمع کرنا بھی ان کے نفع آور استعمال کی ایک محفوظ شکل ہوگی کیونکہ ان کھاتوں سے وابستہ اندیشۂ نقصان کو عملاً ختم کردیا جائے گا۔ تجربے کی روشنی میں ان مختلف راہوں میں سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والی اوسط شرح نفع کا ایک قابل اعتماد اندازہ لگانا ممکن ہوگا جسے پریمیم کا حساب لگانے میں استعمال کیا جاسکے۔

یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ بازار میں سود کی شرح ایک متعین اور معلوم مقدار ہوتی ہے جبکہ غیر سودی نظام میں نفع کی شرح کے ایک محتاط اندازے کو مذکورہ بالا حساب کی بنیاد بنانا ہوگا۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ بازار میں سود کی شرح بھی بدلتی رہتی ہے اور انشورنس کمپنیاں پریمیم کا حساب لگانے میں شرح سود کی مروجہ شرح میں ممکن تبدیلیوں کے پیش نظر اس کے ایک محتاط اندازے کو بنیاد بناتی ہیں، کیونکہ پریمیم کی مقدار بازار میں شرح سود کی ہر تبدیلی کے ساتھ تبدیل نہیں کی جاسکتی۔

انشورنس کے سرمایہ کے نفع اور استعمال سے عملاً اس سے زیادہ نفع ہوسکتا ہے جس کو پریمیم کا حساب لگانے کی بنیاد بنایا گیا ہو۔ اس فاضل نفع [illegible] ایک [illegible] قائم

---

[1] غیر سودی بنک کاری۔ ساتواں باب صفحات ۲۰۸۔۲۲۸ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند (دہلی)۔ ۱۹۶۹ء

کیا جا سکتا ہے جو سرمایے کے استعمال میں نقصان کے نظری اندیشے سے تحفظ کا کام کر سکے جس سال عملاً نقصان سے دوچار ہونا پڑے، اس سال نقصان کی تلافی اس ریزرو فنڈ سے کی جا سکتی ہے تاکہ نقصان کے نتیجے میں انشورنس کرانے والوں سے پریمیم کی مقدار بڑھانے کا مطالبہ نہ کرنا پڑے۔ اس بات کے احتیاطی ریزرو موجودہ نظام میں بھی ضرور ہوتے ہیں۔ اس ریزرو کے ذریعہ عرصہ طویل میں پریمیم کی مقدار کو واقعی شرح نفع کے مطابق رکھنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔

چونکہ انشورنس کا تعلق سود سے صرف ضمنی طور پر سرمایہ کے نفع آور استعمال میں قائم ہوتا ہے اس لیے یہ تعلق ایک ایسی معیشت میں خود بخود ختم ہو جائے گا جس کی تنظیم سود کے بغیر کی گئی ہو جہاں سرمایہ کے نفع آور استعمال کی غیر سودی راہیں میسر ہوں۔ مگر بعض اوقات یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ خود معاہدۂ انشورنس ربا کو مستلزم ہے کیونکہ پریمیم ادا کرنے والے کو اس سے زیادہ رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا جاتا ہے جتنی وہ حادثہ کے وقوع کے وقت تک بالاقساط ادا یا جمع کر چکا ہو۔ اس رائے کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ ہر اضافہ ربا ہے۔ یہ ایک بے بنیاد مفروضہ ہے۔ شریعت میں ہر اضافہ کو علی الاطلاق ربا نہیں قرار دیا گیا۔ پس پریمیم کے طور پر ادا کی جانے والی رقم قرض نہیں ہے کہ اس کے بالمقابل زیادہ رقم کی ادائیگی کو اصل پر اضافہ کے ساتھ واپسی قرار دے کر ربا کا حکم لگایا جا سکے۔ اپنی حقیقی روح کے اعتبار سے پریمیم کی نوعیت زر تعاون یا چندہ کی ہے جو ایک مفید اجتماعی خدمت کی فراہمی کے لئے دیا جا رہا ہو۔ تعاونی انشورنس (MUTUAL INSURANCE) اور ریاست کے زیر اہتمام انشورنس میں اس کی یہ نوعیت بالکل واضح ہے۔ اگر ہم انشورنس کی مجوزہ کاروباری تنظیم کو سامنے رکھ کر بھی غور کریں تو بھی پریمیم کو قرض نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسے ایک ایسی خدمت کی قیمت سمجھا جا سکتا ہے جس کی انجام دہی اس کی ضرورت پڑنے پر موقوف ہے۔

برخلاف عام سودی قرض کے انشورنس میں ملنے والی رقم کا انحصار نہ تو مدت کے طول پر ہوتا ہے نہ اس کی مقدار اس مجموعی رقم پر منحصر ہوتی ہے جو پریمیم ادا کرنے والے نے حادثہ واقع ہونے کے وقت تک مجموعی طور پر ادا کی ہو۔ اس رقم کا انحصار عملاً متعلقہ حادثہ کے نتیجے میں واقع ہونے والے مالی نقصان پر ہوتا ہے۔ انشورنس کی بعض

شکلوں مثلاً بیمۂ زندگی میں ملنے والی رقم پہلے سے متعین ہوتی ہے مگر بہت سی دوسری شکلوں مثلاً آتش زدگی وغیرہ میں یہ رقم پہلے سے متعین نہیں ہوتی بلکہ نقصان واقع ہو جانے پر نقصان کے مطابق متعین کی جاتی ہے۔ بعض دوسری شکلوں میں اس کی پیشگی تعیین کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ نقصان واقع ہونے پر اس کی مالیت بھی پہلے سے معلوم ہوتی ہے مثلاً بحری جہاز کا ڈوب جانا۔

زندگی کے بیمے میں ایک مشکل سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کسی خاص عمر میں کسی آدمی کی موت سے (اس کے اہل خاندان کو) مالی طور پر کتنا نقصان واقع ہوگا۔ اس کا اندازہ کس طرح لگایا جائے۔ مال واملاک کے سلسلے میں مالیت کی تعیین معروضی پیمانوں کے مطابق آسانی سے ممکن ہے مگر جان کے سلسلے میں تعیین کے معروضی پیمانے صرف جزوی طور پر ہی میسر ہیں۔ ایسی صورت میں ایک حد کے اندر رہتے ہوئے اس بات کا فیصلہ متعلق فرد یا افراد کی صواب دید پر چھوڑنا ضروری تھا کہ وہ اس نقصان کا کیا اندازہ قائم کرتے ہیں اور اس کے پیش نظر کس رقم کی پالیسی خریدنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس فرد یا افراد کی حال میں بچت کرنے کی صلاحیت اور اس پر آمادگی بھی اہمیت رکھتی ہے، اور اس سوال کو بھی اُس پر چھوڑا جا سکتا تھا۔ ان تمام باتوں پر نظر ثانی ممکن ہے، مگر ان کی موجودگی میں بھی صرف یہ بات کہ بیمۂ زندگی کرانے والے کو اپنی ادا کردہ رقم سے زیادہ رقم مل سکتی ہے۔ اس مزید رقم کو سود قرار دینے کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ اگر انشورنس کی خالص شکل یعنی تعاونی (Mutual) تنظیم کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو انشورنس کرانے والے افراد پریمیم کے طور پر مجموعی طور پر جو رقم ادا کرتے ہیں اتنی ہی رقم افراد کے اس گروہ کو مجموعی طور پر واپس دی جاتی ہے، نہ کم نہ زیادہ۔ کیونکہ پریمیم کا حساب، قانون اعداد کثیر اور قانون اوسط کی روشنی میں، اس اصول پر مبنی ہے کہ وہ پورے گروہ کے نقصان ..... کی تلافی کر سکے۔ اگرچہ کسی ایک فرد نے جو رقم ادا کی ہے اس میں اور اُس فرد کو جو رقم ملتی ہے اُس میں فرق ہوگا مگر ان تمام افراد پر مشتمل مجموعہ کے لیے دونوں رقموں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس وضاحت میں ہم نے تنظیم انشورنس پر آنے والے انتظامی اخراجات، اور انشورنس کے سرمایہ کے نفع آور استعمال سے ہونے والے اضافہ، دونوں کو نظر انداز کر دیا ہے تاکہ مسئلہ کی اصل نوعیت کو سمجھنا آسان ہو جائے۔ عملاً مذکورہ بالا اخراجات کے پیش نظر انشورنس کرانے والوں کی ادا کردہ رقوم ان کو

مجموعی طور پر دی جانے والی رقوم سے زیادہ ہوں گی۔ مگر دوسری طرف سرمایہ کے نفع اور استعمال سے ہونے والے اضافہ کے پیش نظر ان کو دی جانے والی رقم ان سے لی جانے والی رقم سے زیادہ ہوگی۔ عملاً اس اضافے کا پیشگی حساب کرکے اس نسبت سے انشورنس کرانے والوں سے (پریمیم کے طور پر) نسبتہً کم رقم کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ مسئلہ کی اس نوعیت پر غور کرنے سے واضح ہے کہ انشورنس کا معاملہ ربا سے یکسر مختلف ہے۔ سودی قرض میں قرض لینے والوں کو، انفرادی طور پر لی ہوئی رقم سے زیادہ رقم واپس دینی ہوتی ہے اور یہی صورت حال ان تمام افراد کے مجموعہ کے لیے بھی قائم رہتی ہے جو سودی قرض لیتے ہیں۔ انشورنس میں انشورنس کرانے والے افراد کو مجموعی طور پر اتنی ہی رقم واپس ملتی ہے جتنی انھوں نے ادا کی ہوتی ہے، اگرچہ انفرادی سطح پر صورت حال مختلف ہوتی ہے۔

انشورنس کے سلسلے میں دوسری خرابیوں کا احتمال

یہ دیکھ لینے کے بعد کہ انشورنس اصلاً قمار اور ربا سے پاک ہے اور انشورنس کا نظام اس طور پر چلایا جا سکتا ہے کہ اس کی تفصیلات ان خرابیوں سے نہ آلودہ ہو ہمیں اس بات کا بھی اطمینان حاصل کرنا ہے کہ یہ طریقہ ان دوسری خرابیوں سے بھی پاک ہے جن سے شریعت عام معاملات زندگی، بالخصوص لین دین کے معاملات کو پاک دیکھنا چاہتی ہے۔
قمار اور ربا کے علاوہ یہ دوسری خرابیاں یہ ہیں:

۱۔ اکراہ
۲۔ اضطرار سے بے جا فائدہ اٹھانا
۳۔ غش و غبن
۴۔ غرر فاحش اور جہل مفضی الی النزاع
۵۔ ضرر

کتاب اللہ یا سنت نبویؐ نے جن معاملات کو ممنوع قرار دیا ہے ان میں یہی خرابیاں پائی جاتی ہیں اور یہی ان کے ممنوع ہونے کا سبب ہیں۔ فقہ اسلامی میں معاملات کے

جواز یا عدم جواز کا حکم اسی بنیاد پر لگایا گیا ہے کہ وہ ان خرابیوں سے پاک ہیں یا ان سے آلودہ ہیں۔ جو معاملات ان خرابیوں سے پاک ہوں وہ مباح ہیں۔ اگر وہ معتبر انسانی مصالح کے خادم ہوں تو پسندیدہ اور مطلوب بھی ہیں۔ انشورنس کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تمام خرابیوں سے پاک ہے اور ساتھ ہی اہم انفرادی اور اجتماعی مصالح کا خادم بھی ہے۔

پہلی تین خرابیوں سے عام حالات میں انشورنس کا پاک ہونا کسی بحث کا محتاج نہیں معلوم ہوتا۔ اگر کسی مخصوص معاہدہ میں ان میں سے کوئی خرابی پائی جائے تو قانون کی مدد سے اس کی اصلاح ممکن ہوگی اور اصلاح کے بعد ہی انشورنس کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ انشورنس کی نجی کاروباری اداروں اگر معقول مقدار سے زیادہ پریمیم وصول کریں تو اسے غبن قرار دیا جا سکتا ہے۔ انشورنس کرانے والا فرد اپنی عمر، صحت، مالی حیثیت یا جن اشیاء کا انشورنس کرایا جا رہا ہو ان کی ملکیت کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے تو یہ غش کی تعریف میں آئے گا، وغیرہ۔

اسی طرح چوتھی خرابی یعنی ضرر سے بھی انشورنس کا طریقہ پاک ہے۔ انشورنس کے معاملے سے کسی تیسرے فریق کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا نہ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے کوئی اجتماعی مفاد مجروح ہوتا ہے، بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

شریعت کا منشا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہر معاملہ میں فریقین متعلقہ امور سے پوری طرح آگاہ ہو کر معاہدہ کریں تاکہ وہ اپنے نفع نقصان یا حقوق و فرائض کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں اور آئندہ آگاہی ہونے پر جھگڑے نہ کھڑے ہوں، اور ایک دوسرے کے خلاف غم و غصہ نہ پیدا ہو۔ خرید و فروخت کے معاملات میں قیمت، خریدی جانے والی چیز، اور دوسرے متعلق امور کے بارے میں جب ایسا عدم علم پایا جائے جو آئندہ جھگڑے کی بنیاد بن سکتا ہو تو معاملہ کرنے سے روکا گیا ہے۔

غرر سے مراد دھوکہ ہے جس کی بنیاد عدم علم اور عدم تعیین ہے۔ سنت میں ممنوع بیع کی چند مثالیں یہ ہیں۔ تالاب میں جتنی مچھلیاں ہوں، ان کی ایک متعین قیمت کے عوض فروخت

حاملہ اونٹنی کے بچہ جننے سے پہلے اس بچہ کی فروخت، درخت پر بور آنے پر ان پھلوں کی فروخت جو ابھی تیار نہیں ہوئے ہیں۔ جب فروخت کی جانے والی چیز وصف اور مقدار کے اعتبار سے معلوم اور متعین نہ ہو تو معاہدہ بیع میں غرر کا عنصر داخل سمجھا جائے گا۔ خدمات کی فروخت اور لین دین کے دوسرے معاملات میں بھی جب فریقین کے حقوق اور ان کی ذمہ داریاں اس نوع کے عدم تعیین یا عدم علم کا شکار ہوں تو معاملہ غرر پر مبنی ہوگا۔

سنت میں غرر کی بنا پر ممنوع معاملات کے درمیان ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ مقصد کا حصول غرر سے بچتے ہوئے بھی ممکن ہو۔ مثلاً مذکورہ بالا مثالوں میں یہ ممکن ہے کہ ادا کی جانے والی قیمت کی مقدار مچھلیوں کی اس مقدار پر منحصر ہو جو تالاب سے نکلیں۔ یا اونٹنی کے بچہ جننے کے بعد اس کو خریدا جائے، یا درختوں کے پھل تیار ہونے پر انکی فروخت عمل میں آئے۔ ہمارے علم کی حد تک سنت میں غرر کی بنیاد پر کسی ایسے معاملے سے نہیں روکا گیا ہے جو کسی ضرورت کی تکمیل یا مصلحت کے حصول کے لیے ناگزیر ہو مگر اُسے غرر یعنی عدم علم اور عدم تعیین سے پاک کرنا کسی طرح ممکن نہ ہو۔ فقہاء نے عام طور پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ تمدنی ضرورت کے جن معاملات کو عدم تعیین اور عدم علم سے پوری طرح پاک نہ کیا جا سکتا ہو، ان کی اجازت ہے اور ان کی ضرورت کے پیش نظر تھوڑے غرر کو گوارا کیا جائے گا۔ البتہ اگر غرر زیادہ ہے تو معاملہ سے روک دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس تھوڑے اور بہت کی تعیین میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مثالوں میں سے پہلے اور تیسرے معاملہ کا عدم جواز مختلف فیہ ہے اور متعدد فقہاء متعلقہ غرر کو قابل درگزر سمجھتے ہیں کیونکہ اس کا ازالہ زحمت طلب ہے۔

جہاں تک انشورنس کرنے والے ادارے کا تعلق ہے وہ رقوم معلوم اور متعین ہوتی ہیں جو اسے انشورنس کرانے والے افراد کے مجموعہ سے ملیں گی اور انہیں وہ ادا کرنی ہوں گی۔ یہ علم اور تعیین قانون اوسط اور اس امر پر مبنی ہے کہ پریمیم کا حساب سمی بنیاد پر لگایا جاتا ہے پورے گروہ کو بحیثیت مجموعی کتنی ادائیگی کرنی، قانون اوسط کی روشنی میں لازم آئے گی۔ ان حسابات میں غلطی کی گنجائش کم ہے، اور جو غلطی رہ جائے اس کی تلافی تعاون اور ریاستی انشورنس کی صورتوں میں بآسانی ممکن ہے۔ انشورنس کرانے والے کسی ایک فرد کے اعتبار سے البتہ یہ بات معلوم

اور متعین نہیں ہے کہ اسے کوئی رقم ملے گی یا نہیں، یا کتنی رقم ملے گی اور پریمیم کی صورت میں اسے مجموعی طور پر کتنی رقم ادا کرنی پڑے گی۔ اس عدم علم اور عدم تعیین کا سبب یہ ہے کہ جس حادثے اور اس سے مالی نقصان کے پیش نظر انشورنس کرایا جاتا ہے۔ اس کا وقوع، کسی ایک فرد کے ساتھ، معلوم و متعین نہیں ہے۔ یہ عدم علم اور عدم تعیین کہ کسی فرد کو کوئی متعین حادثہ پیش آئے گا یا نہیں، انسانی زندگی سے دور کرنا ممکن نہیں ہے۔ انسان اس عدم علم اور عدم تعیین کے سلسلے میں معذور ہے۔ یہی صورتِ حال انشورنس کا طریقہ اختیار کرنے کی داعی بنتی ہے۔ انفرادی سطح پر اس عدم علم اور عدم تعیین کو اگر غرر قرار دیا جائے تو بھی اس کی بنیاد پر انشورنس کے طریقے کو ممنوع قرار دینا مناسب نہ ہوگا، کیونکہ اسے ممنوع قرار دینے کی صورت میں متعلقہ ضرورت کی تکمیل اور مصالح کا تحفظ کسی صورت ممکن نہ رہ جائے گا۔ مزید برآں یہ معاملہ اپنی مخصوص نوعیت رکھتا ہے، اس کی اجتماعی نوعیت کو نظر انداز کر کے صرف انفرادی سطح پر موجود غرر کی بنا پر اسے ممنوع نہیں قرار دینا چاہیے۔

انشورنس ایک نیا معاملہ ہے۔ اس کی نوعیت لین دین کے دوسرے معاملات سے بالکل مختلف ہے۔ اس معاملہ میں عدم علم اور عدم تعیین جہاں اور جس قدر پایا جاتا ہے اس کی نوعیت سادہ خرید و فروخت میں پائے جا سکنے والے اُس عدم علم یا عدم تعیین سے مختلف ہے جس کی مثالیں سنت میں ممنوع بیع غرر کے معاملات میں ملتی ہیں۔ یہ معاملہ اجتماعی سطح پر معلوم و متعین، انفرادی سطح پر غیر معلوم و غیر متعین ہے۔

انشورنس میں جس نوع کا عدم علم اور عدم تعیین پایا جاتا ہے۔ وہ آگے چل کر فریقین کے درمیان جھگڑے کی بنیاد نہیں بنتا کیونکہ انشورنس کرانے والا اس عدم علم اور عدم تعیین سے پوری آگاہی کے ساتھ انشورنس کراتا ہے۔ اسے اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی۔ وہ جانتا ہے کہ وہ ایک حادثے کے اندیشے کی بنا پر انشورنس کرا رہا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ حادثہ واقع نہ ہو۔ آگے چل کر اگر اسے وہ حادثہ پیش نہیں آتا جس کے اندیشے سے انشورنس کرایا گیا تھا تو یہ بات اس میں نہ انشورنس کرنے والوں کے خلاف غم و غصہ پیدا کر سکتی ہے، نہ یہ احساس کہ اس کے ساتھ دھوکہ کیا گیا یا اس کی لاعلمی سے بے جا فائدہ اٹھایا گیا۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، انشورنس کرانے والا فرد جو پریمیم ادا کرتا ہے اسے متعلقہ حادثے کے مالی نقصان سے تحفظ کی قیمت قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ تحفظ ایک معلوم اور متعین امر ہے جو اسے معاہدۂ انشورنس کے تحت بہر صورت حاصل ہوتی ہے خواہ متعلقہ حادثہ پیش آئے یا نہ پیش آئے۔ قطع نظر اس سے کہ کس فرد کو یہ تحفظ نقصان کی تلافی میں ملنے والی رقم سے حاصل ہوتا ہے اور کس فرد کو اس طور پر کہ اسے سرے سے نقصان ہی نہیں ہوتا، اور کس فرد کو پریمیم کی کتنی قسطیں عملاً ادا کرنی پڑتی ہیں، اگر اس تحفظ کو مرکز توجہ بنایا جائے تو اس معاملے میں انفرادی سطح پر بھی غرر کا وجود مشتبہ ہے۔ معاملے کے دونوں فریقوں کے حقوق و فرائض بالکل معلوم اور متعین ہیں البتہ ان کی مالی تعبیریں ایسے حوادث پر منحصر ہیں جو عدم علم اور عدم تعین کا شکار ہیں۔

جیسا کہ بعض معاصر اسلامی مفکرین نے اشارہ کیا ہے سنت میں غرر کی بنا پر بعض معاملات سے اسی صورت میں روکا گیا ہے جب غرر بہت زیادہ ہو[1] نیز اس میں بیع غرر کی ممانعت آئی ہے نہ کہ مجرد غرر کی خواہ وہ زندگی کے کسی معاملے میں پایا جائے[2]۔ اگر جائزہ لیا جائے تو متعدد امور زندگی میں شریعت نے ایسے فیصلوں اور معاہدات کو روا رکھا ہے جو تمام متعلقہ باتوں کے پورے علم پر مبنی نہیں ہوتے یا مبنی نہیں ہو سکتے، مثلاً عقد نکاح، اجارہ، انتخاب امیر، حکم کے ذریعہ نزاعات کا فیصلہ چاہنا وغیرہ۔

انشورنس اور شرعی مصالح

خطر محض یعنی آفاتِ ناگہانی اور نادانستہ انسانی لغزشوں کے نتیجے میں رونما ہونے والے حوادث کے سبب مالی نقصان کا اندیشہ، ایک زبردست مفسدہ ہے۔ اس مفسدہ کا ازالہ

---

[1] مصطفیٰ احمد الزرقاء: عقد التامین (السوکرہ) وموقف الشریعۃ الاسلامیہ صفحہ ۴۵۔ مطبعۃ جامعۃ دمشق۔ ۱۹۶۲ء

[2] سید محمد صادق الحسنی الروحانی: المسائل المستحدثہ۔ جلد ا۔ صفحہ ۴۲۔ دار الفکر۔ قم (ایران) ۱۳۸۴ھ

اور جس حد تک ازالہ ممکن نہ ہو اس کے اثرات کی تلافی مطلوب ہے کیونکہ اس کے بغیر انسانی مفادات و مصالح مجروح ہوں گے۔ یہ مقصد اقتصادی طور پر جتنا اہم ہے اس سے زیادہ اہمیت اسے اخلاقی اور روحانی طور پر حاصل ہونی چاہیئے۔ یہ اندیشے سکونِ خاطر کے دشمن ہیں اور انسان کی طبیعت میں خوف و اضطراب پیدا کر کے اس کی قوتِ عمل کو مفلوج کر سکتے ہیں۔ یہ اعمال و افعال اور انکے قدرتی نتائج کے درمیان رخنہ بن کر ذہن کے سامنے آتے ہیں جس کا اثر ہمارے رویہ پر بُرا پڑتا ہے۔

خطرِ محض کے ازالے کی ممکن تدبیریں انسان ہمیشہ اختیار کرتا رہا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ گھر میں آگ نہ لگے، مال چوری نہ ہو، اس کی سواری حادثے کا شکار نہ ہو۔، اس کا ہاتھ مشین کی زد میں نہ آجائے اور وہ عمرِ طبعی سے پہلے نہ مرے۔ وہ چراغ بجھا کر سوتا ہے، مال کو بند کر کے تالے چڑھاتا ہے، اچھی غذا اور مرض کی حالت میں موزوں علاج کا اہتمام کرتا ہے۔ شریعت کو ایسی تدابیر مطلوب ہیں اور اس نے تاکید کی ہے کہ انھیں اختیار کر کے آدمی اپنی جان و مال محفوظ رکھے۔ شریعت نے جان و مال کو دانستہ بربادی کے حوالے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ لیکن انسانی تجربہ بتاتا ہے کہ ہر ممکن تدبیر کے باوجود حوادث پیش آتے رہتے ہیں اور آفات نازل ہوتی رہتی ہیں گھر دیا دکانوں اور کارخانوں میں آگ لگتی ہے، مال چوری چلا جاتا ہے، ژالہ باری سے کھڑی کھیتی تباہ ہو جاتی ہے اور جوانی کی موت خاندان کو بے سہارا بنا دیتی ہے ایسی صورتِ حال پیش آجانے پر اسلام نے متاثر ہونے والے افراد کے ساتھ ہمدردی اور مواساۃ کی تلقین کی ہے اور ان کی امداد کی ترغیب دی ہے۔

ان خطرات کے نتیجے میں جو مالی نقصان ہوتا ہے ان کے سبب بسا اوقات کوئی فرد یا خاندان اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے بھی محتاج ہو جاتا ہے ایسی صورت میں اس کی امداد کی ضرورت اور نقصان کی تلافی کی اہمیت واضح ہے مگر جب نقصان کے نتیجے میں محتاجی کی کیفیت نہ پیدا ہو تو بھی اس فرد کی معاشی کارکردگی متاثر ہوتی ہے اور اس خاندان کے معاشی امکانات محدود ہو جاتے ہیں۔ افراد کی معاشی کارکردگی کو مجروح ہونے سے بچانا اور خاندانوں کے معاشی امکانات کی وسعت کو بحال رکھنا پورے سماج کے لئے معاشی ترقی اور خوشحالی کا ذریعہ ہے۔ وہ سماج جو معاشی خوشحالی اور ترقی کو مطلوب سمجھتا ہو ان مقاصد سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

قانون اعداد کثیر کی روشنی میں انشورنس کا طریقہ اختیار کرکے خطر محض سے وابستہ مالی نقصانات کی تلافی مذکورہ بالا صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی ایک جدید شکل ہے۔ ہم اس بات کا اطمینان حاصل کرچکے ہیں کہ یہ طریقہ ان خرابیوں سے پاک ہے جن کی بنا پر شریعت انسانوں کو بعض طریقے اختیار کرنے سے روک دیتی ہے۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے جن مقاصد کا حصول مطلوب ہے وہ شرعاً معتبر مقاصد ہیں۔ شرعاً معتبر مقاصد کے حصول کے لیے خرابیوں سے پاک نئے طریقے بھی مطلوب ہیں انشورنس کا طریقہ اختیار کرکے افراد معاشرہ پر سے خطر محض کے نتیجے میں پڑنے والے مالی بار کو ہلکا کیا جاسکتا ہے۔ ان کی اقتصادی کارکردگی بحال رکھنے اور پورے سماج میں ایسی فضا قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے کہ پرخطر اقتصادی اعمال چستی کے ساتھ انجام پاتے رہیں۔ اکثر اوقات اس طریقے سے ان لوگوں کو بڑی مدد مل جاتی ہے جنھیں کسی حادثے نے مفلس و محتاج بنا دیا ہو۔ یہ سب شرعاً معتبر مصالح ہیں جن کے تحفظ کے لیے دوسرے ممکن طریقوں کے ساتھ انشورنس کا طریقہ بھی اختیار کرنا چاہیے۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں واضح کیا جائے گا، اسلامی نظام میں انشورنس کی تنظیم کفالت عامہ اور سماجی تحفظ کے نظام سے مربوط ہوگی اور متعلقہ مقاصد کے حصول کے لیے یہ طریقہ بھی دوسرے معروف طریقوں کے ساتھ ہم آہنگ رہ کر اختیار کیا جاسکے گا۔

مومن کی شان یہ ہے کہ جب کوئی ناگوار بات پیش آجائے تو اس پر کبیدہ خاطر نہ ہو صبر کرے اور تسلیم و رضا کے ساتھ بغیر کسی شکوہ اور رنج کے آگے بڑھ جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خطرات و حوادث اور ناگوار باتوں کے سدباب کی کوشش نہ کرے اور ایسی تدابیر نہ اختیار کرے کہ وہ وقوع میں نہ آئیں۔ اسی طرح اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہ پیشگی اس بات کا اہتمام نہ کرے کہ ان خطرات و حوادث اور ناگوار باتوں سے وابستہ مالی نقصانات کی تلافی ہوسکے۔ انسدادی تدابیر اور خطر محض سے وابستہ مالی نقصانات کی تلافی کا پیشگی اہتمام خواہ یہ اہتمام انفرادی ہو یا اجتماعی، عقیدۂ تقدیر اور تسلیم و رضا سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ نبی کریمؐ، صحابہ کرامؓ اور سلف صالح کی پوری تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہی فہم درست ہے۔ اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خطرہ مال و املاک کے ضیاع کا ہے یا کمانے والے کی بیماری، معذور ہو جانے یا وفات پا جانے کا۔

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار[عہ]

(۲)

جناب محمد نعیم صدیقی ایم، اے
رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

ابونعیم علم وعمل، حق گوئی وبیباکی اور زہد و اتقار کے اعتبار سے ابونعیم ایک سدا بہار گلدستہ تھے۔ وہ صغار تابعین کے دامانِ فیض سے وابستہ رہ کر آسمانِ علم وفضل پر مہرِ تاباں بن کر چمکے، امام بخاری جیسے عبقریٔ وقت ان کے تلمذ پر تاحیات فخر محسوس کرتے رہے۔

دولتِ عباسیہ کے شہرۂ آفاق فتنہ خلقِ قرآن کے شعلے جب معتصم باللہ کے عہد میں آسمان سے باتیں کرنے لگے تو اس کی حدت اور لپک سے دوسرے فقہاء ومحدثین کی طرح حافظ ابونعیم بھی محفوظ نہ رہے، مؤرخ خطیب بغدادی نے اس فتنہ میں ابونعیم کے ابتلاء کی پوری تفصیل درج کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

جب مامون الرشید کے فرمان کے تحت والیٔ کوفہ نے خلقِ قرآن کا اعتراف کرنے کے لیے علماء کو طلب کیا تو ابونعیم کوفہ ہی میں تھے، چنانچہ وہ بھی تشریف لے گئے، ان سے پہلے ابن ابی حنیفہ، احمد بن یونس اور ابو غسان بھی پہونچ چکے تھے۔ والی نے سب سے پہلے ابن ابی حنیفہ[عمہ] سے اقرار کرنے کے لیے کہا۔ انھوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ پھر اس نے ابونعیم کی طرف

عہ پہلی قسط کے لیے ملاحظہ ہو الفرقان بابت ماہ شعبان ۱۳۹۲ھ
عمہ یہ امام ابوحنیفہ نہیں ان کے بہت بعد کے ایک اور صاحب ہیں۔

متوجہ ہو کر کہا کہ دیکھو انھوں نے (یعنی ابن ابی حنیفہ نے) بھی اقرار کر لیا ہے۔ ابو نعیم نے یہ سن کر نہایت خشمناک لب و لہجہ میں ابن ابی حنیفہ کو سخت سست کہا اور پھر والی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے کوفہ میں کم و بیش سات سو شیوخ کو یہ کہتے سنا کہ "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" اور یہی میرا بھی عقیدہ ہے۔ اور اس برملا اظہار حق کی خاطر خواہ میری گردن بھی سر سے جدا کر دی جائے میں اس سے باز نہیں رہ سکتا۔[1]

والی کوفہ کے دربار میں ابو نعیم کی اس بے مثال جرأت، حق گوئی و بیباکی کو دیکھ کر احمد بن یونس فوراً اٹھے اور انھوں نے ابو نعیم کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا "جزاک اللہ خیراً" حالانکہ اس سے پہلے دونوں بزرگوں میں سخت غلط فہمیاں تھیں۔

حافظ ابو نعیم مال و دولت اور زخرفات دنیا سے بہت بے نیاز تھے۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگ ان پر تعلیم کی اجرت لینے کا الزام لگاتے ہیں جو اس زمانے میں بہت معیوب اور تورع و ثقاهت کے منافی خیال کیا جاتا تھا لیکن ابو نعیم خود ہی بیان کرتے ہیں کہ اگر لوگوں کا یہ خیال صحیح ہوتا تو میرے ۱۳ نفری گھر کی عسرت اس حال کو نہ پہونچتی کہ اس وقت [illegible] میرے گھر میں نہیں ہے۔ یلومونني على الأجر وفي بيتي ثلاثة عشر نفساً وما في بيتي رغيف[2]

عبد اللہ بن ادریس | امام عبد اللہ بن ادریس (م ۱۹۲ھ) کے جد امجد یزید بلیل المرتبت تابعی تھے جنھوں نے حضرت ابو ہریرہ کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کی تھی۔ ان کے والد ادریس بھی وقت کے بلند پایہ عالم اور ماہر فن تھے۔ ان گوناگوں مناسبتوں کی وجہ سے عبد اللہ بھی علم کی دولت سے مالا مال ہوئے۔

ابن ادریس نے حیات جاہ و منصب سے کنارہ کش رہے۔ دنیا نے ان کے در پر بارہا جبہ سائی کی۔ لیکن انھوں نے بے نیازی کا لائق تقلید نمونہ پیش کرتے ہوئے ہمیشہ اسے ٹھکرا دیا چنانچہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے ان کے سامنے قضا کا عہدہ پیش کیا اور اسے قبول کرنے پر زور اصرار کیا۔ لیکن ابن ادریس نے اپنی عدم صلاحیت کا حیلہ کر کے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ البتہ

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴۹ [2] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۲۷۵

قبل خلیفہ مذکور نے یہ منصب حافظ وکیع ابن الجراح کے سپرد کرنا چاہا تھا مگر انھوں نے بھی اسے ٹھکرادیا اور پھر حفص بن غیاث نے اس کو قبول کر لیا۔

پھر ہارون الرشید نے پانچ ہزار درہم بطور زادِ راہ پیش کیے تو اوالذکر دونوں ائمہ نے اسے بھی لینے سے انکار کردیا۔[۱]

ایک بار خلیفہ ہارون الرشید حج کی غرض سے مکہ جارہا تھا۔ سرِ راہ کوفہ سے اس کا گزر ہوا۔ اس کے ہمراہ دونوں لڑکوں امین و مامون کے علاوہ قاضی ابو یوسف بھی تھے۔ کوفہ پہونچکر اس نے حکم دیا کہ تمام مقامی شیوخ حدیث جمع ہوں تاکہ ان سے امین و مامون سماع حاصل کر سکیں۔ چنانچہ حسب الحکم تمام علماء خلیفہ کی فرودگاہ پر جمع ہوئے۔ لیکن عبداللہ بن ادریس اور عیسیٰ بن یونس اسے وقارِ علم کے منافی تصور کرکے نہ آئے۔

تمام شیوخ کوفہ سے استفادہ کرنے کے بعد امین و مامون ابن ادریس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے سو حدیثیں سماعت کیں۔ اس کے بعد مامون نے ان کی خدمت میں کچھ مال وزر پیش کیا لیکن شیخ نے اس میں سے کچھ قبول کرنا گوارا نہ کیا۔

ان سے فارغ ہوکر دونوں خلیفہ زادے عیسیٰ بن یونس کے پاس پہونچے اور ان سے بھی سماعت حدیث کا شرف حاصل کیا۔ مامون نے انھیں دس ہزار درہم دیے جانے کا حکم دیا جسے ابن یونس نے لینے سے انکار کردیا۔ پھر مامون نے اس رقم کو دوگنا کرکے پیش کیا۔ ابن یونس نے نہایت غصہ میں فرمایا:۔

"خدا کی قسم اگر تم اس مسجد کو فرش سے چھت تک مال بھر کر پیش کرو تو بھی میں حدیث رسول کی تعلیم پر ایک حبہ لینا گوارا نہیں کرسکتا۔"[۲]

عبداللہ بن عمر | حضرت عمر فاروق کے خانوادہ فضل و کمال کے چشم و چراغ تھے۔ علم و عمل دونوں میں بلند پایہ حاصل تھا۔ ایک بار ایام حج میں ہارون الرشید کو سعی (صفا و مروہ کے درمیان سعی کا مقام) روک کر اس کی بدعنوانیوں پر سخت برا بھلا کہا۔ علامہ یافعی نے ان دونوں کے

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۰۸ [۲] ایضاً

مکالمے کو تفصیل سے نقل کیا ہے جو یہ ہے:۔

شیخ:۔ اے ہارون۔

خلیفہ:۔ جی جناب حاضر ہوں۔ فرمائیے۔

"کیا تم ان حاجیوں کی تعداد شمار کر سکتے ہو؟" شیخ نے حجاج کرام کے انبوہ عظیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت فرمایا۔

خلیفہ:۔ بھلا اسے کون شمار کر سکتا ہے۔

"کان کھول کر سن لو" شیخ نے نہایت جرأت کے ساتھ کہا۔" ان میں سے ہر ہر شخص تو خود اپنا مسئول ہے، لیکن تم خدا کے نزدیک ان سب کے جوابدہ اور ذمہ دار ہو۔" پھر ذرا رک کر ارشاد فرمایا۔" بخدا العجب انسان خود اپنے مال میں اسراف کرتا ہے اور وہ لائق تعزیر قرار پاتا ہے تو پھر اگر وہ عام انسانوں کے مال میں فضول خرچی کا مرتکب ہو تو اس کی سزا کس قدر بڑی ہوگی؟[1]

عیسیٰ بن یونس ان کی شانِ استغنا اور بے نیازی کا ایک واقعہ سطور بالا میں آچکا ہے کہ کوفہ میں مامون نے ان سے سماعت حدیث کا شرف حاصل کرنے کے بعد دس ہزار اور پھر بیس ہزار درہم کی خطیر رقم ان کی خدمت میں پیش کی جس کو انھوں نے بڑی بے پرواہی سے ٹھکرا دیا۔

اسی طرح ایک دفعہ انھیں اہل رقہ نے درس دینے کے لیے بلایا۔ جب وہ وہاں سے فارغ ہو کر واپس جانے لگے تو ایک لاکھ کی رقم ان کی خدمت میں پیش کی گئی مگر وہ کسی طرح اسے قبول کرنے پر راضی نہ ہوتے اور ہر مرتبہ فرماتے "لاحاجة لی فیھا" یعنی مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب اصرار حد سے بڑھا تو ناراضگی کے ساتھ نہایت فیصلہ کن انداز میں فرمایا:۔

لا واللہ لا یتحدث اھل العلم	نہیں بخدا میں اہل علم کو یہ کہنے کا موقع
انی وکلت للسنۃ ثمنا الا کان	نہیں دوں گا کہ میں نے حدیث کی قیمت
ھذا قبل أن ترسلوا إلی ۔	وصول کی۔ ہاں اس صورت میں میں اسے قبول
فاما علی الحدیث فلا واللہ ولا	کر لیتا۔ جب تم نے مجھے بلایا نہ ہوتا۔ بخدا

---

[1] مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان ج ۱ ص ۳۶۷

شربة ماء ولا اهليلجة[1] حدیث پر تو میں ایک گھونٹ پانی قبول کرنے کو بھی تیار نہیں ہوں، اور نہ ایک ہرڑ تک لینے کو۔

عیسیٰ بن یونس نے کم و بیش نوے سال کی عمر پائی۔ اس طویل ترین مدت کا بیشتر حصہ حج بیت اللہ اور جہاد میں گزرا تھا۔ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک سال حج کرنے اور ایک سال جہاد فی سبیل اللہ میں لگنے کا معمول بنا لیا تھا۔ اور آخر عمر تک اس پر عامل رہے۔ ان کے شاگرد رشید احمد بن جناب روایت کرتے ہیں:۔

غزا عیسیٰ بن یونس خمسا و اربعین غزوة و حج خمسا و اربعین حجة[1] امام عیسیٰ بن یونس نے ۴۵ حج اور ۴۵ غزوے کیے

حفص بن غیاث | قاضی ابوعمر حفص کوفہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مشاہیر دوران تابعین سے فیض صحبت حاصل کیا تھا۔ حدیث و فقہ میں پوری مہارت رکھنے کے ساتھ استغنا و بے نیازی، حفظ و اتقان اور سیر چشمی و فراخ دستی کا مجسم پیکر تھے۔

ان کی کتاب زندگی کا سب سے روشن باب قضاء و افتا کے سلسلہ میں ان کی خدمات ہیں۔ کوفہ و بغداد میں وہ سالہا سال تک اس منصب کی زینت بنے رہے۔ خلیفہ ان کی بڑی عزت و تکریم کرتا اور ان کے عدالتی فیصلوں کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اسی اثناء میں قاضی حفص نے ایک قرضدار مجوسی سردار کے مقدمہ میں دلائل و شواہد کی بنیاد پر اس کے خلاف فیصلہ دیدیا۔ ۲۹ ہزار کے اس قرض کا کچھ تعلق ام جعفر سے بھی تھا۔ چنانچہ اس نے خلیفہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ قاضی حفص کو معزول کر دیں۔ لیکن ہارون الرشید اس کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا بلکہ وہ اس بے لاگ فیصلہ سے اس قدر مسرور ہوا کہ اس نے حفص بن غیاث کو تین ۳ ہزار درہم دیے جانے کا حکم دیا۔

لیکن پھر جب ان کی معزولی کے لیے ام جعفر کا دباؤ حد سے بڑھا تو ہارون نے ان کو کوفہ کا

---

[1] تذکرہ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۷ و تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۲۲۹

قاضی مقرر کردیا۔ جہاں انھوں نے حق و انصاف کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ۱۲ / ۱
تک اس منصب کی عزت بڑھائے رکھی۔

ھشام الرفاعی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حفص بن غیاث مسند قضا پر بیٹھے اپنے کام میں منہمک تھے کہ خلیفہ کا قاصد ان کی طلبی کا پروانہ لے کر حاضر ہوا۔ قاضی حفص نے اس سے کہا کہ مقدمات سے فارغ ہو کر آؤں گا۔ کیونکہ میں عوام کا خادم ہوں۔ چنانچہ وہ اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ اٹھے جب تک تمام مقدمات کو فیصل کر کے فارغ نہ ہو گئے۔

کسب حلال میں ان کے فرط احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اپنے عہدۂ قضا کے دوران ایک بار پندرہ روز تک علالت کی بنا پر فرائض منصبی انجام نہ دیے تو صحت یاب ہونے کے بعد اپنی تنخواہ کا نصف یہ کہکر عامل کو واپس کر دیا کہ

هذه رزق خمسة عشر يوماً لم احكم فيها بين المسلمين لاحظ لي فيها لـه

یہ ان پندرہ روز کا خرچ ہے جن میں میں نے مسلمانوں کا کوئی فیصلہ نہیں کیا اس لیے اس رقم کو لینے کا مجھے کوئی حق نہیں۔

قاضی حفص بغداد و کوفہ کے چیف جسٹس تھے جو ظاہر ہے حکومت کا ایک اعلیٰ منصب ہے۔ دنیا کی تمام نعمتیں ان کے قدموں میں ڈھیر تھیں لیکن ان کی بے نیازی بھی اسی نسبت سے ارفع تھی۔ سرکاری خزانہ سے انھیں ماہانہ تین سو درہم تنخواہ ملا کرتی تھی۔ لیکن اس میں سے بھی اپنے جملہ مصارف کے لیے صرف سو درہم رکھ کر بقیہ مستحقین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ؎

ان کی سیر چشمی اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ان کے دسترخوان پر ہمیشہ ان کے تلامذہ اور بہت سے مقامی و بیرونی لوگ شریک رہتے تھے۔ مزید برآں گاہ بگاہ پوری بستی کی دعوت بھی کرتے تھے۔ ابو جعفر المسندی بیان کرتے ہیں کہ:۔

كان حفص بن غياث من اسخى العرب وكان يقول من لم

حفص بن غیاث عرب کے سب سے زیادہ سخی آدمی تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص

لـه تاریخ بغداد ۸/ ۱۹۱ ؎ اخبار القضاۃ ۳/ ۱۸۴

یأکل من طعامی لا احد ثہ و
اذا کان یوم ضیافتہ لا یبقی
رأس من الرواسیین[۱]

میرا کھانا نہیں کھائے گا۔ اس سے میں حدیث بیان نہیں کروں گا۔ جب ان کے یہاں دعوت کا دن ہوتا تو وہ اس کا کوئی شخص اس میں شرکت سے باقی نہیں رہتا۔

اسی فراخ دستی کا نتیجہ تھا کہ وہ عمر بھر عسرت کا شکار رہے اور رحلت کے وقت نہ صرف یہ کہ ان کے پاس ایک درہم بھی نہ تھا بلکہ نو سو درہم کے مقروض بھی نکلے جو ان کے پسماندگان نے ادا کیے[۲]

ابو اسحاق الفزاری امام ابو اسحاق الفزاری (م ۱۸۶ھ) علم و دانش کا وہ نیر تاباں تھے جن کی روشنی سے ایک عالم بقعۂ نور بن گیا۔ نہ صرف تبحر علم و مہارت فن میں بلکہ مکارم اخلاق، طہارت عقائد اور استغنا و بے نیازی وغیرہ کے اعتبار سے بھی ان کی نظیر خال خال ہی مل سکتی ہے۔

امام فزاری کے پاس اگرچہ مال و دولت کی فراوانی رہتی تھی، لیکن ان کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ لیتا وہ یا تو معذور اور پابج لوگوں میں تقسیم کر دیتے یا اہل طرسوس میں خرچ کر دیتے تھے۔ ایک بار ہارون الرشید نے ان کو تین ہزار دینار دیے، فرمایا "میں اس سے مستغنی ہوں" اور کل رقم فوراً صدقہ و خیرات میں دیدی[۳]

چند متفرق واقعات حافظ نضر بن شمیل حدیث، فقہ، لغت، نحو، ادب، تاریخ اور انساب سب پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ بصرہ کے دوران قیام میں ان کی اقتصادی و معاشی حالت نہایت دگرگوں تھی یہاں تک کہ نان شبینہ تک کے محتاج ہو گئے تھے۔ حالانکہ ان کے قدر دانوں اور تلامذہ کا حلقہ بیحد وسیع تھا۔ لیکن شیخ کی حد سے فزوں تر خودداری اور حمیت انھیں دست سوال دراز کرنے سے باز رکھتی تھی۔

پھر جب ہجرت کر کے خراسان پہونچے تو ان کی معاشی خوشحالی کا دور شروع ہوا اور خلیفہ وقت کی قدر افزائی سے دولت مند ہو گئے۔ لیکن باایں ہمہ اس زمانے میں بھی ان کی زندگی تقشف

۱؎ تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۷۳ ۲؎ تہذیب التہذیب ۲/۴۱۷

۳؎ معجم الادباء ۱/۲۰۴

کی حد تک سادہ تھی۔ زبیر بن بکار بیان کرتے ہیں کہ ایک بار شیخ نضر خلیفہ مامون کے پاس اس حال میں گئے کہ نہایت موٹے اور خستہ حال کپڑے زیب بدن تھے۔ خلیفہ نے دیکھتے ہی کہا کہ آپ ... امیر المومنین کے پاس اس قسم کے کپڑوں میں آتے ہیں۔ شیخ نے ٹالنے کی خاطر فوراً فرمایا "بات دراصل یہ ہے کہ مرو میں گرمی بہت سخت پڑتی ہے۔ لہٰذا اس کی حرارت سے ایسے ہی کپڑوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے"[۱]

حافظ ذہبی نے داؤد بن مخراق کی روایت سے شیخ نضر کا یہ زریں قول نقل کیا ہے

لا یجد الرجل لذۃ العلم حتیٰ یجوع وینسیٰ جوعہ[۲]	انسان کو علم کی لذت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک وہ بھوک کی حالت میں بھوک کو بھول نہ جائے۔

یعنی طلب علم کے شوق میں بھوک پیاس کا احساس فراموش ہو جائے اور علم کی لذت سے دوسرے تمام محسوسات کا خیال دل سے محو ہو جائے۔

یزید بن زریع پہلی صدی ہجری کے اواخر کے اکابر حفاظ حدیث اور ممتاز اتباع تابعین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ عبادت و ریاضت زہد و اتقا اور استغنا و بے نفسی میں بھی بلند مقام حاصل تھا۔ ان کے والد زریع بصرہ کے والی تھے۔ اس لیے انھیں راحت و تعیش کے ہر قسم کے سامان فراہم تھے لیکن امام یزید مال و زر اور ثروت و عزت سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور غایت تقویٰ کی بنا پر اپنے باپ کے مال میں سے ایک حبہ بھی استعمال نہیں کیا بلکہ کھجور کے پتوں کا کام کرکے روزی حاصل کرتے تھے۔ ابو سلیمان الاشقر بیان کرتے ہیں کہ زریع نے وفات کے وقت پانچ لاکھ درہم وراثت میں چھوڑے تھے مگر یزید نے اس میں سے ایک درہم بھی نہ لیا[۳]۔ ابن حبان کا قول ہے۔

کان من اورع اھل زمانہ[۴]	وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے متقی تھے۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ۱/ ۲۸۶ [۲] ایضاً [۳] تہذیب التہذیب ۱۱/ ۳۲۰ [۴] صفوۃ الصفوۃ ۳/ ۲۰۰

یزید بن ہارون السلمی (م ۲۰۶ھ) بڑے جلیل المرتبت تبع تابعی اور ثقہ حافظ حدیث تھے۔ بایں ہمہ فضل و کمال عجز و فروتنی کا ایک کامل نمونہ تھے۔ چنانچہ اس عہد کے ایک پرگو شاعر علی بن الجندی الحرانی نے ایک مرتبہ حاضر ہو کر آپ کی خدمت میں ایک مدحیہ قصیدہ پڑھا جس کی تشبیب کے بعد وہ کہتا ہے۔

إلی یزید بن هارون الذی کملت ... فیه الفضائل و اشفی علی خفن

حتی أنبیت امام الناس کلهم ... فی العلم و الفقه و الآثار و السنن

و الدین و الزهد و الإسلام قد علموا ... و الخوف لله فی الأسرار و العلن

برا، تقیا، نقیا، خاشعاً، ورعاً ... مبرأ من ذوی الآفات و الابن

ما زال مذ کان طفلاً فی شبیبة ... حتی علاه مشیب الرأس و الذقن

یہ قصیدہ تشبیخ کے ساتھ شاعر کی دلی عقیدت و ارادت کا آئینہ دار ہے اور چونکہ اس نے اسے نہایت دلسوزی اور محبت کے ساتھ لکھا تھا اس لیے یزید بن ہارون نے کسی طرح دل پر جبر کر کے اسے سن تو لیا لیکن راوی کا بیان ہے کہ جب شاعر نے مذکورہ بالا اشعار پڑھے تو شیخ نے اسے روک دیا، اور اپنے ہاتھ فرط ضبط میں دانتوں سے کاٹنے لگے۔[1]

یزید بن ہارون کو معلوم تھا کہ مامون الرشید کا رجحان عقیدۂ خلق قرآن کی طرف ہے لیکن اس کے باوجود ان کی حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ وہ بے خوف و برملا اس بات کا اعلان کرتے تھے کہ

"قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ جو شخص خلق قرآن کا قائل ہے وہ بلاشبہ کافر ہے۔"[2]

یحییٰ بن یمان (م ۱۸۹ھ) زیور علم کے ساتھ دولت عمل سے بھی مالا مال تھے۔ دنیا سے بے تعلقی اور کثرت ریاضت کے باعث راہب کہلاتے تھے۔ قوت حفظ و ضبط میں ان کی نظیر خال خال ہی ملتی ہے۔ ان کی زندگی نہایت سادہ اور متواضع تھی۔ بشر بن حارث عیشی شاہد ہیں کہ ایک مرتبہ میں یحییٰ بن یمان کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ان کے جبہ میں بڑی کثرت سے

---

[1] تاریخ بغداد ۱۴/۳۴۴ [2] ایضاً ص ۳۴۲

پیوند لگے ہوئے تھے[1]

معافی بن عمران (م ۱۸۵ھ) کا شمار علم و کمال کے اعتبار سے علمائے اعلام میں ہوتا ہے اور جزیرہ میں علی الخصوص ان ہی کی جد و جہد سے علوم دینیہ کو فروغ حاصل ہوا۔ اللہ جل شانہ نے انھیں کثرت علم کے ساتھ دنیاوی خوشحالی اور فارغ البالی سے بھی سرفراز کیا تھا۔ مال و دولت کے علاوہ بڑے صاحب جائداد تھے۔ لیکن اس کے باوجود خود ان کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ جو کچھ ان کے پاس آتا تھا اس میں سے بقدر کفاف رکھ کر باقی سب اپنے احباب میں جن کی تعداد بہت تھی تقسیم کر دیتے تھے[2]۔ بشر بن الحارث کا بیان ہے کہ شیخ معافی کبھی تنہا کھانا تناول نہ فرماتے بلکہ اپنے دسترخوان پر کچھ لوگوں کو ضرور شریک کرتے[3]

شیخ مکی بن ابراہیم (م ۲۱۵ھ) خراسان کے رہنے والے تھے۔ بہت کثرت سے عبادت فرمایا کرتے تھے۔ عبد الصمد بن فضیل روایت کرتے ہیں کہ میں نے اکثر ابن ابراہیم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ

حججت ستین سنۃ و جاورت عشرین سنۃ[4] — میں نے ساٹھ حج کیے اور بیس سال بیت اللہ کے قریب رہا۔

عبد اللہ بن مبارک کی روایت کے مطابق شیخ مکی نے بارہ سو دینار مکہ کے مکانوں کا کرایہ ادا کیا تھا[5]۔ ساٹھ مرتبہ اس زیارت حرمین کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس زمانہ میں سفر حج کی ان سہولتوں اور آسائشوں کا تصور بھی محال تھا جو عہد حاضر میں پائی جاتی ہیں۔ اس وقت حج کا سفر اپنی صعوبتوں اور خطرات کی بنا پر سفر آخرت کے مرادف خیال کیا جاتا تھا چنانچہ تاریخ بغداد میں اس روایت کے ساتھ "قطعت البادیۃ من بلخ الی مکہ" کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں یعنی میں نے بلخ سے مکہ تک بادیہ پیمائی کی۔

خاتمۂ کلام | زیر نظر مضمون کی پہلی قسط اور مذکورہ بالا سطور کے مطالعہ کے بعد تبع تابعین عظام

(باقی صفحہ ۱۰۴ پر)

[1] تاریخ بغداد ۱۴/۱۲۱ [2] تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۶۲ [3] تہذیب التہذیب ۱۰/۲۰۰ [4] ایضاً ص ۲۹۴
[5] تاریخ بغداد ۱۳/۱۱۷

نئی مطبوعات

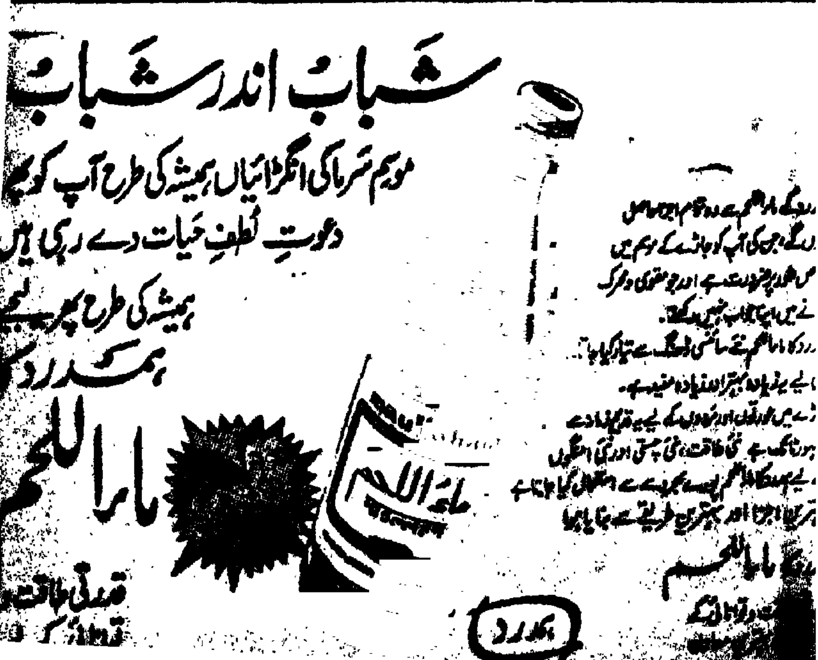
مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ

از ڈاکٹر طاہر محمود (پروفیسر انڈین لا انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی)
سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۱۰۰ غیر مجلد قیمت ۔/۴
ناشر: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر طاہر محمود کو مسلم پرسنل لا کے مطالعہ سے خصوصی دلچسپی ہے۔ اس سلسلے میں وہ بہت سے اسلامی ملکوں کا سفر بھی کر چکے ہیں۔ اسی مطالعہ کی روشنی میں انھوں نے "ہندوستان میں مسلم پرسنل لا" کے مسئلہ پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ موجودہ پرسنل لا میں ترمیم ہونی چاہیے موجودہ حالات میں پرسنل لا کے تحفظ کی یہی صورت ہے۔ اور اس کی پوری گنجائش شریعت میں موجود ہے یعنی ان ترمیمات کے لیے فقہ اسلامی سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی البتہ کسی ایک امام کی فقہ پر انحصار کا رویہ ترک کرنا ہوگا۔ بلکہ شیعہ اور سنی فقہوں کی تفریق بھی ختم کرنی ہوگی۔

کتاب میں بہت تفصیل کے ساتھ ہندوستان میں فی الوقت رائج "مسلم پرسنل لا" کا تعارف کرایا گیا ہے جس پر یہاں عدالتی فیصلے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک باب بیرونی دنیا میں مسلم پرسنل لا کے جائزے سے متعلق ہے۔ مشترکہ سول کوڈ کے مطالبے، اس بارے میں حکومت کی دستوری پوزیشن اور ترمیم کے مختلف نظریوں اور تجویزوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔ مسلم پرسنل لا کے مسئلے کو سمجھنے اور ترمیم کے حامیوں کا نقطۂ نظر جاننے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ہماری رائے میں یقیناً مفید ہوگا۔


4301
ماءُاللحم مصطفائی
طاقت اور خون پیدا کرنیوالا
مشہور و معروف ٹانک
مقوی دل و دماغ و جگر و معدہ و باہ
مفید اور ہر موسم میں قابل استعمال۔
دارالشفاء مصطفائی میرٹھ
MUSTAFAI
MAUL LAHM
دارالشفاء مصطفائی میرٹھ


شباب اندر شباب
موسم سرما کی انگڑائیاں ہمیشہ کی طرح آپ کو بھی
دعوتِ لطفِ حیات دے رہی ہیں
ہمیشہ کی طرح پھر لیجیے
ہمدرد کا
ماء اللحم
ہمدرد